اِهدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِيمَ
تنزیلہ ریاض
Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

# دشتِ ظلمت میں

''دامن سے لے کر آستینوں تک یہ والا ڈیزائن اس طرح سے چھاپنا کہ درمیان سے خم بن جائے۔''

اس نے قمیص کا کپڑا پھیلا کر رکھتے ہوئے انگلی سے نشاندہی کی۔حیدر نے خاموشی سے اس کی ہدایت کو سنا پھر متعلقہ ڈیزائن والا کاربن پیپر نکالنے لگا۔اس کے چہرے سے اس کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔اپنی عادت کے برخلاف وہ اسے مشورہ دینے کے بجائے چپ چاپ کاربن پیپرز کے پلندے میں کھویا ہوا تھا۔اس کو مصروف اور اس درجہ لاتعلق دیکھ کر مریم دکان کا جائزہ لینے لگی۔وہ کافی عرصہ بعد حیدر کی دکان پر آئی تھی، اس لیے اسے بہت سی نئی تبدیلیاں نظر آ رہی تھیں۔گزشتہ مہینے حیدر نے نئی پیکو مشین خریدی تھی جس کے لیے اسے ایک نیا ملازم رکھنا پڑا تھا۔اب اس کی دکان پہ بشمول اس کے تین لڑکے ہوتے تھے۔ایک لڑکا پیکو کرتا تھا جبکہ دوسرا چھپائی کا کام سنبھالتا تھا۔دو ملازموں کی بدولت اب حیدر کا کام ان کی نگرانی ورقم وصولی، دھاگوں یا اس قسم کی دوسری چیزوں کو فروخت تک محدود ہو گیا تھا۔مریم چونکہ گھر کی فرد تھی ،اس لیے اس کی قمیص کی چھپائی حیدر خود کر رہا تھا مگر اس کے چہرے پہ خفگی کے آثار نمایاں تھے اور مریم اس کی خفگی دور کرنا چاہتی تھی۔اس لیے وہ کوئی ایسی چیز تلاش کر رہی تھی جسے موضوع گفتگو بنا کر وہ اسے مخاطب کر سکے۔اسے بالآخر مختلف رنگوں کے دھاگوں کی نلکیوں سے سجی الماری میں ایک چیز نظر آ ہی گئی۔وہ ایک موٹی سی کتاب تھی۔ مریم نے ہاتھ بڑھا کر اس کتاب کو اٹھا لیا جس پر بی اے انگلش گائیڈ بک لکھا تھا۔

''یہ کس کی کتاب ہے؟''صفحہ در صفحہ پلٹتے ہوئے اس نے دریافت کیا۔حیدر نے ایک نظر اسے دیکھا پھر اس کے ہاتھ سے وہ کتاب تقریباً چھیننے والے انداز میں پکڑ کر بند کی اور اسی جگہ پر رکھ دی جہاں سے مریم نے اٹھائی تھی۔مریم کو حد درجہ بے عزتی کا احساس ہوا مگر یہ احساس نیا نہیں تھا۔وہ گزشتہ کئی دن سے حیدر کا یہی رویہ برداشت کرتی چلی آ رہی تھی۔حیدر اس کی حالت زار سے بے خبر وہی کپڑا میز پر رکھ کر ہاتھوں کے دباؤ سے اس پر

پڑی سلوٹیں دور کررہا تھا۔ اس کے بعد اس نے اس پر متعلقہ ڈیزائن والا کاربن پیپر بچھالیا۔ وہ کافی پسند کیے جانے والا ڈیزائن تھا اور بار بار چھپائی کے باعث کچھ بوسیدہ ہوچکا تھا۔ اسی دوران دو خواتین آگئیں جنہیں دھاگے اور موتی وغیرہ خریدنے تھے۔ حیدر ان کی طرف متوجہ ہوگیا۔ حالانکہ اس کا ملازم پہلے ہی ان خواتین کو ڈیل کررہا تھا۔ حیدر کا انداز دیکھ کر مریم کا معصوم دل مزید دکھی ہوگیا۔

''مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے اور ان سے کتنی محبت سے بات کررہا ہے'' اس نے آنکھوں میں آئی ہلکی ہلکی نمی کو پیتے ہوئے خود کلامی کی۔ حیدر اس کا فرسٹ کزن تھا۔ پھپھا جی کی وفات کے بعد پھپھو اپنے سسرال میں رہنے کے بجائے ان کے گھر آگئی تھیں۔ اس کے بعد انہیں سسرال سے لینے کوئی آیا نہ ہی انہوں نے خود واپس جانا مناسب سمجھا۔ بھائی نے بھی بہن کا بہت ساتھ دیا اور زندگی کے ہر معاملے میں ان کی مدد کی کیونکہ اللہ کا دیا بہت کچھ تھا ان کے پاس۔ اپنی زمین، دو بھینسیں، ذاتی مکان، بچوں کے جوان ہونے تک اس عادت میں مزید پختگی آتی چلی گئی۔ مریم اور عمر دو ہی بہن بھائی تھے۔ حیدر نے ان کی تکون کو مکمل کردیا تھا۔ ان تینوں میں بہت گہری دوستی تھی۔ وہ ہر کام ایک ساتھ کرنے کے عادی تھے۔ حیدر نے اسکول جانا شروع کیا تو ایک ہی ضد لگائے رکھی۔

''عمر اور مریم کو ساتھ لے کر اسکول جاؤں گا۔''

''عمر تو ابھی بہت چھوٹا ہے اور مریم لڑکی ہے۔ وہ تمھارے ساتھ اسکول نہیں جاسکتی۔'' ماموں نے سمجھایا تو وہ اور بھی بھڑک اٹھا۔

''واہ جی واہ...... مریم لڑکی ہے...... جب یہ مریم کی بچی کرکٹ کھیلتے ہوئے مجھے اور عمر کو چوکے مارتی ہے، تب آپ کہتے ہیں کہ مریم تو میرا بیٹا ہے اور اب یہ مریم لڑکی ہوگئی۔''

وہ تنک کر بولا تو انہیں اس پر اور بھی پیار آیا۔ انہوں نے اس کے گالوں کو چومتے ہوئے اسے گود میں اٹھالیا۔ وہ جانتے تھے کہ تینوں بچے ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں اور ان کا ایک دوسرے کے بغیر گزارا نہیں، اس لیے وہ ماسٹر صاحب سے خصوصی اجازت لے کر آئے کہ کچھ دن تین سالہ مریم کو اس کے ساتھ بیٹھنے دیا جائے۔ یوں ننھی مریم اس کے ساتھ لڑکوں کے اسکول جانے لگی، لیکن اس سے حیدر کی مشکلات میں اضافہ ہوگیا۔ حیدر کے کلاس فیلوز اور سینئر لڑکے مریم کو اتنا پیار کرتے، اس سے دوستی کرنا چاہتے تو حیدر آگ بگولا ہوجاتا اور ان سے لڑنے مرنے پر تیار ہوجاتا۔

''یہ تو بالکل میری گڑیا ہے۔'' ایک دن ماسٹر صاحب نے مریم کو گود میں بٹھا کر پیار کرتے ہوئے کہا تو حیدر کی شکل دیکھنے والی تھی۔ وہ ماسٹر صاحب سے جھگڑا نہیں کرسکتا تھا مگر اس دن کے بعد سے اس نے مریم کو ساتھ لے جانے کی ضد نہیں کی۔ اسے یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر مریم نے ماسٹر صاحب سے دوستی کرلی تو کیا ہوگا۔

☆ ☆ ☆

''ذرا دھیان سے کرنا۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''مجھے مشورہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر غرایا۔ مریم اس کی دوسری بدتمیزی



پر پہلے کی طرح پھر خاموش ہوگئی۔ حیدر نے اسفنج کو ہلکے ہاتھ سے نچوڑ کر کاربن پیپر پر رکھ دیا۔ وہ مریم کو ستانا نہیں چاہتا تھا مگر نجانے کیسے جو وہ نہیں چاہتا تھا، وہی ہوگیا تھا۔ کاربن پیپر بوسیدہ ہونے کے باعث درمیان میں سے پھٹ گیا اور ساری روشنائی کپڑے کو پھول بوٹوں سے آراستہ کرنے کی بجائے داغدار کرگئی۔ دونوں کچھ لمحے تک اس ہلکے سبز رنگ کے کپڑے کو تکتے رہے پھر مریم کے منہ سے ''ہاہ'' کی صورت سسکی نما آواز نکلی۔

''کوئی مسئلہ نہیں، کوئی مسئلہ نہیں۔ دھل کر صاف ہوجائے گا۔ پکا رنگ نہیں ہے، ایک دھلائی کی مار ہے۔'' حیدر کا خود ساختہ خول لحہ بھر میں چٹخ گیا تھا۔ وہ پشیمانی سے کہنے لگا۔

''بیڑا غرق ہو تمہارا حیدر! یہ کیا کردیا تم نے۔ ہائے میرے اللہ! کتنا پسند تھا مجھے یہ رنگ۔ پھپھو نے کتنے شوق سے مجھے یہ تین سو روپے کا سوٹ لے کر دیا تھا۔'' وہ روہانسی ہوکر بولی جبکہ حیدر کہنے لگا۔

''یہ دھل کر صاف ہوجائے گا مریم! سرف ایکسل ہے نا۔''

''مردتم، سرف ایکسل کے بچے۔ میری خوشی سے تمھیں پتا نہیں کیوں آگ لگ جاتی ہے۔''

وہ جل کر بولی پھر اس کے ہاتھ کے نیچے سے وہ قمیص کا کپڑا کھینچ کر نکالا اور تن فن کرتی اس کی دکان سے باہر نکل گئی۔ اس کی امی ساتھ والی دکان سے دوپٹے رنگوا رہی تھیں۔ اس نے پلٹ کر ایک بار بھی حیدر کی جانب نہیں دیکھا تھا جس کے دل پر ایک بات نقش ہوکر رہ گئی تھی۔

''میری ہر خوشی سے تمھیں پتا نہیں کیوں آگ لگ جاتی ہے''

☆ ☆ ☆

''ناراض ہو؟'' حیدر نے یکدم سوال کیا نل کے نیچے پڑے پانی سے بھرے ٹب میں مریم کا متحرم ہاتھ رک گیا۔ منشی چاچا کچھ دیر پہلے آموں سے بھرا ٹوکرا دے کر گئے تھے۔ مریم صحن میں ایک طرف لگے نل کے پاس بیٹھی آم دھونے میں مصروف تھی۔ حیدر چوکی لے کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''نہیں، میں کیوں ناراض ہونے لگی تم سے۔'' وہ بے حد لاتعلقی سے بولی تو حیدر اس کے انداز پر کٹ سا گیا مگر کچھ کہنے کی بجائے اس نے بھی اسی ٹب میں ہاتھ ڈال دیے اور مریم کے ساتھ مل کر آموں کو غسل دینے لگا۔ یہ اس کے بچپن کی عادت تھی۔ وہ مریم کی ناراضی دور کرنے کے لیے اسی طرح اس کے کاموں میں اس کی مدد کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا اور اس دوران اگر وہ اسے مخاطب کر بیٹھتی تو پھر خوب ہنستا۔

''ارے گلابی سنڈی! تم مجھ سے ناراض ہو بھئی! اتنی جلدی بھول کیوں جاتی ہو۔ یاد نہیں تم نے قسم کھائی تھی کہ اب مجھ سے بات نہیں کروگی؟'' وہ اسے چڑانے کو کہتا تو مریم خاموش ہوجاتی۔

''مان لو گلابی سنڈی! تم میرے بغیر رہ ہی نہیں سکتیں۔'' وہ سینہ تان کر کہتا تو مریم اس کے بال کھینچنے لگتی پھر وہ دونوں ہنس دیتے اور ناراضی ختم ہوجاتی مگر اس بار کی ناراضی عجیب ہی تھی، جس میں خفگی سے زیادہ لاتعلقی اور اجنبیت تھی۔ مریم ٹب میں اس کے ہاتھوں کو حرکت کرتا دیکھتی رہی پھر اس نے آہستگی سے اپنے ہاتھ ٹب سے باہر نکال لیے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھتی حیدر نے اس کا بھیگا ہاتھ تھام لیا۔

''یہ ٹھیک نہیں ہے مریم!'' وہ بہت بے چارگی سے بولا جیسے خود اپنے آپ سے تنگ آچکا ہو۔ گزشتہ

کئی دنوں سے اس کے دل میں جو اتھل پتھل مچی تھی، وہ خود بھی اس سے عاجز آچکا تھا۔ مریم اس کی ماموں زاد تھی۔ وہ ماموں جس نے اسے اس کے ابا کے انتقال کے بعد باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ آج کل جو سوچ رہا ہے، اس کی بھنک کسی کے کانوں تک پہنچے۔ سارا ماموں سمجھیں کہ وہ اپنی اوقات بھولتا جا رہا ہے۔ اسے اپنی اور اپنی امی کی عزت کا بہت پاس تھا مگر آج کل حالات جس نہج پر چل رہے تھے، وہ بھی نا قابل برداشت تھے۔ اس کے دل میں اپنی کم مائیگی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی اس ذہین و فطین، گوری چٹی کزن کے سامنے خود کو بہت کمتر محسوس کرنے لگا تھا۔ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اسے ہمیشہ سے اپنے لمبے چوڑے کسرتی جسم پہ اور اپنے قد و قامت پہ ناز محسوس ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس جیسی شاندار شخصیت والا لڑکا پورے خاندان میں کوئی دوسرا نہیں ہے، مگر جب مریم کا ایف ایس سی کا رزلٹ آیا تو اسے احساس ہوا کہ صرف لمبا چوڑا شاندار سراپا کافی نہیں ہوتا۔ اپنا آپ ثابت کرنے کے لیے کچھ اور خصوصیات بھی ہونی چاہئیں جو اس میں موجود نہیں تھیں اور تب ہی سے احساس ہوا کہ وہ مریم کے لیے کچھ مختلف قسم کے محسوسات کا شکار ہو رہا ہے۔ ان دنوں مریم انٹری ٹیسٹ کی تیاری کرنے لگی اور حیدر نے مسجد جا کر پانچوں وقت باجماعت نماز ادا کرنا شروع کر دی۔ سب کا خیال تھا کہ وہ مریم کے لیے دعا کرتا ہے۔ مگر وہ عجیب سے خدشات میں گھرا رہتا۔

"اگر مریم ڈاکٹر بن گئی تو ماموں مجھ جیسے چھاپے والے کو کبھی اپنی قابل بیٹی دینا پسند نہیں کریں گے۔"

وہ اکثر سوچتا اور پھر خود ہی شرمسار رہتا۔ وہ خود سمجھ نہیں پاتا تھا کہ وہ مریم کی کامیابی سے جلنے کیوں لگا ہے۔ حالانکہ تینوں بچوں میں بڑا ہونے کے باعث ماموں ممانی اسے بہت عزت دیتے تھے مگر پھر بھی وہ سب سے خائف رہنے لگا۔ اس کی بد دعاؤں کا نتیجہ تھا شاید کہ مریم انٹری ٹیسٹ میں فیل ہو گئی۔ حیدر کو لگنے لگا جیسے محاذوں پہ خاموشی چھا گئی ہے۔ اسے اطمینان ہونے لگا تھا مگر مریم اس کے اطمینان کی دشمن تھی۔

"میں بی ایس سی نہیں کروں گی، میں کچھ اور کرنا چاہتی ہوں۔ کچھ ایسا جسے کر کے مجھے سکون ملے۔ میں اپنے آپ کو اسی فیلڈ سے منسلک رکھنا چاہتی ہوں، جس کے میں نے خواب دیکھے تھے۔ میں ڈاکٹر نہیں بن سکی مگر میں نرس تو بن سکتی ہوں۔" اس نے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔ اخبار میں چھپنے والے کسی اشتہار نے اسے پھر سے حیدر سے دور کرنے کے اسباب پیدا کر دیے۔

"میں نرسنگ کرنا چاہتی ہوں ابو!" اس نے اسی روز کھانا کھاتے ہوئے سب کے سامنے ابو جی کو مطلع کیا۔ حیدر کو بعض لوگوں کی خبر نہیں تھی مگر خود اس نے خاموشی سے چمچ پلیٹ میں رکھ کر کھانے کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ اس کی بھوک ہی اڑ گئی تھی۔ ماموں نے ہنس کر بات ٹال دی مگر اس کا دل چاہا کہ دو جوتے لگا کر اس ہٹ دھرم لڑکی کو قاضی صاحب کے سامنے لے جا کر کھڑا کرے اور اس موہنی صورت ضدی لڑکی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا پابند کر لے مگر وہ یہ سب صرف سوچ سکتا تھا۔ آنے والے دنوں میں مریم کی ضد بڑھتی گئی اور ماموں مسلسل انکار کرتے گئے وہ چاہتے تھے مریم بی ایس سی کر لے مگر مریم کے ذہن و دل پہ سفید اوور آل چپک کر رہ گیا تھا۔



"حیدر...... میرے اچھے بھائی...... تمہاری بات تو ابو جی ضرور مان لیں گے۔ تم میری سفارش کر دو نا۔ یہ میرا خواب ہے حیدر! یہ پورا نہیں ہوا تو میں مر جاؤں گی۔ میں سچ مچ مر جاؤں گی۔"

وہ ایک دن اس کے کندھے پہ سر رکھ کر روتے ہوئے کہنے لگی۔ اس کی اس فرمائش پہ حیدر تقریباً تڑپ اٹھا۔ اسے لفظ "بھائی" یکدم ہی برا لگنے لگا مگر مریم کا رونا بھی برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اپنے دل کو مار کر اس نے ماموں کو منا لیا تھا۔ حیدر نے خود مریم کے فارمز اور فیس وغیرہ جمع کروائی تھی مگر ہر مقام پر وہ اپنے آپ کو مزید کھوکھلا اور بے جان محسوس کرتا۔ وہ چڑچڑا ہوتا جا رہا تھا۔ عجیب سی قنوطیت اسے گھیرے رکھتی اور لوگ شکوہ کرتے رہتے کہ وہ بدل گیا ہے۔ وہ جانتا تھا، وہ تبدیل نہیں ہوا مگر ہر گزرتے دن کے سامنے اس کے دل میں اپنی کم مائیگی کا بڑھتا ہوا احساس اسے کمزور کر رہا تھا۔

"حیدر...... حیدر کے بچے...... میرا ہاتھ چھوڑو۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑے سوچ کی نجانے کون سی سیڑھی چڑھ رہا تھا کہ مریم نے اس کی پیشانی پر دوسرا ہاتھ مار کر اسے ہوش کی دنیا میں واپس لانا چاہا۔ حیدر نے دھیرے سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"حیدر...... تمہیں کیا ہو گیا ہے...... تم بہت بدل گئے ہو...... تم ایسے تو نہیں تھے۔" مریم نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ وہ شاید کبھی حیدر کی کیفیت کو سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔ اونچا مزید اونچا اڑنے کی لگن اسے کسی اور طرف دھیان دینے کا موقع کم ہی دیتی تھی۔

"میں کیا کروں مریم! میرا جی آج کل بہت اداس رہنے لگا ہے۔" حیدر نے تھک ہار کر کہہ ڈالا۔

"مجھے ہر چیز سے الجھن ہوتی ہے۔ دل چاہتا ہے خود مر جاؤں یا سب کو مار ڈالوں۔" مریم کے خاموش رہنے پر مزید گویا ہوا۔

"میری وجہ سے اداس ہونا؟" مریم نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے یکدم سوال کیا تو حیدر اثبات میں سر ہلا گیا۔ مریم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری تھی۔

"بہت محبت کرتے ہو نا مجھ سے؟" مریم نے ایک بار پھر سوال کیا تو وہ ہکا بکا ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔ وہ بات جو وہ مہینوں سے خود سے کہتے ہوئے بھی شرما رہا تھا، وہی بات مریم نے بہت آرام سے کہہ ڈالی تھی۔

"عمر کی حالت بھی تمہارے جیسی ہو رہی ہے، وہ تمہاری طرح چڑچڑا تو نہیں ہوا مگر بہت اداس رہنے لگا ہے۔ میں جانتی ہوں تم دونوں مجھے چڑانے کے لیے مجھ سے جھگڑا کرتے ہو مگر حقیقتاً تم دونوں کو مجھ سے بہت محبت ہے۔" اس کی بات سن کر وہ گہرا سانس بھر کر رہ گیا۔

"تم بالکل بے وقوف ہو مریم!" وہ بے چارگی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"اوہوں...... کوئی نہیں...... تم خود ہو گے بے وقوف۔"

وہ ناک چڑھا کر بولی پھر صحن کے بیچوں بیچ پڑی چارپائی پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنے والے دنوں کے حوالے سے ایک نیا عزم صاف دکھائی دے رہا تھا اور حیدر کو اس کے ان ہی عزائم سے ڈر لگتا تھا۔ وہ دو سال بعد والی مریم کا تصور کرنے کی کوشش کرتا تو سادہ لباس میں چوٹی باندھے معصومیت سے مسکراتی ہوئی مریم

کی بجائے ایک نہایت طرحدار اسٹائلش لباس میں ملبوس اونچی ہیل اور کھلے بالوں کے ساتھ منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی بولتی ایک لڑکی اس کے سامنے آجاتی۔ کلف لگے شلوار قمیص میں ملبوس اپنے آپ کو شہزادہ سمجھنے والا حیدر، مریم کے سامنے ایک دم ہی چغد لگنے لگتا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس قسم کی سوچوں کو جھٹک نہیں پا تا تھا۔

''مریم! ایک بات پوچھوں؟'' اس نے وہیں نل کے پاس بیٹھے بیٹھے مریم کو مخاطب کیا۔

''نہیں۔'' وہ فوراً بولی پھر بے وجہ ہنسنے لگی۔

''تم بالکل بدل گئے ہو حیدر! اب تم مجھ سے اجازت لے کر بات کیا کرو گے۔ ارے میں وہی مریم ہوں جسے تم گلابی سنڈی اور چتکبری سنڈی کہہ کر چڑایا کرتے تھے۔'' وہ شگفتہ سے انداز میں اسے اس کے بدلے ہوئے رویے کا احساس دلانے لگی۔ حیدر بھی اب کی بار کھل کر مسکرایا۔

''میں چاہے سو بار بدل جاؤں مریم! مگر تم کبھی مت بدلنا۔ ایسی ہی رہنا معصوم، اپنی اپنی سی۔'' وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی سی آواز میں بولا تو مریم کی بولتی بند ہوگئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات نے حیدر کو مزید مسکرانے پر مجبور کیا۔

''اتنی بھی بے وقوف نہیں ہو مریم!'' یہ بات اس نے خود سے کہی اور مریم نجانے کیوں بس پاؤں کی انگلیوں کو تکے جارہی تھی۔

☆ ☆ ☆

گھڑی کی سوئیاں نجانے کیا بجارہی تھیں جب اس کی آنکھ کھلی۔ کھڑکیوں کے پردے ابھی تک نہیں ہٹائے گئے تھے جس کی وجہ سے کمرے میں تاریکی کا راج تھا اور سامنے دیوار پر لگی گھڑی اسے صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے دو تین بار آنکھیں جھپکیں پھر منہ کھول کر جماہی لی۔ اس کے سارے وجود پر عجیب سی کسلمندی اور بیزاری چھائی ہوئی تھی۔ اس کا جب جب اپنی ممی سے جھگڑا ہوتا تھا، تب تب یہی بیزاری اس کے پورے وجود پر چھا جاتی تھی۔ اس نے کروٹ بدلی اور سائیڈ ٹیبل پر پڑی اپنی رسٹ واچ اٹھا کر ٹائم دیکھنے لگا۔ بارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اس کا خیال تھا ابھی ساڑھے چھ یا سات کا وقت ہوا ہوگا۔

''یعنی کہ حد ہوگئی۔ ایک ممی کا موڈ مجھ سے آف ہو جائے تو سارا گھر مجھ سے لاتعلق ہو جاتا ہے'' اس نے گردن جھٹک کر خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ اسے جلد از جلد اٹھ کر پارک میں واک کے لیے جانا تھا، جہاں اس کی اپنے پاپا کے ساتھ ملاقات متوقع تھی مگر ممی کے ساتھ ہونے والے جھگڑے نے سب چوپٹ کر دیا تھا۔ اسے پاپا کے ساتھ بہت سی باتیں ڈسکس کرنا تھیں جو وہ اب نہیں کر سکتا تھا کیونکہ پاپا ایک ماہ کے لیے تھائی لینڈ جارہے تھے۔ اسے رات والے جھگڑے کے متعلق بھی پاپا کو مطلع کرنا تھا۔ روٹین کے مطابق وہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب گھر واپس آیا تو ممی پہلے ہی بھری بیٹھی تھیں۔ انہوں نے اپنے ذرائع سے اس کے میٹرک کا رزلٹ پتا کروالیا تھا اور وہ اس بار بھی کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ حالانکہ اس سال وہ دوسری بار میٹرک کا امتحان دے رہا تھا۔



''تمھارے رزلٹ کا کیا بنا سنی؟'' ممی نے سنجیدگی سے استفسار کیا تھا۔ وہ لاؤنج میں پڑے فریج کا دروازہ کھولے پانی کی بوتل نکال رہا تھا۔ ان کے انداز نے اسے چونکایا تھا۔ گزشتہ سال رزلٹ اناؤنس ہونے پر ممی نے اس کی جس انداز میں آؤ بھگت کی تھی، وہ اسے بھی بھولا نہیں تھا۔ وہ جواب دینے کی بجائے بوتل کا ڈھکن کھول کر پانی پینے لگا۔

''میں نے تم سے تمھارے رزلٹ کے متعلق پوچھا ہے سنی؟'' ممی اب کی بار اونچی آواز میں بولیں۔ انہیں اپنے سوالات کا نظر انداز کیے جانا سخت ناپسند تھا۔

''ابھی رزلٹ اناؤنس نہیں ہوا ممی! میرا خیال ہے ابھی کچھ اور دن لگ جائیں گے۔'' وہ جل تو جلال تو کا ورد کرتے ہوئے بظاہر اطمینان سے بولا تھا۔ اس کا یہی اطمینان انہیں مزید سلگا گیا۔

''تم جھوٹ بھول رہے ہو! اپنے باپ کی طرح تم بھی مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو۔'' وہ چلا کر بولیں۔ ان کے غیض سے وہ ہمیشہ ہی خائف رہتا تھا۔

''میں آپ سے جھوٹ نہیں بول رہا ممی! بلکہ سچ......''

''شٹ اپ......جسہ ،شٹ اپ......'' انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''میں تمھارے سارے کرتوتوں سے واقف ہوں۔ تم ساری زندگی کچھ نہیں کر پاؤ گے، بس مجھے شرمندہ کرواتے رہو گے اور میرا دل جلاتے رہو گے۔ تمھیں تو اس بات پر بھی کوئی شرمندگی نہیں ہوتی کہ تمھارے باقی کلاس فیلوز تم سے آگے نکل چکے ہیں اور تم ابھی تک میٹرک ہی کلیئر نہیں کر پائے۔ میرے کتنے......''

''میں نے آپ سے کہا تھا ممی! میں سائنس سبجیکٹ نہیں پڑھنا چاہتا۔ ان فیکٹ میں پڑھ ہی نہیں سکتا۔ مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں ہے مگر آپ نے زبردستی......''

''زبردستی......زبردستی......شیم آن یو سنی! میں نے تمھیں آپشن دیا تھا کہ تم......''

''نہیں ممی!'' وہ دونوں مسلسل ایک دوسرے کی بات کاٹ کر اپنا اپنا نقطہ نظر واضح کر رہے تھے۔

''اسے آپشن نہیں کہتے جو آپ نے میرے سامنے رکھا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ اگر میں نے سائنس سبجیکٹس نہیں پڑھے تو آپ مجھے سڈنی، بڑے ماموں کے پاس بھجوا دیں گی، اس لیے مجھے مجبوراً سائنس سبجیکٹس ہی پڑھنے پڑے، ورنہ آپ جانتی ہیں میں کامرس پڑھنا چاہتا تھا۔'' وہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہوگیا۔ وہ بھی کچھ دیر کو خاموش ہوگئی تھیں کیونکہ بات وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اس نے پاپا کے مشورے سے کامرس پڑھنی چاہی تو ممی نے اس ایشو کو انا کا مسئلہ بنالیا تھا۔ وہ کسی قیمت پر اسے کامرس نہیں پڑھنے دینا چاہتی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتی رہیں پھر ان کے چہرے پر بے بسی و بے چارگی کے تاثرات در آئے۔ ان کی خفگی کسی اور جذبے میں ڈھلنے لگی۔

''اس شخص نے تم پر کوئی جادو کر دیا ہے جو تم میری کسی بات کو سننے پر تیار نہیں ہوتے۔ تم میری اولاد نہیں ہو، تم صرف اس شخص کی اولاد ہو۔ تمھیں کبھی بھی میرا احساس نہیں رہا۔ میں نے تمہاری بہتری کے لیے اپنا

آپ قربان کر ڈالا مگر تم اس شخص کے نام کی تسبیح کرنے سے باز نہیں آئے۔ تم نے کبھی مجھے اچھا سمجھا ہی نہیں۔ حالانکہ میں نے تمھارے لیے......" آنسوان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

ممی کے دل میں ہمیشہ پاپا کے لیے غبار رہتا تھا۔ اس کے ممی اور پاپا کے بیچ اس کی پیدائش کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد علیٰحدگی ہوگئی تھی۔ اس کے بعد پاپا نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ممی کے دل میں موجود غلط فہمیوں کو دور کر سکیں، مگر وہ اپنی ہر کوشش میں ناکام رہے تھے۔ اپنے بچوں سے ملاقات کے لیے بھی انہیں کورٹ سے آرڈر حاصل کرنا پڑا تھا مگر ایک جنگ وہ ممی سے لڑے بغیر ہی جیت چکے تھے۔ ان کا بیٹا مکمل طور پر ان کے قابو میں تھا اور یہ بات اس کی ممی کو تاؤ دلائے رکھتی تھی۔ وہ کورٹ آرڈر کی وجہ سے اسے اپنے پاپا سے ملنے سے نہیں روک سکتی تھیں مگر وہ اس پر ہر معاملے میں نہایت سختی روا رکھتی تھیں۔ شاید اسی وجہ سے وہ ان سے اتنا خائف رہتا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ماں سے محبت نہیں کرتا تھا انہیں اس طرح سے روتا دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ ان کے قریب آکر جھجکتے ہوئے کارپٹ پہ ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"آئی ایم سوری ممی! آپ پلیز روئیے مت۔ ٹرائی ٹو انڈراسٹینڈ می ممی! میں نے بہت کوشش کی مگر......" وہ ان کے بہتے آنسو دیکھ کر بے حد پشیمان تھا۔

"میں کیا کروں ممی! میرا اس طرف رجحان ہی نہیں ہے۔ مجھے بائیولوجی، کیمسٹری وغیرہ بالکل سمجھ میں نہیں آتے۔" اس کی ممی نے اپنے گھٹنوں پر رکھے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"تمھیں احساس ہے میں نے تمھارے لیے کیا نہیں کیا۔ تمھیں بہتر سے بہتر چیز فراہم کرنے کے چکر میں، میں نے خود کو بھی فراموش کر ڈالا۔ کتنی رقم خرچ کی میں نے تم پر۔ مہنگی کتابیں، بہترین ٹیوٹر، اعلیٰ انسٹی ٹیوٹ۔ کسی ایک چیز کی...... کسی ایک چیز کی تو لاج رکھی ہوتی سنی!" وہ ایک بار پھر رونے لگیں۔

"مجھے پلیز معاف کر دیجیے ممی! پلیز ممی......"

"تم ہر جگہ مجھے شرمندہ کرواتے ہو۔ تم کیسے بیٹے ہو سنی! بیٹے ایسے تو نہیں ہوتے۔ بیٹے تو ماؤں کا مان ہوا کرتے ہیں۔ تم ایسے کیوں ہو سنی!" اب کی بار وہ بلکنے لگیں۔ یہ سلسلہ مزید چل سکتا تھا مگر دفعتاً فون کی بیل بج اٹھی۔ ممی نے بہتے آنسو پونچھ کر فون اٹھا لیا۔ دوسری جانب اس کے پاپا تھے۔

"وہ تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔" انہوں نے سختی سے کہہ کر فون بند کر دیا جبکہ وہ بے چینی سے پاپا کے فون کا منتظر تھا۔

"آپ کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیے تھا ممی!" اس کا اتنا کہنا قیامت ہو گیا۔

"تمھیں میرے جھوٹ یا سچ کی پروا نہیں ہونی چاہیے۔ تم صرف اپنی پروا کرو یا پھر اپنے باپ کی۔ تمہاری بلا سے میں جیوں یا مروں۔ وہ ہے نا، تمہارا باپ" انہوں نے اس کے پاپا کے لیے بلا دریغ دو تین گالیوں کا استعمال کیا۔

"آپ مجھے گالیاں دے لیجیے مگر پاپا کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ یکدم مشتعل ہو کر بولا۔ اس کا لہجہ اتنا اونچا تھا کہ لمحہ بھر کو اس کی ممی بھی خاموش ہو گئیں۔



"تمھیں میرے ساتھ زیادہ زبان چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں سے اٹھو، اپنے کمرے میں جاؤ۔ اب کی بار میں تمھارے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتوں گی۔ آج کی تاریخ میں لکھ لو، ٹھیک چھ ماہ بعد میں تمھیں سڈنی بھجوا دوں گی۔ مجھے تمھارے جیسے بیرا سائٹ کی ضرورت نہیں ہے۔" ان کی بات سن کر وہ بھڑک اٹھا۔

"آپ شاید اپنے حواسوں میں نہیں ہیں ممی! میں کبھی سڈنی نہیں جاؤں گا۔ آپ کو میرے جیسے پیرا سائٹ کی ضرورت نہیں ہے تو کوئی بات نہیں، میں پاپا کے پاس چلا جاتا ہوں۔" اس نے انہی کے انداز میں ہٹیلے پن سے کہا۔ اسے جواب دینا بھی انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ وہ خاموشی سے اٹھیں اور اپنے کمرے کی سمت چل دیں۔

"تم جانتے ہو میں اپنے فیصلے تبدیل نہیں کرتی۔"

لاؤنج کا دروازہ چھوڑنے سے پہلے انہوں نے کہا۔

"میں بھی آپ ہی کا بیٹا ہوں ممی!" وہ چلا کر بولا لیکن اس کی آواز در و دیوار سے ٹکرا کر واپس آگئی تھی۔ ممی کمرے سے جا چکی تھیں۔ وہ کافی دیر تک وہیں بیٹھا کھولتا رہا پھر اس نے سینٹرل ٹیبل پر پڑا کرسٹل کا نفیس سا گلدان اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔

"میں مر کر بھی آسٹریلیا نہیں جاؤں گا، کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں۔ آپ لکھ لیجیے ممی! میں نہیں جاؤں گا۔" وہ کافی دیر تک اونچی آواز میں بڑبڑاتا رہا۔ اپنے کمرے میں آکر بھی اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے موبائل سے پاپا کے موبائل پہ کال کرتا رہا مگر کوئی رسپانس نہیں آرہا تھا۔ کافی دیر تک غصہ کرنے کے بعد وہ بستر پہ گر گیا اور چھوٹے بچوں کی طرح رونے لگا۔

یونہی روتے روتے نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی عام حالات میں تو اماں بی اسے صبح جگا دیا کرتی تھیں مگر جب بھی اس کا اور ممی کا جھگڑا ہوتا تو وہ بھی اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیتیں کہ بہرحال ملازمہ تھیں اور مالکن کے مزاج کے مطابق چلنے میں ہی عافیت سمجھتی تھیں۔

اسے ممی کے ساتھ ساتھ باقی گھر والوں پہ بھی غصہ آنے لگا۔ اس کی بہن بالکل اس کی ممی کی کاربن کاپی تھی۔ اسے جب ضرورت ہوتی تو وہ بھائی سے محبت کی بات کر لیتی تھی، ورنہ اپنی دنیا میں مگن رہتی۔ اس کے لاتعداد فرینڈز اور ایک عدد منگیتر ہی اس کی زندگی کا محور تھے۔ ایسے میں وہ بے چارا خود کو بہت مس فٹ محسوس کرتا۔ وہ ممی سے یا بہن سے کوئی بھی بات ڈسکس نہیں کر سکتا تھا۔

"میں بھی دیکھتا ہوں ممی مجھے پاکستان چھوڑنے کے لیے کس طرح مجبور کرتی ہیں۔" یہی سب سوچتے ہوئے وہ بستر سے اتر کر زمین پہ کھڑا ہو گیا۔ اپنی شرٹ اتار کر اس نے بیڈ پر پھینک دی اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے مسلز پھلا پھلا کر دیکھنے لگا۔ اچھی خوراک اور ورزش کی وجہ سے وہ دیوار گیر الماری کی جانب بڑھا۔ سی ڈی پلیئر کے پاس آکر اس نے ایک سی ڈی منتخب کر کے چلا دیا۔ والیوم فل کر کے وہ وارڈروب کی سمت آیا پھر کپڑوں کے نیچے سے اس نے مارون گولڈ کا پیکٹ نکالا تھا۔ یہ لت اسے چند دن پہلے لگی تھی۔ سگریٹ سلگا کر اس نے پیکٹ کو دوبارہ چھپایا اور خود بیڈ پر ڈھیر ہو کر سگریٹ اور میوزک سے لطف انداز ہونے

لگا۔

☆ ☆ ☆

''میں تزئین بخاری ہوں۔'' مریم نے اس آواز پہ سر اٹھا کر دیکھا پھر جھجکتے ہوئے اپنے سامنے کھڑی اس دراز قامت لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔ اس لڑکی کے مقابلے میں مریم گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی بلکہ اس پہ کیا موقوف شہر کے سب سے بڑے اسپتال کے نرسنگ اسکول کے اس ہال میں موجود بہت سی لڑکیاں کافی سے زیادہ گھبراہٹ اور ہچکچاہٹ کا شکار تھیں۔ کلاس میں یہ ان سب کا پہلا دن تھا۔ ایسی صورت حال میں تزئین بخاری کے اس کے ساتھ والی کرسی پر آ کر بیٹھنے اور مخاطب کرنے میں پہل کرنے سے مریم کو بہت ڈھارس ملی۔

''میں مریم چوہدری ہوں۔'' اس نے جھجکتے ہوئے اپنا نام بتایا۔

''نائس ٹو میٹ یو۔ ویسے تمھیں تعارف کی ضرورت نہیں۔ تمھارے مارکس اتنے اچھے ہیں کہ تقریباً ساری کلاس تمھیں تمھارے نام سے مخاطب کرنے کے بجائے آٹھ سو نمبر والی لڑکی کہہ کر تمھارا ذکر کر رہی ہے۔'' تزئین نے سابقہ انداز میں کہا تو مریم کو شرم سی آ گئی۔ پہلی تعارفی کلاس میں اپنا تعارف کرواتے ہوئے اس نے میڈم کو اپنے کل نمبرز بھی بتائے تھے۔ میڈم کے ساتھ ساتھ پوری کلاس بھی کافی متاثر ہوئی تھی۔ آٹھ سو یا آٹھ سو سے زیادہ نمبرز لے کر پری میڈیکل پاس کرنا اتنی حیرانی والی بات نہیں تھی۔ حیرانی والی یہ تھی کہ اتنے شاندار مارکس لے کر ایک لڑکی نرسنگ پڑھنے چلی آئی تھی۔ میڈم نے سب لڑکیوں کو مریم کے لیے تالیاں بجانے کے لیے کہا تھا، تب بھی مریم شرما سی گئی تھی۔

''ارے تم ایسے شرما رہی ہو جیسے آٹھ سو نمبر تمھارے دولہا کا نام ہے۔'' تزئین نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ مریم کی شکل ایک بار پھر دیکھنے والی تھی۔ اس کی دودھیا رنگت پہ سرخی پھیلنے میں بس لمحہ لگتا تھا۔ اسے تزئین کی بات عجیب سی لگی۔ وہ شرما نہیں رہی تھی، بس اسے تعریف سمیٹنے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔

''مجھے لگتا ہے، میں اس کلاس کی واحد گھوڑی ہوں، باقی سب تو میرے مقابلے میں بکریاں لگ رہی ہیں۔'' اس کی خاموشی سے اکتا کر تزئین نے کہا تو مریم کو ایک بار پھر مسکرانا پڑا۔ وہ اس کی بات کی تردید کیے بغیر کلاس کا جائزہ لینے لگی۔ وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہہ رہی تھی۔ کلاس کی باقی لڑکیاں بشمول مریم کے اتنی دراز قامت نہیں تھیں، جتنی کہ تزئین اور یہی قد و قامت اسے نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کر رہا تھا۔

''تمہاری اسکن بہت خوبصورت ہے، کیا استعمال کرتی ہو؟''

اب کی بار بھی تزئین کے سوال نے مریم کو الجھا دیا۔ وہ باقی لڑکیوں کی طرح گھبراہٹ و ہچکچاہٹ کا ذکر کرنے کے بجائے عجیب ہی باتیں کر رہی تھی۔

''پہلے میری اسکن بھی بہت اچھی ہوتی تھیں، فریش اور گلوئنگ پھر پمپلز ہونا شروع ہو گئے۔ دراصل مجھے میک اپ کرنے کا بہت شوق ہے۔ ہر وقت چہرے پہ الابلا تھوپنے کے باعث یہ حشر ہو گیا۔'' وہ مسکراتے ہوئے پُر اعتماد لہجے میں اپنے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ مریم ایک بار پھر مصنوعی انداز میں مسکرائی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ تزئین کو سننے سے زیادہ بولنے سے دلچسپی ہے۔ وہ مریم کے استفسار کے بغیر





مریم کو بتانے لگی کہ اس کی چکنی جلد کے لیے وہ کون کون سے ٹوٹکے استعمال کرتی ہے۔ مریم کو ایسی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لائف بوائے صابن سے نہانے والی اور لسی سے بال دھونے والی مریم چوہدری کے لیے اسکربنگ، کلینزنگ، اسٹرنجنٹ وغیرہ جیسے الفاظ بہت نئے اور انوکھے تھے۔ وہ تزئین کی باتیں نہایت عدم دلچسپی سے سن رہی تھی، جب ایک نہایت مہین سی آواز اس کو سنائی دی۔

''آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟'' اس نے بائیں طرف بیٹھی لڑکی سے استفسار کیا۔

''جی...... میں یہ کہہ رہی تھی کہ میں نے پہلی کلاس نہیں لی تھی، آپ مجھے کورس آؤٹ لائن بتا دیں گی؟'' وہ لڑکی پہلے سے بھی دھیمے اور مسکین سے لہجے میں بولی۔ مریم کو دل ہی دل میں تھوڑا سا اطمینان ہوا کہ کوئی لڑکی اس سے بھی زیادہ گھبراہٹ کا شکار تھی، وگرنہ تو وہ خود کو ہی سب سے زیادہ پزل محسوس کر رہی تھی۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' مریم نے اپنی نوٹ بک کھولتے ہوئے اس سے پوچھا۔ تزئین ان دونوں کو باتیں کرتا دیکھ کر کسی اور لڑکی کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

''روبینہ یاسمین۔'' وہ لڑکی بولی۔ اس کی آواز بہت باریک تھی اور اس کے بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے ابھی رو دے گی۔

''میں آپ کو آؤٹ لائن لکھوا دیتی ہوں مگر آپ پریشان مت ہونا۔ ابھی تو ابتداء ہے، اس لیے بہت مشکل لگے گا مگر ظاہر ہے ہم انٹر تک یہی باتیں بہت مرتبہ پڑھ چکے ہیں، اس لیے......''

''میں نے تو ابھی میٹرک کیا ہے۔'' وہ مریم کی بات کاٹ کر بولی۔

''اچھا۔'' وہ حیرت سے بولی۔

''پہلے سال جنرل نرسنگ میں ہمیں اناٹومی، فزیالوجی، کمیونٹی میڈیسن، نیوٹریشن، انگلش اور مائیکرو بائیالوجی پڑھائیں گے۔ پہلے تین ماہ صرف بنیادی چیزیں پڑھائیں گے پھر......''

''فزیالوجی کے اسپیلنگز بتا دیں پلیز۔'' روبینہ اس کی بات کاٹ کر سر جھکائے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی تو مریم کے منہ کا زاویہ بگڑتے بگڑتے رہ گیا۔

''واٹ ربش۔ تمھیں فزیالوجی کے اسپیلنگز بھی نہیں آتے۔ لاؤ میں لکھ دیتی ہوں کورس آؤٹ لائن۔''

مریم کے کچھ کہنے سے قبل تزئین نے روبینہ کے ہاتھ سے نوٹ بک لے کر اس پر کورس آؤٹ لائن لکھنا شروع کر دی۔ جب اس نے Physiology کو fysiology لکھا تو مریم نے گہرا سانس بھر کر اپنی نوٹ بک اس کے سامنے رکھ دی، تاکہ وہ اس پر سے نقل کر کے کورس آؤٹ لائن لکھ دے۔ ساری کلاس ہی تقریباً اپنی اپنی نوٹ بکس کھولے اسی قسم کے کاموں میں مشغول تھی۔ سب کے چہروں پر فکرمندی کے اثرات غالب تھے، کیونکہ پہلی ہی کلاس میں میڈم بتا چکی تھیں کہ جنرل نرسنگ کے لیے کوالیفائی کرنے کے لیے انہیں ٹیسٹ والے مرحلے سے گزرنا پڑے گا جو تین ماہ بعد ہونا تھا۔ اس ٹیسٹ کو کلیئر کرنے کی صورت میں ہی وہ کوالیفائی کر سکتی تھیں، وگرنہ نہیں۔

کورس آؤٹ لائن لکھ کر دینے کے بعد تزئین اب روبینہ کو پیڈی کیور اور مینی کیور کے متعلق بتا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"میں نے نرسنگ اس لیے جوائن کی کہ میں دکھی انسانیت کی خدمت کر کے یسوع مسیح کے نیک اور پیارے بندوں میں اپنا نام لکھوانا چاہتی ہوں۔" ستارہ مسیح نے سینے پہ صلیب بناتے ہوئے کہا تو ہال میں موجود بہت سی لڑکیوں نے بھی صلیب کا نشان بنایا۔ وہ تینوں ایک ہی رو میں بیٹھی یہ سب کاروائی دیکھ رہی تھیں۔ ستارہ مسیح کی بات سن کر مریم نے تالیاں بجائیں تو روبینہ بھی اس کی تقلید میں تالیاں بجانے لگی۔ جبکہ تزئین نے چیونگم چباتے ہوئے صرف ناک چڑھانے پر اکتفا کیا۔ مزاج کے تفاوت کے باوجود ان تینوں کی اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ وہاں پر اسی فیصد لڑکیاں کرسچن تھیں۔ دس فیصد کچھ دوسرے مذاہب سے تعلق رکھتی تھیں، جبکہ باقی پانچ فیصد مسلم لڑکیاں تھیں۔ ان پانچ فیصد مسلمان لڑکیوں میں مریم اپنی ہم مزاج لڑکی ڈھونڈنے نکلتی تو شاید اسے سارا سیشن اکیلے ہی گزارنا پڑتا، اس لیے اس نے روبینہ اور تزئین کی دوستی کو نہ صرف قبول کر لیا بلکہ ہاسٹل میں وہ تینوں ایک ہی کمرے میں اپنی الاٹمنٹ کروا چکی تھیں۔

ہاسٹل کے اس بڑے سے ہال میں یہ پارٹی سینئرز کی طرف سے نئی آنے والی لڑکیوں کے لیے ارینج کی گئی تھی۔ سب ہی لڑکیاں باری باری وہ وجہ بتا رہی تھیں جس کی وجہ سے انہوں نے نرسنگ کو بطور کیریئر اپنانے کا سوچا تھا۔

"مجھے بچپن سے ہی میڈیسن پڑھنے کا شوق تھا۔ میڈیکل میں ایڈمیشن نہ ہو سکا تو میں نے یہاں ایڈمیشن لے لیا۔" اپنی باری پہ مریم نے اعتماد سے کہا۔ پہلے دن کی نسبت اب وہ کافی پُراعتماد ہو چکی تھی۔

"مجھے بھی شوق ہی ہے جی۔" روبینہ نے اپنی باری آنے پہ مخصوص انداز میں کہا۔ بہت سی لڑکیوں کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ روبینہ کا لہجہ ہی کچھ اس قسم کا تھا

"مجھے شوق ہی نہیں بلکہ جنون ہے۔" تزئین سپاٹ سے لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکتا طنز مریم سے مخفی نہیں رہا تھا۔ اس کے دل میں شدت سے خواہش جاگی کہ وہ اس موضوع پر تزئین سے کھل کر بحث کرے مگر اسے موقع نہ مل سکا۔ ڈنر کے بعد پارٹی کا اختتام ہوا تو وہ اپنے اپنے کمروں میں آ گئیں۔ مریم نے تہیہ کر رکھا تھا کہ آج کی رات تزئین سے وجہ دریافت کر کے رہے گی کہ اس نے یہ پروفیشن کیوں اپنایا، جبکہ وہ اسے اس قدر ناپسند کرتی تھی۔ روبینہ کے سونے تک اسے انتظار کرنا پڑا مگر اس کے سونے کا اطمینان کرنے کے بعد وہ خود کو ایک لمحہ بھی روک نہ پائی۔

"تزئین! تم نے بتایا نہیں کہ تم نے نرسنگ کیوں جوائن کی؟" اس نے اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے سوال کیا۔ تزئین اپنے ہاتھ کا مساج کر رہی تھی۔ اس کی بات سن کر لمحہ بھر کے لیے رک سی گئی پھر مریم کی طرف دیکھ کر بولی۔

"تم نے پوچھا بھی تو نہیں کہ میں نے نرسنگ کیوں جوائن کی؟" اس کے انداز نے مریم کو الجھن



میں مبتلا کیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید تزئین اس سوال کو ٹال دے گی۔

"میں پوچھوں گی تو تم بتا دو گی؟" اس نے ایک اور سوال کیا۔

"ویل... بتا دوں گی... یقیناً بتا دوں گی... تم سے میں کچھ نہیں چھپاؤں گی کیونکہ مجھے اگلے چار سال تک تمہارے ساتھ اسی کمرے میں رہنا ہے مگر..." اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی پھر اپنے بستر سے اٹھ کر اس کے بستر پر آ کر اسی کے سرہانے پہ سر ٹکا کر لیٹتے ہوئے بولی۔

"مگر پھر تمہیں بھی اصل وجہ بتانا پڑے گی۔"

"میں ہال میں سب لڑکیوں کے سامنے بھی بتا چکی ہوں اور اب پھر ایک بار بتا دیتی ہوں کہ میرا شوق مجھے اس فیلڈ میں لایا۔ میں صرف اسی فیلڈ میں کامیاب ہو سکتی تھی، اس لیے میں نے اسے بطور پروفیشن اپنانے کے لیے یہاں ایڈمیشن لے لیا۔" مریم نے ایک ہی سانس میں کہا تو تزئین کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی جس نے مریم کو کسی قدر الجھا دیا۔

"تمہیں شاید میری بات کا یقین نہیں ہے بلکہ تمہیں کسی کی بھی بات کا یقین نہیں آتا۔ ہال میں جب دوسری کلاس فیلوز نے یہ سب کہا تب بھی تمہارے چہرے پہ ایسی ہی مسکراہٹ تھی جیسی اب تمہارے چہرے پہ ہے۔" وہ جل کر بولی تو تزئین ہنس دی۔

"میرے چہرے پہ ایسی مسکراہٹ اس لیے آتی ہے کہ میں تم سب لوگوں کے کھوکھلے لہجے با آسانی پہچان سکتی ہوں۔ اگر کوئی لڑکی یہ کہے کہ وہ نرسنگ کی طرف اس لیے آئی ہے کہ اسے شوق ہے تو مجھے یہ اس صدی کا سب سے بڑا لطیفہ لگتا ہے۔ بھلا کوئی انسان اپنی ضرورت کو اپنا شوق کیسے کہہ سکتا ہے۔" وہ سادہ سے انداز میں ایک تلخ سی بات کہہ رہی تھی۔ مریم کو اس کی بات سے اتفاق نہیں تھا مگر وہ خاموش رہی تاکہ تزئین اپنی بات مکمل کرے۔

"تم جانتی ہو میں نے یہ فیلڈ کیوں اپنائی؟ کیونکہ اس میں مجھے اتنے روپے مل جائیں گے کہ میں اپنی بہت سی معاشی ضروریات با آسانی پورا کرنے کے قابل ہو جاؤں گی، کسی بھی اور پروفیشن کو اپنانے کے لیے سب سے پہلے مجھے اس کے متعلق سب پڑھنا پڑے گا اور پھر جاب حاصل کرنے کا ایک نا ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا، جبکہ نرسنگ میں تو ابتدائی مہینوں میں ہی الاؤنس ملنے لگتا ہے۔" وہ لمحہ بھر کے لیے سانس لینے کو رکی۔

"یہ صرف اور صرف میری ضرورت ہے مریم! تم جانتی ہو میرے باپ نے میری امی کو تب چھوڑ دیا تھا جب میں صرف تین دن کی تھی۔ میری امی کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے دوسری بیٹی کو جنم دیا تھا جبکہ میرے باپ کو بیٹے کی خواہش تھی۔ میری امی مجھے اور میری دو سالہ بہن کو لے کر اس دنیا کی ٹھوکریں کھانے کے لیے شوہر کے گھر کو چھوڑ کر آنے کے لیے مجبور کر دی گئیں۔ امی نے ایک پارلر میں ہیلپر کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ وہ ساری زندگی روپے جمع کرنے کی کوشش کرتی رہیں تاکہ اپنا ذاتی پارلر بنا سکیں دن رات کی محنت کے باوجود وہ کبھی اتنے روپے جمع نہیں کر پائیں۔ میری بہن نے سترہ سال کی عمر میں ایک بوتیک میں جاب کر لی اور آج تک وہ بھی

جاب کر رہی ہے۔ اس کے پاس کبھی اتنی رقم جمع نہ ہو سکی کہ اس بوتیک سے خود اپنے لیے ایک سوٹ ہی خرید سکے۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر لہجہ سسک رہا تھا۔

''میں جانتی ہوں، میری امی اور میری بہن ہمیشہ اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات کے لیے سسکتی رہیں گی۔ ان دونوں کو ملنے والے دو ہزار روپے ہمیں زندگی کی ہر چھوٹی آسائش کے لیے ترسانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ مجھے دیکھ کر شاید تمھیں یہ لگتا ہو کہ میں بہت مالدار لڑکی ہوں مگر یہ سب ملمع کاری ہے جو میں نے خود پر کی ہوئی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ لوگ مجھے غریب سمجھ کر دھتکاریں۔ میں اپنی امی اور بہن کی طرح ترس ترس کر جینا نہیں چاہتی۔ میں ایئر ہوسٹس کے لیے قومی ایئر لائن میں بھی اپلائی کر چکی ہوں۔ میں نے ماڈلنگ کے لیے بھی آڈیشن دیے ہیں مگر وہاں میری قسمت نے ساتھ نہیں دیا، اس لیے میں نے اس فیلڈ کو اپنا لیا۔ حالانکہ میری امی کی اخلاقیات پہ اس بات سے بہت کاری ضرب پڑی ہے مگر پھر بھی میں خوش ہوں کہ ان پر فی الحال بوجھ نہیں بنوں گی۔ الاؤنسز ملنا شروع ہو گئے تو میں امی اور باجی سے ایک روپیہ لینا بھی چھوڑ دوں گی۔'' مریم خاموشی سے اس کی بات سن رہی تھی، مگر بات مکمل ہو جانے پہ وہ تڑپ کر بولی۔

''تمہاری امی تمہارے اس فیصلے پر ناخوش کیوں ہیں؟'' تزئین نے جواب دینے کی بجائے ایک استہزائیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔

''اتنی معصوم مت بنو مریم! میری امی تو میرے عزائم سے ویسے بھی خائف رہتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں چند روپوں کی خاطر ہر حد پار کر سکتی ہوں۔ انہیں میرا کوئی بھی کام کرنا پسند نہیں ہے۔ انہیں ایئر ہوسٹنگ ناپسند ہے، انہیں ماڈلنگ ناپسند ہے، انہیں نرسنگ ناپسند ہے۔ شاید انہیں میں بھی ناپسند ہوں۔ ہر وہ کام جو ہمیں جلدی امیر کر سکتا ہے۔ انہیں ناپسند ہیں۔'' مریم کو تزئین کی باتیں بہت عجیب اور تکلیف دہ لگ رہی تھیں۔ اس کے ابو نے بھی اس کے اس فیلڈ کو اپنانے کے فیصلے کی مخالفت کی تھی مگر اس کی ضد کے آگے ان کی ایک نہیں چلی تھی، مگر اس کے ابو کے دل میں تزئین کی امی کی طرح کے خدشات نہیں تھے۔

☆ ☆ ☆

''مریم......'' ناشتہ کے فوراً بعد وہ اپنا یونیفارم پریس کر رہی تھی، جب عقب سے تزئین کی آواز سنائی دی۔ اس نے منہ سے کچھ کہنے کی بجائے صرف گردن موڑ کر دیکھنے پہ اکتفا کیا۔

''میں امید رکھتی ہوں کہ جو کچھ میں نے رات کو تم سے ڈسکس کیا، وہ سب تم بھول چکی ہو گی۔''

تزئین کے لہجے میں اس قدر سادگی و بے بسی تھی کہ مریم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ مریم سے اپنا ہر راز کہہ دینے کے بعد اب خدشات کا شکار تھی۔ مریم نے استری کا پلگ اتارا اور تزئین کے قریب آ گئی۔

''میں نے تمھیں دوست کہا ہی نہیں دل سے تسلیم بھی کیا ہے اور جسے میں دوست مان لیتی ہوں، اس کے ساتھ میں مرتے دم تک دوستی نبھاتی ہوں۔ رات جو کچھ تم نے مجھ سے کہا، میں نے سب بھلا دیا ہے۔'' وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر محبت سے بولی۔ تزئین کے چہرے پر تشکرانہ جذبات ذرا کی ذرا چمکے پھر وہ اپنی جون میں واپس آتے ہوئے بولی۔



''ایک بات کا دھیان رکھنا، آئندہ کبھی مجھ سے سورج ڈھلنے کے بعد اتنی محبت سے کچھ مت پوچھنا۔ میرا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔'' مریم زور سے ہنس دی، اسی وقت روبینہ کمرے میں داخل ہوئی۔

''تم مجھ پر ہنس رہی تھیں نا؟'' ہاسٹل میں اور پھر نرسنگ اسکول میں بہت سی لڑکیوں کے ساتھ وقت گزار کر وہ اپنے بارے میں کچھ محتاط ہو چکی تھی۔

''ارے نہیں پاگل۔ دراصل میں نے مریم کو لطیفہ سنایا تھا، اس لیے یہ ہنس رہی تھی۔ تم نے شاور نہیں لیا؟'' تزئین نے اس کو ٹالنے والے انداز میں کہا پھر اس کا خشک سر دیکھ کر استفسار کیا۔

''میں نے تو کچھ نہیں لیا۔'' روبینہ ناسمجھی کے انداز میں بولی تو تزئین اور مریم دونوں ہی ہنس دیں۔ روبینہ کی انگریزی کافی سے زیادہ خراب تھی۔

''تزئین نے پوچھا ہے تم نہائیں کیوں نہیں؟'' مریم نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ روبینہ نے کندھے پہ رکھا تولیہ بستر پر پھینکا اور خود تزئین کے بستر پر دھپ کر بیٹھ گئی۔

''میں اس غسل خانے میں نہیں نہا سکتی، وہاں اتنا بڑا لال بیگ اور دیوار کے ساتھ ایک چھپکلی بھی چپکی ہے۔ مجھے بے پردگی کا احساس ہوتا ہے۔'' روبینہ کے اس طرح سے کہنے پہ وہ دونوں پھر سے ہنس دیں۔

''او چک جھمرہ کی شہزادی! تم یہاں کیا کرنے آ گئی ہو، وہیں چک جھمرہ میں رہتیں نا۔ یعنی میڈم کو چھپکلی کے سامنے بے پردگی کا احساس ہوتا ہے۔'' تزئین نے شگفتہ سے انداز میں اسے چڑانا چاہا۔ مریم کے چہرے پر بھی مسکراہٹ بکھری۔ اسے گھر کی یاد آ گئی تھی۔ اسے بھی چھپکلی اور دوسرے حشرات وغیرہ سے بہت ڈر لگتا تھا۔ برسات کے دنوں میں جب کیڑے مکوڑے نکلتے تو وہ چیخنے چلانے لگتی۔ حیدر اس کا خوب مذاق اڑاتا اور پھر جب امی یا پھپھو میں سے کوئی آ کر پوچھتا تو عمر مسکین سی شکل بنا کر کہتا۔

''دیکھیں نا امی! دولہا بھائی پہلی بار گھر آئے ہیں اور مریم بی بی کس طرح شرما رہی ہیں۔'' اس کا اشارہ کاکروچ یا مینڈک وغیرہ کی طرف ہوتا۔ مریم کا غصے سے برا حال ہو جاتا، جبکہ باقی سب مسکرانے لگتے۔ اب بھی وہ سب یاد آیا تو مسکرانے لگی پھر تزئین اور روبینہ کو آپس میں الجھتا چھوڑ کر وہ خود غسل خانے کی سمت چل دی۔ گھر سے نکلتے ہی اسے لگنے لگا تھا جیسے وہ بہت بہادر ہو چکی ہے اور وہ لڑکی جو شہد کی مکھی سے بھی ڈرا کرتی تھی، اسی غسل خانے میں کپڑے تبدیل کرنے چل دی، جہاں ایک کاکروچ موجود تھا اور دیوار سے چھپکلی بھی چپکی تھی، کیونکہ یہاں کوئی حیدر یا عمر نہیں تھا جو اس کی تسلی کی خاطر جوتا لے کر چھپکلی کے پیچھے بھاگتے۔ اسے یہاں اکیلے رہنا تھا اور بہت سی مشکلات کا اکیلے ہی مقابلہ کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

''مجھے لگتا ہے اگر ہم پاپا کے ساتھ رہا کرتے تو ہم سے زیادہ خوش قسمت کوئی نہ ہوتا۔'' ڈبل روٹی کے دو سلائسز کے بیچ آملیٹ کو سیٹ کرتے ہوئے اس نے اپنی بہن سے کہا جو اس کے ساتھ والی چیئر پر بیٹھی اورنج جوس گھونٹ گھونٹ اپنے اندر منتقل کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر لاپروائی اور بے نیازی کا عنصر نمایاں تھا۔

''تمھیں نہیں لگتا کہ اگر......''

''اماں بی! میرا بریک فاسٹ لے بھی آیئے۔'' اس کی بہن اس کی بات کاٹ کر بولی۔ وہ ناشتے میں جوس کے بعد بوائل انڈہ کھاتی تھی جو ٹیبل پر موجود نہ تھا۔ اپنی بہن کے اس طرح سے بات کاٹ دینے سے وہ جی بھر کر بدمزہ ہوا۔

''بولو نا ماہی! تمھیں کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا۔'' وہ اپنا تیار کردہ سینڈوچ نگلتے ہوئے استفسار کرنے لگا۔

''تم چھوٹا بائٹ نہیں لے سکتے۔'' اس کی بہن نے ناگواری سے اپنی ننھی سی ناک چڑھا کر کہا۔

''تم میری بات کا جواب نہیں دے سکتیں۔'' وہ اسی کے انداز میں بولا۔

''نہیں، اس لیے کہ مجھے تمہاری بے سروپا باتوں میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔ میں ممی کیساتھ رہنے کو بھی اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوش قسمتی سمجھتی ہوں۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولی۔

''گوٹوہیل (بھاڑ میں جاؤ) تم ہو ہی احسان فراموش...... جب بڑی بڑی اماؤنٹس (رقوم) چاہیے ہوتی ہیں تو کیسے پاپا کے ساتھ اپنا رویہ درست کر لیتی ہو۔ بھاگ بھاگ کر ان کے پاس جاتی ہو اور جب مطلب نکل جاتا ہے تو پھر ممی کی چمچی بن جاتی ہو۔'' وہ اپنی بہن کو کھا جانے والے انداز میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اسی اثناء میں اماں بی ناشتے کے مزید لوازمات میز پر سجانے لگیں۔ وہ دونوں ان کی موجودگی کے باعث چپ ہو گئے تھے مگر ان کی نگاہوں میں ایک دوسرے کے لیے اس قدر بیزاری تھی کہ اماں بی پوچھے بنا نہ رہ سکیں۔

''تم دونوں جھگڑا کر رہے تھے؟'' اماں بی ان کی آیا تھیں اور وہ دونوں ہی اماں بی سے بہت اٹیچڈ تھے۔

''ہم دونوں نہیں۔ صرف وہ لڑ رہا تھا مجھ سے۔ آپ جانتی ہیں اماں بی! جھگڑے کی عادت مجھے نہیں، اسے ہے۔'' اس کی بہن نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا تو وہ بھڑک اٹھا۔

''ہاں میں تو لڑاکا طیارہ ہو۔ ہر وقت ہر ایک سے جھگڑنا میری تو فیورٹ ہابی ہے۔'' وہ اپنے آگے رکھی پلیٹ کھسکاتے ہوئے بولا۔ پلیٹ سامنے رکھے جوس سے بھرے گلاس سے ٹکرائی۔ گلاس لڑکھڑایا اور جوس کناروں سے چھلک کر ڈبل روٹی کے سلائسز پر گرا۔ اماں بی نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ گزشتہ کچھ دنوں سے وہ کچھ زیادہ ہی چڑچڑا ہوتا جا رہا تھا۔ غصیلا تو وہ بچپن سے ہی تھا مگر اب ہر ایک سے بدتمیزی کرنا جیسے اس کی عادت بن چکی تھی۔ انہیں اس کی اسی سرکشی سے خوف آتا تھا۔

''ارے بیٹا! بہن نے ایسا تو نہیں کہا جو تم اس قدر بے قابو ہو رہے ہو۔ دیکھو ذرا کیا حشر کر دیا تم نے۔'' ان کا اشارہ میز کی ابتر حالت کی جانب تھا۔ اس نے ایک نظر میز کی جانب اور دوسری اماں بی پر ڈالی۔ اس کی آنکھیں پانیوں سے لبالب بھری تھیں۔ اماں بی کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ اٹھارہ سالہ جوان لڑکا بالکل آٹھ سالہ بچے کی طرح لگ رہا تھا۔

''مجھے تم سے نفرت ہے، سب سے، تم سب قابل نفرت ہو۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا اماں بی اور اس کی بہن نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا پھر دونوں نے ہی ایک دوسرے سے نظریں



چرالیں۔

''بچہ ہے، جذباتی ہو جاتا ہے۔ بیگم صاحبہ ہی تو زبردستی اسے سڈنی بھجوا کر اچھا نہیں کر رہیں۔'' اماں بی نے جوس سے بھیگے سلائس الگ پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''بچہ ہے......؟ اماں بی! اٹھارہ سال کا ہو چکا ہے، بچہ نہیں رہا، آپ جانتی ہیں یہ اسموکنگ کرنے لگا ہے۔ میں نے خود اس کو دیکھا ہے۔ بعد میں وارڈ روب چیک کی تو وہاں سگریٹ کا پیکٹ بھی ملا اور آپ کہتی ہیں......'' اس کی بہن کو جوشِ جذبات میں پتا نہیں چلا کہ وہ اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو چکا ہے۔

''ہاں نہیں ہوں میں بچہ...... بہت بڑا ہو چکا ہوں اور کرتا ہوں میں اسموکنگ، تمھیں کیا۔ میں وہی کروں گا جو میری مرضی ہوگی۔ میں نے تو کبھی تمھیں نہیں روکا کہ اپنے درجن بھر بوائے فرینڈز سے فون پر لمبی لمبی باتیں نہ کرو۔ ان کے ساتھ گھومنے مت جاؤ، پھر تم کیوں میری ہر بات میں دخل اندازی کرتی ہو؟'' وہ چبا چبا کر بولنے لگا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ بھی اس کی حالت سے ڈر گئی۔

''میں تم سے بات نہیں کر رہی......''

''تم مجھ سے بات نہیں کر رہیں مگر میرے بارے میں تو بات کر رہی ہو۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر غرایا۔

''دیکھو سنی! میرے ساتھ زیادہ زبان چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ممی کا غصہ مجھ پر مت نکالو۔ تمھیں ممی کے ساتھ رہنا ہے یا پاپا کے ساتھ، یہ تمہارا پرسنل پرابلم ہے۔ میرے ساتھ بدتمیزی مت کرو، ورنہ میں ممی کو بتا دوں گی کہ تم اسموکنگ کرتے ہو۔'' اس کی بہن کے دھمکی آمیز لہجے نے اسے مزید سلگا دیا۔

''اوشیور، وائے ناٹ۔ تم ابھی جا کر ممی کو بتا دو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں کسی سے ڈرتا نہیں ہوں۔ بس اتنا یاد رکھنا کہ پرسوں تم ممی سے لیلیٰ کے گھر پارٹی میں جانے کی پرمیشن لے کر گئی تھیں مگر لیلیٰ تو ایک ہفتہ قبل اپنے پیرنٹس کے ساتھ میونخ روانہ ہو چکی تھی۔ لیلیٰ کا بھائی میرا دوست ہے۔ پرسوں تم جب واپس آئی تھیں تو میں جاگ رہا تھا اور تم جس لڑکے کے ساتھ واپس آئی تھیں، اسے میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ وہی تھا نا افتخار علی...... ممی کے بزنس پارٹنر اطہر علی کا بیٹا...... تمھیں ممی نے پہلے بھی منع کیا تھا نا کہ اس لڑکے کے ساتھ میل جول ختم کر دو، تم ممی کو بتاؤ گی تو میں بھی ....'' وہ اس قدر اطمینان سے بول رہا تھا جبکہ اماں بی بے بسی اور بے چارگی سے بہن بھائی کے اس جھگڑے کو دیکھ اور سن رہی تھیں۔ دونوں کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

''میں تمہارا منہ توڑ دوں گی، تمھیں شرم نہیں آتی......''

''ہاں مجھے شرم نہیں آتی اور تم مجھے ہاتھ لگا کر دکھاؤ۔ میں تمھیں شوٹ کر دوں گا۔'' وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اماں بی لرز اٹھیں۔

''بس بیٹا! خدا کے واسطے بس کرو، بہن ہے تمہاری۔'' وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر بولیں۔ انکی آنکھ سے ٹپ ٹپ گرتے آنسو اسے شرمسار کر رہے تھے۔ اس اتنے بڑے گھر میں اسے صرف اماں بی سے ہی محبت تھی۔ وہ دھپ دھپ کرتا ڈائننگ روم کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

''سمجھتا کیا ہے خود کو، میں تو اب کبھی اس سے بات نہیں کروں گی۔ ممی کے ساتھ کرے اتنے نخرے۔ میں ایسا رویہ نہیں برداشت کر سکتی۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

''حیدر بھائی! اپنی گھیا توری کالی ہوگئی ہے نا۔'' عمر نے محبت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے چڑانے والے انداز میں کہا۔ مریم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ تین ماہ قبل عمر جب اس طرح کی کوئی بات کرتا تھا تو مریم بلا جھجک اپنا جوتا اس کی پشت پر رسید کرنے کو بھاگتی تھی مگر اب شاید حالات بدل گئے تھے۔ وہ کنفرمیشن لیٹر لینے کے بعد پہلی مرتبہ گھر آئی تھی اور سب گھر والے اس کے ساتھ ایسا سلوک کر رہے تھے، جیسے وہ کسی سلطنت کی ملکہ ہے۔ امی نے اس کے لنچ کے لیے اپنی موٹی تازی مرغی قربان کی تھی۔ پھپھو اپنے ہاتھوں سے خربوزے کی قاشیں کاٹ کاٹ کر اسے کھلانے پہ تلی ہوئی تھیں۔ حیدر آتے جاتے صرف شرمیلی مسکراہٹ اچھالنے پر اکتفا کر رہا تھا اور عمر جو پہلے کبھی اس کے نام کے ساتھ باجی یا آپا جیسی کوئی چیز نہیں لگاتا تھا، گزشتہ ایک دن سے اسے آپی مریم کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔

''کیا میری ترقی ہوگئی ہے؟'' اس نے عمر سے سوال کیا۔ وہ اس کے منہ سے آپی مریم سن کر ہی حیران پریشان ہوگئی۔

''ویسے تو مجھے یقین ہے ایسا نہیں ہوا لیکن اگر سچ مچ ایسا ہو چکا ہے تو یہ یقیناً اس صدی کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔'' حیدر نے ہونٹ سکیڑ کر افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ مریم نے چارپائی پہ پڑا تکیہ اسے دے مارا جبکہ اس نے ہاتھ میں پکڑا پانی سے لبالب بھرا اسٹیل کا گلاس اس پر انڈیل دیا۔ اس کے بعد وہ تینوں پہلے کی طرح ایک دوسرے کو چڑانے اور ستانے لگے۔ عمر نے اسے ''گھیا توری'' کہا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

''گھیا توری کالی تو نہیں ہوئی مگر سکڑ کر ہری مرچ جتنی ہوگئی ہے۔'' حیدر نے ٹکڑا لگانا ضروری سمجھا۔ وہ تینوں صحن میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ امی اور پھپھو صحن میں ہی بنے مٹی کے چولہے پر ہنڈیا چڑھائے رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ مغرب کی اذان ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ تاریکی نے صحن میں اپنا پھن پوری طرح پھیلا لیا تھا۔ صحن میں چولہے کے پاس ایک زرد رنگ کا بلب روشن تھا جس کی زرد زرد سی روشنی سارے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ گھر بھر کی چہیتی و لاڈلی تھی۔ اس کے گھر میں موجود ہونے سے ایک عجیب طرح کی رونق سارے گھر میں محسوس کی جا سکتی تھی۔ عمر کسی کام سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ وہ دونوں ہی اب ایک چارپائی پر بیٹھے تھے۔ صحن میں لگے نیم کے درخت کے تنے پر ننھے ننھے سے نقطے جگمگا رہے تھے۔

''وہ دیکھو جگنو......'' حیدر نے مریم کی توجہ ان ٹمٹماتے نقطوں کی جانب دلائی۔ مریم اسی سمت دیکھ رہی تھی۔ حیدر اٹھ کر تنے کے قریب گیا اور چند لمحوں بعد وہ ننھے ننھے نقطے اس کے ہاتھ میں منتقل ہو چکے تھے۔

''اپنا ہاتھ دو۔'' اس نے مریم کے قریب آ کر کہا۔ مریم نے اپنی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی۔ اب حیدر کے ہاتھ کے جگنو مریم کی ہتھیلی میں منتقل ہو گئے۔ حیدر ایک بار پھر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی مریم نے ہاتھ کھول دیا۔ جگنو ایک ایک کر کے اڑ گئے۔ حیدر نے حیرت سے اس کا یہ عمل دیکھا۔ یہ اس کا پسندیدہ



کھیل تھا۔ وہ جگنوؤں کو بوتل میں بند کر کے تاریکی میں رکھ دیتی اور پھر دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی۔

''روشنی قید ہو کر بھی روشنی رہتی ہے پھر اسے قید کرنے کا فائدہ۔'' حیدر کے چہرے پر پھیلے بڑے سے سوالیہ نشان کا جواب دیتے ہوئے مریم نے کہا۔ حیدر چند لمحے یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی، وہ سمجھ نہیں پایا۔

''تم بہت بدل گئی ہو مریم!'' کچھ دیر بعد وہ بولا۔

''کوئی نہیں۔ میں تو پہلے جیسی ہی ہوں۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی۔

''ایسا لگ رہا ہے جیسے مجھ سے زیادہ تم خود کو یقین دلا رہی ہو۔'' حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا، مگر مریم سنجیدہ ہوگئی۔

''مطلب؟'' اس نے استفہامیہ انداز میں کہا۔

''یار! میرے کہنے کا مطلب ہے کہ تبدیلی برحق ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بس اسی طرح تم بھی تبدیل ہو گئی ہو۔''

''مثلاً؟'' مریم نے مزید سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔

''مثلاً؟'' یہ کہ پہلے تم جوتے کو جوتا کہتی تھیں، اب شوز کہتی ہو۔ پہلے تم غسل خانے کو غسل خانہ ہی کہتی تھیں، اب باتھ روم کہتی ہو اور پہلے......''

''پہلے میں حیدر کو گدھا کہتی تھی، اب میں حیدر کو ڈونکی کہنے لگی ہوں۔'' وہ حیدر کی بات کاٹ کر بولی تو اندر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ابو بھی مسکرا دیے۔

''اپنے ابو جی کے لیے کون سا لفظ منتخب کیا ہے۔ ہماری گڑیا نے۔'' انہوں نے مریم کے پاس بیٹھ کر شفیق سے لہجے میں پوچھا تو اس نے ''میرے پیارے ابو جی'' کہہ کر ان کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔ اس جذباتی منظر میں گھر کر اصل بات کہیں پیچھے رہ گئی، مگر مریم کے ذہن سے نہ نکل سکی۔ رات کو اپنے بستر پر لیٹ کر وہ حیدر کے اس معصوم الزام کو یاد کرتی رہی اور تاروں سے بھرے آسمان کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں تردید کرتی رہی۔ صبح اٹھتے ہی اس نے پھپھو سے پوچھا تھا۔

''پھپھو جان! کیا میں تبدیل ہو گئی ہوں؟'' پھپھو لکڑیاں چولہے میں دیے پھونکنی کی مدد سے انہیں سلگانے کی کوشش کر رہی تھیں، اس کی بات سن کر رک گئیں، کھانسیں اور پھر مسکرا دیں۔

''میں کل رات بھابھی سے یہی بات کر رہی تھی کہ ہماری مریم بہت بدل گئی ہے۔'' ان کی بات سن کر مریم کا چہرہ اتر سا گیا ہے۔ وہ بات جو اس کے سب گھر والے محسوس کر رہے تھے۔ وہی بات اسے کیوں محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

''میری بیٹی پہلے سے بہت سوہنی اور بہت پیاری ہو گئی ہے۔'' وہ گہری سانس بھر کر پراٹھوں کے لیے پیڑے بنانے لگی۔ گھر میں شروع سے سب پراٹھے ہی کھاتے تھے۔ ناشتے میں چائے کے ساتھ رات کا سالن، اچار اور دہی سب کو بہت پسند تھا۔ اس نے سب افراد کے حساب سے گن کر آٹے کے پانچ

پیڑے بنائے اور تب ہی اسے احساس ہوا تھا کہ حقیقتاً وہ کچھ نہ کچھ تبدیل ضرور ہوئی ہے۔ وہ بھی بچپن سے پراٹھا کھاتی آئی تھی مگر پہلی بار اس نے اپنے لیے پراٹھا نہیں بنایا تھا۔ اتنے دن تک دودھ اور ڈبل روٹی کا ناشتہ کرتے رہنے کے بعد اب اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ پراٹھا ناشتے میں کھائے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا آٹے کا پیڑا پرات میں رکھا اور اندر کمرے میں چل دی۔ نجانے کیا بات تھی اسے رونا آ رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ آنکھیں جھپک جھپک کر آنسو روکنے کی کوشش کرتی رہی مگر ناکام رہی۔ حیدر کسی کام سے کمرے میں آیا تو اسے روتا دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

''کیا ہوا ہے مریم!'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔ وہ چپ رہی تو وہ اور بھی مضطرب ہو گیا۔

''تم بتاتی کیوں نہیں ہو کہ کیا ہوا ہے۔ اچھا میں ماموں کو بلا کر لاتا ہوں، وہی تم سے پوچھیں گے۔'' وہ دھمکی آمیز انداز میں بولا۔

''حیدر پلیز! ابو جی کو مت بلانا۔'' وہ اس کے انداز پر التجا کرتے ہوئے بولی۔ حیدر خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''اب بولو کیا بات ہے؟ کسی کی بات بری لگی ہے؟'' اس نے بہت محبت سے پوچھا مگر پھر بھی مریم کو اس کا انداز اچھا نہ لگا۔ وہ سب مل کر اسے شہزادیوں والا پروٹوکول دے رہے تھے اور پھر شکوہ بھی اسی سے کر رہے تھے۔ وہ چپ چاپ حیدر کو تکنے لگی کہ وہ بے چارہ خجل سا ہو گیا۔

''تم نے کیا مجھے نظر لگانی ہے؟'' وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

''میں کیا بہت بدل گئی ہوں حیدر؟'' اس نے نم آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو حیدر کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ خوانخواہ ہی ہنس دیا۔

''ارے میری بدھو مریم! تم بالکل نہیں بدلیں، ویسی ہی ہو۔ احمق اور بے وقوف اور میں بھی وہی حیدر ہوں جو تمھیں تنگ کرنے اور چڑانے کو ایسی باتیں کرتا رہتا ہے۔'' وہ پہلے سے بھی زیادہ محبت بھرے لہجے میں بولا۔ مریم کے دل سے بھاری بوجھ سرکا۔

''میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں کبھی نہیں بدلوں گی۔'' وہ اپنی آنکھوں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے مستحکم لہجے میں بولی۔ اس کا رویا رویا چہرہ بے حد معصوم لگ رہا تھا۔ حیدر کا دل چاہا، اس کی پلکوں میں اٹکے آنسو اپنی ہتھیلیوں میں جذب کر لے۔ پہلے تو وہ بہت آرام سے روتی ہوئی مریم کو کندھے سے لگا کر دلاسا دے لیا کرتا تھا مگر گزشتہ تین ماہ نے جیسے ایک نادیدہ پردہ ان دونوں کے درمیان حائل کر دیا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی خواہش پوری نہ کر سکا۔

''بدل تو میں بھی بہت گیا ہوں یار!'' اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔ مریم کب کی اٹھ کر باہر جا چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

''یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟'' ایک کرخت سی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ شرمندگی سے اٹھ کر



بیٹھ گئی۔ وارڈز شروع ہوئے ابھی چند دن ہی ہوئے تھے۔ پہلے سال ان کی ڈیوٹیز دو سے اڑھائی گھنٹے تک کی ہوتی تھیں مگر ان مختصر ڈیوٹیز میں بھی وارڈز سے وارڈز تک اتنے چکر لگتے تھے کہ وہ تھک جاتی تھیں۔ اس کی ڈیوٹی چلڈرن وارڈ میں تھی۔ پہلی ہی کلاس میں اسے کسی بات پر پروفیسر اختر کمال سے ڈانٹ پڑ گئی تھی پھر چلڈرن وارڈ میں بچوں کے درمیان ان کے چیخ چیخ نے اسے بے حد تھکا دیا تھا۔ اس کے سر میں بہت درد ہو رہا تھا۔ ایک بچے کی ماں واش روم کی طرف گئی تو مریم آ کر اس کے بچے کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ذرا دیر کو ستانے کے خیال سے اس نے شوز اتار کر پاؤں بھی پسار لیے۔ اسی دوران اس دبلی پتلی مگر لمبی سی خاتون نے اسے اس کی غلط حرکت کا احساس دلایا۔

''محترمہ! آپ شاید بھول گئی ہیں کہ آپ اپنے گھر کے لاؤنج میں نہیں بلکہ ہاسپٹل کے وارڈ میں بیٹھی ہیں۔'' وہ خاتون تنک کر بولیں۔ مریم نے انہیں پہچان لیا تھا، وہ سینئر موسٹ وارڈ سسٹر زینت آغا تھیں، جنہیں سب میڈم زینت کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ہفتہ بھر قبل جب فرسٹ ایئر کے وارڈز شروع ہوئے تھے، تب ان کی ایک سینئر نے بطورِ خاص میڈم زینت کا حوالہ دے کر کہا تھا کہ وہ بہت سخت قسم کی وارڈ سسٹر ہیں جو جونیئر سسٹرز کے ساتھ بہت سختی سے پیش آتی ہیں۔ مریم اپنی باقی کلاس فیلوز کی طرح ان سے ڈرتی تھی بلکہ ساری فرسٹ ایئر چونکہ ابھی موسٹ جونیئر تھی، اس لیے وارڈ بوائز اور سوئپرز وغیرہ بھی ان پر رعب جمانے کی کوشش کرتے تھے۔ فرسٹ ایئر کے سفید دوپٹے اور نیلی Sash ہی دور سے سمجھا دیتی تھی کہ ان کو دھمکانا آسان ہے۔

''اب کیا مراقبے میں چلی گئی ہو؟'' اب کی بار میڈم زینت نہایت کاٹ دار لہجے میں بولیں۔ دوسرے بیڈز پر اپنے اپنے بچوں کے ساتھ لیٹی مائیں اور دوسری تیماردار عورتیں دلچسپی سے ان دونوں کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ مریم کو نہایت شرمندگی کا احساس ہوا۔

''مس! میں آپ سے مخاطب ہوں۔'' وہ چٹکی بجا کر اسے متوجہ کرتے ہوئے بولیں۔

''آئی ایم سوری میڈم! دراصل ...... میں آئندہ ......'' وہ منمناتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آنسو گالوں پر پھیلنے لگے تھے۔

اسے اس قسم کی ایکسپلینشن کالز بھگتنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا ایک لائق فائق طالبہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اساتذہ کی ہمیشہ پسندیدہ رہی تھی مگر یہاں کا نظام ذرا مختلف تھا۔ یہاں استاد صرف استاد نہیں بلکہ باس تھا۔

''میں آئندہ نہیں کروں گی میڈم!'' مریم نے خود کو سنبھالتے ہوئے بات مکمل کی۔

''آئندہ ......؟ آئندہ کی نوبت کون آنے دے گا۔ میں ابھی جا کر میٹرن سے آپ کی شکایت کرتی ہوں۔ آپ کو احساس ہے آپ نے کس قدر غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ اگر اتفاق سے کوئی سینئر ڈاکٹر اس طرف آ جاتے تو ہم سب کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ ہر جگہ کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور سب لوگوں کو ان اصولوں کے مطابق چلنا چاہیے۔ آپ یہاں مریضوں کی دیکھ بھال کے لیے آئی ہیں خود اپنی دیکھ بھال کے لیے نہیں ......'' میڈم زینت کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی مریم نے ہچکیاں لے کر رونا شروع کر دیا شرمندگی،

خجالت، خفت اور سب سے بڑھ کر خوف...... وہ خود کو رونے سے روک نہیں پائی تھی۔

''یعنی کہ حد ہوگئی، چوری پھر سینہ زوری۔ بچی نہیں ہو دودھ پیتی کہ ذرا سی بات پر رونے لگو۔'' ان کا لہجہ اس قدر سخت تھا کہ مریم کے رونے میں تیزی آ گئی۔ میڈم زینت کی جھنجلاہٹ میں اضافہ ہوا۔

''ارے ایسا کیا کہہ دیا میں نے کہ تمہاری آنکھوں میں سیلاب اتر آیا۔ آج کل کی لڑکیاں بھی عجیب ہیں کسی غلطی پر سرزنش کرو تو شرمندہ ہونے کی بجائے دوسروں کو شرمندہ کرنے لگتی ہیں۔'' مریم کے رونے میں کمی آ رہی تھی نہ میڈم زینت کے غصے میں۔ ان کی آواز کی شدت سے دو ایک وارڈ بوائز اور جونیئر ڈاکٹرز بھی شاید تماشا دیکھنے کی غرض سے آ کھڑے ہوئے تھے۔

''زینت آپا! کیوں ڈانٹ رہی ہیں بے چاری کو، بس کیجئے......'' مریم کے کانوں میں بھاری مردانہ آواز پڑی۔ آنسوؤں کی دھند میں وہ کچھ دیکھ ہی نہیں پا رہی تھی۔

''ان بے چاری کی وجہ سے سب کو مصیبت آ سکتی تھی ڈاکٹر! آج میڈم عذرا اور ڈاکٹر اطہر بخاری کا وزٹ ہے۔ آپ جانتے ہیں وہ کس قدر سخت مزاج اور اصولوں کے سخت ہیں۔'' میڈم زینت اس شخص کے ساتھ نسبتاً نرم لہجے میں بات کر رہی تھیں۔ مریم کا شرمندگی کے مارے برا حال تھا۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے کہ اس قدر بے عزتی سہنا پڑ گئی تھی۔

''آپ لوگ اسٹوڈنٹ نرسز کے ساتھ زیادہ ہی سختی برت جاتے ہیں۔'' اس شخص کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔

''ڈاکٹر! آپ شہہ مت دیجئے، آپ کچھ نہیں جانتے۔'' میڈم زینت کا لہجہ ناصحانہ سا تھا۔ وہ شخص پھر کچھ بڑبڑایا مگر اس کی آواز بے حد مدھم تھی۔ مریم کو کچھ بھی سمجھ میں نہ آ سکا۔

''اوکے۔ ایز یو وش۔'' وہ شخص کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔ میڈم زینت کی سختی سے سب ہی خائف رہتے تھے۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' میڈم زینت نے اس سے پوچھا۔

''مریم چوہدری۔'' مریم نے منمناتی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پا چکی تھی۔

''آنسہ مریم چوہدری مسلمان ہیں؟'' انہوں نے پھر استفسار کیا۔

''جی۔'' مریم نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''دیکھو مریم! میں کسی کی دشمن نہیں ہوں، بات اصول کی ہے۔ جب تم آن ڈیوٹی ہو تو تمہیں ایسی غیر ذمہ داری کا ثبوت نہیں دینا چاہیے۔ میں نے تمہیں سرزنش کی ہے۔ اگر میری جگہ ڈاکٹر بخاری ہوتے تو وہ تمہاری نیلی sash دیکھتے ہی ایک آدھ ہفتے کے لیے تمہیں ٹرمینیٹ کر دیتے۔ ایسی بے ضرر ٹرمینیشنز بعد میں جاب کے حصول میں بہت نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ فرسٹ ایئر میں زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب کی بار میں تمہیں معاف کر دیتی ہوں، دوبارہ یہ غلطی نہ ہو۔'' ان کے جانے کے بعد مریم من من بھر کے قدم اٹھاتی وارڈ سے باہر آ گئی۔ ریسیپشن کے کاؤنٹر پہ اس کی کتابیں پڑی تھیں۔ کتابیں لے کر وہ ارد گرد دیکھے بغیر



باہر کی سمت چل دی۔ ہاسٹل واپس آ کر بھی اس کا موڈ کافی خراب تھا۔ اسے احساس تھا کہ غلطی اس کی تھی مگر یہ غلطی بہت بے ضرر تھی، اسے اتنی ڈانٹ نہیں پڑنی چاہیے تھی۔ تزئین اور روبینہ مارکیٹ تک گئی تھیں۔ وہ اپنے لیے چائے بنا کر چارپائی پر بیٹھی تھی کہ نگہت آ گئی۔ نگہت ان سے دو سال سینئر اور نہایت پھرتیلی لڑکی تھی۔ مریم کی اس سے اچھی علیک سلیک تھی جو روبینہ کے توسط سے ہوئی تھی۔ روبینہ اور تزئین نے بہت تھوڑے عرصے میں اچھی پی آر بنالی تھی۔

''میں نے سنا ہے تمہیں کالی گھوڑی سے ڈانٹ پڑی ہے؟'' وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولی۔ مریم پہلے تو سمجھی نہیں اور جب سمجھ گئی تو جواب دینے کے بجائے پھر گردن جھکا کر بیٹھ گئی۔ آنسو پھر آنکھ کے گوشوں میں چمکنے لگے تھے۔ اس نے پہلے بھی نگہت اور دوسری سینئر نرسز کے منہ سے ''کالی گھوڑی'' کے بارے میں سن رکھا تھا۔ ہاسٹل میں جونیئر نرسز نے سینئر نرسز کے بہت سے الٹے سیدھے نام رکھے ہوئے تھے۔

''کم آن مریم! اس عورت کی ڈانٹ کا برا مت مانو۔ اس کا بس چلے تو آتی جاتی ہوا کو بھی ڈانٹنے لگے۔'' نگہت اسے دلاسہ دیتے ہوئے بولی۔ مریم کو اس لمحہ نگہت سے زیادہ ہمدرد اور کوئی نہیں لگا۔

''نہیں نگہت! غلطی میری ہے، مجھے دھیان رکھنا چاہیئے تھا۔'' وہ بمشکل بولی تھی۔ دل بے حد بوجھل ہو رہا تھا۔

''جی نہیں، تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔ مجھے اسلم بتا رہا تھا کہ شاید تم ذرا دیر کو آرام کی غرض سے وارڈ میں لیٹ گئی تھیں، اس لیے ڈانٹ پڑی۔ آرام کرنا کوئی غلط بات تو نہیں ہے اور اگر غلط بات ہے بھی تو کم از کم میڈم زینت صاحبہ کو ڈانٹنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ میٹرن نہیں ہے، صرف ایک وارڈ سسٹر ہے۔'' نگہت شاید پہلے سے ہی بھری بیٹھی تھی۔ اس کے انداز میں اس قدر حقارت تھی کہ مریم حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کا ایک دم سے اس قدر جذباتی ہو جانا حیران کن ہی تو تھا۔

''تم جانتی ہو میڈم زینت نے آج تمہیں کیوں ڈانٹا؟'' نگہت نے آواز کو بے حد مدھم کرتے ہوئے سوال کیا۔

''آج سرجن بخاری کا وزٹ تھا نا اس لیے۔'' نگہت نے اس کے مزید قریب آ کر کہا۔

''مجھے انہوں نے بتایا تھا کہ وہ اس لیے سختی سے پیش آ رہی ہیں کہ آج سرجن بخاری کا وزٹ ہے۔ وہ بتا رہی تھی، سرجن بخاری اصولوں کے بہت پابند ہیں، وہ غیر ذمہ داری برداشت نہیں کرتے۔'' مریم نے ٹھنڈی چائے کا مگ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ اسے نگہت کا رویہ الجھن میں ڈال رہا تھا۔

''تم بہت معصوم ہو مریم! تم کچھ نہیں جانتیں۔'' نگہت تاسف سے بولی پھر اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات دیکھ کر مزید گویا ہوئی۔

''اس نے تمہیں اس لیے ڈانٹا کہ آج سرجن بخاری کا وزٹ ہے اور تم بہت خوبصورت ہو، سمجھیں کچھ؟''

"تم کیا کہہ رہی ہو، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا؟" مریم زچ ہو کر بولی۔ نگہت اس کے چہرے کی جانب دیکھتی رہی۔ گویا اس کے دل کا حال جاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

"سنو بے وقوف لڑکی! دراصل میڈم زینت نہیں چاہتی تھیں کہ سرجن بخاری تمہیں دیکھیں۔ سرجن بخاری سب سے اپروچ فل سرجن ہیں۔ وہ منیجمنٹ کا حصہ ہیں۔ ان کی فیور حاصل ہو جائے تو سمجھو ہیلتھ سیکرٹریٹ تک رسائی حاصل ہوگئی۔ میڈم زینت کو یہی فیور حاصل ہے اور وہ اسی فیور کو کھودینے سے ڈرتی ہے، اسی لیے اس کے انڈر جتنی بھی خوبصورت لڑکیاں ہوتی ہیں، وہ انہیں سرجن بخاری کے سامنے آمنے ہی نہیں دیتی کہ اگر سرجن بخاری کسی اور حسینہ کی زلفوں کے اسیر ہوگئے تو خود اس کا کیا بنے گا، اسی لیے ہر خوبصورت لڑکی کو ڈانٹنا اور بے عزت کرنا وہ اپنا حق سمجھتی ہے۔" مریم نے ناسمجھی کے انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

"یار...... اتنی بڑی تہمت مت لگاؤ۔" وہ نگہت کے انداز سے خائف ہو کر بولی۔

"یہ تہمت نہیں ہے، یہ اس ہاسپٹل کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ میں تمہیں اسی لیے یہ سب بتا رہی ہوں کہ تم محتاط رہنا۔ خصوصاً میڈم زینت سے تو دور ہی رہنا، وہ بالکل اچھی عورت نہیں ہے۔ ہاں میٹرن اچھی ہے۔ وہ بہت محبت سے بات کرتی ہے۔" وہ آخر میں مسکراتے ہوئے بولی مگر مریم مسکرا بھی نہ سکی۔

"اب تم پریشان مت ہو، اچھے برے لوگ تو ہر فیلڈ میں ہوتے ہیں۔ لگن کے ساتھ اپنا کام کرو۔ تمام سینئر ڈاکٹرز کے ساتھ بنا کر رکھو اور پھر میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔" نگہت نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر حوصلہ دینے والے انداز میں کہا۔ مریم کو حوصلے کی ہی ضرورت تھی۔ وہ نگہت کی باتوں سے بہل گئی۔

☆ ☆ ☆

"مریم! مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔" تزئین نے اس کے ہاتھ میں کمیونٹی میڈیسن کے نوٹس لے کر روبینہ کی چارپائی پر پھینک دیے۔ وہ ہاتھ میں آئینہ اور پلکر لے کر بیٹھی اپنی آئی بروز ادھیڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے نہایت ناگواری سے تزئین کی جانب دیکھا مگر منہ سے کچھ نہیں بولی۔ اس کے انداز واطوار اور مزاج میں پہلے کی نسبت بہت تبدیلی آ چکی تھی۔ ہفتہ دس دن قبل اس نے تزئین سے اپنی آئی بروز کی شیپ بنوائی تھی۔ اب اس کی بھنوؤں کے نیچے ننھے ننھے بال نمایاں ہو رہے تھے۔ وہ کافی دیر سے تزئین سے کہہ رہی تھی کہ دوبارہ سے آئی بروز کی شیپ درست کر دے، مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"ابھی میرا موڈ نہیں ہے، جب موڈ ہوگا، تب تمہاری آئی بروز کی کانٹی چھانٹی کر دوں گی۔" روبینہ کو یہی بات بری لگی تھی۔ اتنے بہت سے دن اتنی رنگ برنگ لڑکیوں میں گزار کر وہ کافی کچھ سیکھ گئی تھی۔ اب اسے چھوٹے چھوٹے مذاق بھی برے لگ جاتے تھے اور تزئین کے ساتھ تو اس کی اکثر جھڑپ ہو جاتی تھی۔ اس نے وہی نوٹس اٹھا کر دور کرسی پر پھینک دیے۔

"اوہو، اب تو روبینہ بھی نخرے کرنے لگی ہیں۔" اس نے روبینہ کو چڑانا چاہا اور روبینہ چڑ بھی گئی۔

"میرے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ تڑخ کر بولی۔



"بلے بھئی بلے...... مینڈکی کو زکام......" تزئین کی بات مکمل ہونے سے پہلے مریم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ان دونوں کی روز روز ہونے والی ان جھڑپوں سے وہ بہت تنگ آ چکی تھی۔

"تم مجھ سے کوئی بات کرنے والی تھیں نا؟" اس نے تزئین کو یاد دلایا۔

"اوہ ہاں، اس فتنے منہ کا منہ دیکھ کر سب بھول جاتا ہے۔" اس نے روبینہ کی طرف اشارہ کر کے کہا تو روبینہ کھول کر رہ گئی۔ گزشتہ چار ماہ میں اس میں بہت تبدیلیاں آئی تھیں۔ بہتر سے بہترین کا سفر وہ بہت تیزی سے طے کر رہی تھی، مگر تزئین سے جیتنا ابھی بھی اس کے لیے بہت مشکل تھا۔

"اب تم بک بھی چکو۔" مریم نے اکتا کر کہا۔ اسے ابھی وائیوا کی تیاری بھی کرنا تھی۔

"یار...... یہ روبینہ بہت تبدیل ہوگئی ہے۔" تزئین نے دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے کہا، جہاں سے روبینہ باہر گئی تھی۔

"ٹھیک کہتی ہو اور یہ تبدیلی بہت مثبت ہے۔ تم نے دیکھا، وہ پہلے کی نسبت کتنے اچھے رنگوں کے کپڑے پہننے لگی ہے۔ ان کا انداز گفتگو بھی پہلے کی نسبت بہت بہتر ہوگیا ہے۔" مریم نے اسے سراہتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اسے حیدر کی یاد آئی جو ہاسٹل سے گھر جانے پہ اسے تبدیل شدہ قرار دے رہا تھا۔

"مجھے کہہ رہی تھی کہ تزئین! میری انگلش Vocabulary بہت ویک ہے۔ تم اس کو امپروو کرنے میں ہیلپ کر دوگی؟" تزئین نے ہو بہو اس کی نقل اتاری تو مریم ہنس دی۔

"تم مجھ سے کیا بات کہنے والی تھیں؟" اس نے تزئین کی طرف دیکھتے ہوئے پھر پوچھا تو وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوگئی پھر نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے آنکھیں میچے ایسے ظاہر کرنے لگی، جیسے کچھ سوچ رہی ہو پھر مریم کی طرف رخ کر کے بولی۔

"یار لڑکی! تم میری کوئی بات نہیں مانتیں مگر پھر بھی نجانے کیوں بری نہیں لگتیں۔ دل چاہتا ہے ہر راز تم سے ہی شیئر کروں۔" اسکا انداز جتانے والا تھا مریم مسکرا دی۔ چند روز پہلے الاؤنس کی رقم ملنے پہ تزئین نے کچھ فرینڈز کے ساتھ مل کر آؤٹنگ کا پروگرام بنایا تھا مگر مریم نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اسی بات کو ایشو بنا کر تزئین اسے طعنہ دے رہی تھی۔

"اب پھوٹ بھی چکو کیا بات ہے؟" تزئین کے ایک بار پھر خاموش ہونے پہ مریم اس کا کندھا ہلا کر بولی۔

"یار! تم نے سانولی رنگت والا وہ لڑکا دیکھا ہے جس کی داڑھی ہے، جس کی آنکھیں خمار آلودہ سی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے نیند اس کی پلکوں پہ ٹھہری رہتی ہے۔"

"ہاں...... دیکھا ہے۔" مریم نے اس کے سوال کا مختصر جواب دیا۔

"کون ہے؟" تزئین نے دلچسپی سے پوچھا۔

"انضمام الحق۔" مریم اطمینان سے بولی تو تزئین کے لبوں سے قہقہہ پھوٹ پڑا۔

''میں کرکٹ اسٹیڈیم کی نہیں، اس ہاسپٹل کی بات کر رہی ہوں۔ عام طور سے چلڈرن وارڈ میں نظر آتا ہے۔ بہت سوبر اور سنجیدہ سا لگتا ہے۔ بہت عزت و احترام سے مخاطب کرتا ہے اور پھر......''

''یار ہوگا، تم وہ بات بتاؤ جو تمھیں مجھے بتانی تھی۔'' مریم اس کی قصیدہ خوانی سے زچ ہو کر بولی۔ وہ اتنے سے دنوں میں ہی تزئین کی عادات کے متعلق بہت اچھی طرح جان گئی تھی۔ وہ جب بھی کسی بات پر ڈپریسڈ ہوتی تھی، تب اسی طرح کے بے سروپا اور بے معنی باتیں کیا کرتی تھی۔ اس کے اپنی امی سے تعلقات بہت اچھی نوعیت کے نہیں تھے بلکہ اس کی امی ابھی تک اس سے ناراض تھیں اور عام طور پر تزئین کی سب سے بڑی پریشانی اس کی امی کا رویہ ہی تھا۔

''امی نے نگین کا رشتہ طے کر دیا ہے۔'' تزئین نے بالآخر اگل ہی دیا۔

''یہ تو خوشی کی بات ہے، مبارک ہو۔'' مریم نے خوش ہو کر کہا۔ دو ایک بار تزئین نے ذکر کیا تھا کہ اس کی امی جلد از جلد اس کی بڑی بہن کی شادی کروا دینا چاہتی ہیں۔

''بہت زیادہ خوشی کی بات ہے۔ وہ شخص جس سے نگین کی شادی ہو رہی ہے، تقریباً اس سے دوگنی عمر کا ہے اور پھر شادی شدہ بھی ہے۔ وہ نگین سے شادی صرف شریعت کا تقاضا نبھانے کی خاطر کر رہا ہے۔'' تزئین دل جلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ اسے بتانے لگی۔ مریم کو بھی از حد افسوس ہوا۔ وہ ابھی تسلی دلاسے کے لیے الفاظ ڈھونڈ ہی رہی تھی کہ روبینہ کمرے میں آگئی۔ اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر تزئین نے تکیے کے ساتھ کروٹ بدل لی۔ وہ اپنی آنکھ میں آئی نمی کم از کم روبینہ کو نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ روبینہ اس کے انداز کو اس کی ادا سمجھی، اس لیے ناک چڑھا کر الماری سے کپڑے نکالنے لگی۔ اس نے پہلے الاؤنس کی مد میں ملنے والی تمام رقوم اپنی ذات پر خرچ کر ڈالی تھی۔ وہ بہت سے نئے سوٹ لائی تھی۔ نئے جوتے، کاسمیٹکس کا سستا سامان اور تھوڑی سی جیولری بھی خریدی تھی۔

''تم کہیں جا رہی ہو؟'' مریم نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں......ستارہ، لیزا اور نگہت وغیرہ کے ساتھ ہوٹل میں کافی پینے جا رہی ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ جا رہی ہوں، تم بھی چلو۔'' اس نے بتانے کے ساتھ ساتھ دعوت بھی دے ڈالی۔

''ہوٹل میں کافی پینا، ہاسٹل میں کافی پینے سے مختلف ہوتا ہے کیا؟'' یہ سوال تزئین نے کیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ اس کے چہرے پر غم و الم کے تمام تاثرات غائب ہو چکے تھے۔ وہ غضب کی اداکارہ تھی۔

''نہیں مگر ہوٹل میں مزا آتا ہے نا۔ فلموں میں نہیں دیکھا کبھی۔'' روبینہ سابقہ جھڑپ کو بھلا کر بھولے پن سے کہہ رہی تھی۔

''کیا پتہ روبینہ! ہوسٹل میں کافی پی کر بھی زیادہ مزا آئے کیونکہ تمھارے لیے تو کافی کا ذائقہ بھی ایک نئی چیز ہوگی۔ آئی ایم شیور، تم آج پہلی بار کافی پیو گی۔'' تزئین کا انداز طنزیہ نہیں تھا مگر پھر بھی شاید روبینہ کو اچھا نہیں لگا۔ وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر کپڑے پریس کرنے لگی۔



مریم نے دوبارہ سے اپنے نوٹس اٹھا لیے اور پڑھنے کی کوشش کرنے لگی مگر اسے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ تزئین اپنی قنوطیت کو بھلائے روبینہ کی تیاریوں پر فقرے کسنے میں مصروف تھی، جبکہ روبینہ مسلسل اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوتی کہ وہ تڑخ کر جواب دینے پر مجبور ہو جاتی۔ اس ساری صورت حال میں یکسوئی سے پڑھنا تو ناممکن تھا۔ مریم نے بھی نوٹس سائڈ میں رکھ دیے اور ان دونوں کی اس نوک جھونک کو دیکھنے لگی۔ روبینہ کے کمرے سے نکلنے کے بعد ہی اس کا خاتمہ ہوا تھا اور مریم نے بھی تب ہی سکون کا سانس لیا مگر یہ سکون بھی عارضی تھا۔

''یار! یہ محترمہ اتنا تیار ہو کر انجوائے کرنے باہر جا سکتی ہے تو ہم کیوں نہیں جا سکتے۔ چلو ہم بھی چلتے ہیں۔'' تزئین نے گویا حکم سنایا۔ مریم کے مسلسل انکار کے باوجود وہ اسے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لائی۔ ''ہم جائیں گے کہاں؟'' مریم نے اپنے اڑتے ہوئے دوپٹے کو بمشکل سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ تزئین نے اسے کپڑے بدلنے کی مہلت بھی نہیں دی تھی، ہاں مگر اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک ضرور لگوا دی تھی۔ اسے تزئین کی زبردستی اچھی نہیں لگی تھی مگر اب آسمان کی گہری رنگت کہیں کہیں لہراتی مٹیالی بدلیاں اور پھر چھیڑ چھاڑ کرتی ہوا اسے بہت مزا دے رہی تھی۔

''ہم افق کے پار جائیں گے۔'' تزئین ہوا سے بھی زیادہ مستی میں تھی۔ ہاسٹل کے مین گیٹ سے باہر نکلتے ہی وہ لوکل وین میں سوار ہو گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

''ممی کا عزم حقیقتاً قابل تعریف ہے۔'' اس نے ٹماٹو کیچپ کی پلیٹ میں فرنچ فرائز سے دائرے بناتے ہوئے یاسیت بھرے لہجے میں کہا۔ اس کے پاپا کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

''تم شاید اپنی ممی کی بے جا ضد کو عزم کہہ رہے ہو۔ وہ صرف اور صرف ضد میں یہ سب کر رہی ہے تاکہ تمھیں مجھ سے دور کر سکے کیونکہ وہ جانتی ہے مجھے تم سے بہت محبت ہے اور میری ہر محبوب چیز اسے چھین لینے کی عادت ہے۔'' وہ نہایت طنزیہ انداز میں کہہ رہے تھے۔ اس نے پہلے کبھی اپنے پاپا کو ممی کے بارے میں اس طرح بات کرتے نہیں سنا تھا۔

''نہیں پاپا! ایسی بات نہیں ہے۔ ممی ایسی نہیں ہیں، وہ دل کی بہت اچھی ہیں پاپا!'' اس نے فوراً تردید کی اسے ہزار ہا شکایتوں کے باوجود اپنی ممی سے بہت محبت تھی۔ اپنی طرف سے وہ ممی پاپا کے دل میں ایک دوسرے کے لیے موجود کدورت دور کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

''ان فیکٹ میرے برے رزلٹ نے ان کا موڈ اس قدر آف کر دیا ورنہ آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔'' اس نے تمام تر ذمہ داری قبول کرتے ہوئے تاسف میں گھر کر کہا۔ اس کا رزلٹ اناؤنس ہوئے تقریباً چھ ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس کی ممی نے چھ ماہ قبل جو سڈنی بھجوانے کی دھمکی دی تھی، وہ ابھی تک اس پر قائم تھیں مگر چونکہ وہ ابھی اٹھارہ سال کا نہیں ہوا تھا، اس لیے یہ سلسلہ کسی قدر تعطل کا شکار ہو گیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اپنا فیصلہ تبدیل کر چکی تھیں۔

''تمہاری ممی تم سے محبت کرتی ہیں؟ میرے لیے تو یہ ایک بریکنگ نیوز ہے بھئی! جہاں تک میرا خیال ہے، تمہاری ممی کو لفظ ''محبت'' سے بھی چڑ ہے۔'' وہ شگفتہ سے انداز میں کہہ رہے تھے۔ ان کا مقصد ماحول میں پھیلی سوگوار سی فضا کو ختم کرنا تھا۔

''نو پاپا؟ یو آر کوائٹ رانگ۔ ان فیکٹ حالات نے ممی کو ذرا چڑ چڑا کر دیا ہے۔'' وہ وضاحت دیتے ہوئے بولا۔ اکثر وہ اپنے آپ کو عجیب طرح کی صورت حال میں الجھا لیتا تھا۔ ممی کے سامنے ہوتا تو پاپا کے متعلق وضاحتیں دیتا اور پاپا کے سامنے ممی کی حمایت میں بولتا۔ وہ دونوں ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔ اس کے پاپا بہت بذلہ سنج اور شوخ طبیعت کے تھے مگر کبھی کبھی ان پر بھی قنوطیت کا دورہ پڑ جاتا۔ وہ اسے اس بات پر آمادہ کر رہے تھے کہ وہ ان کے ساتھ رہنا بھی چاہتا تھا مگر ابھی کیونکہ اس کی عمر اٹھارہ سال نہیں ہوئی تھی اور اٹھارہ سال سے پہلے وہ خود مختاری سے فیصلہ نہیں کر سکتا تھا اور ویسے بھی اپنی ممی اور بہن کے سامنے وہ انہیں چھوڑ دینے کے بلند و بانگ دعوے ضرور کرتا تھا، مگر انہیں اکیلا چھوڑ کر پاپا کے پاس آ کر رہنے کی اس میں بھی ہمت نہیں تھی۔

''تمہارا آئی کارڈ بن چکا ہے؟'' اسے خاموش دیکھ کر اس کے پاپا نے سوال کیا۔

''نہیں۔'' اس نے گہری سانس بھری پھر مزید گویا ہوا۔

''ابھی میری عمر اٹھارہ سال ہونے میں کچھ مہینے باقی ہیں۔'' اسے پاپا کی کمزور یادداشت پہ ہمیشہ جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ وہ ہر ملاقات میں اس کی عمر کے متعلق سوال کرتے اور ہمیشہ بھول جاتے جبکہ ممی گھنٹے اور منٹ کی تفصیل کے ساتھ اس کی عمر بتا سکتی تھیں۔

''اس کا مطلب یہ کہ تمھارے سڈنی جانے میں ابھی کچھ عرصہ لگ جائے گا۔'' انہوں نے اپنے سامنے پڑے کافی کے کپ کو واپس ٹرے میں رکھ دیا۔ کافی ٹھنڈی ہو کر بدذائقہ ہو چکی تھی۔

''کم آن پاپا! کچھ اور عرصہ......؟ ساری زندگی لگ جائے گی۔ میں تو کبھی سڈنی نہیں جاؤں گا، مر کر بھی نہیں۔'' اس کے پاپا نے تڑپ کر اس کی جانب دیکھا۔

''فضول باتیں مت کرو۔'' انہیں اس کی بات سے دکھ پہنچا تھا۔ گزشتہ چھ ماہ سے وہ بہت ہی زود رنج ہو چکا تھا۔ اس کی صحت پہلے کے مقابلے میں کافی گر چکی تھی۔ اس کا قد کاٹھ ان ہی کی طرح لمبا چوڑا تھا اور رنگت اپنی ممی کی طرح بے حد سرخ و سفید تھی، مگر کمزور صحت کی بنا پر وہ بہت شاندار دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کے چہرے پر کم سنی کے اثرات کسی قدر معدوم ہونے لگے تھے۔ دوستوں کے صلاح مشورے پر اس نے کافی پہلے سے شیو کرنا شروع کر دی تھی، مگر اس کی آواز اور انداز میں بچپنا نمایاں تھا۔

''پاپا پلیز! آپ ممی سے بات کیجئے نا، ان کی بات پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔ وہ آج کل بار بار ایمبسی فون کر کے نجانے کون سی انفارمیشن اکٹھی کرتی رہتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے ہی میرا برتھ ڈے ہو گا، ویسی ہی ممی میرے کندھے پر بیگ ڈال کر مجھے پلین میں بٹھا دیں گی۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا چپس پلیٹ میں پٹختے ہوئے کہا۔ اس کے پاپا اس کی ڈپلومیسی پہ مسکرائے۔ اگر یہی بات وہ کہتے تو ان کا یہ معصوم بیٹا فوراً تردید کرنے لگتا۔

''او کے......او کے ریلیکس......تم پریشان مت ہو......میں بات کروں گا۔'' انہوں نے میز کے اوپر





سے ذرا سا کھسک کر اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا اور اس کا دل چاہا کہ وہ ان کے گلے لگ جائے مگر ماحول کا تقاضا تھا کہ وہ خاموشی سے بیٹھا رہے۔ ریسٹورنٹ میں اس وقت کافی رش تھا۔ موسم کی جولانی بھی عروج پر تھی اور وقت بھی شام کا تھا۔ ایسے میں تمام ٹیبلز ہی بھرے ہوئے تھے۔ لوگ مسلسل اپنی اپنی مطلوبہ چیزیں سیلف سروس کے تحت لانے لے جانے میں مصروف تھے، جبکہ ان کی ٹیبل پر سب کچھ ویسے کا ویسا ہی پڑا تھا۔ اس کے پاپا کی کافی ٹھنڈی جبکہ اس کی کولڈ ڈرنک گرم ہو چکی تھی۔

''لاؤ یار! میں اور کافی لے آتا ہوں اور تمھارے لیے ٹھنڈی کوک بھی۔'' ان کے بیچ پھیلی خاموشی سے اکتا کر اس کے، پاپا نے کہا اس نے ایک نظر کاؤنٹر پر ڈالی پھر گہری سانس بھر کر بولا۔

''بہت رش ہے، لایئے میں لے آتا ہوں''

''ینگ مین! میں ابھی بوڑھا نہیں ہوا۔'' انہوں نے اٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ان کے اس طرح سے کہنے پر وہ بھی مسکرا دیا۔ وہ کاؤنٹر کی سمت بڑھ گئے۔ سفید ٹی شرٹ اور ڈھیلی سی جینز میں وہ کافی ینگ اور اسمارٹ لگ رہے تھے۔ وہ اس کے پاپا کی بجائے بڑے بھائی لگتے تھے۔ اسے اپنے پاپا کی ڈیشنگ پرسنلیٹی پہ ہمیشہ فخر محسوس ہوتا تھا۔ کاؤنٹر کے قریب کھڑی ایک خاتون اس کے پاپا کی جانب ہی دیکھ رہی تھیں اور وہ جس انداز میں دیکھ رہی تھیں، وہ بھی بہت دلچسپ تھا۔ اس کے لبوں پر بہت جاندار سی مسکراہٹ چمکی تھی۔

''مریم! ذرا دیکھنا، وہ لڑکا خود بخود مسکرا رہا ہے۔ یہ پاگل تو نہیں۔'' اس کے کانوں میں آواز آئی تھی۔ ساتھ والی ٹیبل پر دو لڑکیاں بیٹھی شاید اسی کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔ ان کی سرگوشی نما آواز بھی اس کے کانوں میں بخوبی پہنچ رہی تھی۔ وہ شاید ابھی وہاں آ کر بیٹھی تھیں۔

''آہستہ بولو، اس نے سن لیا تو۔'' مریم نامی اس لڑکی نے مزید دھیمی آواز میں کہا۔ وہ اپنی چیئر پر بالکل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں لڑکیاں اب مکمل طور پر اس کی نظروں کے حصار میں تھیں۔ سادہ سے کپڑوں میں ملبوس وہ دونوں لڑکیاں کافی خوبصورت تھیں۔ ان میں سے ایک نے دوپٹہ سر پر پھیلا رکھا تھا جبکہ دوسری لڑکی نے کندھے پر لیا ہوا تھا۔ اس کے اس طرح سے دیکھنے پہ وہ کچھ جھجک سی گئی تھیں۔ کندھے پر دوپٹے والی لڑکی تو پھر بھی کسی قدر بولڈ لگ رہی تھیں مگر دوپٹے کے ہالے میں مقید وہ پری وش کچھ گھبرا سی گئی۔ اسے بڑی دلچسپ سی حیرت ہوئی۔ اس نے اپنے اردگرد اس قسم کی لڑکیاں کچھ کم ہی دیکھی تھیں۔ ذیشان اور افتخار اس کے ساتھ ہوتے تو اس لڑکی کو اپنے فقروں اور شرارتوں سے ٹھیک ٹھاک زچ کر سکتے تھے۔ چھٹی کے وقت گرلز کالجز کے آگے سے اپنی موٹر بائیک پہ چکر لگا کر لڑکیوں پہ فقرے کسنا اس نے انہی سے سیکھا تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر ان لڑکیوں کو ہاتھ سے ''ہیلو'' کا سگنل دیا۔

''توبہ آج تو اس قدر رش ہے کہ ہماری باری شاید کل صبح تک آ سکے گی۔'' اس کی اس حرکت پر وہ دونوں سٹپٹائی تھیں، اسی دوران اس کے پاپا خالی ہاتھ واپس آ گئے۔ اس نے جتانے والے انداز میں انہیں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ''میں نے کہا تھا نا''

''آؤ ہم کہیں اور چلتے ہیں۔'' اس کے پاپا نے اسے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنا سیل فون اٹھا کر

فوراً کھڑا ہو گیا۔ مین انٹرنس سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے مڑ کر اسی ٹیبل کی جانب دیکھا، جہاں وہ لڑکیاں بیٹھی تھیں وہ ٹیبل اب خالی تھی۔ وہ لڑکیاں شاید اپنی جگہ تبدیل کر چکی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

"کھڑکیاں بند کر دو سسٹر! مجھے بہت سردی لگ رہی ہے۔" ملک صاحب نے دھیمی سی آواز میں کہا۔

مریم نے عجیب الجھن میں گھر کر کھڑکیوں کی جانب دیکھا۔ اس وی وی آئی پی روم کی تمام کھڑکیاں پہلے ہی بند تھیں۔ جولائی کے مہینے میں اے سی چلنے سے شاید انہیں خنکی کا احساس ہو رہا تھا۔ مریم نے اٹھ کر بے دلی سے اے سی بند کر دیا۔ حالانکہ اسے کافی گھٹن اور گرمی محسوس ہو رہی تھی۔

"مجھے بہت گھٹن محسوس ہو رہی ہے، کیا یہاں کا اے سی ٹھیک کام کر رہا ہے؟" اے سی بند کر کے ابھی وہ اپنی جگہ پر بیٹھی تھی کہ ملک نے پھر سے حکم جاری کیا۔ مریم نے بے حد جھنجھلا کر انہیں دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے بے سدھ پڑے تھے۔ ان کے چہرے پر نقاہت کی زردی کھنڈی تھی۔ مریم کا نرم دل پسیجا۔ وہ خواہ مخواہ ایک بیمار شخص پر غصہ ہو رہی تھی۔ حالانکہ یہ اس کے فرائض میں شامل تھا۔ وہ خود کو ڈانٹتی ہوئی اٹھی اور پھر سے اے سی آن کر دیا۔ اے سی کا مین پاور والا بٹن ملک صاحب کے بیڈ کے بالکل اوپر تھا۔ مریم جب اے سی آن یا آف کرنے کے لیے آگے بڑھتی تو اسے بیڈ کے بہت قریب ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ ملک صاحب دواؤں کے زیر اثر غنودگی میں تھے۔ ان کا ایک بازو پہلو میں ٹکا تھا جبکہ دوسرا بیڈ سے نیچے لٹک رہا تھا۔ مریم ان کا بازو ان کے سینے پہ ٹکا دیتی مگر وہ پھر سے نیچے ہو جاتا۔ ملک صاحب، مریم کو سکون سے بیٹھنے ہی نہیں دے رہے تھے۔ ان کی طرف سے ہر پندرہ منٹ بعد جاری ہونے والے نئے احکامات اسے متحرک رکھتے ہوئے تھے۔

"مجھے پانی پلا دو۔"

"میرے سر میں بہت درد ہے، سر دبا دو"

"مجھے لحاف اوڑھا دو۔"

"میرا لحاف ہٹا دو"

یہ سب کام کرتے ہوئے اسے نگہت پہ بھی غصہ آ رہا تھا۔ مریم کام سے گھبرانے والی لڑکی نہیں تھی، مگر چونکہ اسے ابھی ایسے کاموں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس نے تو ابھی تک دو گھنٹے سے زیادہ والی کوئی ڈیوٹی بھی نہیں دی تھی۔ فرسٹ ایئر میں ہر شفٹ ذرا کم دورانیے کی ہوتی تھی۔ وہ صرف اور صرف نگہت کی وجہ سے اس الجھن میں گرفتار ہوئی تھی۔ نگہت کو کسی ضروری کام سے اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں جانا تھا اور اس کی نائٹ شفٹ تھی۔ اس نے مریم سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کی جگہ ڈیوٹی کر لے۔ مریم نے بہت مشکل سے ہامی بھری تھی۔ اگر میٹرن اس کی یہ ڈیوٹی لگاتی تو وہ ہنسی خوشی یہ فریضہ سرانجام دے لیتی مگر کسی اور کی جگہ اسے ڈیوٹی دینے پر ڈر لگتا تھا۔

"میرے ہاتھوں سے جان نکل رہی ہے سسٹر؟ میرے ہاتھ بالکل سن ہو چکے ہیں۔" ملک صاحب کراہ کر بولے۔ ان کی آواز میں بے پناہ درد تھا۔ مریم ان کی تکلیف کی شدت کو محسوس کر کے ہمدردی کے



جذبات سے مغلوب ہو کر آگے بڑھی۔ اس نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بخار کی شدت محسوس کرنا چاہا، مگر ان کے جسم کا درجہ حرارت نارمل تھا۔ انہیں ڈرپ بھی نہیں لگی تھی۔ نگہت نے مریم کو یہی بتایا تھا کہ ملک صاحب اینزائٹی کا شکار رہتے ہیں۔ بزنس میں ہونے والے نقصان کے باعث ان کا بی پی شوٹ کر گیا تھا۔ وہ ڈاکٹر کے مشورے پر ریلیکس کرنے کے لیے ہاسپٹلائزڈ ہوئے تھے مگر نجانے کیوں مریم کو محسوس ہو رہا تھا کہ ملک صاحب کا مسئلہ کچھ اور ہے وہ شدید احساسِ تنہائی کا شکار تھے، اسی لیے بار بار مریم کو پکارتے تھے۔

"میرے ہاتھوں کو سہلا دو سسٹر! میرے ہاتھ بے جان ہو رہے ہیں۔" انہوں نے کراہتے ہوئے نیم غنودگی کی حالت میں کہا۔ مریم نے ان کے بھدے ہاتھ پر اپنا نرم و نازک ہاتھ رکھ کر سہلانا شروع کر دیا۔ ملک صاحب کے ہاتھوں پہ موجود سفید کھردرے بال ان کے ہاتھوں میں گدگدی پیدا کر رہے تھے۔ مریم ان کے ہاتھ کی پشت کو سہلا رہی تھی کہ انہوں نے اپنا ہاتھ سیدھا کر لیا۔ قبل اس کے کہ وہ مدہوشی کے زیر اثر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں جکڑتے دروازہ آہستگی سے کھل کر تیزی سے بند ہو گیا۔ مریم تو گڑبڑائی ہی تھی، ملک صاحب نے بھی سٹپٹا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ جو انہیں سویا ہوا سمجھ رہی تھی، ان کی اس حرکت پر کچھ حیران ہوئی۔ ابھی وہ ان کے ہاتھ دوبارہ تھامنا چاہتی تھی کہ دروازہ پھر سے کھلا۔ اندر داخل ہونے والی شخصیت کو دیکھ کر وہ حیران ہی نہیں بلکہ پریشان بھی ہو گئی۔ وہ آن ڈیوٹی ڈاکٹر صاحب تھے۔ مریم ان کے چہرے سے واقف تھی مگر ان کے نام سے آگاہ نہیں تھی۔ انہوں نے اوور آل کندھے پر لٹکا رکھا تھا جبکہ اسٹیتھسکوپ گردن کے گرد لٹک رہا تھا۔ رات کے اس پہر بھی وہ جاگ رہے تھے۔ حالانکہ مریم نے سینئر نرسز سے سنا تھا کہ رات کی شفٹ کے آن ڈیوٹی ڈاکٹرز عام طور پر اپنے اپنے کمروں میں مورچہ بند ہو کر بیٹھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

"کیسا محسوس کر رہے ہیں ملک صاحب!" وہ شخص ملک صاحب کے بستر کے قریب آ کر دریافت کرنے لگا۔ ملک صاحب نے کیا جواب دیا، مریم سن نہیں پائی وہ دل ہی دل میں "جل تو جلال تو" کا ورد کرنے لگی۔

نگہت نے اسے خاص طور سے تاکید کی تھی کہ آن ڈیوٹی ڈاکٹر کو کال کرنے کی کوشش مت کرنا اور کسی بھی طرح کی پرابلم ہو تو اسے خود ہینڈل کرنا کیونکہ ایک تو ملک صاحب کی حالت بے حد تسلی بخش تھی اور دوسرا اس صورت میں نگہت کی جواب طلبی کا اندیشہ تھا۔

"آپ ماشاءاللہ بالکل ٹھیک لگ رہے ہیں ملک صاحب! انشاءاللہ مارننگ میں آپ کو ڈسچارج کر دیا جائے گا۔" مریم کی طرف ایک نظر ڈالے بغیر ڈاکٹر صاحب نے چیک اپ مکمل کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"اب آپ کی ضرورت نہیں ہے سسٹر!" "آپ چل کر میرے کیبن میں بیٹھیے میں ابھی آتا ہوں۔ میرا خیال ہے، آپ کو بہت نیند آ رہی ہے اور آپ کو ایک کپ کافی کی ضرورت ہے۔"

ڈاکٹر نے پہلی مرتبہ مریم کی طرف دیکھ کر کہا۔ ان کی آنکھوں میں اب نیند کا شائبہ بھی نہیں تھا اور ان کے چہرے پر عجیب مبہم سی مسکراہٹ تھی۔ وہ دوبارہ سے ملک صاحب کی طرف متوجہ ہوا تو مریم فوراً اس پرائیویٹ روم سے باہر نکل کر نرسز کے لیے بنے ہوئے مخصوص کیبن میں آ کر واش روم میں گھس گئی۔ اسے جواب طلبی سے

ہمیشہ ڈر لگتا تھا۔ اور اس وقت سے اسے نگہت پہ سب سے زیادہ غصہ آ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

''کیا آ آ آ'' نگہت نے ساری بات سن کر شہادت کی انگلی منہ میں ڈال کر جس طرح ''کیا آ آ آ'' کا نعرہ بلند کیا، اس سے مریم جو جھنجھلائی ہی، ساتھ ساتھ دور آئینے میں اپنا عکس دیکھتی روبینہ بھی ہڑبڑا گئی۔ وہ لپ اسٹک لگانے میں مصروف تھی۔ نگہت کی بانگ نے اس کے ہاتھ کا توازن بھی خراب کیا۔ جس سے لپ اسٹک ہونٹوں کے کنارے سے آگے پھیلتی چلی گئی۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا، مگر اس کے چہرے پر نگہت کے لیے ''فٹے منہ تمہارا'' والے تاثرات تھے۔

''کیا تم سارا وقت واش روم میں بیٹھی رہیں؟'' نگہت نے سابقہ حیرانی و پریشانی سے پوچھا۔ مریم نے اسے آنکھ کے اشارے سے خاموش ہو جانے کے لیے کہا کیونکہ وہ روبینہ کے سامنے یہ سارا معاملہ ڈسکس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ روبینہ سے تو خیر اس کی بہت گہری دوستی ہی نہیں تھی مگر تزئین سے بھی اس نے ابھی یہ ساری بات ڈسکس نہیں کی تھی۔ لیکن نگہت کو بتانا بے حد ضروری تھا۔ روبینہ اپنی سرگرمیوں میں دوبارہ مصروف ہو چکی تھی، اس لیے اس نے ان کی جانب اتنا دھیان ہی نہیں دیا۔

''تو کیا تم سارا وقت واش روم میں بیٹھی رہیں؟'' مریم کے ٹوکنے پر نگہت نے آواز کو بے حد دھیما کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

''نہیں، میں سارا وقت واش روم میں بیٹھی نہیں رہی بلکہ واش روم کی چھت سے لٹک گئی تھی۔'' مریم نے بہت جل کر جواب دیا مگر نگہت پہ کوئی اثر نہیں ہوا۔

''ملک صاحب تو بہت خفا ہوں گے؟'' وہ بڑبڑائی مریم کا سارا دھیان روبینہ کی جانب تھا جس کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔ مریم خود بھی یہ سارا معاملہ تفصیل سے ڈسکس کرنا چاہتی تھی مگر اسے روبینہ کے کمرے سے نکل جانے کا انتظار تھا۔

''وہ ڈاکٹر کون تھا جس نے تمہیں ڈانٹا تھا؟'' نگہت نے ایک اور سوال اٹھایا۔ اب کی بار مریم نے اسے گھور کر دیکھا پھر روبینہ کی پروا کیے بغیر بولی۔

''میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں اس ڈاکٹر کا نام نہیں جانتی۔ میں نے ایک بار اسے وارڈز میں چلتے پھرتے دیکھا ہے مگر چونکہ مجھے وارڈز میں آتے جاتے بھی صحیح معنوں میں جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے، اس لیے میری بہت سارے لوگوں سے ابھی واقفیت نہیں ہے۔'' نگہت نے اس کے لہجے کی سختی کا قطعاً برا منائے بغیر گردن ہلانا شروع کر دی تھی، گویا اس کی بات سے اتفاق کر رہی ہو۔

''وہ ڈاکٹر مرتضیٰ تو نہیں تھے نا؟'' نگہت نے پوچھا۔ ''نہیں بابا، وہ ڈاکٹر مرتضیٰ نہیں تھے۔'' مریم نے اسے تسلی دلائی۔

''وہ ڈاکٹر مرتضیٰ ہو بھی نہیں سکتے۔ انہوں نے میرے کام میں مداخلت کر کے اپنی شامت بلوائی تھی۔



'' نگہت نے با آواز بلند خود کلامی کی تھی۔ مریم نے اس کی جانب حیرانی سے دیکھا۔

''یار! ڈاکٹر مرتضیٰ بہت رحم دل انسان ہیں۔ وہ کسی کو نہیں ڈانٹ سکتے۔ میرا تو وہ بہت خیال رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے جس ڈاکٹر نے تمہیں ڈانٹ پلائی ہے، وہ ڈاکٹر مرتضیٰ نہیں تھے۔'' نگہت اس کی حیرانی بھی رفع کر رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ خود کو بھی یقین دلا رہی تھی۔

''مریم! میں اپنے کزن کے ساتھ اپنی خالہ کے گھر جا رہی ہوں۔ میں لیٹ واپس آؤں گی۔'' روبینہ کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ اپنا دوپٹہ شانوں پہ درست کرتی وہ مریم کو اپنے پروگرام کے بارے میں مطلع کر رہی تھی۔ مریم نے مسکرا کر صرف سننے پر اکتفا کیا۔ روبینہ کے لاہور شہر میں اچانک بہت سے رشتے دار پیدا ہو گئے تھے۔ وہ اکثر اوقات ان سب سے ملنے کے لیے جاتی رہتی تھی اور واپسی میں لیٹ ہو جانا اس کا عام معمول تھا۔ جب تک روبینہ کمرے سے نکل نہیں گئی، مریم اسی کی جانب دیکھتی رہی۔ روبینہ اتنے سے دنوں میں بہت نکھر گئی تھی۔

''تم نے اس ڈاکٹر کے اوورآل پر لگا بیج نہیں دیکھا تھا؟'' روبینہ کے چلے جانے کے بعد نگہت پھر سے اسی موضوع پر آ گئی۔ وہ بے حد تشویش میں مبتلا تھی۔

''ارے یار! اس نے اوورآل کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ میں دیکھ ہی نہیں پائی اس کے نام والا بیج۔'' مریم نے افسوس سے کہا۔ اسے نگہت کی پریشانی کا احساس تھا اور وہ خود بھی کم پریشان نہیں تھی۔

''میں ایسا کرتی ہوں کہ تمہیں اس شخص کا حلیہ بتانا شروع کرتی ہوں۔ تم خود ہی اندازہ کر لینا کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔'' اس ڈاکٹر کے متعلق بتانے لگی۔

''ہاں میں سمجھ گئی، وہ یقیناً ڈاکٹر عادل تھا۔ مجھے پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا کہ وہ ڈاکٹر عادل کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔'' نگہت نے ناگواری سے ناک چڑھا کر کہا۔

''ستیاناس ہو تمہارا ڈاکٹر عادل...... اس ملک نے تو میرا قیمہ کر دینا ہے۔'' اب وہ بڑبڑا رہی تھی۔ مریم کو اس کی کچھ باتیں سمجھ میں آ رہی تھیں اور کچھ بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ وہ بیک وقت ڈاکٹر عادل اور ملک صاحب کے خوف میں مبتلا تھی۔

''ڈاکٹر عادل میری شکایت تو نہیں کر دیں گے؟'' مریم نے ایک نئی تشویش میں گھر کر نگہت سے پوچھا۔

''تمہیں ڈاکٹر عادل کی پڑی ہے اور مجھے اس ملک سے خطرہ ہے۔'' نگہت اکتا کر بولی، پھر مریم کے رنگ بدلتے چہرے پر نظر پڑی تو فوراً بات پلٹ کر بولی۔

''ایسی کی تیسی ڈاکٹر عادل کی، بھاڑ میں جائے۔ تمہیں پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''میں ان سے ایکسکیوز کر لیتی ہوں؟'' اس نے گویا نگہت سے اجازت طلب کی۔ نگہت بدک اٹھی۔

''خبردار جو تم اس شخص کے پاس گئیں۔ تمہیں کیا پتہ وہ کس قدر برا آدمی ہے۔ دنیا کا خبیث ترین آدمی ہے۔ تم نے بہت اچھا کیا جو تم اس کے کیبن میں نہیں گئیں۔ اس انسان نے تو ہمارا جینا ہی حرام کر دیا ہے۔

تم کیا جانو کتنی لڑکیوں کو کافی پلوانے کے بہانے برباد کر چکا ہے۔ ایسے لوگوں کو تو اپنے مرتبے اور مقام کا احساس بھی نہیں ہوتا۔'' نگہت کی باتیں مریم کے لیے کسی قدر انوکھی تھیں اور دل دہلا دینے والی بھی مگر پھر بھی وہ مطمئن تھی کہ نگہت جیسی دوست اس کے ہمراہ تھی جو اسے بہت سی مشکلات سے بچا سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

چھٹی والے روز خلاف توقع اس کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا کیونکہ وہ ایک دن پہلے سب کام کر کے فارغ ہو چکی تھی۔ وہ مہینہ بھر بعد ہی گھر جا پاتی تھی، اس لیے اپنے میلے کپڑے وہ ہاسٹل میں ہی دھو لیتی تھی۔ اس نے کل ہی ہفتہ بھر کے میلے کپڑے دھوئے تھے پھر رات کو انہیں پریس بھی کر لیا تھا۔ وہ چونکہ ذرا جلدی اٹھنے کی عادی تھی اس لیے روبینہ اور تزئین کے اٹھنے سے پہلے ہی اس نے اپنی الماری میں کتابوں وغیرہ کی ترتیب درست کی، رات کی چائے کے جھوٹے برتن دھوئے اور اس کے بعد اس نے پریس کیا ہوا یونیفارم بھی دوبارہ پریس کر لیا تھا مگر روبینہ اور تزئین ابھی بھی گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہی تھیں۔ ان کو جگاتے جگاتے اسے بھی نیند آنے لگی اور اس وقت وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تینوں چھٹی کے روز ایک ساتھ ناشتہ کیا کرتی تھیں اور تقریباً ہر اتوار ہی اسے ناشتے کی طلب میں بہت دیر تک بھوکے رہنا پڑتا تھا کیونکہ اس کی دونوں روم میٹس بہت لیٹ اٹھنے کی عادی تھیں۔

ان دونوں کو کوسنے دیتی وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ سارے ہاسٹل میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ویک اینڈ پہ بہت سی لڑکیاں گھروں کو چلی جاتی تھیں یا پھر اپنے رشتہ داروں کے یہاں وقت گزارنا پسند کرتی تھیں۔ مریم کوریڈور سے گزرتے ہوئے اردگرد کے کمروں کے دروازوں پہ لگے موٹے موٹے تالے دیکھتی لان میں آ گئی، مگر ساڑھے نو بجے ہی سورج کی تابناکی عروج پر تھی۔ صبح کی تیز دھوپ اسے تپتی دوپہر کا مزہ دے رہی تھی۔ وہ اکتا کر دوبارہ کوریڈور کی سمت آ گئی۔

''اماں! میری میتھس کی نوٹ بک پہ دو اسٹارز ملے ہیں۔ ٹیچر کہتی ہیں، ساری کلاس میں علیزے کا میتھس سب سے اچھا ہے۔ میں ہمیشہ ٹین آؤٹ آف ٹین لیتی ہوں اماں۔''

ایک کمرے کے آگے سے گزرتے ہوئے مریم کے کانوں میں آواز پڑی۔ وہ کمرہ کس کا تھا، مریم نہیں جانتی تھی مگر ادھ کھلے دروازے سے فرش پر بیٹھی ایک بچی اسے واضح دکھائی دے رہی تھی۔ اس بچی کے سامنے جگسا پزل پڑی تھی۔ وہ فرش پر سے اس کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر جگسا پزل کے فریم میں جمع کرنے میں مصروف تھی۔ وہ صحت مند سی گولو سی بچی، مریم کو پہلی نظر میں ہی بے حد کیوٹ لگی۔ اس کا دل چاہا کہ کمرے کے اندر جا کر اس بچی کو پیار کرے۔ ابھی وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ بچی کی اماں کی آواز سنائی دی۔

''اماں کی چندا! اردو کے بارے میں بھی تو بتاؤ۔ تمہاری اردو کی ٹیچر کہہ رہی تھیں کہ تم اردو میں بہت غلطیاں کرتی ہو۔''

مریم کے لیے یہ آواز بہت جانی پہچانی تھی۔ میڈم زینت کی آواز تو وہ سینکڑوں آوازوں میں بھی



پہچان سکتی تھی۔ اُسے حیرت ہوئی میڈم زینت کی بیٹی بالکل بھی ان پر نہیں گئی تھی۔ اس بچی کی رنگت بے حد سرخ و سفید تھی جبکہ میڈم زینت کافی سانولی تھیں۔ مریم نے اندر کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا کہ بہر حال میڈم زینت کبھی بھی اس کی گڈ بکس میں شامل نہیں رہی تھیں۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' میڈم زینت نے اسے اپنے کمرے کے باہر کھڑا دیکھ لیا تھا۔

''السلام علیکم۔'' اس نے گڑبڑاہٹ میں سلام کر ڈالا۔ حالانکہ یہاں اس طرح سے سلام کرنے کا رواج ذرا کم ہی تھا۔

''وسلام...... خیریت؟'' انہوں نے دروازے کے قریب آ کر استفہامیہ انداز میں پوچھا۔ وہ انہیں کوئی مناسب جواب دینے ہی والی تھیں کہ پیون اسے بلانے آ گیا۔

''تسی اتھے کھڑے او، میں تہاڈے کمرے وچ لب ریا سی۔ تہاڈے پائی ہوراں آئے نیں۔''

( آپ یہاں کھڑی ہیں اور میں آپ کو آپ کے کمرے میں تلاش کر رہا تھا۔ آپ کے بھائی آئے ہیں)

اسے خوشگوار جھٹکا لگا۔ وہ تقریباً بھاگتے ہوئے گیسٹ روم کی جانب آئی۔ حیدر اس سے ملنے کے لیے آیا تھا۔

''ایہہ بیٹھے نیں تہاڈے پائی جان۔'' پیون بھی اس کے ساتھ ہی بھاگ کر گیسٹ روم تک آیا تھا۔ لڑکیوں سے ملنے کے لیے آنے والے لوگوں سے ٹپ وغیرہ ملنے کی توقع اس کو بہت مستعد کر دیتی تھی۔

''اس احمق سے کہو، میں تمہارا پائی جان نہیں ہوں۔'' حیدر چڑ کر بولا۔ مریم کو اس کے انداز پر خواہ مخواہ کی ہنسی آئی۔ گزشتہ بار جب وہ گھر گئی تھی تو اس کی امی نے سرسری سا ذکر کیا تھا کہ اس کی پھپھو، حیدر کے لیے اس کا رشتہ مانگ رہی ہیں۔ ظاہر ہے یہ بات حیدر بھی جانتا تھا، اس لیے اس کے انداز پہلے کی نسبت کچھ بدل سے گئے تھے۔

''میں تمہیں لینے کے لیے آیا ہوں۔'' ابتدائی علیک سلیک کے بعد حیدر نے کہا۔ سفید لٹھے کے کڑکتے کلف شدہ شلوار قمیص میں وہ خود کو کسی ریاست کا راجہ سمجھ رہا تھا۔ اسے اپنی وجاہت کا بے حد احساس تھا اور گیسٹ روم میں آتی جاتی جھانکتی لڑکیاں اسے باور کرا رہی تھیں کہ وہ اچھا لگ رہا ہے۔ مریم نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

''تمہیں کچھ احساس ہے گلابی سنڈی! اس بار تمہیں پورا ڈیڑھ مہینہ ہو گیا ہے گھر سے آئے۔ وہاں سب تمہارے لیے کتنے اداس ہو رہے ہیں۔''

حیدر نے اتنا کہہ کر ملک شیک کے گلاس میں موجود آخری گھونٹ بھی اپنے اندر منتقل کر لیا اور پھر تب تک گلاس منہ سے لگائے رکھا جب تک آخری قطرہ بھی اس کے منہ میں منتقل نہیں ہو گیا۔

''حیدر کے بچے...... شرم کرو...... سب لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔'' اس نے جل کر کہا۔ اسے افسوس ہوا کہ اس نے حیدر کو ملک شیک آفر ہی کیوں کیا۔

''ارے تو اس میں شرم والی کیا بات ہے، ماشاء اللہ اتنا خوبرو ہوں۔ لڑکیوں نے دیکھ بھی لیا تو کیا ہوا اور پھر لڑکیاں ہی دیکھ رہی ہیں نا، ان کی مائیں تو نہیں، مائیں دیکھتیں تو میں شرماتا بھی کیونکہ ہمارے معاشرے میں داماد تو مائیں ہی پسند کرتی ہیں نا۔'' وہ ڈھیٹ بنا کہہ رہا تھا۔

''یہ لاہور ہے حیدر صاحب! آپ کا بھائی پھیرو نہیں۔ یہاں لڑکیاں اپنی مرضی سے اپنی ماؤں کے لیے داماد چنتی ہیں۔''

وہ اسی کے انداز میں بولی مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

''اچھا یہ تو بڑے مزے کی بات ہے......تم نے بھی کچھ سیکھ لینا تھا ہمارا بھی کوئی فائدہ ہو جاتا۔ اب ہم کہاں تمھارے لیے خوار ہوتے پھریں گے۔'' وہ اسے چڑاتے ہوئے بولا۔

''ارے تم فکر مت کرو...... میں نے سب سیکھ لیا ہے...... میرے لیے تمھیں کوئی خواری نہیں اٹھانی پڑے گی۔''

مریم نے شرارت کا بدلہ شرارت سے لیا مگر حیدر کے چہرے کا رنگ بدلا، ایک لمحے کے لیے وہ خاموش ہو گیا پھر گہری سانس لے کر بولا۔

''یہ بات تو تم دل سے نکال دو مریم بی بی میں جانتا ہوں یہ خواری تو مجھے ہی اٹھانی پڑے گی کیونکہ یہ میری قسمت میں لکھی ہوئی ہے...... یہ دیکھو میرے ہاتھ پر کتنا واضح ''M'' لکھا ہے''

اس نے اپنی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی۔ اس کے دل اور دماغ کی لائن اس طرح سے آپس میں ملتی تھی کہ اگر زندگی کی لائن کو ساتھ ملا کر دیکھا جاتا تو ایسا ہی محسوس ہوتا تھا جیسے ''M'' لکھا ہے۔ حیدر کے چہرے پر پھیلی میٹھی سی سنجیدگی نے مریم کو عجیب سے احساسات سے دوچار کیا وہ بچی نہیں تھی کہ حیدر کے محسوسات کو سمجھ نہ سکتی۔ وہ پہلے کی نسبت خود کو بہت مجبور محسوس کرتی تھی۔ حیدر جب تک بیٹھا رہا اسی طرح کی بے سروپا باتیں کرتا رہا۔ حیدر کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آئی تو اس کا موڈ بے حد خوشگوار ہو چکا تھا۔

''تو پیا سے مل کر آئی ہے بس آج سے نیند پرائی ہے۔'' تزئین نے اسے دیکھتے ہی گنگنانا شروع کر دیا۔ روبینہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔

''وہ کون تھا؟'' تزئین نے شرارتی انداز میں پوچھا۔ وہ شاید گیسٹ روم میں اسے کسی لڑکے کے ساتھ بیٹھا دیکھ چکی تھی۔

''کزن تھا میرا...... حیدر...... میرے بھائی کے جیسا ہے۔'' وہ ذرا چڑ کر بولی۔ اسے پتا تھا اب تزئین مزید سوالات کرے گی، اس لیے فوراً بھائی کا حوالہ دیا مگر تزئین نے بات ہی پکڑ لی۔

''ہیں...... سچ تمہارا بھائی بھی ایسا ہی ہے۔ اس کا مطلب تمہارا بھائی بھی ہینڈسم ہے۔ تم نے اس کی منگنی وغیرہ تو نہیں کی ہو گی ابھی، یار پلیز ایسا کرتے وقت ایک بار میرے متعلق ضرور سوچنا۔ میرا اور تمھارے بھائی کا پرفیکٹ کپل بنے گا۔ وہ کیا کہتے ہیں پرفیکٹ میچ۔'' وہ آنکھیں بند کیے کہہ رہی تھی۔ مریم کو ہنسی آ گئی۔

''بکو نہیں...... تم سے چھوٹا ہو گا وہ۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔



''ہائے ہائے ایک تو ہر ہینڈسم لڑکا مجھ سے چھوٹا ہوتا ہے اور جو مجھ سے بڑا ہوتا ہے وہ ''کزن'' ہوتا ہے اور ''کزن'' پہ پہلا حق تمہارا ہے۔ میں تمھارے حق پہ ڈاکہ نہیں ڈال سکتی۔''

وہ آنکھ مارتے ہوئے بولی۔ مریم خاموش ہی رہی۔ وہ پہلے ہی حیدر کا غائبانہ تعارف کروا چکی تھی اور تزئین، مریم کو اکثر حیدر کے نام سے چھیڑتی تھی۔ چونکہ روبینہ کا بھی کزن اس سے ملنے آتا رہتا تھا اس لیے وہ ان دونوں سے کہا کرتی تھی۔

''یار! ویسے تم لوگ اس معاملے میں کتنے خود کفیل ہو جسے دیکھو اس کا ہی ایک عدد کزن ضرور ہے۔ ایک میں ہی ''بے کزنی'' پیدا ہو گئی ہوں، اس بھرے جہاں میں۔''

''مریم نے چائے اور ناشتے کے لوازمات دیکھنے شروع کیے پھر تزئین سے پوچھا۔''

''روبینہ کہاں ہے؟''

''وہ بھی گیسٹ روم میں ہی تھی......اس کا بھی کزن آیا ہوا ہے۔''

تزئین نے جل کر جواب دیا۔ مریم خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہی وہ روبینہ کو گیسٹ روم میں ایک لڑکے کے ساتھ بیٹھا دیکھ چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

''آپ سب لوگ انتہائی نکمے، کام چور اور انسانیت سے عاری لوگ ہیں۔''

سرجن مرتضیٰ کی آواز قدرے اونچی تھی۔ مریم چند لمحے پہلے وارڈ میں داخل ہوئی تھی اس نے حیرانی سے ان کی جانب دیکھا۔ اس نے انہیں پہلی مرتبہ اس قدر غصے میں دیکھا تھا۔ دھیمے لہجے اور پُر شفقت انداز میں بات کرنے والے سرجن مرتضیٰ اس کے پسندیدہ ترین ڈاکٹر تھے۔ مستقل فکلیٹی کا حصہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ آرتھوپیڈک وارڈ کے ہیڈ بھی تھے۔

مریم کی ڈیوٹی اسی وارڈ میں لگ رہی تھی اس لیے ان سے اکثر سامنا رہتا تھا۔ ان کا اتنا غصیلا روپ وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

''میں نے الطاف سے کہا تھا سر! مگر وہ کہنے لگا کہ......'' اختر منمنایا۔

''مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو اختر! تم جانتے ہوئے کہ غلطی تمہاری ہے۔''

سرجن مرتضیٰ نے اس کی بات کاٹی۔

''میں نے ایکسرے رپورٹ دیکھ کر پرسکرپشن لکھا تھا۔ اس بچی کے جوائنٹس ابھی اس قابل بھی نہیں تھے کہ ایک سوئی کا بوجھ اٹھا سکیں اور تم نے کمال جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے پلستر ہی ہٹا دیا۔ مجھے یہ بتاؤ سرجن میں ہوں یا تم۔ ہفتہ بھر سے پہلے تم نے ایک مریض کی پٹیاں نہیں کھولنی۔'' ان کا لہجہ اب کی بار پہلے سے بھی زیادہ اونچا تھا۔ مریم کو اصلاحات سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ اختر علی آرتھوپیڈک وارڈ کا سینئر موسٹ میل نرس تھا۔ اسے اکثر معاملات میں اپنی من مانی کرنے کی عادت تھی۔ وہ رشوت لیکر بہت سے غلط سلط کام کر دینے کا عادی تھا جس کا خمیازہ اسے بعد میں بھگتنا پڑتا تھا۔

''میں نے خود پٹیاں نہیں کھولی تھیں سر! ان کے گھر والوں کا اصرار تھا کہ اب پٹیاں کھول دی جائیں۔ وہ میری منت سماجت کر رہے تھے بس اس لیے میں نے......''

''پہلے تمہاری منت سماجت کر رہے تھے اور اب میری منت سماجت کر رہے ہیں کیونکہ اب کوئی آرتھوپیڈک ایسا نہیں جو ان کی بیک بون کے اس مہرے کو دوبارہ پوزیشن پر لا سکے۔ تمہاری عجلت کے باعث ایک اچھا بھلا صحت مند انسان ساری زندگی کے لیے مفلوج ہو گیا۔'' سرجن مرتضیٰ نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''میں آپ سے کہہ تو رہا ہوں سر کہ......''

''اچھا چلو ایک لمحے کے لیے فرض کر لیتا ہوں کہ اس مریض کے گھر والے اصرار کر رہے تھے مگر اس بچی کا کیا قصور تھا جس کا پلستر ہٹا دیا تم نے اس بچی کے پیرنٹس سے میری بات ہوئی ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ تم نے زبردستی اس کا پلستر ہٹایا تھا کیونکہ وارڈ میں کوئی بیڈ خالی نہیں تھا اور تمہارا کوئی رشتہ دار ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہونے والا تھا اسی لیے تم نے اس بچی کا پلستر کھول دیا۔''

سرجن مرتضیٰ چبا چبا کر کہہ رہے تھے۔ مریم کے علاوہ الطاف، نگہت وغیرہ بھی اردگرد کھڑے تاسف بھری نظروں سے اختر کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ہفتہ بھر پہلے سرجن مرتضیٰ نے اسے تنبیہہ کی تھی مگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا۔

''سرجن مرتضیٰ اب کی بار اختر کو معاف نہیں کریں گے۔'' نگہت نے مریم کے قریب ہو کر سرگوشی میں کہا۔ اس کا اندازہ بالکل درست ثابت نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر مرتضیٰ اختر کو گھورتے ہوئے اپنے کیبن کی سمت چل دیے مگر چند لمحوں بعد آرتھوپیڈک وارڈ کے آن ڈیوٹی پیرا میڈیکل اسٹاف کو طلب کیا گیا تھا۔ ان کے کیبن میں ان کے علاوہ ڈاکٹر عادل، ڈاکٹر تحریم سرجن ظہور بھی موجود تھے۔ وہیں مریم کو پتا چلا تھا کہ جس بچی کا پلستر وقت سے پہلے کھول دیا تھا وہ سیاسی واثر ورسوخ رکھنے والے خاندان کی بچی تھی اور اس کے گھر والوں کی شکایت بہت اوپر تک پہنچ گئی تھی جہاں سے ایم ایس تک خاص ہدایت آئی تھیں اور ایم ایس نے سرجن مرتضیٰ کو طلب کر کے ٹھیک ٹھاک قسم کی جواب طلبی کی تھی۔

''میں اب کی بار تمہیں پھر معاف کر دیتا ہوں۔ میں نے ایم ایس کے سامنے کہیں تمہارا نام نہیں لیا بلکہ خاموشی سے تمہاری غلطی کو اپنے کھاتے میں ڈال کر ان کی بری بھلی سن آیا ہوں مگر آج کے بعد تم نے اس قسم کی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا تو پھر تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔''

سرجن مرتضیٰ نے سب کی موجودگی میں اختر کو معاف کر دیا تھا مگر اختر کے ساتھ ساتھ ان سب کو بھی اپنی اپنی ذمہ داری مکمل ایمانداری کے ساتھ نبھانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس سارے معاملے میں ڈاکٹر عادل کے انداز نے مریم کو بے حد سلگایا۔ انہوں نے ساری گفتگو کے دوران کچھ بھی کہنے کے بجائے مریم کو گھورنے پر اکتفا کیا۔ نگہت نے ان کا یہ انداز دیکھ کر مریم سے آنکھوں ہی آنکھوں میں یقین دہانی چاہی تھی کہ یہ وہی ڈاکٹر ہیں جو ملک صاحب والے پرائیویٹ روم میں آئے تھے۔ مریم پہلے ہی ان کے اوور آل پر لگے بیج سے ان کا نام



پڑھ چکی تھی۔ اس روز سارے وارڈ میں سرجن مرتضیٰ کے جذبہ ایثار کی تعریف ہوتی رہی جبکہ مریم دل ہی دل میں ڈاکٹر عادل کے رویے سے خفا ہو رہی تھی۔ اچھا بھلا پڑھا لکھا شخص اس قسم کی جاہلانہ حرکتیں کرتا اسے ذرا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔

☆　☆　☆

''روبینہ کی بات پکی ہو گئی ہے۔'' تزئین نے سینڈل کا اسٹریپ بند کرتے ہوئے پُرمسرت لہجے میں اطلاع دی۔ وہ دونوں مارکیٹ تک جا رہی تھیں۔

''اتنی خوشی کی خبر اتنی دیر سے سنا رہی ہو اور یہ محترمہ روبینہ کہاں ہیں؟'' مریم نے چادر اوڑھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

''محترمہ روبینہ اپنے کزن کم منگیتر کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے گئی ہیں۔ میں نے پوچھا کہاں جا رہی ہو تو کچھ بولی نہیں پھر شرماتے ہوئے کہنے لگی کہ اجمل کے ساتھ باہر جا رہی ہوں پھر خود ہی کہنے لگی کہ بات پکی ہونے کی خوشی میں اجمل مجھے ٹریٹ دینا چاہتا ہے۔''

''تزئین نے تفصیل کے ساتھ بتایا۔ وہ دونوں ہاسٹل کے کاریڈور سے ہوتی ہوئی گیٹ تک آ گئی تھیں۔''

''اجمل اس کا وہی کزن ہے نا جو ہر ویک اینڈ پہ ملنے کے لیے آتا ہے؟''

مریم نے پوچھا تو تزئین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ دونوں مین روڈ کی طرف جا رہی تھیں جہاں سے انہوں نے وین پکڑنا تھی۔

''ہاں یار وہی کزن ہے...... اچھا ہینڈسم لڑکا ہے...... میرا تعارف تو نہیں ہے مگر میں نے بہت مرتبہ گیسٹ روم میں اور ہاسٹل کے لان میں اسے روبینہ کے ساتھ دیکھا ہے۔''

تزئین جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے میں ماہر تھی۔ وہ دونوں وین میں سوار ہوئیں تو کچھ دیر کے لیے خاموش بھی ہو گئیں پھر مارکیٹ میں بھی خریداری کرتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ سب ضروری چیزیں خرید لینے کے بعد مریم کو بھوک ستانے لگی۔ تزئین کو بھی بھوک تو لگ رہی تھیں مگر ہاسٹل میں آج اس کی فیورٹ مکسڈ سبزی بن رہی تھی اس لیے وہ ڈنر ہاسٹل میں ہی کرنا چاہتی تھی۔ وہ دونوں متفقہ فیصلہ کر کے جوس پینے کے لیے ایک چھوٹے سے کھوکھے کی جانب آ گئیں جہاں ملک شیک بھی دستیاب تھا۔ ان دونوں نے اسٹابری شیک کا آرڈر دیا پھر آپس میں باتیں کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ موسم میں اوائل نومبر کی مخصوص خنکی شامل تھی۔ لوگوں کا کافی رش لگا تھا۔ لاہور شہر کے باسیوں کی یہ روایت مریم کو بہت عجیب لگتی تھی۔ موسم میں جیسے ہی کوئی خوشگوار تبدیلی آتی سارا لاہور گھروں سے باہر امڈ آتا۔ ہوٹلز، ریسٹورنٹس، کھوکھے، چھوٹے چھوٹے فاسٹ فوڈ کارنرز سب جگہ گویا میلہ سا لگ جاتا تھا۔ سب لوگ تقریباً ہم کھانے کے لیے زندہ ہیں، کی عملی تصویر بنے نظر آنے لگتے۔ اب بھی کم و بیش یہی صورتحال تھی۔ دوبئی چوک کے گرد جتنے ٹھیلے یا فوڈ کارنرز نظر آ رہے تھے وہاں بے تحاشا رش تھا۔ وہ دونوں مین جگہ کھڑی تھیں تب ہی ان سے چند قدم کے فاصلے پر ایک بائیک آ کر رکی۔ اس پر ایک لڑکا، لڑکی سوار تھے۔ لڑکے

سے تو وہ دونوں انجان تھیں مگر لڑکی روبینہ تھی۔ مریم نے تزئین کو ٹہوکا دے کر متوجہ کیا۔

''ارے...... یہ تو روبینہ ہے۔'' وہ خوشگوار حیرت میں گھر کر بولی۔ روبینہ پہلی نظر میں تو پہچانی ہی نہیں جا رہی تھی۔ دوپٹہ گلے میں ڈالے سن گلاسز بالوں میں اٹکائے وہ ایک الٹرا ماڈرن لڑکی کے روپ میں اُس پاس کھڑے بہت سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ وہ اونچا لمبا ہینڈسم لڑکا بھی کافی اچھا لگ رہا تھا۔

''آؤ ان سے ملتے ہیں۔'' وہ مریم کا ہاتھ تھام کر فوراً ہی دو قدم آگے ہوئی۔ روبینہ نے اسی لمحے ان کی جانب دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کے چہرے پر عجیب سی گھبراہٹ نمایاں ہوئی۔

''مجھے تزئین نے بتایا تھا تمہاری انگیجمنٹ کا...... مبارک ہو روبینہ......'' مریم نے اتنا ہی کہا تھا کہ روبینہ نے اس کی بات کاٹی۔

''یہ کامران توصیف ہیں۔''

اس شخص کی پوری بتیسی باہر نکل آئی جبکہ تزئین نے حیرت سے روبینہ کی جانب دیکھا۔ وہ اس سے کہہ کر آئی تھی کہ وہ کسی اجمل نامی کزن کم منگیتر کے ساتھ باہر جا رہی ہے جبکہ اس کے ساتھ موجود شخص کا نام کامران توصیف تھا اور پھر اس شخص کا انداز بھی عجیب لوفرانہ تھا۔

''تم نے بتایا ہی نہیں روبی کہ تم انگیجڈ ہو...... بہر حال مبارک ہو یار! اب ان دونوں کا انٹروڈکشن بھی تو کرواؤ۔''

وہ للچائے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔ مریم تو مریم تزئین بھی کچھ حیرانی کے عالم میں اسے تکنے لگی۔

''یہاں ایک بہت اچھا ریسٹورنٹ ہے آیئے آپ کو کولڈ ڈرنک پلواتا ہوں روبینہ کی انگیجمنٹ کی خوشی کو کہیں بیٹھ کر سیلیبریٹ کرتے ہیں۔'' وہ حقیقتاً لسوڑا تھا۔ مریم اور تزئین معذرت کرتے آگے بڑھ گئیں جبکہ روبینہ نے انہیں روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

''مریم! روبینہ جھوٹ بول رہی تھی؟'' تزئین نے ناسمجھی کے انداز میں پوچھا۔ مریم خود سمجھ نہیں پائی کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے۔ اس نے جس لڑکے کو ایک آدھ بار گیسٹ روم میں روبینہ کے ساتھ دیکھا تھا وہ یہ لڑکا تو نہیں تھا جبکہ روبینہ نے تزئین کو بتایا تھا کہ اس کا صرف ایک ہی کزن اس سے ملنے آتا ہے۔

وہ دونوں عجب کشمکش میں گھری واپس ہاسٹل آ گئی تھیں۔

''وہ میرا دوست ہے یار؟ اچھا شخص ہے۔ فرینڈلی اور کیئرنگ۔'' رات کو واپس آ کر روبینہ نے تزئین کے ایک بار پوچھنے پر بہت آرام سے تسلیم کر لیا تھا۔ اس کا انداز اتنا دوٹوک تھا کہ مریم اور تزئین کو مزید کچھ پوچھنے کی جرأت ہی نہیں ہوئی۔

''مریم! تم کامران کو بہت پسند آئی ہو۔ وہ تم سے دوستی کرنا چاہتا ہے۔'' تزئین کے کمرے سے نکل جانے کے بعد روبینہ نے اسے اطلاع دی۔

''یار! ہی از ویری رچ...... بہت دیالو بندہ ہے۔ ایسے دوست قسمت والوں کو ملتے ہیں۔''

وہ مریم کے چہرے کی جانب دیکھے بغیر اپنا ہی راگ الاپ رہی تھی جبکہ مریم کا غصہ انتہا کو پہنچنے لگا۔



یہ روبینہ اس روبینہ سے کس قدر مختلف تھی جو اسے پہلے دن کلاس میں ملی تھی اور جسے تزئین پرنسز آف چک جھمرہ کہا کرتی تھی۔

''میں یہاں دوستیاں کرنے نہیں آئی مجھے تو معاف ہی رکھو۔''

وہ ناک چڑھا کر کہتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ روبینہ نے کندھے اچکا کر اپنی مخصوص الماری میں منہ گھسا لیا۔

☆ ☆ ☆

''میں ماہین ہوں...... میرے فرینڈز مجھے ماہی کہتے ہیں۔'' اس کے ساتھ بیٹھی اس خوبصورت لڑکی نے مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔ مریم ایک ہفتے کی چھٹیاں گزارنے کے بعد بھائی پھیرو سے واپس لاہور جا رہی تھی۔ وہ جب کوچ میں سوار ہوئی تو ماہین نامی یہ لڑکی پہلے سے کوچ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی اس لیے مریم سہولت سے اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ حیدر تسلی کر کے ہی کوچ سے اترا تھا کہ اسے کسی خاتون کے ساتھ جگہ ملی ہے ورنہ بعض اوقات کوچ والے اس بات کا دھیان نہیں رکھتے تھے۔ کوچ اسٹارٹ ہوئی تو اس لڑکی نے اپنا تعارف کروایا۔

اعلا تراش خراش کے ڈریس میں ملبوس نفیس سے میک اپ کے ساتھ وہ کوچ میں بیٹھی ہوئی باقی سب خواتین سے بے حد مختلف لگ رہی تھی۔ اس نے باقی خواتین کی طرح دوپٹہ سر پر اوڑھنے کے بجائے کندھوں پر پھیلا رکھا تھا کوچ میں سفر کرتے ہوئے مریم کو عام طور پر بہت سی نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا مگر آج ان کی سیٹ کی طرف کچھ زیادہ ہی نگاہیں اٹھ رہی تھیں۔

''میں مریم ہوں اور میرے فرینڈ مجھے مریم ہی کہتے ہیں۔''

''نائس ٹو میٹ یو مریم...... لاہور جا رہی ہو؟'' ماہین نے بے تکلف ہونے میں پہل کی۔

''ہاں'' مریم نے اختصار سے جواب دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ خود سے ماہین سے کوئی سوال کرتی وہ خود ہی بولنے لگی۔

''میں بھی لاہور جا رہی ہوں...... ان فیکٹ میں لاہور ہی کی رہنے والی ہوں۔ یہاں ساہیوال اپنے ننھیال آئی ہوئی تھی۔ مجھے تو کوچ میں سفر کرنے سے وحشت ہوتی ہے۔ پہلے ماموں کا ڈرائیور مجھے چھوڑنے کے لیے آنے والا تھا مگر ماموں کے کسی فرینڈ کی ڈیتھ ہو گئی۔ سب لوگوں کو وہاں جانا پڑا۔ میں نے سوچا ڈرائیور کے فارغ ہونے کا انتظار کون کرے اس لیے مجبوراً کوچ سے آنا پڑا۔''

وہ کافی تفصیل سے بات کرنے کی عادی معلوم ہوتی تھی۔

''تم لاہور میں کہاں رہتی ہو؟'' اس نے مریم کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''ہاسٹل میں پڑھتی ہوں۔''

''ویری گڈ...... تعلیم ضرور مکمل کرنی چاہیے۔ تم کیا پڑھتی ہو۔ میں نے لاہور کالج سے گریجویشن کیا ہے۔ اس کے بعد میں نے این سی اے سے کچھ آرٹ کورسز بھی کیے۔ آج کل اپنے ایک فرینڈ کے ساتھ اس کے

فادر کی فرم میں کام کر رہی ہوں۔ میں تو کہتی ہوں سب لڑکیوں کو جاب کرنی چاہیے۔ اس دور میں سب لوگوں کا انڈیپنڈینٹ ہونا بہت ضروری ہے۔''

وہ خود ہی سوال کر رہی تھی اور خود ہی جواب بھی دیتی جا رہی تھی۔

''ان فیکٹ ہماری فرم ابھی بہت وسیع پیمانے پر کام نہیں کر رہی۔ خرم بہت ہارڈ ورکنگ اور ٹیلنٹڈ ہے۔ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہے اسے پورا کر کے ہی چھوڑتا ہے، اس لیے میں بہت ہوپ فل ہوں کہ ہم جلد بہت آگے آ جائیں گے۔ ویسے بھی میں تو کام کے سلسلے میں آج کل کچھ غیر سنجیدہ ہوتی جا رہی ہوں۔'' وہ لمحہ بھر کے لیے رکی۔ اپنے پرس میں سے ایک ننھا سا آئینہ اور لپ اسٹک نکال کر میک اپ درست کرنے لگی۔ مریم کو از حد کوفت ہوئی۔ اس کا پالا ایک عجیب وغریب ''چیز'' سے پڑا تھا۔

''یار سچ بتاؤں...... نیکسٹ ایئر میری شادی ہو جائے گی پھر مجھے لندن چلے جانا ہے۔ ثوبان وہاں ہوتا ہے نا۔ میں تب تک ہی جاب کر پاؤں گی جب تک وہ آ نہیں جاتا۔ اس کے بعد کیا کرنا ہے یہ میں لندن جا کر ڈیسائیڈ کروں گی۔ سنا ہے وہاں پہ کام کرنا بہت ضروری ہے ورنہ گزارا نہیں ہوتا۔ خیر جو کام کل ہونا ہے اس کے بارے میں فکرمند بھی کل ہی ہونا چاہیے۔ تم بتاؤ تمہاری انگیجمنٹ وغیرہ ہوئی ہے ابھی تک یا نہیں۔ ویسے اتنی کیوٹ لگ رہی ہو آئی ایم شیور تم بھی ''بک'' ہو چکی ہو گی۔''

وہ پھر سے شروع ہو چکی تھی۔ مریم بس ''ہوں، ہاں'' کرتے ہوئے اسے سنے چلی جا رہی تھی۔

''تمہارا تعلق بھائی پھیرو سے ہے نا تم وہیں سے کوچ میں بیٹھی تھیں نا، کیسا شہر ہے یہ؟ ساہیوال تو قسم سے بہت ہی بورنگ جگہ ہے۔ اتنی ڈل لائف ہے وہاں کی۔ میں تو اکتا جاتی ہوں مگر میرے ننھیال والے سمجھتے ہی نہیں اصرار کیے جائیں گے کہ آؤ آؤ اس لیے مجبوراً مجھے جانا پڑتا ہے۔ ویسے سب کزنز مجھے پیار بہت کرتے ہیں خصوصاً اطہر وہ میرا ہم عمر ہے...... آئی ٹی میں ماسٹرز کر رہا ہے۔ طارق بھی اسی کا کلاس فیلو ہے۔''

وہ پروفیشن سے فیملی ریلیشن شپس تک آ گئی تھی۔ مریم نے اکتا کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

اسے پتا چل گیا تھا کہ اس کے بولنے کے چانسز بہت ہی کم ہیں۔ لاہور کے قریب پہنچنے تک وہ اپنے آدھے خاندان کا غائبانہ تعارف کروا چکی تھی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اس کی ساری گفتگو میں ماں باپ کے علاوہ سب رشتہ داروں کا چیدہ چیدہ ذکر آ چکا تھا۔ اسی دوران اس کے موبائل کی بپ بجنے لگی۔

''اوہ...... ثوبان کی کال ہے۔'' اس نے پرس میں سے موبائل نکال کر CLI پر نمبر چیک کر کے خوشی سے کہا۔ اگلے پندرہ منٹ تک وہ ثوبان سے باتیں کرتی رہی۔

''آئی مس یو ثوبان۔'' خدا حافظ کہنے سے پہلے اس نے موبائل کے ماؤتھ پیس کو ہونٹوں سے لگا کر کہا۔

''لاحول ولا قوۃ۔'' مریم بھری کوچ میں اس حرکت پر شرمندگی سے جز بز ہوتے ہوئے بڑبڑائی۔

''ثوبان کی جان ہے مجھ میں...... بہت محبت کرتا ہے مجھ سے۔''

ماہین نے مریم کی معلومات میں اضافہ کیا۔



مریم کو اس ''ثوبان نامہ'' سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر ماہین نے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات سے قطع نظر اسے ثوبان قدوائی کے متعلق بتانا شروع کر دیا تھا۔ بات ابھی ثوبان کے پسندیدہ ٹوتھ پیسٹ تک پہنچی تھی کہ موبائل پر پھر سے بپ ہوئی۔

''ارے سفیر کا مسیج ہے۔ ایک تو میں اس لڑکے سے بھی بہت تنگ ہوں ہر دو گھنٹے بعد مجھے SMS کرنے کا شوق ہے اسے۔''

ماہین نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا۔ وہ مسیج چیک کرنے کے بعد خود بھی کچھ دیر تک موبائل کے بٹن پش کرتی رہی۔

''وہ کہتا ہے کہ وہ مجھے مس کر رہا ہے اور اسے یقین ہے کہ آج میں بہت اچھی لگ رہی ہوں۔''

ماہین نے اپنا موبائل دوبارہ سے پرس میں رکھتے ہوئے کہا۔

''سفیر تمہارا بھائی ہے؟'' مریم نے اس کے چہرے پر پھیلی مسرت کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''او کم آن مریم! آئی ہیٹ مائی برو (برادر) سفیر از مائی فرینڈ۔'' وہ کوفت سے بولی۔

''بلے بھئی بلے۔ سفیر از جسٹ اے فرینڈ۔'' مریم نے حیرت میں گھر کر سوچا۔

''میری اور میرے بھائی کی آپس میں کبھی نہیں بنی۔ اسے میری ہر بات پہ اعتراض کرنے کی عادت ہے حالانکہ چار سال چھوٹا ہے مجھ سے مگر باتیں ایسے کرتا ہے جیسے چودہ سال بڑا ہو یہ مت کرو...... وہاں کیوں جاتی ہو...... اس سے کیوں ملتی ہو...... لیٹ کیوں آئی۔ فلاں کے ساتھ ریسٹورنٹ میں کیوں تھی۔ فلاں کے ساتھ گاڑی میں کیوں تھی۔ بس اس لیے اچھا نہیں لگتا مجھے۔ حالانکہ میں نے کبھی اس کی کسی بات پر اعتراض نہیں کیا۔ اس کی کتنی گرل فرینڈز ہیں، وہ نیٹ پر کون کون سی ویب سائٹس کا وزٹ کرتا ہے۔ پاکٹ منی کے علاوہ اس کے پاس روپے کہاں سے آتے ہیں۔ اسموکنگ بھی کرتا ہے۔ میں یہ سب باتیں جانتی ہوں مگر میں نے کبھی اس کی شکایت نہیں لگائی۔ جبکہ وہ تو ہمہ وقت میری شکایت لگانے کو بے تاب رہتا ہے۔ ممی نے طے کیا تھا اسے آسٹریلیا بھجوا دیں گی مگر ابھی اس کا آئی ڈی کارڈ نہیں بنا ان فیکٹ وہ بنوانا ہی نہیں چاہتا، حالانکہ اس منتھ کی ٹینتھ کو پورے اٹھارہ سال کا ہو چکا ہے۔ پاپا کی فیور بھی اس کے ساتھ ہے نا۔''

وہ لمحہ بھر کے لیے رکی۔ اس بار اس کی خاموشی عجیب سی تھی۔ افسردہ سی، تاسف بھری۔ شاید وہ کچھ مزید وقت اسی خاموشی میں گزار دیتی مگر موبائل کی بپ نے پھر اسے الرٹ کر دیا تھا۔

''سفیر نے دوبارہ SMS کیا ہے۔'' وہ ایک بار پھر موبائل چیک کرتے ہوئے اونچی آواز میں مریم کو مطلع کر رہی تھی۔

مریم اب بالکل ہی لاتعلق ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ ویسے بھی تھوڑا سا سفر ہی باقی رہ گیا تھا۔ اس نے ماہین عرف ماہی کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالنا شروع کر دیا۔ کچھ سفر ماہین کے رشتہ داروں کے تعارف میں گذرا تھا کچھ اس کے ''فرینڈز'' کے تعارف میں گزر گیا۔

''تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ تم میرے گھر ضرور آنا۔ میرا بھائی تم سے مل کر بہت خوش ہو گا۔ وہ

کہتا ہے کہ یہ لڑکوں کی ہمت ہے کہ وہ مجھ جیسی دوست برداشت کر لیتے ہیں ورنہ کوئی لڑکی تو کبھی میری دوست بننے پر تیار نہ ہو۔ اب میں اسے جا کر بتا دوں گی میں نے ایک بہت اچھی لڑکی کو دوست بنایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حیران ہو جائے گا۔"

اس کی مطلوبہ جگہ پر پہنچ کر ماہین نے کہا تھا۔ یہ آخری بات تھی۔ جو مریم نے سنی۔ وہ اسے خدا حافظ کہے بنا کوچ سے اتر گئی تھی۔

☆　☆　☆

"السلام علیکم...... کیسی ہیں آپ سسٹر؟" ڈاکٹر عادل ایک دم اس کے سامنے آئے۔ یہ ان کی بہت اچھی عادت تھی۔ کہ وہ سلام میں ہمیشہ پہل کرتے تھے جبکہ مریم نے انہیں دیکھتے ہی راستہ بدل لینے کی عادی تھی اب بھی ان کے سلام کے جواب میں اس نے چہرے پر رسمی سے مسکراہٹ سجا کر "وعلیکم السلام" کہا اور آگے کی سمت بڑھ گئی۔ ڈاکٹر عادل کا آج کل کسی نئی میڈیکل آفیسر کے ساتھ زبردست افیئر چل رہا تھا اور نگہت کے پاس اس افیئر کی لمحہ بہ لمحہ رپورٹ ہوتی تھی۔ جس طرح وہ تفصیل سے مریم کو یہ سب بتاتی تھی اس سے تو ایسا لگتا تھا جیسے ڈاکٹر عادل کا افیئر خود اس کے ساتھ چل رہا ہے، مریم ڈاکٹر عادل کو نظر انداز کرتے ہوئے سرجن مرتضیٰ کے کیبن کی سمت چل دی۔ کیبن کے قریب پہنچ کر اس نے گہری سانس بھری اور پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ خنکی کا ایک لطیف احساس اس کے رگ وپے میں اتر آیا۔ کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا مگر کھڑکیاں کھلی تھیں جن سے ٹھنڈی ہوا سبج سبج قدم اٹھاتی اندر آ رہی تھی۔ موسم کچھ ابر آلود ہو چلا تھا۔ اسے وہاں بیٹھے ابھی پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک نسوانی ہنسی کی مترنم آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ اس نے حیرانی سے چہار جانب دیکھا مگر کمرے میں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ ابھی وہ اس ہنسی کو اپنا وہم سمجھ کر ذہن سے جھٹکنے ہی والی تھی کہ ایک بار پھر وہی ہنسی سنائی دی۔ چند لمحوں بعد ریٹائرنگ روم کا دروازہ کھلا اور سرجن مرتضیٰ باہر آئے گرے ڈریس پینٹ کے ساتھ لائٹ میرون رنگ کی شرٹ پہنے اپنے اونچے لمبے سراپے کے ساتھ وہ بہت جچ رہے تھے۔ بلا شبہ وہ نہایت شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ سرجن تھے مگر کسی بھی ڈاکٹر سے کم عمر دکھائی دیتے تھے۔

"السلام علیکم سر! کیسے ہیں آپ؟" مریم نے مسکرا کر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے انہیں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام...... الحمد للہ خیریت سے ہیں اور آپ؟" وہ اپنے مخصوص شفیق سے انداز سے دریافت کرنے لگے۔ پیرا میڈیکل اسٹاف سے لے کر آرتھوپیڈک وارڈ کے تمام چھوٹے بڑے ڈاکٹرز ان کے رعب میں تھے مگر یہ رعب و دبدبہ کبھی ان کے لہجے پر حاوی نہیں ہوا تھا۔

"ڈاکٹر نائلہ نے عباس رضوی کی فائل بھجوائی ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ عباس صاحب کی ڈسچارج شیٹ پر سائن کر دیجئے۔"

اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل کو ان کی میز پر رکھتے ہوئے ڈاکٹر نائلہ کا پیغام دیا۔ جب سے اختر کو ڈانٹ پڑی تھی سب ہی لوگ محتاط ہو گئے تھے۔

"اتنی جلدی میں کیوں ہیں مریم! اطمینان سے بیٹھ کر بات کیجئے۔"



سرجن مرتضیٰ نے ریوالونگ چیئر پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ تو گئی مگر ریٹائرنگ روم کے ادھ کھلے دروازے سے نظریں ہٹا نہیں پائی تھی۔ اس نے واضح طور پر سفید کپڑوں میں ملبوس کسی لڑکی کی جھلک دیکھی تھی۔ سرجن مرتضیٰ نے عباس رضوی کی فائل چیک کرنا شروع کر دی تھی جو بے حد تسلی بخش تھی۔

"مریم!" سرجن مرتضیٰ نے میز کی سطح کو انگلی سے بجا کر اسے متوجہ کیا۔ اس کا سارا دھیان ریٹائرنگ روم کی جانب تھا۔

"آر یو اوکے......؟" وہ اپنے مشفق انداز میں پوچھنے لگے۔

"وہ...... وہاں کوئی ہے۔" اس نے عجب بے یقینی میں گھر کر کہا۔ کیونکہ سرجن مرتضیٰ اس بات کو مائنڈ بھی کر سکتے تھے۔

"وہ نگہت ہے...... میرے ریٹائرنگ روم کا کارپٹ بہت گرد آلود ہو رہا تھا۔ وہ کارپٹ صاف کر رہی ہے۔"

سرجن مرتضیٰ نے مریم کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے وضاحت دی۔

"نگہت...... نگہت...... بس کرو بھئی، بہت ہو چکی ڈسٹنگ باہر آؤ۔" انہوں نے آواز دے کر اسے باہر بلایا۔

نگہت باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں سچ مچ جھاڑو تھی۔ وہ ویکیوم سے صفائی کرنے کے بجائے جھاڑو سے صفائی کر رہی تھی۔

"سرجن مرتضیٰ نے کبھی کسی خاکروب سے اپنے کمرے کی صفائی نہیں کروائی کیونکہ انہیں تو روم میں نماز بھی پڑھنی ہوتی ہے اور ان کے روم میں قرآن کریم بھی رکھا ہے اس لیے یہاں کی صفائی ہمیشہ میں کرتی ہوں۔"

مریم کے استفسار کی نوبت بھی نہیں آئی تھی اور نگہت خود ہی صفائی دینا شروع ہو گئی تھی۔ مریم نے دل ہی دل میں خود کو ڈانٹا۔

سرجن مرتضیٰ نے فائل پر سائن کیے تو وہ ڈاکٹر نائلہ کے کیبن کی طرف چلی آئی ریسیپشن کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے ڈاکٹر عادل کو تزئین کے پاس کھڑے دیکھا۔ اس نے نگہت کے علاوہ ڈاکٹر عادل کے بارے میں کبھی کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی، بلکہ نگہت سے بھی دو ایک بار ہی بات ہوئی تھی اور ان دو ایک بار کی بات نے ہی مریم کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ روبینہ سے مریم کی ایسی خاص دوستی نہیں تھی مگر تزئین کو سمجھانا وہ اپنا فرض سمجھتی تھی۔ اس نے سوچا تھا ہاسٹل جا کر تزئین سے تفصیلی بات کرے گی مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ وہ ہاسٹل واپس پہنچی تو تزئین الماری میں منہ گھسائے نجانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ وہ مریم سے کچھ دیر پہلے ہی ہاسٹل واپس آئی تھی۔

"کیا کر رہی ہو؟" مریم نے بستر پر بیٹھ کر جوتے کے تسمے کھولتے ہوئے سرسری لہجے میں دریافت

کیا۔

تزئین کو شاید مریم کی کمرے میں آمد کے بارے میں پتا نہیں چلا تھا اس لیے وہ کچھ چونک سی گئی۔

"یار میں گھر جا رہی ہوں، امی کا فون آیا تھا وہ مجھے بلا رہی ہیں۔" تزئین نے لمحہ بھر کے لیے الماری میں سے منہ نکال کر جواب دیا۔

"خیریت؟" تزئین کے گھر سے ایسے بلاوا آنا کچھ اچنبھے کی بات تھی۔

"میں نے خود فون ریسیو نہیں کیا۔ ریسپشن پہ شبیر بھائی تھے۔ انہوں نے پیغام نوٹ کر لیا تھا۔ مجھے بس یہی پتا چلا کہ وہ مجھے یاد فرما رہی ہیں۔"

وہ خاصے اکتائے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ جب سے اس کی امی نے اس کی بڑی بہن کی زبردستی شادی کی تھی۔ ان کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں طنز نمایاں ہوتا تھا۔

مریم اس کے ساتھ مل کر پیکنگ میں مدد کرنے لگی۔ اس کے چلے جانے کے بعد مریم نے یونیفارم تبدیل کیا اور کمرے میں بکھرا ہوا پھیلاوا سمیٹنے لگی۔ تزئین جا چکی تھی اور روبینہ سے یہ توقع رکھنا ہی فضول تھا کہ وہ کمرے کی صفائی وغیرہ جیسے کسی کام کو ہاتھ لگائے گی۔ مریم نے پہلے بستر درست کیا پھر تزئین کے بستر کی طرف آ گئی۔ اس کو ٹھیک کرنے کے بعد روبینہ کا بیڈ کو درست کیا، تکیے کی پوزیشن درست کرتے ہوئے اسے ایک چمکیلی سی چیز نظر آئی۔ روبینہ کو اپنی رسٹ واچ تکیے کے نیچے رکھ کر سونے کی عادت تھی اسی لیے وہ اکثر اوقات اپنی رسٹ واچ لگانا ہی بھول جاتی تھی۔ مریم نے اس رسٹ واچ کو ہاتھ میں تھام لیا۔ اس قدر قیمتی رسٹ واچ کا روبینہ کے پاس ہونا کوئی حیران کن بات نہیں تھی۔ اس کے پاس اب ایسی بہت سی قیمتی اشیاء کا انبار رہنے لگا تھا اس کا حلقہ احباب بے حد وسیع تھا اور اسے ایسے شاندار گفٹس ملتے ہی رہتے تھے۔

مریم اس رسٹ واچ کو بے حد قیمتی خیال کرتے ہوئے میز پر رکھنے سے ہچکچا رہی تھی۔ اس نے کچھ سوچ کر روبینہ کی الماری کا دروازہ کھول لیا۔ رسٹ واچ رکھتے ہوئے اس کی نگاہ ایک چھوٹے سے پیکٹ پر پڑی۔ وہ اتنی احتیاط سے چھپا کر کپڑوں کی تہہ کے نیچے رکھا گیا تھا کہ مریم تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر خود کو اس پیکٹ کو دیکھنے سے روک نہیں پائی۔ اس پیکٹ کے اندر موجود چیز کو دیکھ کر مریم کو بے حد شاک لگا۔

"مخصوص گولیاں" تھیں جو آدھی استعمال کی جا چکی تھیں۔ ایک غیر شادی شدہ لڑکی کی الماری میں ان کی موجودگی نے مریم کے حواس گم کر دیے تھے۔

"کیا نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے؟" اس نے انتہائی تاسف میں گھر کر خود سے کہا۔ خود تزئین نے روبینہ کی منگنی والے جھوٹ کے بعد اسے بارہا نصیحت کرنے کی کوشش کی مگر روبینہ اس قدر خودسر ہو چکی تھی کہ اب نصیحتیں اس پر اثر نہیں کرتی تھیں۔ مریم اس سے کچھ بھی کہہ کر اپنے ہاتھوں اپنی ذلت کا سامان نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے وہ گولیاں دوبارہ اسی جگہ رکھ دیں اور الماری کو پہلے کی طرح بند کر دیا۔

"روبینہ بری لڑکی نہیں تھی۔ بدقسمتی سے اس کی دوستی بری لڑکیوں سے ہو گئی۔ اس کے گھر کے حالات بھی کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ وہ سہیلیوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر ساری حدیں پار کرتی چلی گئی۔"



تزئین کی واپسی پر جب مریم نے اسے اشاروں کنایوں میں یہ سب بتانے کی کوشش کی تو اس کے انداز میں حیرانی کی کوئی رمق نہیں تھی۔

"تم یہ سب باتیں پہلے سے جانتی تھیں؟" مریم نے مشکوک لہجے میں پوچھا تو تزئین نظریں چرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"ہم روبینہ کو سمجھا سکتے ہیں تزئین!" مریم نے موہوم سی امید میں گھر کے کہا۔

"کس کس کو سمجھاؤ گی اور پھر تمہاری بات سمجھے گا کون؟" تزئین نے دھیمے لہجے میں کہا۔ مریم ہکا بکا اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"کیا تزئین بھی روبینہ کی طرح......" اس سے زیادہ اس کا ذہن کچھ سوچنے کے قابل نہیں تھا۔

تزئین خاموشی سے اپنے بستر پر منہ لپیٹ کر پڑ گئی۔ تزئین کا انداز بہت حوصلہ شکن تھا۔ وہ جب سے گھر سے واپس آئی تھی عجب کشمکش کا شکار تھی ان کے پہلے سال کے امتحان بھی ہونے والے تھے۔ مریم ہر خیال کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے کتابوں میں خود کو گم کرنے کی سعی کرنے لگی۔

اگلے بہت سے دن امتحانات کی نذر ہو گئے۔ بہترین پرسنٹیج کے ساتھ مریم سیکنڈ ایئر میں پروموٹ کر دی گئی اس کے ساتھ ساتھ تزئین، روبینہ، ریٹا، لیزا، ستارہ وغیرہ بھی پروموٹ ہو کر پارٹ ٹو میں آئی تھی، حالانکہ بہت سی لڑکیاں پڑھائی اور کلاسز کے معاملے میں ریگولر نہیں تھیں اور یہی بات مریم کے لیے اچنبھے کا باعث تھی کہ جن لڑکیوں کے بارے میں قیاس کیا جاتا تھا کہ وہ ڈس کوالیفائی کر دی جائیں گی وہ اتنے اچھے مارجن سے پاس کیسے ہو گئیں۔

سال دوم ابتدا سے ہی مشکل تھا۔ کورس میں جہاں میڈیسن، سرجری اور اخلاقیات کے مضامین کا اضافہ ہوا، وہاں وارڈ شفٹس کا دورانیہ بھی بڑھ گیا تھا، سرخ Sash اور سفید دوپٹے کے ساتھ مریم خود کو پہلے سے زیادہ پر اعتماد ذمہ دار محسوس کرتی تھی۔ سیکنڈ ایئر کی کلاسز شروع ہوتے ہی روبینہ نے اپنا روم تبدیل کر لیا تھا۔ اس لیے مریم نے بھی سکون کا سانس لیا کیونکہ روبینہ کی موجودگی اسے الجھن میں مبتلا کرنے لگی تھی۔ دوسری طرف تزئین بھی پہلے کی نسبت کافی ذمہ دار ہوتی جا رہی تھی۔ ہر وقت امیر ہونے کے خواب دیکھنے کے بجائے وہ اب زیادہ تر خاموش رہنے لگی تھی۔

☆　☆　☆

اس روز اس کی ڈیوٹی ای این ٹی وارڈ میں تھی۔ شدید سردی کی لہر نے پورے شہر کو ناک کان اور گلے کے امراض میں مبتلا کر دیا تھا۔ جس روز مریم کی شفٹ تھی، اسی روز تھائی لینڈ سے آئے ہوئے جونیئر ڈاکٹرز کی ایک ٹیم نے بھی فری کیمپ لگا رکھا تھا، اس وجہ سے بھی آؤٹ ڈور مریضوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ مریم کی شفٹ دو سے آٹھ بجے والی تھی۔ لنچ آورز کے بعد ایک چھ سال کے بچے کی ناک کی ہڈی کی میجر سرجری تھی۔ یہ اپنی نوعیت کا منفرد سا آپریشن تھا جس میں کل ملا کر چھ جونیئر اور سینئر سرجن اپنی اپنی مہارت کا مظاہرہ کرنے والے تھے۔ مریم اس آپریشن کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی کیونکہ اس کی ڈیوٹی ای این ٹی کی بجائے وارڈ میں تھی،

مگر اس آپریشن کی وجہ سے ای این ٹی وارڈ کا سارا عملہ ہی متحرک تھا۔ سب لوگ عام دنوں کے مقابلے میں زیادہ الرٹ نظر آ رہے تھے اور مریم بھی ان سب میں شامل تھی۔

لنچ آورز کے بعد چائے کا دور چل رہا تھا وہ ریسپشن پر شبیر بھائی اور شائستہ کے پاس آ گئی۔ ان دونوں سے اس کی کافی اچھی علیک سلیک تھی۔ آیا اماں نے ابھی ان کے سامنے چائے کے کپ رکھے تھے کہ سرجن داؤد آتے دکھائی دیے۔

''سسٹر! ڈاکٹر عادل کا نمبر ملائیے۔'' انہوں نے ثروت کی طرف دیکھ کر بعجلت کہا تھا۔ ثروت ٹیلی فون سیٹ سے چپکی بیٹھی تھی۔

''ڈاکٹر عادل از ناٹ آن ڈیوٹی سر'' ثروت نے نمبر ملانے کے بعد بتایا تھا۔

''ہاں میں جانتا ہوں اس کا آج آف ہے مگر پیشنٹ اس کے کسی دوست کا بیٹا ہے اور میں نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ وارڈ کا وزٹ ضرور کرلے وہاں بلڈ بینک میں او نیگیٹو نہیں ہے اور یہاں بچے کی ماں نے واویلا مچا رکھا ہے عادل ہی سنبھال سکتا ہے ان لوگوں کو، آپ پلیز عادل کے سیل کا نمبر ملائیے۔''

سرجن داؤد نے اکتا کر کہا۔ وہ اس وارڈ کے جونیئر موسٹ سرجن تھے۔

''مجھے ایک گلاس پانی دیجئے۔'' سرجن داؤد نے مریم سے کہا۔ مریم نے فوراً گلاس میں پانی انڈیل کر انہیں تھمایا۔

''ڈاکٹر عادل از ناٹ ریسپانڈنگ سر۔'' ثروت نے مایوسی سے سرہلاتے ہوئے کہا۔ سرجن داؤد کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔ انہیں ڈاکٹر عادل کی غیر ذمہ داری پہ غصہ آ رہا تھا۔ مریم ان کے چہرے کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر ہونٹ بھینچتے ہوئے انہوں نے شہادت کی انگلی سے اپنی کنپٹی کو چھوا، جیسے کسی فیصلے پر پہنچ چکے ہوں۔

''ڈاکٹر شیریں جبار کا نمبر ملائیے۔'' انہوں نے ایک مشہور گائناکولوجسٹ کا نام لیا۔ ثروت کے پاس موجود انڈیکس میں ان کا نمبر نہیں تھا۔ ڈاکٹر داؤد نے اپنی جیب سے اپنا سیل فون نکال کر ثروت کو ڈاکٹر شیریں کا نمبر نوٹ کروایا۔

''ڈاکٹر شیریں از آن لائن سر!'' ثروت نے فون ملتے ہی ریسیور ان کو دیا۔

''یس ڈاکٹر! میں سرجن داؤد، ایک پرابلم ہے۔'' وہ لمحہ بھر کے لیے دوسری طرف کی بات سننے کے لیے رکے۔

''میری وائف کا بلڈ او نیگیٹو ہے مگر دو ماہ قبل اس کا مس کیریج ہوا تھا اب وہ بالکل نارمل ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ کیا میری وائف بلڈ ڈونیٹ کرسکتی ہے۔ آپ کی پیشنٹ ہے، اس لیے پوچھ رہا ہوں۔'' سرجن داؤد نے ایک بار پھر توقف کیا۔

پھر تھوڑی دیر ڈاکٹر شیریں کی بات سننے کے بعد بولے۔

''او کے ڈاکٹر ظاہر ہے، آپ زیادہ بہتر سمجھتی ہیں۔ تھینکس۔'' انہوں نے الجھن بھرے انداز میں



فون بند کیا پھر جھنجھلا کر بولے۔

''عورتوں کو کوئی بات سمجھانا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔''

''سرجن آپ کو OT میں بلا رہے ہیں۔ صورتحال مزید خراب ہو رہی ہے۔'' وارڈ سسٹر ارم نے آ کر کہا۔ وہ چند لمحے قبل آپریشن تھیٹر سے نکلی تھی۔

''ڈاکٹر عادل کا نمبر ابھی بھی رسپانس نہیں کر رہا؟'' انہوں نے ثروت سے استفسار کیا۔ ثروت کا جواب نفی میں تھا۔

''او کے...... اب مجھے اپنا کام کرنا ہے...... آپ میرے گھر کا نمبر ملائیے اور میری وائف سے کہیے آئی وانٹ ٹو سی ہر ان دی ہاسپٹل رائٹ ناؤ۔''

وہ حکمیہ انداز میں کہتے ہوئے آپریشن تھیٹر کی سمت چل دیے۔ مریم اور ثروت نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

''یار! سرجن داؤد کیسے خبطی آدمی ہیں۔ میں ان کی وائف سے مل چکی ہوں...... وہ تو خود اتنی ویک ہیں، وہ کیسے بلڈ ڈونیٹ کریں گی۔'' شائستہ اس دوران پہلی مرتبہ بولی۔ مریم کسی بھی رائے کا اظہار کیے بغیر ای این ٹی لیب کی سمت چل دی۔ وہاں سخاوت پہلے سے کسی کا بلڈ گروپ چیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی دوران ایک اکیس بائیس سال کا لڑکا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا رنگ گندمی تھا اور اس کے سیاہ سلکی بال کندھوں تک آ رہے تھے۔ میلی سی ٹائٹ جینز کے ساتھ وہ سفید اور سیاہ لائننگ والی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی دائیں کلائی میں لیدر کی موٹی سی بریسلٹ تھی، جبکہ بائیں کلائی میں قیمتی سنہری ڈائل والی رسٹ واچ تھی۔ اس شاندار قد کاٹھ والے لڑکے کی شخصیت کی سب سے مضحکہ خیز چیز اس کے نچلے ہونٹ اور ٹھوڑی کے عین درمیان میں موجود بالوں کا وہ ننھا سا گچھا تھا جسے داڑھی کہنا داڑھی کی توہین تھی۔

''ہائے...... میں سمیع مرتضیٰ ہوں...... مجھے عادل بھائی نے بھیجا ہے۔'' اس نے مریم کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

☆ ☆ ☆

''تم میری بات غور سے کیوں نہیں سن رہیں؟''

مریم نے چائے کا خالی مگ گھاس پر رکھتے ہوئے مصنوعی غصے سے سوال کیا۔ تزئین جواب دینے کے بجائے مسلسل گھاس نوچنے میں مصروف رہی۔ فضا میں ٹھیک ٹھاک خنکی تھی مگر تزئین کے اصرار پر وہ چائے پینے کے لیے لان میں آ بیٹھی تھی۔ ساڑھے دس کے قریب کا ٹائم تھا مگر گھاس ابھی سے شبنمی ہو رہی تھی۔ مریم نے اونی شال اوڑھ رکھی تھی مگر تزئین کاٹن کا سوٹ پہنے، ڈوپٹے کو ایک کندھے پر ڈالے دنیا جہان سے بے خبر گھاس کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

''تم میری بات سن بھی رہی تھیں یا نہیں۔'' مریم اب کی بار منہ پھلا کر بولی۔ کبھی کبھی اسے تزئین کی اس مست ملنگ حالت پر تشویش ہونے لگتی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ دن کے بارہ گھنٹے اسی حالت میں گزارتی تھی مگر

کبھی کبھی اچانک اس پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی کہ وہ اردگرد سے بالکل ہی بے نیاز ہو جاتی، ایسے میں مریم کو اسے اس کی اصل حالت میں واپس لانے کے لیے بہت جتن کرنا پڑتے۔ مریم نے دو ایک بار اس سے پوچھا تھا کہ وہ کیوں پریشان ہے، مگر اس نے ہنس کر بات ٹال دی پھر مریم نے بھی مزید کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔

''اے بی بی! کہاں گم ہو؟'' وہ اس کے جھکے سر پر چپت رسید کرتے ہوئے بولی

''میں یہیں ہوں اور تمہاری بات سن رہی ہوں۔ تم یہ کہہ رہی تھیں کہ......'' تزئین کو مریم کی بتائی ہوئی بات کا اصل متن یاد کرنے میں کچھ توقف کرنا پڑا۔

''ہاں، تم یہ کہہ رہی تھیں کہ سرجن داؤد بہت اچھے ہیں۔ وہ دراصل انسانی روپ میں فرشتہ ہیں اور تم ان کے جذبہ ایثار سے بہت متاثر ہوئی ہو۔''

''جی نہیں...... بات فرشتے کی دریافت سے بہت آگے نکل گئی تھی۔ میں تمھیں یہ بتا رہی تھی کہ......''

''مجھے یاد ہے مریم! تم یہ بتا رہی تھیں کہ تمہارا بھی دل چاہا کہ اگر تمہارا بلڈ گروپ سیم ہوتا تو تم فوراً سے پیشتر بلڈ ڈونیٹ کر دیتیں۔'' تزئین اس کی بات کاٹ کر بولی تو مریم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری۔

''ہاں بالکل...... قسم سے میرا اتنا دل چاہ رہا تھا کہ میں بھی اس کارِ خیر میں حصہ لے سکتی۔ سرجن داؤد کے جذبہ ایثار نے مجھے حقیقتاً بہت متاثر کیا مریم کے ذہن میں پھر سے ساری کارروائی متحرک ہوئی تھی۔ وہ عام طور سے اتنی تفصیل سے بات کرنے کی عادی نہیں تھی مگر آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ تمام تر جزئیات کے ساتھ تزئین کو ہر بات بتائے۔''

''تم سچ مچ پاگل ہو مریم!'' تزئین اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولی پھر اس کی خاموشی کا فائدہ اٹھا کر مزید گویا ہوئی۔

''اس فیلڈ میں جذباتی ہو کر کام کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہاں ہر روز سینکڑوں ایسے مریض آتے ہیں جنھیں خون کی ضرورت ہوتی ہے تو کیا سب ڈاکٹرز اپنا خون دینا شروع کر دیں یا پھر پیرا میڈیکل اسٹاف اس جہاد میں حصہ لینے لگے۔ میرا ذاتی......''

''تم خاموش رہو تو بہتر ہے اور جس چیز کو تم جذباتیت کہہ رہی ہو نا اس چیز کو میری زبان میں انسانی ہمدردی کہتے ہیں۔''

مریم اس کی بات کاٹ کر بولی۔ تزئین مسکرا دی پھر شرارتی انداز میں اسے دیکھ کر بولی۔

''تم سرجن داؤد سے زیادہ ہی امپریس نہیں ہوتی جا رہیں۔ ان کے خلاف کہی گئی کوئی بات تمھیں اتنی بری لگتی ہے کہ تمہارا چہرا ہی لٹک جاتا ہے۔ خیر تو ہے؟''

مریم اس کی پشت پر دھپ رسید کرتے ہوئے بولی۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی برا آدمی بھی بلڈ ڈونیٹ کرے تو تم اس کی بھی عزت کرنے لگو گی اور عزت کروانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان خون دینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔''



تزئین ابھی بھی تنگ کرنے کے موڈ میں تھی مگر اب کی بار مریم سکرا دی۔

''مجھے ان سب باتوں کا نہیں پتا مگر مجھے ایسے لوگ اچھے لگتے ہیں جو انسانی ہمدردی کے تحت ہی سہی ایثار کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ سمیع مرتضیٰ کی ہی مثال لے لو۔ میں عام حالات میں اس لڑکے کو دیکھتی تو وہ مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا، مگر اس کا یہ عمل مجھے اتنا اچھا لگا کہ وہ لڑکا میری نظر میں خود بخود اچھا ہو گیا۔''

مریم مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ تزئین کو ساری گفتگو میں شاید پہلی بار دلچسپی محسوس ہوئی۔

''اچھا...... انٹرسٹنگ...... ہائی داوے سمیع مرتضیٰ میں ایسی کیا برائی تھی کہ وہ تمھیں عام حالات میں اچھا نہ لگتا؟'' تزئین متجسس ہوئی۔

''استغفر اللہ...... میں نے یہ نہیں کہا کہ اس لڑکے میں کوئی برائی تھی...... بس مجھے اس طرح کے لڑکے اچھے نہیں لگتے۔ اس لڑکے کا قد کاٹھ تو اچھا تھا۔ رنگ انتہائی گورا۔ کندھوں تک آتے سلکی بال اور سب سے دلچسپ چیز اس کی ٹھوڑی پر موجود داڑھی جیسی کوئی چیز تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے پینسل سے دائرہ بنا دیا ہے۔ پہلے میں سمجھی کہ کسی پرائیویٹ روم کا وزیٹر ہے مگر جب اس نے بتایا کہ وہ بلڈ ڈونیشن کے لیے آیا ہے تو مجھے بہت ہی حیرانی ہوئی۔''

مریم نے لحہ بھر کا توقف کیا پھر تزئین کی رائے کا انتظار کیے بغیر بولی۔

''ایک مزے کی بات بتاؤں اس کے ہاتھ بالکل لڑکیوں جیسے تھے۔ لمبے اور نازک سے جب میں نے اس کے ہاتھ پر ڈرپ پن وغیرہ سیٹ کی تب ہی دیکھا تھا۔ اس نے انگلیوں میں سنہری اور سیاہ رنگز پہن رکھے تھے۔ کلائی میں بریسلٹ بھی تھا۔''

مریم بات کرتے کرتے ذرا کی ذرا رکی۔ تحیر سے تزئین کی جانب دیکھا جو ٹکٹکی باندھے مسکراتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''تم مجھے گھور کیوں رہی ہو؟'' اس نے آنکھیں سکیڑ کر سوال کیا۔

تزئین ایک بار پھر مسکرائی۔

''میں تمھیں گھور نہیں رہی، بلکہ بغور تمہاری باتیں سن رہی ہوں۔ تم نے پہلے تو کبھی کسی لڑکے کے بارے میں اتنی تفصیل سے بات نہیں کی۔''

وہ ملائمت سے ہنستے ہوئے بولی۔

''لڑکا؟ وہ بالکل بھی لڑکا نہیں تھا۔ یقین کرو اگر اس کے چہرے پر ٹھوڑی کے اوپر داڑھی کے بقایاجات موجود نہ ہوتے تو میں اسے ''مسٹر سمیع'' کے بجائے ''مس سمیع'' کہہ کر مخاطب کرتی۔''

مریم کے اس طرح کہنے پر تزئین خوب ہنسی۔

''تم نے اس لڑکے کا فون نمبر لیا؟'' وہ ہنستے ہوئے پوچھنے لگی۔

''ارے...... میں کیوں لیتی اس کا فون نمبر۔'' مریم نے اسے گھورا۔

''یار! میرے لیے لے لیتیں۔ میرا کوئی چانس بن جاتا۔'' وہ مصنوعی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے

بولی۔ مریم نے اسے ایک اور دھپ رسید کی۔ تزئین کو اس طرح کی اوٹ پٹانگ باتیں کرنے کا بہت شوق تھا۔

''اب دوبارہ کہاں ملے گا ایسا اسٹائلش لڑکا! جاؤ مریم تم تو بالکل بھی کام کی لڑکی نہیں ہو۔''

وہ مسلسل بول رہی تھی۔

''ڈاکٹر عادل رحیم کے ریفرنس سے آیا تھا۔ تم ان سے اس لڑکے کا کونٹیکٹ نمبر لے لینا۔''

مریم نے تجویز دی۔

''آہاں...... پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے یار! ان سے تو میں خود ہی لے لوں گی۔''

تزئین مصنوعی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی، مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ مریم ابھی مزید کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اسے پیون اپنی سمت آتا دکھائی دیا۔

''تزئین باجی! تہاڈا فون اے'' (تزئین باجی آپ کا فون ہے) اس نے قریب آ کر اطلاع دی تھی۔

''کس کا ہے؟'' تزئین اطمینان سے پوچھا۔

''گوجرانوالہ توں تہاڈی ماں جی دا۔'' (گوجرانوالہ سے آپ کی امی کا)

''انہیں کہہ دو میں ہاسٹل میں نہیں ہوں۔ میری نائٹ شفٹ ہے آج۔'' تزئین نے سابقہ پرسکون انداز میں کہا۔ پیون کو شاید ایسے احکامات آگے پہنچانے کی بہت پریکٹس تھی، اس لیے وہ خاموشی سے واپس چل دیا جبکہ مریم نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

''ابھی کوئی سوال مت پوچھنا مریم! میں تمھیں اپنے رویے کی وجہ بتا دوں گی۔'' وہ سر جھکائے ہوئے کہہ رہی تھی۔ مریم خاموش رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

''اپنے ہاتھ کو سیدھا کر لیں اور انگلیوں کو پھیلا لیں...... شاباش...... شاباش درد بالکل بھی نہیں ہوتا۔''

کسی نے نرم لہجے میں بہت محبت سے اس کے آس پاس سرگوشی کی تھی۔ اس نے گہری سانس بھر کر اپنا بایاں ہاتھ نظروں کے سامنے کیا جس کی پشت پر بینڈ یج ہوئی تھی۔ وہ عجیب سی نظروں سے اپنے ہاتھ کی پشت کو تک رہا تھا، پھر دھیرے دھیرے وہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بائیں ہاتھ کی انگلیوں اور پشت پر پھیرنے لگا۔ کمرے کے نیم تاریک مگر گرم سے ماحول میں بستر پر چت لیٹا وہ اپنے آپ کو ایک غیر مرئی طاقت کے زیر اثر محسوس ہو رہا تھا، ایک میٹھا سا لمس ابھی بھی اسکے ہاتھ کی پشت پر تھا۔

سفید دوپٹے کے ہالے میں چھپا وہ چاند چہرہ، چھیڑ چھاڑ کرتی براؤن زلفیں پھر اس کا وہ اپنائیت بھرا انداز، نہایت نفاست اور محبت سے ڈرپ پن سیٹ کرنا، اسے ننھا سا بچہ سمجھتے ہوئے محبت بھری تلقین کرنا۔ سمیع تب سے اب تک کچھ بھی بھلا نہیں پا رہا تھا، حالانکہ ہاسپٹل سے واپس آئے ہوئے اسے کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔

...وٹین کے مطابق پاپا سے ملنے آیا تھا۔ پاپا اپنے کیبن میں موجود نہیں تھے۔ وہ اپنی پرسنل ڈائری پاپا



کی میز پر رکھ کر عادل بھائی سے ملنے چلا آیا۔ عادل بھائی اس کے پاپا کے کولیگ تھے اور اس سے بہت محبت سے ملتے تھے، حالانکہ پاپا نے اسے منع کیا تھا کہ وہ ان سے زیادہ نہ ملا کرے پاپا، عادل بھائی کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے، مگر پھر بھی وہ ان کی نصیحت کو نظر انداز کرتے ہوئے اکثر و بیشتر عادل بھائی سے مل لیتا تھا۔ وہ اس کی ممی کے کزن بھی تھے۔ اور سڈنی نہ جانے والے معاملے میں اور پھر بعد میں اپنے پسندیدہ سبجیکٹ کے ساتھ اولیول کرنے کے سلسلے میں انہوں نے ہی اس کی ممی کو کنوینس کیا تھا۔ عادل بھائی اپنے کیبن میں کافی پریشان بیٹھے تھے۔

''یار! او نیگیٹو کی ضرورت ہے۔ بلڈ بنک میں بھی نہیں ہے۔ کیا کروں موبائل بھی آف کر کے گھر بھول آیا ہوں۔ پریشانی ہو رہی ہے۔ داؤد سے وعدہ کیا تھا کہ میں ارینج کر دوں گا۔ وہ بندہ آیا ہی نہیں یار...... حد ہے غیر ذمہ داری کی۔''

وہ مسلسل فون ملانے، جھنجلانے اور اس سے بات کرنے میں مصروف تھے۔

''عادل بھائی! میرا گروپ او نیگیٹو ہے۔'' اس نے اپنی طرف سے ان کی الجھن دور کرنے کے لیے خوشخبری دینے والے انداز میں کہا تھا، مگر وہ مزید جھنجلا گئے۔

''ارے یار! کیوں سرجن مرتضٰی سے ڈانٹ پڑوانا چاہتے ہو مجھے۔ میں تو ویسے بھی ان کی گڈ بکس میں نہیں ہوں۔''

''ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا عادل بھائی۔'' وہ ان کے انداز پر مسکرا کر بولا۔ ان کے بتائے ہوئے وارڈ کی سمت آ گیا اور اسی وارڈ میں اسے وہ پری وش نظر آئی جو ابھی مکمل طور پر اس کے حواسوں پر سوار تھی۔

اس کی عمر ابھی بمشکل انیس سال تھی مگر اپنے اونچے قد کے باعث وہ عمر سے کچھ بڑا دکھائی دیتا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ دھان پان سی حسینہ اسے ایسے ٹریٹ کر رہی تھی جیسے وہ کوئی پانچ سالہ بچہ ہو۔

''ان کا نام کیا ہے؟'' اس نے اس لڑکی کے روم سے چلے جانے کے بعد پوچھا۔

''سسٹر مریم!'' وہ ادھیڑ عمر کمپاؤنڈر ناک چڑھا کر بولا۔

دل ہی دل میں وہ خود بھی لفظ ''سسٹر'' پر چڑ سا گیا۔

''کسی نرس سے محبت کرنے میں یہ سب سے نقصان والی بات ہے۔''

دوبارہ سے یہی بات یاد آنے پر وہ اونچی آواز میں بڑبڑایا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایکسرسائز کر رہا تھا۔ کیبل کلچر سے بہت بری طرح متاثر سمیع مرتضٰی پہلی نظر کی محبت کا شکار ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

''میں کوئی منفرد اور مختلف سی چیز خریدنا چاہتی ہوں۔''

تزئین نے بلا مبالغہ پانچویں مرتبہ یہی ایک جملہ دہرایا تھا۔ مریم نے اکتا کر اس کی جانب دیکھا، مگر وہ اثر لیے بغیر ایک جانب ترتیب سے ہینگ کی ہوئی شرٹس دیکھنے لگی۔

''وہ والی شرٹ دکھائیے۔'' ادھر ادھر نظر دوڑاتے شاید اسے کوئی شرٹ پسند آ ہی گئی تھی۔ سیلز مین نے

پھرتی سے شرٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔

''مریم! یہ کیسی ہے۔ سانولے رنگ پر سوٹ کرے گی یا نہیں؟''

وہ شرٹ کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے مریم سے رائے لے رہی تھی۔ مریم کو شرٹ تو پسند آئی تھی مگر تزئین کے سوال کا جواب نہیں تھا اس کے پاس۔ اس نے کبھی اس طرح خریداری نہیں کی تھی۔ وہ گورے اور سانولے کی تخصیص کے بغیر خریداری کرنے کی عادی تھی۔ ویسے بھی وہ جانتی تھی کہ اس کے مشورے کا تزئین پر کوئی اثر نہیں ہونے والا۔ گزشتہ ڈیڑھ گھنٹے سے وہ لبرٹی مارکیٹ کے مختلف شاپنگ سنٹرز میں گھوم رہی تھیں مگر تزئین کو کوئی چیز ہی پسند نہیں آ رہی تھی۔ پہلے انہوں نے پرفیومز دیکھے تھے، پھر رسٹ واچ اس کے بعد کتابوں کی باری آئی مگر کوئی ''منفرد'' اور مختلف چیز ابھی بھی نہیں ملی تھی۔

''اس کی پرائس کیا ہے؟'' تزئین نے شرٹ کو فائنل کر لیا تھا۔

''ریزن ایبل پرائس ہے میم؟ آپ نے ایک زبردست پیس پسند کیا ہے۔ کوالٹی میں شاندار اور قیمت میں بے حد کم۔ میں پیک کروا دیتا ہوں۔'' وہ قیمت بتائے بغیر شرٹ کو پیکنگ میں پارسل کرنے لگا۔

''پہلے قیمت تو بتا دیجئے؟'' تزئین نے سیلز مین کے خوشامدانہ رویے کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''اونلی نائن ہنڈرڈ میم۔'' وہ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا جبکہ تزئین کو چند لمحوں کے لیے چپ لگ گئی۔

''ارے یہ بہت سستی ہے۔ کوئی مہنگی چیز دکھایئے جناب۔''

تزئین نے منہ بنا کر کہا، بلاشبہ قیمت سن کر اسے مایوسی ہوئی تھی۔ شرٹ اسے پسند آئی تھی مگر آؤٹ آف بجٹ تھی۔ پہلے اسے پرفیوم پسند آیا تھا اور اس کی قیمت اس شرٹ سے بھی زیادہ تھی۔ وہ پہلے ہی غصے میں بھری ہوئی تھی شرٹ کی قیمت سن کر مزید غصے میں آ گئی۔

''اس شرٹ کی خوبی کیا ہے بائی داوے..... اس کو پہن کر انسان ٹام کروز لگنے لگتا ہے؟''

وہ تنک کر بولی مگر سیلز مین نے اس کے لہجے کی سختی کا برا مانے بغیر ایک اور شرٹ اس کے سامنے رکھی۔

''آپ۔'' یہ دیکھ لیجئے یہ اس سیزن کا موسٹ فیورٹ کلر ہے۔ اونلی ایٹ ہنڈرڈ روپیز۔

مگر وہ دونوں شرٹس تزئین کی جیب کے لیے ناقابل برداشت تھیں۔ وہ مایوسی سے ''تھینک یو'' کہہ کر اپنی ہی دھن میں مڑی اور پیچھے آنے والی لڑکی سے ٹکرا گئی۔

''آئی ایم سوری۔'' اس لڑکی نے کندھا سہلاتے ہوئے معذرت کی..... حالانکہ غلطی اس کی نہیں تھی۔ مریم نے بھی اس صورتحال سے اکتا کر لڑکی کی جانب دیکھا اور چونک سی گئی۔ وہ لڑکی بھی شاید مریم کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تم..... تم..... ہم پہلے بھی مل چکے ہیں نا۔ آئی تھنک ہم پی سی میں ملے تھے بسنت ایوننگ پر؟''

وہ لڑکی ذہن پر زور دیتے ہوئے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگی۔



''کیسا عجیب اتفاق ہے۔ میں نے سوچا تھا ہم دوبارہ کبھی نہیں ملیں گے۔'' اس کی بات پر مریم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''تمہارے گروپ کا عاطف لوگوں سے جھگڑا ہو گیا تھا نا۔ ان لوگوں کی تو بعد میں خوب بے عزتی ہوئی تھی اور پھر......''

''ہم پی سی میں نہیں ملے تھے۔ ہم کوچ میں ملے تھے، ایک بار۔'' مریم نے منمنا کر کہا۔ اس کا سارا زور ''ایک بار'' پر تھا۔ ماہین عرف ماہی کا اس قدر بے تکلف انداز اسے پہلی ملاقات میں بھی ہضم نہیں ہوا تھا اور اب بھی نہیں ہو رہا تھا۔

''او یس..... گڈ گاڈ..... مائی پور میموری..... یہ میرا بچپن کا پرابلم ہے شکل اور نام تو یاد رہ جاتی ہیں مگر واقعات بھول جاتی ہوں۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ تزئین بھی حیرت سے اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اتنی طرحدار اور ماڈرن لڑکی اس نے مریم کے حلقہ احباب میں ابھی تک نہیں دیکھی تھی۔

''یہ کون ہے؟ تمہاری فرینڈ؟ تم لوگ شاپنگ کر رہے ہو؟ اس شاپ سے کیا لینا ہے۔ یہاں تو خالصتاً جینٹس کلیکشن ہوتی ہے اچھا اچھا۔ اب سمجھی کسی فرینڈ کے لیے کچھ لینا ہوگا۔''

ماہین کا وہی انداز تھا۔ زیادہ بولنا اور کم سننا۔

''یہ تزئین ہے میری دوست۔ اس کو اپنے بہنوئی کے لیے گفٹ خریدنا تھا اسی لیے۔''

اس کے خاموش ہونے پر مریم جلدی سے بولی۔ مبادا وہ پھر سے بولنا شروع ہو جائے۔ اس کی بات سن کر ماہین نے ساری توجہ تزئین کی طرف کر لی۔

''ارے یار! یہ بھائی اور بہنوئی سب ایک سے ہوتے ہیں نخریلے اور مغرور ان کو گفٹ مشکل سے ہی پسند آتے ہیں۔ بائی داوے کیا خریدا تم لوگوں نے کچھ پسند آیا یا نہیں؟''

اس کا انداز بالکل بچپن کی سہیلیوں والا تھا۔ تزئین کی آنکھوں میں بھی تحیر تھا۔

''مے آئی ہیلپ یو اس طرف بہت اچھے کرسٹل پیسز ہوتے ہیں، اس طرف چلتے ہیں''

وہ خود ہی سوال کر کے خود ہی جواب دینے کے بعد آگے کی سمت بڑھی۔ مریم اور تزئین نے ایک دوسرے کی آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھا پھر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔ شاپنگ سنٹر کے بیسمنٹ میں اتر کر آگے کی جانب چلتے ہوئے ماہین اس سے شکوہ کرنے لگی۔

''تم نے مجھ سے کانٹیکٹ ہی نہیں کیا۔ میں نے تمہیں اپنا سیل نمبر دیا تھا نا۔ وہ تزئین تم کیا کرتی ہو مریم کی طرح ابھی پڑھ رہی ہو یا جاب کرتی ہو میری طرح؟''

ایک جگہ پر رکتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

''یہ میری کلاس فیلو ہے'' جواب ایک بار پھر مریم نے دیا۔ وہ تینوں اب گلاس شوکیس میں سجے کرسٹل کے ڈیکوریشن پیسز دیکھ رہی تھیں اس سیکشن میں حقیقتاً ایک سے ایک زبردست چیز موجود تھی۔ وہ مختلف چیزوں کو

دیکھتی وسراہتی آگے بڑھتی رہیں، مگر کچھ خریدنے کی ہمت تزئین میں نہیں تھی۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کے ساتھ بھی اس کا بڑی سی رقم والا پرائس ٹیگ چسپاں تھا، جبکہ ماہین ہر چیز خریدنے پر اصرار کر رہی تھی۔

''یہ باربی ڈول دیکھو، کس قدر کیوٹ ہے۔'' اس نے کرسٹل کی ایک نازک سی گڑیا کی طرف اشارہ کیا۔ اس گڑیا کا ہر نقش اور ہر عضو نہایت مہارت کے ساتھ تخلیق کیا گیا تھا، مگر اس گڑیا کے ساتھ لگا پرائس ٹیگ ان دونوں کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

''میں نے ثوبان کی برتھ ڈے پر یہیں سے گفٹ پسند کر کے دیا۔ آئی ایم شیور تمھارے بہنوئی کو یہ چیز بہت پسند آئے گی۔ ایکسکیوزمی اسے پیک کر دیجیے۔''

اس نے سیلز مین کو اشارہ کرتے ہوئے کہا، جبکہ تزئین نا نا کرتی رہ گئی۔

''کیوں پسند نہیں آیا؟ یار...... میرا مشورہ مانو تو لے لو بہت کیوٹ چیز ہے۔''

وہ لاپروائی سے بول رہی تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ تزئین کی ہچکچاہٹ کا اصل محرک کیا ہے۔

''نہیں یہ بات نہیں ہے پسند تو آیا ہے عادل کو بھی بہت پسند آئے گا۔ مگر دراصل۔''

تزئین کہتے کہتے پھر خاموش ہوگئی، جبکہ مریم حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگی اتنی دیر سے اس کے ساتھ بازار میں گھومتے ہوئے اندازہ ہی نہیں ہوسکا تھا کہ وہ اتنی دلجمعی سے کس کے لیے گفٹ خریدنا چاہ رہی ہے۔ ہاسٹل سے نکلنے سے پہلے اس نے مریم سے صرف یہ کہا تھا کہ وہ اپنے بہنوئی کے لیے کوئی گفٹ خریدنا چاہ رہی ہے۔ مریم کو حیرت تو ہوئی تھی کہ جس بہنوئی کو وہ ہمہ وقت ''گنجا بھالو'' اور ''بدصورت دیو'' کے نام سے پکارتی رہتی ہے آخر وہ اس قدر توجہ کا مرکز کیسے ہوگیا۔ اسے دکھ تو بہت ہوا مگر کچھ کہنے کی بجائے وہ ان دونوں کے ساتھ چلتی رہی پے منٹ کا مرحلہ کیسے طے ہوا اسے کچھ نہیں پتا تھا بس اس نے تزئین کو بیگ سے اپنی ساری جمع پونجی نکال کر گنتے ہوئے دیکھا تھا۔ شاپنگ سنٹر سے نکل کر وہ ماہین کے ساتھ ایک ریسٹورینٹ میں آگئیں۔ ماہین یا تو حقیقتاً بہت دوستانہ مزاج کی مالک تھی یا پھر آج وہ گھر سے بور ہو کر نکلی ہوئی تھی اسی لیے ان کے ساتھ اتنی فراغت سے وقت گزار رہی تھی۔ یہ عقدہ بھی بہرحال تھوڑی دیر بعد کھل ہی گیا

''میں نے اپنا موبائل آف کیا ہوا ہے۔ یار! محسن نے آج کل میری بہت جان کھائی ہوئی ہے۔ اسے شاید کسی عامل بابا نے کہہ دیا ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں تب ہی جب ملتا ہے، ایک ہی بات کہتا ہے ثوبان سے قطع تعلق کرلو۔ یار! بھلا میں کیوں ایسا کروں؟ ثوبان میری پہلی اور آخری محبت ہے اور پھر اتنا ڈیل آف لڑکا، میں پھٹیچر محسن کی وجہ سے تو نہیں چھوڑ سکتی نا۔ بس میں اسی سے چھپ کر گھر سے نکلی تھی وہ ڈرائنگ روم میں آیا بیٹھا تھا میں پچھلے دروازے سے نکل کر آگئی۔ موبائل بھی اسی لیے گھر پہ چھوڑ دیا کہ مجھے کانٹیکٹ نہ کر سکے۔''

وہ نہایت اطمینان سے تفصیل بتا رہی تھی۔ تزئین اور مریم خاموش بیٹھی رہیں۔

''میں تم لوگوں کو ڈراپ کر دیتی ہوں۔'' چائے پی کر اس نے ان دونوں کو آفر کی۔ شام نے رات کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ وہ دونوں بھی لوکل وین سے جانا نہیں چاہتی تھیں اور آٹو رکشہ پہ کافی پیسے خرچ ہو جاتے اسی



لیے ماہین کی آفر قبول کرلی گئی۔ مریم پیچھے بیٹھ گئی جبکہ تزئین نے اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ سنبھال لی۔ سفر کے دوران ہی فون نمبر کا تبادلہ ہوا۔ تزئین نے چند دن پہلے ہی موبائل خریدا تھا اس نے بھی اپنا نمبر ماہین کو دیا۔ اسے مریم کی طرح تزئین سے کوئی کوفت نہیں ہوئی تھی، بلکہ اسے وہ لڑکی کافی ملنسار اور خوش اخلاق لگی تھی۔

''تم دونوں یہاں رہتی ہو؟'' ان کی منزل پر پہنچ کر ماہین نے کسی قدر تحیر سے پوچھا حالانکہ وہ تزئین سے پوچھ کر ہی یہاں تک آئی تھی۔ مریم نے اس کے سوال پر ناک چڑھا کر اس کی جانب دیکھا۔ پہلی ملاقات میں اس نے واضح طور پر اسے بتایا تھا کہ وہ ہاسٹل میں رہتی ہے۔

''ہاں...... ہم یہیں رہتے ہیں۔ تمھیں اتنی حیرت کیوں ہو رہی ہے؟'' تزئین نے دروازہ کھولنے سے پہلے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''نہیں حیرت نہیں ہو رہی، ان فیکٹ میرے فادر اسی ہاسپٹل کے ایمپلائی ہیں۔ وہ آرتھوپیڈک سرجن ہیں۔ سرجن مرتضیٰ احسن نام تو سنا ہوگا؟''

وہ بہت سنجیدہ اور عجب لاتعلقی والے انداز میں کہہ رہی تھی جبکہ مریم اور تزئین نے حیرت سے اسے دیکھا۔ بلاشبہ وہ دونوں چونکی تھیں۔

''ڈاکٹر عادل تمھارے ماموں ہیں؟'' تزئین نے پوچھا۔ وہ متجسس نظر آ رہی تھی۔ ماہین نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر انہیں ہاتھ ہلا کر گاڑی آگے بڑھا لے گئی۔ تزئین نے مریم کی جانب دیکھا۔ شاید اس نئی اطلاع پر تبصرہ کرنا چاہ رہی تھی مگر مریم کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی دیکھ کر اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

☆ ☆ ☆

''سرجن مرتضیٰ آپ کو اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔'' وہ آڈیٹوریم سے نکل کر کوریڈور کی سمت جا رہی تھی جب وارڈ بوائے نے اسے پیغام دیا۔ اس کی آج سارے دن میں کوئی شفٹ نہیں تھی اس لیے اسے اس کال پر حیرت کے ساتھ ساتھ تشویش بھی ہوئی۔ وہ گزشتہ ایک ہفتے کی تمام شفٹس کو ذہن میں دہراتی اور قیاس آرائیاں کرتی سرجن مرتضیٰ کے کمرے کی سمت چل دی۔ اس نے کس مریض کو کس طرح ڈیل کیا تھا اور اس نے کیا غلطیاں کی تھیں۔ یاد کرنے پر بھی اسے کوئی قابل گرفت بات یاد نہیں آئی۔ وہ دل ہی دل میں دعا کرتی سرجن مرتضیٰ کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''یس سرجن! آپ نے مجھے بلایا تھا۔'' اس کے انداز میں عجلت اور تشویش نے سرجن مرتضیٰ کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

''آؤ بیٹھو مریم! جلدی میں ہو کیا؟ مجھے تم سے تفصیلی بات کرنی ہے۔'' وہ اپنا سنہری چشمہ آنکھوں سے اتارتے ہوئے بولے۔ مریم ابھی شش و پنج میں تھی کہ سرجن مرتضیٰ پھر بولے۔

''تم اگر جلدی میں ہو تو میں پھر بات کرلوں گا۔ آج میں سارا دن وارڈ میں ہوں۔ ٹیکساس سے جو ڈاکٹرز کی ٹیم آئی ہے جس نے فری ڈائبیٹک کیمپ لگایا ہوا ہے میں ان کی میزبانی کر رہا ہوں۔ اگر تم ابھی مصروف ہو تو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد آ جانا۔''

''نہیں سرجن......! اٹس او کے......آپ ابھی بات کر لیجئے۔'' ان کے لہجے نے اسے کسی قدر مطمئن کر دیا۔

''اچھا......تم بیٹھو تو سہی۔'' انہوں نے کرسی کی سمت اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ کر ان کی جانب دیکھنے لگی۔ لائٹ گرین شرٹ ان کے سراپے کو بے حد وقار بخش رہی تھی۔ انہوں نے اپنے سامنے پڑے کاغذات کو ترتیب سے رکھ کر چشمہ دوبارہ سے آنکھوں پر ٹکا لیا۔ ان کی کنپٹیوں پر چند ایک سفید بال نمودار ہو رہے تھے اور ان کے وقار میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔

''دراصل بات یہ ہے کہ میرے ایک دوست کا بیٹا ایکسیڈنٹ میں کافی زخمی ہو گیا تھا۔ کافی فریکچر تھے۔ یہیں کسی ایک روم میں کچھ دن ایڈمٹ رہا تھا۔ میرا خیال ہے تمہاری بھی ایک دن ڈیوٹی رہی تھی اس روم میں، آج کل وہ بیڈ ریسٹ لے رہا ہے۔ اسے ایک میڈیکل کیئر ٹیکر کی ضرورت ہے۔''

وہ رک رک کر بات کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ مریم کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ بھی لے رہے تھے۔ مریم یقیناً ان کی نامکمل بات کا کوئی رخ سمجھ نہیں پائی تھی۔

دراصل میرا وہ دوست ایک معروف اور مصروف سیاسی رکن ہے۔ اس کی بیوی بھی ایک سماجی کارکن کی حیثیت سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ دونوں میاں بیوی زیادہ وقت گھر سے باہر ہوتے ہیں بچے کی مناسب دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ ان لوگوں نے مجھ سے ریکویسٹ کی ہے کہ میں ایک نرس کا بندوبست کر دوں۔''

انہوں نے پھر توقف کیا اور اب کی بار مریم نے اس توقف کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔

''ان فیکٹ میں تمہیں جاب آفر کر رہا ہوں۔ رات نو سے صبح نو تک کی ڈیوٹی ہو گی۔ تمہیں کوئی مشکل نہیں ہو گی۔ میرے بھروسے کے لوگ ہیں تمہیں کافی ہینڈسم سیلری پیکج ملے گا اور اجازت تمہیں میں دلوا دوں گا۔'' انہوں نے اب کی بار کافی وضاحت کی تھی مگر مریم کو ان کی بات پسند نہیں آئی۔

''میں پیسے کی خاطر اس فیلڈ میں نہیں آئی سرجن۔'' وہ لہجے کو بمشکل نارمل رکھتے ہوئے بولی۔

''نہیں، نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں تم ایک اچھی روشن خیال فیملی سے تعلق رکھتی ہو۔ پیسہ تمہارا مسئلہ نہیں......اسی لیے تمہیں یہ ذمہ داری سونپنا چاہ رہا تھا۔ تم بہت ڈیوٹی فل ہو اور تم یہ ذمہ داری بخوبی نبھا سکتی ہو۔''

مریم کو نجانے کیوں ان کے لہجے میں عجیب سا اسرار محسوس ہوا۔

''سر! آپ نگہت کو کیوں نہیں کہتے، وہ مجھ سے زیادہ ذمہ دار اور زیادہ ڈیوٹی فل ہے اور سب سے بڑھ کر وہ مجھ سے بہت سینئر ہے اور اس کا تجربہ مجھ سے زیادہ ہے۔ اسے اس قسم کی ڈیوٹیز ویسے بھی پسند ہیں۔'' مریم نے نرمی سے کہا۔ واضح انکار کر کے وہ سرجن مرتضیٰ کو بھی ناراض نہیں کر سکتی تھی۔

''نگہت کو تو بہت کچھ پسند ہے مگر میرے دوست کو تم پسند آئی ہو۔'' سرجن مرتضیٰ اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے نجانے کس خیال کے تحت بولتے چلے گئے۔ مریم نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''کیا مطلب؟'' اب کی بار وہ اپنے لہجے کو سخت ہونے سے بچا نہ سکی۔



''دراصل بچہ بہت ضدی ہے۔ وہ اپنی ماں کے علاوہ کم ہی کسی کے ہاتھ سے کچھ لے کر کھانے پینے پہ تیار ہوتا ہے اس لیے ان لوگوں کی ڈیمانڈ تھی کہ کسی کیوٹ نرس کا بندوبست کیا جائے تاکہ اس سے بچے کی دوستی بھی ہو جائے اور تیمارداری بھی ہوتی رہے۔ آج کل کے بچے تم جانتی ہو کم صورت چہرے سے جلدی راضی نہیں ہوتے کجا کہ کچھ کھانے پینے پر تیار ہونا۔ اسی لیے میں نے تمہیں اپروچ کیا ہے تاکہ یہ پریشانی ختم ہو سکے۔''

سرجن مرتضیٰ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے مگر مریم دیر تک نہ بول سکی۔

''دیکھو، میری بات کا غلط مطلب مت لو۔ میں تمہیں گزشتہ ایک ڈیڑھ سال سے اس ہاسپٹل میں دیکھ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں تم میں کام کرنے کی، آگے بڑھنے کی لگن ہے بس اسی لیے''

انہوں نے بہت رسانیت سے کہا۔ ان کی بات میں اور ان کے انداز میں کچھ تو ایسا تھا کہ مریم غصہ کرنے کی بجائے ان کی بات پر غور کرنے لگی۔ وہ کوئی متبادل نام سوچ رہی تھی، جو اپنے بجائے سرجن مرتضیٰ کے سامنے پیش کر سکے۔ اسے یکدم لیزا کا خیال آیا جو چند دن پہلے اسے بتا رہی تھی کہ وہ کسی پارٹ ٹائم جاب کی تلاش میں ہے۔ لیزا کے علاوہ سلویا اور ساجدہ اور پھر سب سے بڑھ کر تزئین بھی ضرورت مند لڑکیوں کی فہرست میں آتی تھی اور اکثر اس کے پاس بیٹھ کر اپنی اپنی ضرورتوں کا رونا روتی رہتی تھیں۔

''آپ لیزا سے بات کیجئے سر یا پھر ساجدہ یا تزئین وغیرہ سے۔ وہ بھی میری طرح بہت ڈیوٹی فل ہیں، خاص کر تزئین وہ ہم سب میں سب سے زیادہ اچھی ہے، بلکہ وارڈ میں اک وہی لڑکی ہوتی ہے جو بچوں کو بہترین طریقے سے ہینڈل کرتی ہے۔'' اس نے اپنی دو تین کلاس فیلوز کا نام لیا۔

''تم اپنی بات کرنے کے بجائے دوسروں کی بات کیوں کر رہی ہو؟''

سرجن مرتضیٰ گویا زچ ہو کر بولے۔

''آپ دوسروں کی بات کرنے کے بجائے میری ہی بات کیوں کر رہے ہیں؟''

اس نے بھی دوبدو جواب دیا۔ سرجن مرتضیٰ کے انداز نے اسے جرات سے بات کرنے کا حوصلہ دیا تھا۔ سرجن مرتضیٰ ایک دم ہنس دیے۔ مریم کو اس سنجیدہ صورتحال میں اس قسم کے قہقہے کی امید نہیں تھی۔

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔'' وہ اس کے چہرے پر مکمل ارتکاز کرتے ہوئے بولے۔ انہوں نے چشمہ ایک بار پھر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

''تم اچھی لڑکی ہو، اس لیے میں نے تم سے بات کی ورنہ یہاں لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ بہت سی ایسی لڑکیاں ہیں جو میرے ایک بار کہنے پر فوراً تیار ہو جائیں گی۔''

مریم خاموشی سے بیٹھی رہی۔ ان کی اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، جبکہ سرجن مرتضیٰ مسلسل اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔

''اب میں جاؤں۔'' اس نے ان کے اس طرح سے دیکھنے پر مدھم سی آواز میں اجازت طلب کی۔

سرجن نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''تم واقعی معصوم ہو یا صرف پوز کرتی ہو۔'' وہ میز پر قدرے جھک کر بولے۔ مریم نے حیرانی سے ان کی شکل دیکھی۔ وہ نجانے اس کے ساتھ پہیلیاں بوجھنے والا یہ کھیل کیوں کھیل رہے تھے۔

''ارے بابا...... میں تم سے مذاق کر رہا تھا۔ صرف تمھیں جانچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم اتنی ہی اچھی لڑکی ہو جتنا کہ میں نے سوچا تھا۔ دراصل مجھے تمھیں یہ پیپرز دینے تھے۔'' انہوں نے کچھ پیپرز اس کے سامنے رکھے۔

''سری لنکا میں پیرا میڈیکل اسٹاف کے بنیادی انفراسٹرکچر کے لیے ایک پندرہ روز کورس ہو رہا ہے۔ سارے جنوبی ایشیاء سے لوگ آرہے ہیں ہمارے یہاں سے بھی چند منتخب لوگوں کو بھیجا جا رہا ہے۔ مبارک ہو تمہارا نام بھی ان لوگوں میں شامل ہے۔''

انہوں نے وہ بات بتا دی جس کے لیے انہوں نے مریم کو بلایا تھا۔ مریم نے اپنی سینئرز سے ایسے کورسز کے بارے میں سن رکھا تھا اور وہ ان کورسز کی اہمیت وافادیت سے بخوبی واقف تھی۔

''میں...... مجھے...... میرا مطلب میں تو ابھی اسٹوڈنٹ نرس ہوں۔ میرا اسلیکشن کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ بے پناہ خوشی پر قابو پا کر بولی۔

''تمہارا گزشتہ ریکارڈ بہت شاندار ہے مریم......! اس کے علاوہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے تم بہت ریگولر ہو، بہت ذمہ دار اور فرض شناس ہو، اسی لیے تمھیں چنا گیا ہے۔''

وہ ریوالونگ چیئر کی پشت سے کمر ٹکائے اس کے خوشی سے سرخ پڑتے چہرے کو مسکراتے ہوئے بغور دیکھ رہے تھے۔ مریم کچھ کہنے ہی والی تھی کہ کمرے کا دروازہ بنا دستک کے کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔

''آؤ...... نگہت! آجاؤ'' سرجن مرتضٰی ایک دم سے اپنی سیٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولے۔ مریم نے بھی مڑ کر دیکھا۔

''تم بہت خوش لگ رہی ہو...... خیریت؟'' وہ مریم کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں تحیر، پیشانی پر تیوریاں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''اور کیا میں پوچھ سکتی ہوں، تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو...... آج تو تمہاری شفٹ بھی نہیں ہے؟''

اس کے لہجے میں عجیب سا طنز گھلا ہوا تھا۔

''مجھے ایک کام تھا اسی لیے میں نے بلوایا تھا۔ سری لنکا والے کورس کے لیے مریم کو سلیکٹ کیا گیا ہے۔''

سرجن مرتضٰی نے نگہت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مریم کو؟ مگر مریم تو...... میرا مطلب ابھی تو یہ سیکنڈ ایئر میں ہے اس کورس کے لیے تو وارڈسسٹرز کو سلیکٹ کیا جا رہا تھا اور مریم تو ابھی سٹوڈنٹ نرس ہے۔''

اس کی ساری توجہ مریم کے بجائے سرجن مرتضٰی کی طرف مبذول تھی۔



''ہاں...... تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر کبھی کبھی وارڈ سسٹرز سے کوتاہی ہو جاتی ہے تو پھر اس کا ازالہ کرنے کے لیے اسٹوڈنٹ نرس کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔'' سرجن مرتضٰی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا مگر ان کی مسکراہٹ اور الفاظ میں عجیب سی کاٹ تھی جسے مریم بوش جذبات میں محسوس بھی نہیں کر پائی تھی۔

''آپ جاسکتی ہیں مریم!''

سرجن مرتضٰی نے اسے جانے کا عندیہ دیا۔ اور وہ ان پیپرز کو اٹھا کر دروازے کی سمت چل دی۔

''یہ سب آخر ہو کیا رہا ہے؟'' عقب میں اس نے نگہت کی غراتی ہوئی آواز سنی تھی۔

☆ ☆ ☆

''کیا کر رہی ہو؟'' نگہت دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی پوچھ رہی تھی۔ مریم نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا پھر بشاشت سے مسکرائی۔

''شکر ہے یار! تمہاری شکل تو نظر آئی۔'' وہ نگہت کے چہرے پر پھیلی ہوئی بیزاری وخفگی کو محسوس کیے بغیر کہنے لگی۔ اس کی بات سن کر نگہت کے چہرے پر استہزائیہ ہنسی نے ذرا کی ذرا جھلک دکھائی۔

''کیوں، خیریت؟ اتنا مس کر رہی تھیں مجھے؟'' وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے قریب آگئی۔ مریم نے بستر پر پڑے سفری بیگ کا رخ بالکل اس کی جانب کر دیا۔

''ہاں نا...... یہ دیکھو، میں نے یہ سب سامان رکھا ہے۔ مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آرہا کہ مجھے کون سی چیزیں ساتھ لے جانا چاہئیں۔ میں تو کنفیوز ہو گئی ہوں۔''

وہ بے چارگی سے کہہ رہی تھی۔

''اوہ...... اس کا مطلب، تم نے فیصلہ کر لیا ہے۔'' نگہت نظریں گھماتے ہوئی بولی۔ اس کا انداز مریم کے لیے کسی قدر اجنبی تھا۔ مریم نے ناسمجھی کے انداز میں اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔

''آئی مین تم سری لنکا کے ٹور پر جا رہی ہو؟'' نگہت نے ایک اور سوال کیا۔

''ہاں یار...... تب ہی تو یہ پھیلاوا پھیلا کر بیٹھی ہوں۔'' مریم نے نفاست سے تہہ کر کے رکھا ہوا ایک اور سوٹ بیگ میں ٹھونسا۔ وہ بہت خوش اور بہت مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔

''بائی داوے تمھارے گھر والوں نے اجازت دے دی؟'' اس کا انداز خاصا طنزیہ تھا۔

''ہاں، دے دی۔ ابو جی تو بخوشی رضامند ہو گئے تھے، بس حیدر واویلا کر رہا تھا مگر میں نے کوئی پروا نہیں کی۔ ایسا چانس روز روز نہیں ملتا۔'' وہ بات کرتے کرتے الماری کی جانب چل دی اور ضرورت کی دوسری چیزیں نکال کر ایک شاپر بیگ میں رکھنے لگی۔

''چانس؟'' نگہت نے استفہامیہ انداز میں اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ساری گفتگو میں پہلی مرتبہ مریم نے ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھا پھر سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''نگہت! مجھے لگتا ہے، تم نے آج چائے نہیں پی اسی لیے سست ہو رہی ہو۔ میں ذرا اس پیکنگ سے فارغ ہو لوں پھر مل کر چائے پیتے ہیں، میں نے بھی ابھی تک چائے نہیں پی۔ تزئین بھی تب تک آجائے گی۔'' وہ

شاپر کو گرہ لگا کر بیگ میں رکھنے لگی۔ میز کے ایک کارنر پہ اس کا ٹوتھ برش اور پیسٹ وغیرہ پڑے تھے۔ وہ انہیں اٹھانے کے لیے نگہت کی دائیں جانب سے گزرنے لگی تھی کہ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ نگہت کی گرفت میں عجیب سی سختی تھی۔ مریم نے حیرانی سے اس کی شکل دیکھی۔

''کافی ہو چکا مریم! اب بس کرو...... بتادو مجھے کہ یہ چکر کتنے دن سے چل رہا تھا اور مرتضٰی نے اس ٹور کے بدلے تم سے تمھارے علاوہ مزید کیا ڈیمانڈز کی ہیں۔'' اس کے لہجے میں عجیب سی تھکن اور الفاظ میں کاٹ تھی۔ نگہت کے منہ سے سرجن مرتضٰی کے لیے صرف ''مرتضٰی'' سننا بھی مریم کے لیے کافی اچنبھے کا باعث تھا۔

''تم...... تم کیسی باتیں کر رہی ہو نگہت...... مجھے......''

''بس بہت ہو چکا مریم۔'' وہ مریم کی بات کاٹ کر غرائی۔

''اب یہ مت کہنا کہ تمھیں میری بات سمجھ میں نہیں آرہی۔ تمہارا یہ ڈائیلاگ بہت پرانا ہو چکا ہے۔ بہتر ہوگا کہ اب اس معصومیت کے چوغے کو اتار پھینکو...... بہت برداشت کر لیا میں نے...... تم کیا سمجھتی ہو نگہت کوئی دودھ پیتی بچی ہے جسے تم بےوقوف بنالوگی۔ مجھے چلانا اتنا آسان نہیں ہے مریم! اب مجھے بتا ہی دو کہ تم نے مرتضٰی کو کس حد تک اپنی مٹھی میں کیا ہوا ہے۔ وہ شخص جو صرف نیر[illegible]نام کی تسبیح پڑھتا تھا وہ اب تمھارے نام کی مالا کیوں جپنے لگا ہے۔'' اس کے انداز میں اس قدر تضحیک تھی کہ مریم اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی۔

''یہ بات میں ابتدا سے جانتی تھی کہ مرتضٰی تمھیں پسند کرتا تھا۔ میں نے سوچا کوئی بات نہیں لڑکی اچھی ہے اور اچھی چیز ہر کسی کو اچھی لگتی ہے مگر میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ اچھی چیز مجھے ری پلیس کر دے گی۔''

وہ چبا چبا کر بول رہی تھی۔ مریم نے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''خدا کے واسطے نگہت چپ ہو جاؤ، تمہاری یہ بکواس مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آرہی۔ تمھیں میری عزت کا پاس نہیں نا سہی مگر سرجن مرتضٰی تو تمھارے لیے قابلِ عزت ہیں نا۔ ان کا ہی احساس کر لو۔''

''میں کیوں کسی کا احساس کروں۔'' نگہت نے اس کی بات کاٹی۔

''میں کسی کا احساس نہیں کروں گی اور یہاں کون ایسا ہے جس کی میں عزت کروں۔''

''تم اپنی مثال لے لو۔ اتنی بڑی کانفرنس کے لیے کسی عام سی اسٹوڈنٹ نرس کا سلیکشن کسی کرم نوازی کے بغیر تو نہیں ہوا ہوگا اور پھر مرتضٰی کو میں تم سے زیادہ اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ شخص تو مطلب کے بغیر کسی کے سر پر ہاتھ نہ رکھے۔'' نگہت کی سانس بے تحاشا پھول رہی تھی مگر اس کے غیض میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ مریم کی آنکھ سے جھر جھر آنسو بہنے لگے۔ اس کے خیال میں نگہت کا دماغی توازن خراب ہو گیا تھا۔

''اس کورس میں شرکت کے لیے مجھے سلیکٹ کیا جانا تھا۔ مجھے اس کے بعد آرتھوپیڈک میں ہی اسپشلائزیشن کرنی تھی۔ مرتضٰی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ میرا ہی نام دے گا اور چیئرمین تک پہنچائے گا مگر پھر بیچ میں تم آگئیں اور میرا نام واپس لے لیا گیا۔ مرتضٰی......''

اس کی بات ابھی نامکمل تھی کہ تزئین کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے ہاتھ میں کچھ شاپر بیگز پکڑے ہوئے تھے۔ وہ اندر کی صورتحال سے بالکل بے خبر تھی اس لیے ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے وہ ان دونوں کی سمت بڑھی تو مریم کے بہتے آنسوؤں نے اسے حیران کر دیا۔ نگہت کے چہرے کے تاثرات بھی کچھ نارمل نہیں لگ رہے تھے۔



''تم دونوں کو کیا ہوا ہے؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔ مریم اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آئی اور اس کے بازو کو تھام لیا۔

''تزئین! نگہت کو کوئی غلط فہمی......''

''مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی اور اس تزئین سے کیا پوچھتی ہو یہ تو خود اس غلاظت میں لتھڑی ہوئی ہے۔''

نگہت نے پھر مریم کو بولنے کا موقع نہیں دیا۔

''کیا بکواس کر رہی ہو نگہت! تم اپنے ہوش میں تو ہو؟'' تزئین اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''اوہو، تو اب آپ مجھے سمجھائیں گی کہ میں اپنے ہوش میں رہوں...... کیا میں آپ سے پوچھ سکتی ہوں کہ میٹرن کے کہنے پر جب آپ پہلی مرتبہ ڈین کے گھر گئی تھیں آپ ہوش میں تھیں اور پھر اب جب......'' تزئین نے بات کاٹی۔

''مزید ایک لفظ نہیں نگہت...... میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔ تم......''

''میرا منہ توڑ دوگی کیونکہ میں سچ بول رہی ہوں۔ بہت خوب۔'' مریم نے حیرانی سے ان دونوں کی جانب دیکھا۔ وہ دونوں اب آپس میں لڑنے لگی تھیں۔

''تمھیں جو بات کرنی ہے مجھ سے کرلو مگر مریم کے سامنے نہیں۔'' تزئین اس کے قریب آکر بہت دھیمی آواز اور مصالحانہ انداز میں بولی، مگر نگہت نے اس کی بات کاٹ دی۔

''مریم کے سامنے کیوں نہیں، یہ بھی ہم میں سے ایک ہے، اسے بھی تو سب کچھ پتا ہے۔ اس سے یہ پردہ داری کیوں۔ دراصل تم سب لوگ بھی میری طرح دھوکے میں ہو۔ مریم وہ نہیں ہے جو یہ نظر آتی ہے۔ اس کا صرف چہرہ معصوم ہے، ورنہ اندر سے یہ بھی پوری ہے۔'' تزئین نے اس کے چہرے پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا پھر اسے بستر پر دھکا دے کر بٹھانے والے انداز میں پٹختے ہوئے چلا کر بولی۔

''اب اگر ایک لفظ بھی تمھارے منہ سے نکلا تو میں تمہارا حشر بگاڑ دوں گی۔'' نگہت نے اس کی بات سن کر عجیب سے انداز میں قہقہہ لگایا۔ اس کے ہونٹوں کے کنارے سے رال ٹپکنے لگی تھی۔ تزئین اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کی دیوانگی نے تزئین کو مزید چونکا دیا۔

''تم نگہت کی باتوں کو اگنور کر دو مریم! یہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ میرا خیال ہے یہ نشے میں ہے۔'' وہ مریم کی طرف رخ کر کے جھکی آنکھوں کے ساتھ بے حد دھیمی آواز میں بولی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں مریم! میں نے ہر بات مکمل ہوش و حواس میں کہی ہے۔ میں نشے میں نہیں

ہوں۔ ایک دو پیگ چڑھانے سے مجھے اب نشہ نہیں ہوتا۔ تم میرے بجائے تزئین کی باتوں کو اگنور کرو، یہ تمھیں کبھی حقیقت نہیں بتائے گی۔ دراصل یہ بے چاری بھی میری طرح تمھیں بہت معصوم سمجھتی ہے۔"

الفاظ اس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ مریم ہکا بکا ان دونوں کی شکل دیکھ رہی تھی۔ ان کی باتیں اس کے لیے پریشان کن بھی تھیں اور حیران کن بھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے نگہت اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے قدموں میں آ کر بیٹھی۔ مریم بدک کر پیچھے ہٹی۔

"تمھیں خدا کا واسطہ مریم! میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میں نے بہت غلط کام کیے ہیں، بہت لڑکیوں کو غلط راہ لگایا، بہت گناہ کمائے مگر میں اللہ سے معافی مانگ لوں گی۔ تم میری راہ سے ہٹ جاؤ۔ مرتضیٰ کو مجھے واپس کردو۔ مجھے اس سے بہت محبت ہے، سچی محبت، میں تمھارے پاؤں پڑتی ہوں مریم!"

"تم یہ کیا کر رہی ہو نگہت! ہوش میں آؤ۔ چلو، میں تمھیں تمھارے کمرے میں چھوڑ آؤں، اٹھو یہاں سے۔ پاگل مت بنو، مریم وہی کرے گی جو تم چاہو گی۔" تزئین ہمت کر کے آگے بڑھی اور اس کے شانوں پہ ہاتھ رکھ کر اسے کھڑا کرنا چاہا۔

"وعدہ کرو کہ مریم وہی کرے گی جو میں چاہوں گی، پہلے وعدہ کرو۔ میں جانتی ہوں مریم تمہاری ہر بات مانتی ہے۔ وہ تمہاری بہت اچھی سہیلی ہے نا۔ تم مجھ سے وعدہ کرو۔" وہ تزئین کا ہاتھ پکڑ کر نہایت التجائیہ انداز میں بولی۔ آنسو ابھی بھی اس کی آنکھوں سے بہت روانی سے بہہ رہے تھے۔

"ہاں میں وعدہ کرتی ہوں۔" تزئین نے بالآخر اسے کھڑا کیا۔ مریم نے اس کی جانب حیرانی سے دیکھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو نہایت جارحانہ موڈ میں تھی، مگر جب کمرے سے جا رہی تھی تو اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ وہ برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ وہ تزئین کے ہاتھ کا سہارا لے کر کمرے سے باہر نکل گئی، جبکہ مریم تھکے ماندے انداز میں بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے ہی بیگ کھلا پڑا تھا جس میں اس نے اپنے کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں رکھی تھیں۔ وہ خود کو پاتال کی گہرائیوں میں اترتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اس کے قدموں کے نیچے سے کسی نے زمین کھینچ لی تھی۔

☆ ☆ ☆

"پاپا! آپ نے کبھی محبت کی ہے؟" اس نے ان کے کلین شیوڈ تروتازہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ جواب میں انہوں نے بلند و بانگ قہقہہ لگایا۔ وہ کچھ خجل سا ہو گیا۔ وہ ان کے گھر ویک اینڈ گزارنے کے لیے آیا تھا اور پہلی مرتبہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ان سے ان کی اور اپنی باتیں کرنے کے بجائے کسی "اور" کی باتیں کرے۔ وہ ان سے اس پری چہرے لڑکی کے متعلق کرید کرید کر بہت سے سوالات کرنا چاہتا تھا، مگر پھر ہمت نہیں ہو پاتی تھی۔ تھک ہار کر اس نے گھما پھرا کر یہ سوال پوچھ ہی ڈالا تھا مگر ان کے اس قہقہے نے اسے بدمزہ کر دیا۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" اس نے ناک چڑھا کر سوال کیا۔ اس کے پاپا ٹانگ پہ ٹانگ چڑھاتے ہوئے مسکرائے اور ٹی وی کا چینل چینج کرنے لگے۔

"یار سنی! کبھی کبھی تم عجیب الجھا دینے والی باتیں کرنے لگتے ہو۔" مسکراہٹ ابھی بھی ان کے



ہونٹوں کے کناروں پر کہیں ٹکی تھی اور یہی مسکراہٹ سمیع مرتضیٰ عرف سنی کو حوصلہ دے رہی تھی۔

"میں نے ایک سادہ سا سوال پوچھا۔ اس میں الجھا دینے والی کیا بات ہے۔ محبت میں کچھ عجیب نہیں ہوتا پاپا۔ جو سمجھ نہ آ سکے۔" اس نے آرام دہ صوفے کی بیک سے ٹیک لگائی اور دونوں ٹانگوں کو سنٹر ٹیبل پر رکھ لیا۔ اس کے پاپا اب کی بار مسکرائے۔

"ینگ مین..... آر یو اوکے..... سب خیریت ہے نا میرے بچے؟" وہ اس کے سلکی بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے نرم لہجے میں استفسار کر رہے تھے۔ سمیع کچھ جھینپ سا گیا۔

"یس پاپا! آئی ایم فائن۔ وہ میرا دوست ہے نا زوہیب..... ہی از ان لو..... آج کل اس کی چھب ہی نرالی ہے۔ آئی سوئر پاپا! وہ بالکل تبدیل ہو چکا ہے۔ ایسی عجیب و غریب باتیں کرتا ہے۔ آئی مین بہت پوئٹیکل لینگویج استعمال کرنے لگا ہے۔ کبھی کبھی تو بالکل پاگل لگنے لگتا ہے۔ مجھے اس کو دیکھ کر بہت حیرت ہوتی ہے۔ ایسا ممکن ہے پاپا کہ کوئی ہر وقت کسی کے تصور میں کھویا رہے۔ ہر وقت کسی اور کی باتیں کرتا رہے۔ ہر وقت کسی اور کے بارے میں سوچتا رہے؟" وہ دونوں ہاتھ سر کی پشت پر باندھے خلا میں دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ مرتضیٰ احسن نے حیرت سے اپنے بیٹے کی جانب دیکھا۔

"پاپا! آپ پہلی نظر میں محبت پر یقین رکھتے ہیں۔ اس نے سابقہ انداز میں سوال کیا۔"

"ہاں۔" اس نے یکدم کہا پھر فوراً سنبھل کر بولا۔

"میرا مطلب ہے، میں نہیں کرتا مگر زوہیب کرتا ہے۔ اس نے اس لڑکی کو ایک بار دیکھا ہے اور بس۔ وہ مسحور ہو کر رہ گیا ہے۔ جب بھی ملتا ہے، اسی لڑکی کے بارے میں بات کرتا ہے۔ ایک دم ڈفر لگنے لگا ہے۔ جس لڑکی کا نام تک نہیں جانتا، اس سے محبت کیسے ہو سکتی ہے؟" مرتضیٰ احسن نے ٹی وی کا والیوم بالکل کم کر دیا اور اس کی طرف رخ پھیر کر بولے۔

"یہ تو محبت نہیں ہوتی، کسی کو ایک بار دیکھو اور پھر اس کے سحر کا شکار ہو جاؤ۔ ارے بھئی! لڑکی سے محبت کر رہے ہو یا جادوگرنی سے۔ تم کو سمجھانا تھا اسے کہ ابھی اس کی عمر عشق و محبت والی نہیں ہے۔ ابھی وہ صرف گرل فرینڈز سے کام چلائے۔" ان کا انداز بہت کھوجتا ہوا تھا۔ سمیع کچھ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"یس پاپا! میں اسے سمجھاؤں گا اور میں اسے سمجھاتا بھی ہوں مگر....." وہ تذبذب کا شکار ہوا۔

"مگر وہ نہیں سمجھ سکتا۔ مجھے یقین ہے، وہ اب کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ وہ بہت آگے جا چکا ہے۔" سمیع کی آواز میں تسلسل نہیں تھا۔

"وہ لڑکی کون ہے؟" انہوں نے انٹرویو کا سلسلہ شروع کیا۔

"میں نے آپ کو بتایا تو ہے وہ لڑکی کے متعلق بہت زیادہ نہیں جانتا۔ اس نے اسے صرف دو بار دیکھا ہے۔ ایک بار کے ایف سی میں بہت سرسری سا پھر ایک بار....." وہ بات کرتے کرتے رکا پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "دوسری ملاقات بھی شاید کے ایف سی میں ہی ہوئی تھی۔"

وہ اب بات ختم کر کے وہاں سے اٹھنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے پاپا کو بھنک بھی پڑے

کہ زوہیب کے پردے میں وہ ان سے اپنی یک طرفہ محبت ڈسکس کرتے ہوئے ان کے خیالات سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کررہا تھا جبکہ اس کے پاپا اس سے بھی زیادہ چالاک تھے۔

''وہ لڑکی اس کی کلاس فیلو تو نہیں ہوگی؟'' انہوں نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

''نہیں، نہیں کلاس فیلو تو نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کلاس فیلوز کو میں گھاس نہیں...... او مائی گڈ نیس...... میرا مطلب......'' وہ اپنا راز اپنے منہ سے اگل چکا تھا۔ اس کے پاپا نے اس کی بات اچکی۔

''تمہارا مطلب ہے، تم نہیں، زوہیب...... ہے نا؟'' وہ اس کی حالت کا مزہ لیتے ہوئے بولے۔

سمیع بے طرح جھینپ گیا۔

''مجھ سے تم کچھ نہیں چھپا سکے برخوردار! اب سیدھی طرح اگل دو کہ وہ کون ہے جس نے ہمارے صاحبزادے کا یہ حال کردیا ہے؟'' ان کے انداز میں شرارت تھی۔ وہ خواہ مخواہ شرما سا گیا۔ شاید اس کی عمر کا تقاضا تھا مگر وہ اپنے پاپا سے اتنے واضح انداز میں بات نہیں کرسکتا تھا جبکہ زوہیب کا حوالہ دے کر وہ اپنی ہر الجھن بھی دور کرنا چاہتا تھا مگر اس کی بے وقوفی نے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔

''میں آپ کو سب کچھ بتادوں گا پاپا! مگر آپ اپنے سری لنکا والے ٹور سے فارغ ہولیں پھر ماہین کا نکاح ہے، اس کے بعد ہم اس بارے میں تفصیل سے بات کریں گے۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ وہ جانتا تھا اس کے پاپا اپنے ہاسپٹل میں کام کرنے والی کسی معمولی نرس کو اتنی جلدی قبول نہیں کریں گے پھر ممی تو شاید اس کی شکل ہی بگاڑ دیتیں۔ اگر انہیں اس کی اس خواہش کا پتا چل جاتا۔ ابھی وہ اس کی بات کا جواب بھی نہیں دے پائے تھے کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ انہوں نے فون اٹھا کر کان سے لگایا۔

''ہاں...... میں بات کررہا ہوں...... ہاں ٹھیک...... تم کیسی ہو؟'' انہوں نے سمیع کی جانب دیکھتے ہوئے محتاط سے انداز میں جواب دیا۔

''واٹ...... محبت؟ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔ واٹ ربش۔ نگہت! تم ایسا کچھ نہیں کروگی۔ واٹ...... اوکے گو ٹو ہیل۔'' وہ بہت دھیمی آواز میں بات کررہے تھے، مگر پھر بھی سمیع تک آواز بخوبی پہنچ رہی تھی مگر اسے ان کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا ذہن کسی اور ہی سمت میں پرواز کررہا تھا۔ وہ اٹھ کر اپنے لیے مخصوص بیڈروم کی سمت آگیا۔ اس کے پاپا لاؤنج میں ابھی بھی فون کان سے لگائے بیٹھے تھے۔

☆ ☆ ☆

''میں نے نرسنگ اس لیے جوائن کی کہ میں دکھی انسانیت کی خدمت کرکے یسوع مسیح کے نیک اور پیارے بندوں میں اپنا نام لکھوانا چاہتی ہوں۔'' کمرے میں گہری تاریکی تھی اور اس گہری تاریکی میں ستارہ یوسف کی آواز نے گویا روشنی سی کردی تھی۔ مریم نے ٹھنڈی سانس بھر کر پلکیں جھپکیں تو یہ روشنی گل ہوگئی۔ اسی تاریکی میں ستارہ یوسف کا ہیولا نمایاں ہونے لگا۔ ستارہ یوسف جب نرسنگ اسکول میں آئی تھی تو اس کا حلیہ اب والی ستارہ یوسف سے بہت مختلف ہوا کرتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے نجانے کون سی ''دکھی انسانیت'' کی



خدمت کی تھی کہ دھن اس پر بارش کی طرح برسنے لگا۔

''یہ صرف اور صرف میری ضرورت ہے مریم!'' اب کی بار تزئین کی آواز گونجی تھی۔ وہ برملا اس بات کا اعتراف کیا کرتی تھی کہ وہ نرسنگ کی طرف اس لیے آئی کہ اپنی ماں اور بہن کے برعکس ایک پُرتعیش طرزِ زندگی اپنا سکے۔ وہی تزئین اس کے ساتھ اس کے کمرے میں رہتی تھی۔ اس کے ساتھ والے بستر پر سوتی تھی، اس کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی تھی اور اسے کچھ پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ گندگی میں اس قدر لتھڑ چکی تھی۔

''کیا گناہ اتنا شفاف بھی ہوسکتا ہے کہ نظر ہی نہ آئے۔'' مریم نے نجانے کس سے سوال کیا۔ جب پردہ ہٹتا ہے تو ایک بھید نہیں کھلتا بلکہ کئی بھید کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ مریم کے سامنے سے پردہ تو ہٹ گیا تھا مگر کوئی بھید نہیں کھل سکا تھا۔ ہر بھید ایک نئے بھید کو جنم دیتا چلا جارہا تھا۔ وہ اپنے بستر پر اس طرح لیٹی تھی جیسے صدیوں کی بیمار ہو۔ اس کو لگنے والا دھچکا اتنا شدید تھا کہ اپنی ذات ہی زلزلوں کی زد میں محسوس ہورہی تھی۔ نگہت اور تزئین کو کمرے سے گئے کافی دیر ہوچکی تھی اور وہ ابھی تک اپنے بستر پر ساکت بیٹھی تھی۔

ڈاکٹر عادل اور تزئین، سرجن مرتضیٰ اور نگہت، روبینہ اور کامران توصیف، سرجن بخاری اور میڈم زینت...... کیا سب ہی لوگ ایک جیسے تھے، کیا کوئی اس جیسا نہیں تھا اور اگر تھا تو نظر کیوں نہیں آرہا تھا وہ اچانک ہی اپنے بستر سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ یہ کمرہ جو آج تک اسے اپنے گھر جیسا لگا کرتا تھا، آج اچانک جیل کے بیرک کی طرح کیوں لگنے لگا تھا۔

''کیا میں اس قدر بے وقوف ہوں کہ مجھے آج تک کچھ سمجھ نہ آسکا؟'' وہ ایک بار پھر خود سے سوال کررہی تھی۔ وہ کسی اور کے پاس جا کر استفسار کربھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے نگہت اور تزئین کو اپنا دوست سمجھا تھا اور دونوں نے ہی اسے دھوکا دینے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا، فی الفور ہر چیز کو جوں کا توں چھوڑ کر کہیں بھاگ جائے لیکن کیا اس چیز سے فرار ممکن تھا جو اس کا شوق تھا، اسکا نصب العین تھا۔

''کیا میں اندر آسکتی ہوں؟'' کسی نے دروازہ کھول کر دستک دیے بنا اجازت طلب کی تھی۔ دروازہ کھلنے سے چاند کی چاندنی دبے پاؤں اندر چلی آئی تھی، مگر اس چاندنی نے دروازے میں کھڑے وجود کو مزید نا قابل شناخت بنادیا تھا۔

''مریم! تم جاگ رہی ہونا؟'' آنے والی شخصیت نے کمرے کے عین وسط میں آکر پوچھا اور پھر مزید چند قدم چل کر ٹیوب لائٹ آن کردی۔ مریم کی آنکھیں لحہ بھر کو چندھیائی تھیں، مگر پھر سب کچھ واضح ہوگیا۔ اندر داخل ہونے والی شخصیت تزئین بخاری تھی۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا مریم؟'' اس نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔

وہ مریم کی طرف دیکھنے سے احتراز برت رہی تھی۔ مریم نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کیا جواب دیتی، طبیعت تو اتنی اچھی صاف ہوئی تھی کہ شاید اب زندگی بھر ''ٹھیک'' رہتی۔

''یہ پانی پی لو۔'' اسے نجانے کیسے خبر ہوئی کہ اس کی طلب پانی ہے۔ مریم نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے پانی کا گلاس تھام لیا۔ تزئین اس کے بستر پر ہی بیٹھ گئی۔ اس کے انداز میں شرمندگی کے ساتھ ساتھ

تذبذب بھی تھا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر مریم نے پانی پی لینے کے بعد اس کی جانب ایک بار بھی نہیں دیکھا۔

''کیا تم مجھ سے کچھ بھی پوچھنا نہیں چاہتیں مریم! مجھ سے ناراض ہی ہو لو، غصہ کرو مگر اس طرح خاموش مت رہو۔'' تزئین نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر تھپکتے ہوئے کہا۔ مریم اب بھی خاموش رہی۔ اس کے وجود میں ذرا سی بھی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے تزئین کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ بھی نہیں نکالا تھا۔

تزئین! نگہت نے جو کہا، تمھارے بارے میں اور ڈاکٹر عادل......'' ٹوٹے لہجے میں بولتی مریم اپنی بات مکمل نہیں کر پائی۔

''نگہت جھوٹ بول رہی تھی نا تزئین؟'' اس نے رک کر گہری سانس بھری اور پھر پوچھا، تزئین خاموش رہی۔ وہ مریم کی بات کی تائید کیسے کر سکتی تھی، جبکہ وہ جانتی تھی نگہت نے چند گھنٹے قبل جو کچھ کہا تھا، وہ حرف بہ حرف سچ تھا۔ نگہت نشے میں نہ ہوتی تو شاید اتنی بے باکی سے سچ بھی نہ بولتی۔

''تزئین! مجھے بتا دو پلیز...... میرا دل پھٹ جائے گا۔'' مریم اس کے شانے کو ہلاتے ہوئے بولی۔

''میں نے ڈاکٹر عادل سے کورٹ میرج کر لی ہے مریم!'' تزئین نے بہت دھیمی آواز میں انکشاف کیا۔ مریم کو جھٹکا لگا۔ شاید وہ تزئین کے منہ سے یہ سب نہیں سننا چاہتی تھی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے تزئین کو دیکھا۔

''میرے پاس...... اس کے علاوہ......'' تزئین نے بات ادھوری چھوڑ کر مریم کی جانب دیکھا، جو اس سے یکدم ہی دور ہٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی بڑھ رہی تھی۔

''مریم! تم میری بات سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ میں نے گناہ نہیں کیا۔ میں نے ڈاکٹر عادل سے شادی کی ہے۔ میں تمھیں بتانا چاہتی تھی مگر مجھے موقع ہی نہ مل سکا۔ دراصل تم عادل کو ناپسند کرتی ہو، یہ بات میں بہت شروع سے جانتی تھی۔ میں نے بارہا کوشش کی تمھیں سمجھانے کی، تمھیں حقیقت بتانے کی کہ عادل برے انسان نہیں ہیں مگر تم میری کوئی بات سننے پر تیار نہ ہوئیں، بس اسی لیے۔ تم خود بتاؤ مریم! میں تمھیں کس طرح یہ سب بتاتی۔ تم تو میڈم زینت کو بھی بری عورت سمجھتی تھیں۔ تم تو ان کی کسی اچھائی کو بھی ماننے کو تیار نہیں تھیں۔ حالانکہ وہ کتنی اچھی ہیں۔''

''مجھے کچھ مت بتاؤ تزئین! مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔ تم جن لوگوں کو اچھا کہہ رہی ہو، وہ سب برے لوگ ہیں۔ مجھے خود نگہت نے بتایا تھا'' مریم اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی اور پھر تزئین کی شکل دیکھنے لگی۔ نگہت کی آج والی حالت دیکھ کر کیا وہ اس کی کسی بات پر اعتبار کر سکتی تھی۔ نگہت آج سے پہلے اسے جو کچھ سمجھاتی رہی تھی۔ وہ سچ تھا تو آج جو کچھ وہ نشے کی حالت میں کہہ گئی تھی، وہ سب کیا تھا۔ مریم کے سامنے انہیں انتہائی شریف بنا کر کیوں پیش کرتی تھی؟ وہ کس کی بات کو سچ مانتی، نگہت کی یا تزئین کی۔ یہ کیسی بھول بھلیاں تھی، جس میں وہ پھنس کر رہ گئی تھی۔

''تمہارا مسئلہ یہ ہے مریم! کہ تم ہر چیز کو اپنی آنکھ سے دیکھنے اور سمجھنے کے بجائے دوسروں کی آنکھ سے



دیکھنا پسند کرتی ہو۔ نگہت کی دوستی نے تمھیں بہت سے اچھے لوگوں کی دوستی سے محروم کر دیا۔ مجھے خود بھی یہ بات بہت دیر سے سمجھ میں آئی تھیں اور میں تمھیں بتانا بھی چاہتی تھی مگر......'' وہ لمحہ بھر کو رکی۔

''تمھیں یاد ہے مریم! جب میں تم سے کوئی ایسی بات شروع کرتی تو تم مجھے خاموش کروا دیا کرتی تھیں۔ ایسی صورت حال میں کیا کیا جا سکتا تھا؟'' وہ جتاتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تمھیں یاد ہے ایک بار تم نے نگہت کی جگہ نائٹ شفٹ میں ڈیوٹی کی تھی۔ تب تم نے خود کو کتنی بڑی مشکل میں پھنسا لیا تھا؟ تم خود بھی نہیں جانتی تھیں۔ اس دن اگر عادل اس روم میں نہ آتے تو اس حریص شخص سے کوئی تمھیں نہیں بچا سکتا تھا تم شکر کرو مریم! کہ تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اللہ نے تمہاری بہت بہت مدد کی ہے اور جن بندوں کے ذریعے اس نے یہ مدد کی ہے تمھیں ان بندوں کا شکر گزار ضرور ہونا چاہیے۔ میڈم زینت اور عادل نے کبھی تمہارا برا نہیں چاہا مگر یہ دونوں کبھی تمھیں اچھے نہیں لگے جبکہ نگہت اور سرجن مرتضیٰ نے کبھی تمہارا اچھا نہیں چاہا اور وہ دونوں کبھی تمھیں برے نہیں لگے۔ غلطی تو سراسر تمہاری ہے مریم! بہت ساری گتھیاں تو خود بخود سلجھ جاتی ہیں لیکن اگر انہیں طریقے سے سلجھایا جائے تو۔ اگر تم غور کرتیں تو جان لیتیں کہ تمھیں پھانسنے کے لیے پلان بنایا گیا ہے۔ سب سینئر رینک کی نرسز کے ساتھ ایک جونیئر رینک کی اسٹوڈنٹ نرس کا کیا کام؟ مگر تم شاید......'' دروازے پر ہونے والی دستک سن کر تزئین خاموش ہو گئی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا پھر تزئین نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

''تم دونوں یہاں اطمینان سے بیٹھی ہو، وہاں غضب ہو گیا ہے۔ نگہت نے خودکشی کر لی ہے۔'' دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے وارڈ بوائے نے گویا دھماکہ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

''تم ٹھیک کہتے تھے حیدر! میں سچ مچ بہت بے وقوف ہوں۔'' اس نے بمشکل آنکھوں میں امڈتی نمی کو پیتے ہوئے کہا۔ دوسری جانب سے حیدر نے شگفتہ لہجے میں کچھ کہا۔ مریم لمحہ بھر کو خاموش ہو گئی پھر ریسیور کو تقریباً کان میں گھسا کر دھیمی آواز میں بولی۔

''یہ بات نہیں ہے، بس تم لوگوں کی یاد آ رہی ہے۔ میں جلدی گھر واپس آ جاؤں گی، بہت جلدی۔'' پی سی او کے مالک نے ساری توجہ مریم کی جانب ہی لگائی ہوئی تھی۔ آواز دھیمی کرنے والی اس حرکت کو اس نے بہت دلچسپی سے دیکھا اور پھر سیٹی بجانے لگا۔ مریم کا بس نہیں چل رہا کہ فون پر ہی حیدر کو الف سے یے تک ہر بات بتا دے اور ٹیلی فون ریسیور کو اس کا کندھا سمجھ کر زار زار رونا شروع کر دے مگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے عجلت میں حیدر کو خدا حافظ کہا اور پھر پیسے ادا کر کے پی سی او سے باہر نکلی اور تیز تیز قدم اٹھاتی مین گیٹ کی جانب چل دی۔ ہاسپٹل کے بالمقابل بنے اس پی سی او پر زیادہ تر نرسز یا مریضوں کے رشتہ دار ہی آیا کرتے تھے۔ مریم بھی یہیں سے گھر فون کیا کرتی تھی۔ وہ ہاسپٹل کا لان کراس کر کے اب کوریڈور کی طرف جا رہی تھی۔ صبح کے نو بجے تھے۔ گیٹ نمبر 6 پر آئی وارڈ کے آؤٹ ڈور پیشنٹس کا تانتا بندھا تھا۔ پہلے جب کبھی وہ

کوریڈورز میں پیشنٹس کے قریب سے گزرتی تو ان کو دیکھ کر دل ہمدردی کے جذبات سے لبالب بھر جاتا، مگر آج نجانے کیوں دل اتنا بوجھل تھا کہ کسی ننھے مریض کو دیکھ کر دل محبت سے تڑپا نہ ہمدردی سے۔ وہ جھکے ہوئے سر اور لرزیدہ قدموں سے میٹرن کے روم کی جانب بڑھ رہی تھی۔

مریم کی آنکھوں میں کم فہمی کی عینک لگی ہوئی تھی تو ہر شخص کی آنکھوں میں صرف اور صرف عزت دکھائی دیتی تھی مگر اب جب یہ عینک اتری تھی اور ایک انوکھی مگر شرمناک حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوئی تھی تو ہر شخص کی آنکھیں ننگی تلوار کے مانند دکھائی دے رہی تھیں۔

نگہت کے انتقال نے تو اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی خودکشی سب ہی کے لیے معمہ بن کر رہ گئی تھی۔ ہر دم خوش رہنے والی۔ سینئر ڈاکٹرز اور میٹرن کی پسندیدہ نگہت کو آخر کیا غم لاحق تھا کہ اس نے اپنے آپ کو مار ڈالا اور مریم کو یہی دکھ مارے ڈال رہا تھا کہ نگہت نے اس کی وجہ سے اپنے آپ کو مار ڈالا۔ وہ شخص جسے وہ باپ کے برابر عزت دیتی تھی، وہ ایک دم سے شیطان بن گیا تھا۔

وہ نگہت کے انتقال کے فوراً بعد ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر واپس چلی جانا چاہتی تھی، مگر میڈم زینت کا خیال تھا کہ اگر وہ اس طرح سے واپس گئی تو خواہ مخواہ یہ فرض کیا جانے لگے گا کہ وہ شاید نگہت کی موت کی ذمہ دار ہے کیونکہ یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ نگہت کی وفاداریاں سرجن مرتضیٰ کے ساتھ تھیں اور سرجن مرتضیٰ کی نظر التفات نگہت کے بجائے اب مریم پر ہو چکی تھی۔ پہلے تو شاید مریم نے ایسی باتیں سنی بھی نہیں تھیں مگر دھیمی آواز میں ہونے والی چہ مگوئیاں بھی اب اسے بخوبی سنائی دینے لگی تھیں۔

''آیئے مریم! بیٹھیے۔'' میٹرن نے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ نے مجھے بلوایا تھا؟'' مریم نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے نگہت کی موت کا بہت دکھ ہے، اچھی لڑکی تھی۔'' وہ دھیرے سے بولیں۔ مریم خاموش رہی۔

''تمہارا نگہت سے کیا جھگڑا تھا؟'' ان کا اگلا سوال مزید خطرناک تھا۔ مریم ہکا بکا ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگی۔

''میں نے سنا ہے کہ تم دونوں کے درمیان کوئی تنازعہ تھا۔ نگہت اتنے کمزور اعصاب کی مالک نہیں تھی کہ کسی عام سی بات پر اپنے آپ کو مار ڈالتی جبکہ...... جبکہ وہ پریگنینٹ بھی تھی۔'' مریم ششدر بیٹھی ہوئی تھی۔

''تمھارے مرتضیٰ سے کس قسم کے تعلقات تھے۔ دیکھو مجھ سے کچھ مت چھپانا، مجھے صاف صاف بتاؤ، تب ہی میں تمھیں اس سے بچا پاؤں گی لیکن اگر تم نے غلط بیانی سے کام لیا تو تمھارے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔'' ان کی بات پوری ہونے سے پہلے مریم کی آنکھیں برسنے لگیں۔ وہ آج کل اتنی زود رنج ہو چلی تھی کہ ذرا ذرا سی بات پر رونے لگتی۔ تزئین کا ساتھ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ دو روز قبل اپنے شوہر ڈاکٹر عادل کے ساتھ دمام روانہ ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر عادل نے بہت عرصہ سے وہاں اپلائی کر رکھا تھا اور اب ان کو وہاں اچھی جاب مل گئی تھی۔ میٹرن نے اس کے آنسوؤں کو خاطر میں لائے بغیر اگلا سوال کیا۔



''کیا میں سمجھ لوں کہ تمھارے اور مرتضیٰ کے......''

''نہیں میڈم! ایسا مت کہیے، ایسی کوئی بات نہیں، میں ایسی نہیں ہوں۔ میں تو......'' وہ ان کی بات کاٹ کر تڑپ کر بولی۔

''ہاں ہاں، میں جانتی ہوں تم بہت شریف لڑکی ہو۔ مجھے حیرت اس بات پر ہو رہی ہے کہ اگر تمہارا اور مرتضیٰ کا کوئی سلسلہ نہیں ہے تو وہ کس برتے پر اکڑ رہا ہے۔ وہ یہ کیوں کہہ رہا کہ اس کا تم پر حق ہے۔ مجھے آج کل ایک اچھی لڑکی کی بہت ضرورت ہے۔ میرے ذہن میں شروع سے تمہارا نام تھا مگر اب یہ مرتضیٰ نے نیا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ اچھا تم اب جاؤ، میں خود سنبھال لوں گی۔'' انہوں نے بے رحم لہجے میں گویا خود ہی مقدمہ شروع کیا اور خود ہی ختم کر کے فیصلہ سنا دیا۔ وہ اٹھ کر ایک بار پھر وہی مردنی چال چلتی ان کے کمرے سے باہر نکل آئی۔ ابھی چند قدم چل کر مڑنے لگی تھی کہ سامنے سے اختر آتا دکھائی دیا۔

''سسٹر مریم! آپ کو سرجن مرتضیٰ یاد فرما رہے ہیں۔'' اس نے آنکھیں گھما کر شوخی سے بھرپور لہجے میں کہا۔ اس کے انداز میں یہ شوخی پہلے کبھی مریم کو محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اختر کو ٹال کر آگے بڑھنا چاہا مگر وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا۔ اس کے اصرار پر وہ مجبوراً سرجن مرتضیٰ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی کہ جب تک وہ یہاں تھی، کسی قسم کے نئے مسئلے میں الجھنا نہیں چاہتی تھی۔

''اب گھما پھرا کر بات کرنے کا وقت ہے نہ موقع۔ میں تم سے دوٹوک اور واضح بات کرنا چاہتا ہوں۔ میرا ایک دوست ہے جس کا بیٹا چند روز پہلے یہاں ایڈمٹ رہا ہے۔ میرے دوست کو تم پہلی نظر میں بہت پسند آئی ہو۔ میرے اس دوست کی رسائی ہیلتھ منسٹری تک ہے۔ میں اس کی اسی اپروچ کا فائدہ اٹھا کر اس ہاسپٹل کا اگلا چیئرمین بننا چاہتا ہوں۔ اس کو خوش کرنے میں ہی میری خوشی ہے۔ تم سمجھ رہی ہو نا۔ تمھیں اب میرا کام کرنا ہی ہوگا مریم!'' سرجن مرتضیٰ اس کی شکل دیکھتے ہی شروع ہو گئے۔ ان کا انداز حکمیہ تھا نہ التجائیہ۔ بس ایسے جیسے کوئی بہت ہی عام سی بات کر رہے ہوں۔

''آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے سر! میں آپ کی کوئی بات......''

''ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی سسٹر مریم!'' انہوں نے اس کی بات کاٹ کر ''سسٹر مریم'' پر زور دیتے ہو کہا۔

''میں نے تم سے تمہاری رضامندی نہیں پوچھی۔ میں تمھیں بتا رہا ہوں کہ تمھیں یہ سب کرنا ہوگا۔ تمھارے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں ہے۔ میں نے نگہت سے کہا تھا کہ تم سے طریقے سے بات کرلے مگر وہ آخری دنوں میں کچھ زیادہ ہی اونچا اڑنے لگی تھی مگر تم تو سچ مچ اڑیل ٹٹو ہو مگر خیر......'' انہوں نے لمحہ بھر رک کر سانس لیا۔

''نگہت کی موت نے سارا کھیل ہی بگاڑ دیا لیکن ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ یوں سمجھو کچھ ہوا ہی نہیں۔ کل ویک اینڈ ہے۔ میرے دوست کا ڈرائیور تمھیں آ کر لے جائے گا اور وہاں......'' ایک بار پھر توقف کیا گیا۔

''تمھیں ایک اور بہت ضروری بات بتانی ہے۔ دراصل نگہت نے مرنے سے پہلے میرے نام ایک میسج چھوڑا تھا، جس میں اس نے اعتراف کیا ہے کہ اس کا اور تمہارا جھگڑا چل رہا ہے اور اس کی جان کو تم سے بہت خطرہ ہے۔ یہ پیغام میرے ٹیلی فون سیٹ کے ریکارڈر میں ابھی بھی محفوظ ہے۔ اگر تم میرا یہ چھوٹا سا کام نہیں کروگی تو میں یہ پیغام پولیس کو دے دوں گا۔ باقی تم خود سمجھ دار ہو۔''

مریم کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ اس ایک ہفتے میں مریم کو پے در پے جتنے جھٹکے لگے تھے، اس نے اس کے حواس مخل کر دیے تھے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

''میں...... بری لڑکی...... نہیں ہوں۔'' لفظ بہت ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے نکلے۔

''ہم میں سے کوئی بھی برا نہیں ہوتا، بس کبھی کبھی ہماری قسمت بری ہو جاتی ہے۔'' زینت آرا نے بہت محبت سے کہتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگایا۔ اس کی حالت نہایت خراب ہو رہی تھی۔ آنکھیں بے تحاشا رونے کے باعث سوج چکی تھیں۔ وہ ایسے بچے کی مانند لگ رہی تھی جس کا پسندیدہ کھلونا اس کی اپنی غلطی سے ٹوٹ گیا تھا۔ زینت مسلسل اس کے کندھے کو سہلا رہی تھیں۔ آج سے پہلے وہ جب تک اس سسٹم کو سمجھ نہیں پائی تھی تو یہی زینت آرا اسے اس سسٹم کا سب سے ناکارہ حصہ لگتی تھیں اور اب جب وہ اس سسٹم کو سمجھ گئی تھی تو زینت آرا ہی سب سے کارآمد حصہ لگ رہی تھیں۔

''میں نے جب تمھیں پہلی بار دیکھا، تب ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم اس جگہ کے لیے ''مس فٹ'' ہو، تم بہت معصوم ہو اور کسی قدر احمق بھی۔ بہت سی باتیں جو خود بخود سمجھ میں آنے لگتی ہیں، وہی باتیں تمہاری سمجھ میں ہی نہیں آ رہی تھیں۔ تم اچھے گھر کی لڑکی ہو، کوئی معاشی مجبوری بھی لاحق نہیں، اس لیے جب تم جاب چھوڑ کر نہیں گئیں تو مجھے تم پر غصہ آنے لگا اور ساتھ ساتھ تجسس بھی۔ میرا خیال تھا کہ تم لڑکیوں کی اس قسم میں سے ہو جو ایڈونچر اور تھرل میں اس فیلڈ کو جوائن کرتی ہیں۔ تمھیں یاد ہے میں نے تمہاری ایک بے ضرر سی غلطی پر تمھیں وارڈ میں سب کے سامنے ڈانٹا تھا۔ میرا مقصد تمھیں دل برداشتہ کرنا تھا تاکہ تم خائف ہو کر واپس چلی جاؤ مگر تم نہیں گئیں۔'' وہ اسے ہر بات سے آگاہ کر دینا چاہتی تھیں۔

''اس کے بعد تمہاری آنکھوں میں روز بروز میرے لیے نفرت بڑھنے لگی۔ اس کی وجہ بھی مجھے بہت جلد سمجھ آ گئی۔ تمہاری نگہت سے دوستی ہو چکی تھی۔ وہ سرجن مرتضیٰ کی منظورِ نظر تھی اور وارڈ میٹرن کی چہیتی۔ اس نے دونوں طرف اچھی خاصی پی آر بنا رکھی تھی۔ وہ بہت ابتدا سے نئی نرسز کو میرے اور ان بہت سے دوسرے لوگوں کے خلاف بہکا دیا کرتی جو انہیں غلط راستوں پر نہ چلنے کی تاکید کرتے تھے، پھر میں خود ہی تمھارے سامنے سے ہٹ گئی کیونکہ اگر میٹرن کو پتا چل جاتا کہ میں ''شر'' پھیلا رہی ہوں تو وہ میری نوکری کی دشمن ہو جاتی۔ میں اس نوکری کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں مریم! میری بچی کی ساری ذمہ داری مجھ پر ہے۔ ایسی صورت حال میں، میں لڑکیوں کو نصیحت ضرور کر سکتی ہوں مگر اس کے علاوہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔'' ان کی آخری بات پر مریم نے چونک کر ان کی شکل دیکھی۔ اس کا ''آخری تنکا'' بھی ڈوبتا دکھائی دے رہا تھا۔



''یہاں اور بھی بہت سے اچھے لوگ ہیں۔ سسٹم مکمل طور پر ناکارہ نہیں ہوا ابھی، مگر تمہارا کیس کچھ مختلف ہے۔ تم بہت بری طرح پھنس چکی ہو۔ لڑائی دراصل اب میٹرن اور سرجن مرتضیٰ کے درمیان ہے۔ وہ دونوں اپنے اپنے مقصد کے لیے تمھیں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ سرجن مرتضیٰ ترقی چاہتا ہے جبکہ میٹرن کو ٹرمینیشن کا ڈر ہے۔ اس سے کچھ غلطیاں ہوئی ہیں جن کی پاداش میں اسے کبھی بھی نکالا جا سکتا ہے۔ وہ دونوں اب اسی لیے ان ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں۔ تم کسی سے جا کر شکایت کروگی تو تمہاری بدنامی کا زیادہ ڈر ہے۔ میٹرن کو تو میں بھی سنبھال سکتی ہوں مگر سرجن مرتضیٰ تو بہت آفت شے ہے۔ اس کے تو بیوی بچے بھی اس کے ساتھ نہیں رہتے کہ ان سے جا کر بات کر لی جائے۔''

زینت آرا خود بھی اس الجھن کی سلجھن ڈھونڈنے میں ناکام ہو گئی تھیں مگر مریم ان کی آخری بات پر قدرے چونکی۔ اس کے ذہن میں اس مسئلے کا ہلکا سا حل نظر تو آیا تھا۔ ماہین مرتضیٰ لڑکی تھی اور اس کے مسئلے کو بخوبی سمجھ سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

کال بیل بجانے کے بعد وہ بے صبری سے دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ علامہ اقبال ٹاؤن میں واقع یہ چھوٹا مگر نہایت خوبصورت گھر سرجن مرتضیٰ کی بیوی کا تھا۔ مریم کو یہ گھر ڈھونڈنے میں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی تھی۔ اس نے پہلے فون کر کے گھر کی ملازمہ سے ایڈریس سمجھا تھا اور پھر وہ زینت آرا کے ساتھ یہاں تک چلی آئی تھی، مگر زینت آرا گھر کے اندر جانے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ وہ ڈاکٹر عادل کی وجہ سے سرجن مرتضیٰ کی اہلیہ سے ایک آدھ بار مل چکی تھیں کیونکہ ڈاکٹر عادل ان کی اہلیہ کے فرسٹ کزن تھے۔

''ان دونوں میاں بیوی کے درمیان علیحدگی بھی دراصل ڈاکٹر عادل کی وجہ سے ہوئی تھی۔ جن دنوں ڈاکٹر عادل نے اس ہاسپٹل میں اپنا ہاؤس جاب شروع کیا، ان ہی دنوں سرجن مرتضیٰ فارن سے اسپیشلائزیشن کر کے لوٹے تھے۔ سرجن مرتضیٰ کا ذہن شروع سے ہی کچھ مغربی اپروچ رکھتا تھا۔ ان کا چال چلن ابتداء سے ہی مشکوک تھا جسے وہ اپنی شاندار پرسنیلیٹی سے کیموفلاج کر کے رکھتے تھے۔ ڈاکٹر عادل نے ان کی وائف سے بس دو ایک افیئرز کی داستانیں کہہ ڈالیں، جن کی بنا پر ذرا سا تنازعہ طلاق تک جا پہنچا۔ ان حضرت نے طلاق دینے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ بے چاری شریف عورت بچے لے کر الگ ہو گئیں۔ اب تو خیر اپنا کوئی بھلا بزنس چلا رہی ہیں۔'' زینت آرا نے اسے بہت تفصیل سے سرجن مرتضیٰ اور ان کے گھریلو حالات کا قصہ سناتے ہوئے بتایا تھا۔

''جی...... آپ کو کس سے ملنا ہے؟'' دروازہ کھلنے کے بعد آواز پہلے سنائی دی تھی اور شکل بعد میں نظر آئی۔ وہ جو کوئی بھی تھیں، کافی پرنور چہرے والی خاتون تھیں۔ ہلکے فیروزی شلوار قمیص میں سفید کڑھائی والا دوپٹہ اوڑھے شاید جائے نماز سے ہی اٹھ کر آ رہی تھیں۔

''مجھے...... وہ...... مسز مرتضیٰ...... ماہین سے...... میرا مطلب ماہین مرتضیٰ سے؟'' ان کی کھوجتی آنکھوں نے مریم کو گڑبڑا دیا۔

''ماہین بیٹا سے! تم کون ہو بیٹی! ماہین کی کوئی نئی دوست ہو؟'' انہوں نے دروازہ پورا وا کر کے استفسار کیا۔ گویا اندر آنے کی اجازت بھی دی تھی اور ساتھ ہی ساتھ انکوائری بھی کر رہی تھیں۔

''جی...... جی میری ان کی زیادہ پرانی دوستی نہیں ہے۔'' وہ ان کے پیچھے چلتے ہوئے بول رہی تھی۔ انہوں نے اسے جس کمرے میں لا کر بٹھایا وہ دیکھنے میں ٹی وی لاؤنج لگ رہا تھا۔ دو ایک دروازے دکھائی دے رہے تھے اور عین درمیان سے سیڑھیاں بھی اوپر جاتی نظر آ رہی تھیں۔ مریم ان کے اشارے پر صوفے پر بیٹھ گئی۔ دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ جو بات وہ ماہین سے کرنے آئی تھی، اگر ماہین اس پر یقین نہ کرتی تو پھر مریم کے پاس کوئی جائے پناہ نہیں بچتی۔

''تمہاری اور اس کی پرانی دوسی ہوتی تو یقیناً وہ تمھیں اپنی شادی پر ضرور بلاتی اور تمھیں پتا ہوتا کہ دو روز قبل اس کی شادی ہو چکی ہے۔'' انہوں نے بہت اطمینان سے اس کا اطمینان غارت کیا۔

''شاید......؟ مم...... مگر...... کچھ روز قبل...... وہ ملی تھی، تب تو اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔'' مریم نے بے حد پریشانی کے عالم میں کہا۔ چاہنے کے باوجود بھی وہ گھبراہٹ پر قابو نہیں پا سکی تھی۔ ان خاتون نے اس کے انداز کو بغور دیکھا پھر گہری سانس بھر کر بولیں۔

''ارے بس، یہی تو ملال ہے۔ ہر کام جلدی میں کر دیا بڑی بیگم نے۔ بچی کے دل میں کتنے ہی ارمان تھے مگر بڑی بیگم کو نجانے کیا خدشات لاحق تھے۔ فون پر بس ثوبان بیٹے کی آواز سنائی دی۔ یہاں ہمیں بیٹھے بیٹھے بتا دیا کہ مبارک ہو، نکاح ہو گیا ہے۔ اگلے دن بچی کو جہاز پر چڑھا آئیں کہ جاؤ اپنے میاں کے پاس رہو، وہی تمھیں سنبھال سکتا ہے۔ بڑی بیگم کسی بات کی ٹھان لیں تو پھر کوئی طاقت انہیں نہیں روک سکتی۔ بچی کو لال جوڑا پہننے دیا نہ سنگھار کرنے دیا۔ خیر تم بتاؤ، خیریت سے آئی تھیں۔ آج کل روز ہی فون کر رہی ہے۔ کہتی ہے، اماں بی! میرا دل نہیں لگ رہا۔ بے چاری وہاں اتنی اداس ہے اور یہاں اماں جان اور بھیا کو پرواہ ہی نہیں۔ تم بتاؤ، کوئی پیغام ہے تو میں پہنچا دوں گی۔ خوش ہو جائے گی۔'' وہ ماہین کو یاد کر کے سچ مچ آبدیدہ ہو رہی تھیں۔ مریم کے جسم سے جان نکلتی جا رہی تھی۔ ماہین کے نام پیغام تو بہت اہم تھا مگر وہ پیغام دے نہیں سکتی تھی۔

''پانی، وانی لاؤں تمھارے لیے۔ ٹھہرو، میں تمھارے لیے کچھ لاتی ہوں۔''

انہیں شاید بہت دن بعد کوئی جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے دستیاب ہوا تھا۔ وہ بات مکمل کر کے کچن کی سمت چل دیں۔ مریم نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کیونکہ حقیقتاً اِسے بہت پیاس لگ رہی تھی۔ ان کے جانے کے بعد بھی وہ اپنے ہاتھوں کو تکتی رہی۔ قسمت اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی خوفناک مذاق کر رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا سب چھوڑ چھاڑ کر گھر بھاگ جائے پھر اس کے سارے ڈاکومنٹس جو ایڈمیشن کے وقت رکھ لیے گئے تھے۔ الاؤنس میں ملنے والی رقم جو مریم کے لیے تو صرف پاکٹ منی تھی، مگر بہت سی لڑکیوں کے لیے وہ ان



کی گھر میں آنے والی واحد کمائی تھی۔ ابتدا میں لیا جانے والا وہ حلف، سرجن مرتضیٰ کی دھمکی، پولیس کا خوف اسے نجانے کیا کیا چیز ڈرا رہی تھی۔ اسے بیٹھے بمشکل پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ دھیرے سے گنگنانے کی آواز آئی جو لحہ بہ لحہ تیز ہو رہی تھی۔ یقیناً کوئی گنگناتا ہوا سیڑھیاں اتر کر آ رہا تھا۔ مریم مزید چوکنا ہو کر بیٹھ گئی۔ اپنی سیاہ چادر کو اس نے کانوں کے قریب سے مزید آگے کی طرف سرکا لیا۔ حالانکہ جو کوئی بھی تھا، اس کی پشت کی طرف تھا۔ چند لمحے بعد مریم نے ایک لمبے مگر دبلے پتلے لڑکے کو اپنے عقب سے ہو کر اسی سمت میں جاتے دیکھا جہاں وہ عمر رسیدہ خاتون تشریف لے گئی تھیں۔ اسے ان دونوں کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔

''تمھیں وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھے گھر کی بچی لگتی ہے، کیسے اپنے آپ کو ڈھک کر بیٹھی ہے۔ کیا پتا تمہاری موجودگی پسند نہ کرے۔'' انہی خاتون کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ ماہین کی نانی تھیں مگر وہ ماہین کی والدہ کے لیے بڑی بیگم کا لفظ استعمال کر رہی تھیں۔ مریم ان کے اور ماہین کے رشتے کے متعلق زیادہ نہیں جان پائی تھی۔

''یہ بھی خوب کہی آپ نے۔ میں آپ کو ایسا لڑکا لگتا ہوں اور مجھے دیکھتے ہی ان کی ٹینٹ نما چادر میں بھی شگاف پڑ جائیں گے۔ حد کرتی ہیں آپ بھی اماں بی! محترمہ کے بارے میں اچھی طرح سے چھان بین بھی کی ہے کہ نہیں۔ کون ہیں، کہاں سے تشریف لائی ہیں، کس مقصد سے تشریف لائی ہیں؟'' وہ شاید جان بوجھ کر اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ ''اماں بی'' کے نام سے پکاری جانے والی خاتون نے کیا جواب دیا، مریم سن نہیں پائی۔

''واٹ، ماہین کی سہیلی......؟ اماں بی! محترمہ بنا رہی ہیں آپ کو۔ اللہ معافی، میں نے تو ساری زندگی ماہین کی ایسی کوئی سہیلی نہیں دیکھی۔ اتنی دقیانوسی تو اس کی سہیلی کی دادی بھی نہیں ہوں گی۔ دیکھو ذرا لاؤنج میں بھی اس طرح ٹینٹ اوڑھ کر بیٹھی ہیں، جیسے کسی کے چہلم میں دعا مانگ رہی ہوں۔ ارے اماں بی! مجھے تو یہ فراڈ لگ رہی ہیں۔ ماہین کی سہیلیاں ایسی نہیں ہیں۔'' وہ تیز تیز بول رہا تھا۔ مریم کا دل چاہا وہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے۔

''اچھا اب یہ اپنی بک بک بند کرو۔ سنی بیٹے! ہر ایک کو شکی نگاہ سے مت دیکھا کرو۔ میں دیکھ رہی ہوں چند دن سے بہت بدلے بدلے دکھائی دیتے ہو۔ ارے میرے بچے ہنستے کھیلتے اچھے لگتے ہو۔ شکر کرتی ہوں کہ اب بڑی بیگم سے بھی زیادہ درازی نہیں کرتے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بے وجہ بولتے چلے جاؤ۔''

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں بعد وہی خاتون اس کے سامنے ایک ٹرے میں جگ اور گلاس لیے کھڑی تھیں۔ مریم نے بس ایک نظر ان کی جانب دیکھا اور پھر دوبارہ سے اپنے ہاتھوں کو تکنے لگی، کیونکہ وہ لڑکا بھی لاؤنج میں آ کر اس کے بالکل سامنے بیٹھ گیا تھا۔ مریم نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا مگر شارٹس میں ملبوس ہونے کی وجہ سے اس کی گھٹنوں تک برہنہ ٹانگوں پہ ایک نظر ضرور پڑی تھی۔ اس کے بعد اس نے دوسری نظر نہیں ڈالی، مگر خود اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس لڑکے کی گھورتی ہوئی نگاہوں کا مرکز ہے۔

''پانی پی لو بیٹی!'' شربت سے بھرا ایک گلاس اسے انہی شفیق لہجے والی خاتون نے پکڑایا۔

''نہیں، اب میں چلتی ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' وہ یکدم ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سامنے بیٹھا وہ لڑکا بھی ہڑبڑا کا اٹھا۔

''آ......آپ......بیٹھے تو......سہی......پلیز......'' اس نے عاجزی سے کہا۔ اس کا لہجہ یکدم ہی بدلا تھا۔ مریم نے بہت وقت سے اس کی جانب دیکھا۔ نجانے کیوں اس لڑکے کے انداز نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔ اس کے گورے رنگ پر بڑھی ہوئی شیو، ننھی ننھی چیونٹیوں کی مانند لگ رہی تھی۔ اس کے بال بے حد چکنے ہو رہے تھے اور اس نے انہیں پیچھے باندھ رکھا تھا۔ مریم کو یاد آیا کہ یہ لڑکا اس نے شاید پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔

''آپ ماہین کی فرینڈ ہیں؟ آپ کو پہلے تو کبھی ماہین کے ساتھ نہیں دیکھا۔ آپ......آپ تو شاید نرس ہیں نا۔ میرا مطلب آپ جاب کرتی ہیں نا؟''

وہ بالکل بدلے ہوئے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ مریم نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی خوشی اور اشتیاق پھیلا ہوا تھا۔ اماں بی نے بھی کسی قدر حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ لفظ ''نرس'' پر وہ بے طرح چونکی تھیں۔

''ہیں بیٹا! تم نرس ورس ہو کیا؟ ماہین سے کہاں ملاقات ہو گئی تھی تمہاری؟'' جن شکوک کا اظہار وہ لڑکا کچن میں کر رہا تھا، اماں بی ان شکوک کا شکار اب ہونے لگی تھیں۔

''اماں بی! آپ پہلے انہیں پانی تو دیجیے۔'' اس نے اماں بی سے کہا اور پھر ان کا انتظار کیے بغیر خود اٹھ کر گلاس اسے پکڑا دیا۔

''آپ پلیز کولڈ ڈرنک پیجیے۔ بائی داوے، آپ نے مجھے پہچانا۔ آئی ایم سمیع......آپ میرے پاپا کے ہاسپٹل میں ہی ہوتی ہیں نا......میں بلڈ ڈونیشن کے لیے آیا تھا آپ کا نام مریم ہے نا؟'' وہ لہجے میں بے پناہ چاہت سموئے کہہ رہا تھا۔ اس کے انداز لحہ لحہ مریم کو مزید محتاط کر رہے تھے۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ لڑکا جانا پہچانا کیوں لگ رہا ہے۔ یہ وہی لڑکا تھا، جسے ''لطیفہ'' سمجھ کر اس نے تزئین کو بہت شوق سے سنایا تھا۔

''آپ کو یاد آیا...... ہم پہلے مل چکے ہیں نا؟'' وہ امید کا ایک جہان آنکھوں میں بسائے پوچھ رہا تھا۔ مریم نے بمشکل مسکرانے کی کوشش کی۔

''مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ آپ ماہین کی دوست ہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ سرجن مرتضیٰ کا بیٹا تھا مگر ان کی نسبت وہ کسی قدر معصوم دکھائی دیتا تھا۔ اس کے انداز میں بچپنا بہت زیادہ تھا۔ مریم نے آدھا گلاس اسکواش پینے کے بعد اسے میز پر رکھ دیا۔

''مجھے جانا ہے۔'' اس نے بس یہی کہا تھا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ پلیز ابھی مت جایئے۔'' وہ لڑکا اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''نہیں، مجھے بہت کام ہے۔''



اس نے عجلت سے کہا اور پھر خود ہی باہر کی سمت چل دی۔ سمیع عرف سنی اس کے پیچھے پیچھے تھا جبکہ اماں بی وہیں صوفے پر بیٹھی حیران پریشان ان دونوں کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ مریم کا انداز تو حیران کن تھا ہی، سنی کا انداز حیران کن ''ترین'' تھا۔

☆ ☆ ☆

''اماں بی! میں کیسا لگ رہا ہوں۔'' اس نے قدم آدم آئینے میں اپنے سراپے کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے ان سے دریافت کیا۔ وہ چند منٹ قبل اس کے بیڈروم میں اسے کھانے کے لیے بلانے آئی تھیں مگر اب اس کی سج دھج دیکھ کر حیران کھڑی تھیں۔ سیاہ ڈنر ٹو پیس میں اپنی لہراتی زلفوں کو اس نے بلو ڈرائی کر کے کندھوں پہ پھیلا رکھا تھا۔ اپنے پارلر سے وہ خاص طور سے آج فرنچ کٹ بنوا کر آیا تھا۔ اس کے دوستوں کا خیال تھا کہ وہ فرنچ کٹ میں بہت ڈیسنٹ اور مرد لگتا ہے۔ وہ ویسے بھی اپنی ''لڑکوں'' والی لک سے تنگ تھا۔ اس کا ذاتی خیال تھا، لڑکیاں لڑکوں کے بجائے مردوں کو زیادہ پسند کرتی ہیں۔

''میں ڈیشنگ لگ رہا ہوں نا اماں بی!'' اس نے Eternity کی بوتل اٹھا کر اپنے اوپر خوب اسپرے کرتے ہوئے پھر پوچھا۔

''ارے بیٹا! اس وقت اتنی خوشبو لگائے کدھر جا رہے ہو۔ تمھارے بالوں سے تو میں غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔ کسی جن بھوت نے پشت سے دیکھ لیا تو عاشق ہونے میں لمحہ بھر ہی لگے گا بیٹا!'' اماں بی کو کافی سے زیادہ حیرت ہو رہی تھی۔ اماں بی کی بات پر اس نے زبردست قہقہہ لگایا جو کہ اس کے اچھے موڈ کی غمازی کر رہا تھا۔

''میں ایک پری کے ساتھ ڈیٹ پر جا رہا ہوں، جن بھوت کا چانس ہی نہیں بنتا۔ آپ فکر مت کیجیے۔'' وہ پلٹ کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوا پھر اپنا سیل فون اٹھایا، گاڑی کی چابی اٹھائی۔ آئینے میں خود کو ایک بار پھر دیکھا اور دروازے کی سمت بڑھا مگر ایک دم سے دوبارہ پلٹ کر آیا اور اماں بی کے قریب آ کر ان کی گردن میں باہیں حمائل کرتے ہوئے پیشانی کو چوما۔

''اماں بی! پلیز پلیز ممی کو نہیں بتایئے گا۔'' وہ سفارشی انداز میں کہہ رہا تھا پھر ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گیا۔ ''یہ حادثاتی ڈیٹ'' تو اس کی زندگی میں بغیر کسی منصوبہ بندی کے آئی تھی۔ آج دوپہر کو ماہین کی کسی دیرینہ سہیلی کی صورت میں اس مہربان پری کو دیکھ کر وہ حیران و پریشان ہو گیا تھا۔ ایسا تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ لڑکی جس کے عشق میں وہ گوڈے گوڈے ڈوب چلا ہے، خود چل کر اس کے گھر آ سکتی ہے۔ اس کی تو گویا لاٹری نکلی تھی مگر مریم نے شاید اس کے اور اماں بی کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو سن لی تھی، تب ہی وہ کافی کنفیوز دکھائی دے رہی تھی۔ سمیع کو پہلی مرتبہ اپنی بڑبولی طبیعت پر غصہ آیا۔ وہ اپنے رویے کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔ سمیع اسے دروازے تک چھوڑنے آیا۔

''آپ......ماہین کے بھائی ہیں؟'' اس نے اچانک پوچھ لیا تھا اور سمیع نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''سگے بھائی؟'' مریم نے ایک اور سوال پوچھا۔

''جی...... ایک دم سگا بھائی۔'' سمیع نے لہجے میں شرارت سموئی تھی۔

''مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے مگر یہاں پر نہیں۔'' اس نے گردن جھکا کر بہت دھیمی آواز میں کہا۔ سمیع کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ بات تو اسے بھی کرنا تھی۔

''پھر کہاں پر...... کسی ریسٹورنٹ میں...... میں آپ کو پک کر لوں گا۔'' اس نے فٹافٹ پروگرام ترتیب دیا۔ بات ڈنر پر منتج ہوئی۔ سمیع نے مریم کا ایڈریس وغیرہ سب پہلے ہی حاصل کر لیا تھا بلکہ وہ تو دو تین مرتبہ ہاسپٹل جا کر اسے دیکھ بھی چکا تھا۔ عشق کا بھوت اس کے سر پر سوار تھا، اسی لیے اب وہ سج دھج کر نئی آن بان سے گھر سے نکلا۔ اس کی ذاتی گاڑی نہیں تھی مگر وہ اپنے پاپا کی گاڑی مانگ کر لایا تھا۔ ہوٹل کا بل ادا کرنے کے لیے کچھ اپنی پاکٹ منی تھی اور کچھ ممی سے منت سماجت کر کے حاصل کی تھی۔ اس کی جیب میں ٹھیک ٹھاک رقم سے بھرا والٹ، موبائل فون اور بہترین برانڈ کی سگریٹ کی ڈبیا بھی تھی۔ ایک دوست نے کسی اچھے وقت میں یہ گر کی بات بتائی تھی کہ لڑکیاں سگریٹ پینے والے لڑکوں کو بہت پسند کرتی ہیں۔ وہ بہت دھیمی رفتار میں ڈرائیو کر رکھا تھا کیونکہ جو ٹائمنگ سیٹ ہوئی تھی، اس کے مطابق ابھی کچھ وقت باقی تھا اور پھر ابھی اسے مریم کے لیے بکے بھی لینا تھا۔

☆ ☆ ☆

''مجھے ڈر لگ رہا ہے زینت آپا! میں کیا کروں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' اس نے تقریباً روتے ہوئے زینت آپا سے فریاد کی۔ وہ جب سے سرجن مرتضیٰ کی اہلیہ کے گھر سے آئی تھی، اسی ایک فقرے کی گردان کر رہی تھی۔ زینت آرا خود سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ اس کی مدد کریں تو کیسے کریں۔ میٹرن کو تو انہوں نے مریم کی جھوٹی سچی رشتہ داریوں کے متعلق بتا کر کسی قدر محتاط کر دیا تھا، مگر سرجن مرتضیٰ کا وہ کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ تھک ہار کر یہی حل نظر آ رہا تھا کہ ان کے نوعمر بیٹے کو ساری صورت حال سے آگاہ کر کے مدد مانگی جائے۔ مریم اس سے ملاقات کا وقت تو طے کر آئی تھی مگر اب الجھن میں پڑی تھی کہ اس لاابالی لڑکے کو بتائے تو کیا بتائے۔

''اسے میری بات سمجھ میں ہی نہیں آئے گی اور سمجھ میں آ بھی گئی تو وہ میری بات کا یقین نہیں کرے گا۔ وہ بدھو سا لڑکا ہے، میں اسے کیسے یہ سب بتاؤں گی۔'' اس نے پھر کہا۔ اس کی آنکھیں روتے رہنے کے باعث بہت سرخ ہو رہی تھیں۔ اور گوری رنگت پر یہ سرخ آنکھیں اس کے حسن کو مزید دوآتشہ کر رہی تھیں۔

''تمھارے پاس یہی ایک آخری موقع ہے۔ اس کو بھی گنوا دو گی تو پھر کیا کرو گی۔ اچھا چلو میرے کہنے پر ایک بار اس سے بات کر کے تو دیکھو۔'' انہوں نے سرجن مرتضیٰ کے بیٹے کے بارے میں ڈاکٹر عادل سے کافی کچھ سن رکھا تھا۔ انیس سالہ سمیع مرتضیٰ اپنے باپ سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتا تھا۔ مریم ان کے کہنے پر بمشکل اٹھی۔ منہ ہاتھ دھونے اور بال باندھنے میں اسے بمشکل دس منٹ لگے تھے۔ وہ اپنی سیاہ چادر اوڑھ کر تیار ہو گئی تھی۔ سوا سات کے قریب اسے بلاوا مل گیا تھا۔



''آپ کے مہمان آئے ہیں۔'' وہ زینت آرا کی طرف یاس بھری نگاہ ڈالتی باہر کی سمت چل دی۔

سمیع مرتضیٰ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولے باہر ہی کھڑا تھا۔ اس کی ''تیاری'' دیکھ کر مریم کو عجیب سی الجھن ہوئی۔ وہ ''ولیمے کا دولہا'' لگ رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر وہ بشاشت سے مسکرایا مگر پھر آنکھوں میں الجھن آمیز مایوسی نے ذرا کی ذرا جھلک دکھائی۔ اس نے مریم کو سر سے پیر تک بغور دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وائٹ للی کا بوکے تھا۔

''میں لیٹ تو نہیں ہوا نا؟'' گاڑی کے بالکل قریب پہنچنے پر اس نے پوچھا۔ مریم نے صرف نفی میں گردن ہلائی اور پھر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے وہ بوکے تھام لیا۔

اس نے خود مریم کے لیے گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے اندر بٹھایا۔ اپنی نشست سنبھالنے کے بعد اس نے سب سے پہلے کیسٹ پلیئر آن کیا۔ ایک انگلش نمبر دھیمی سی آواز میں بجنے لگا۔ اس نے بہت تیز پرفیوم لگا رکھا تھا۔

''ایک بات پوچھوں؟'' سمیع نے سگنل پر گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ مریم کو اس کے انداز پہلے ہی کچھ چونکا رہے تھے۔ اس سوال نے اسے مزید چونکایا۔

''آپ ہمیشہ اتنی بڑی بیڈ شیٹ...... میرا مطلب ہے اتنی بڑی چادر لے کر باہر نکلتی ہیں؟'' مریم نے اس کی جانب دیکھا، جہاں کسی قدر خفت کی سرخی نمایاں تھی۔ وہ اس پر طنز نہیں کر رہا تھا، مگر اس کے حلیے سے عجب سی تذبذب میں گھرا ہوا ضرور نظر آ رہا تھا۔

''آئی ایم سوری...... پلیز آپ میری بات کا غلط مطلب مت لیجئے گا۔ آپ اس طرح بھی بہت اچھی لگ رہی ہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ مریم خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی۔ باقی کا راستہ خاموشی میں کٹا۔ وہ دل ہی دل میں الفاظ ترتیب دیتی رہی۔

گاڑی ایک وسیع و عریض ہوٹل کے سامنے جا رکی تھیں۔ مریم نہیں جانتی تھی، وہ کون سا ہوٹل ہے مگر اس کے باہر ایک بڑا سا پارکنگ لاٹ اور وہاں گاڑیوں کی لمبی قطار ثابت کر رہی تھی کہ کوئی شاندار جگہ ہے۔ سمیع نے پارکنگ لاٹ میں بڑی مشکل سے جگہ حاصل کی تھی، لیکن جب دروازہ کھول کر باہر اترنے کی باری آئی تو مریم نے گھبرا کر کہا۔

''مم...... میں اندر نہیں جاؤں گی۔ ہم یہیں بات کر لیتے ہیں۔''

''آپ اتنا گھبرا کیوں رہی ہیں مریم! اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔ اطمینان سے بات کریں گے۔ فکر مت کیجئے میں آپ کو کھا نہیں جاؤں گا۔'' اس کے لہجے میں شوخی در آئی۔ اس شوخی کا مفہوم مریم کے لیے قطعاً ناقابل فہم تھا۔ وہی خوف جو اس کے دل میں سرجن مرتضیٰ کے حوالے سے تھا، ایک دم ہی سمیع مرتضیٰ سے ویسا ہی خوف محسوس ہوا۔

''نہیں، آپ واپس چلیے۔ پلیز آپ واپس چلیے۔'' مریم نے منت بھرے لہجے میں کہا۔ سمیع نے الجھ

کراس کی جانب دیکھا۔

یہ کیسی ڈیٹ تھی جس میں لڑکی نے ایک بار بھی مسکرا کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا، اس کی تیاری کی تعریف کی تھی نہ ہی اس کے لائے ہوئے پھولوں کو سراہا تھا۔ وہ تو گھر سے نہ جانے کتنے پلان بنا کر آیا تھا مگر یہاں تو سب کچھ الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔

''لڑکیاں نخرے بہت کرتی ہیں۔ آرام سے کبھی اپنے دل کی بات نہیں کہتیں۔ ایک لڑکی آئی لو یو کہنے میں جتنا وقت لیتی ہے، ایک لڑکا اتنی دیر میں کسی دوسری لڑکی سے شادی کر کے ابا جان بھی بن چکا ہوتا ہے۔'' اسے کاشف نے یہ بات خاص طور پر بتائی تھی۔ سمیع نے گہری سانس بھر کر مزید کوئی استفسار کیے بغیر گاڑی واپس موڑ لی۔ اسے کاشف کی بات کا یقین آتا جا رہا تھا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ مریم کچھ تو بولے کہ بہر حال یہ ''ڈیٹ'' اس کے کہنے پر ارینج کی گئی تھی، مگر وہ خاموش تھی یا دل نخواستہ وہ بھی خاموش تھا۔ گاڑی اس نے دوبارہ وہیں جا کر روکی، جہاں مریم کو پک کیا تھا۔ مریم اب بھی گاڑی میں ہی بیٹھی رہی۔ اپنی انگلیوں کو مروڑتی وہ عجب شش و پنج میں گھری تھی۔

''مجھے...... آئی ایم سوری...... میں نے آپ کا قیمتی وقت...... ضائع کیا۔'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بات کر رہی تھی۔

''اوہ کم آن مریم؟ میں پریذیڈنٹ نہیں ہوں کسی ملک کا، اور میرا وقت بھی بالکل قیمتی نہیں ہے۔'' اس نے سر جھٹک کر کہا۔ مریم نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے نقوش میں سرجن مرتضیٰ کی شباہت تھی۔ وہ ماہین مرتضیٰ کی طرح باتونی نہیں تھا بلکہ وہ کسی قدر معصوم اور کھلنڈرا سا لڑکا لگتا تھا۔ مریم اس سے اس کے والد محترم کے بارے میں کیسے بات کرتی۔

''میں جانتا ہوں آپ کو مجھ سے کوئی بات کرنی ہے۔ ان فیکٹ بات تو مجھے بھی کرنی ہے۔ اینڈ آئی ایم شیور، ہمیں ایک دوسرے سے ایک ہی بات کرنی ہے۔ مجھے بھی آپ ہی کی طرح...... یو نو...... میں بھی تھوڑا...... کانشس ہو رہا ہوں۔'' وہ کندھے اچکا کر مسکراتے ہوئے بولا۔ مریم نے پوری آنکھیں وا کر کے اس کی جانب دیکھا، وہ کیا کہنے والا تھا۔

''آپ کچھ مت کہیے، میں نے بھی کچھ نہیں کہا۔ بس مجھے اتنا بتا دیجیے کہ میرے اسٹیبلش ہونے کا انتظار کر لیں گی؟'' اس نے آخری بات بہت تیزی سے کہی۔ مریم اس نئی افتاد پہ حیران پریشان ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''ویسے تو ممی کی سب دولت میری ہے، پاپا کا بھی سب کچھ میرا ہے لیکن پھر بھی میں ابھی شادی نہیں کر سکتا۔'' وہ مزید کہہ رہا تھا۔ اس سے زیادہ سننے کی مریم میں ہمت نہیں تھی۔ وہ بے وقوف سا لڑکا بات کو کہاں سے کہاں لے گیا تھا۔

''آپ...... آپ میری بات سمجھے نہیں۔'' اس نے وضاحتی انداز میں لب کھولے، مگر پھر بھی کچھ کہہ



نہ پائی۔ لاتعداد آنسو پلکوں کی باڑ توڑنے کو بے تاب تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونا شروع کر دیا اور لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے لبوں سے نکلنے لگے۔ اب بھی وہ خاموش رہتی تو نجانے مزید کیا نقصانات ہوتے۔

سسکیوں کے اٹک اٹک کر وہ اسے سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

''آپ جھوٹ بول رہی ہیں، بکواس کر رہی ہیں آپ!'' سمیع مرتضیٰ نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چلا کر کہا۔ اس کا چہرہ بے انتہا سرخ ہو رہا تھا یقیناً وہ ضبط کی آخری منزل پہ تھا۔

☆ ☆ ☆

''مے آئی کم ان پاپا!'' اس نے ذرا سی گردن دروازے سے اندر کرتے ہوئے اجازت طلب کی۔ مرتضیٰ احسن کسی ایکسرے رپورٹ کو دیکھ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر بے طرح چونکے۔ فوراً گھڑی کی جانب نظر کی۔ اس وقت تو وہ کبھی بھی ان سے ملنے ہاسپٹل نہیں آیا تھا۔

''آؤ ینگ مین، اندر آ جاؤ'' تمہیں کب سے اجازت کی ضرورت پڑنے لگی۔'' انہوں نے بشاش لہجے میں کہا۔ سمیع کمرے میں داخل ہو گیا۔ انہوں نے حیرانی سے اس کے حلیے کا جائزہ لیا۔ اس نے خود کو اس حلیے میں ڈھالنے کے لیے یقیناً ٹھیک ٹھاک محنت کی تھی۔

''بہت ہینڈسم لگ رہے ہو۔'' انہوں نے مسکرا کر اس کی تعریف کی مگر وہ مسکرایا تک نہیں۔ اس کی آنکھوں میں ناقابل فہم قسم کے تاثرات تھے۔ وہ خاموشی سے ان کے مقابل بیٹھ گیا۔

''ماہین کے نکاح کا فنکشن کیسا رہا۔ سنا ہے تمہاری ممی نے بہت رقم خرچ کی ہے۔ جھوٹے منہ ہمیں انوائٹ کر لیتیں۔ ان کے خزانے میں کوئی کمی تو واقع نہ ہوتی اور پھر ماہین کو دیکھو، جاتے ہوئے ایک بار مجھ سے مل ہی لیتی مگر وہ بھی اپنی ممی کی طرح مجھے کچھ خاص پسند نہیں کرتی۔'' وہ شکوہ کناں انداز میں کہہ رہے تھے۔ سمیع نے ان کی بات کی تائید کرنے کے بجائے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ اس کے اندر اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ مریم چوہدری نے اسے جو کچھ بتایا تھا، وہ بہت شرمناک تھا۔ اس کے پاپا کے بارے میں اس کی ممی کی رائے ہمیشہ ہی کچھ مشکوک رہی تھی۔ عادل بھائی سے اس نے کئی مرتبہ اپنی ممی اور پاپا کے بیچ موجود اصل تنازعے کی بابت پوچھا مگر انہوں نے بھی اسے ہمیشہ ٹال دیا تھا۔

''تمہاری ماں میں بہت برداشت ہے بیٹا! مگر کچھ باتیں عورتیں کبھی برداشت نہیں کرتیں۔''

اماں بی نے ایک بار اس سے کہا تھا اور تب وہ ان کی بات بالکل بھی نہیں سمجھا تھا۔ اس کے پاپا اتنے قابل، اتنے ڈیشنگ، انتہائی شاندار انسان تھے۔ ان میں کوئی ایسی خامی نہیں تھی جسے ناقابل برداشت کہا جاتا۔ وہ آج تک اپنی ممی کو ہی ناقابل برداشت سمجھتا تھا جو انتہائی جذباتی عورت تھی۔ انہیں ہمیشہ یہ خوف لاحق رہتا تھا کہ ان کا بیٹا انہیں چھوڑ کر ان کے سابقہ خاوند کے ساتھ رہنے لگے گا۔ سمیع ہمیشہ سوچتا تھا کہ اس کی ممی صرف اس لیے خائف ہیں کہ وہ غلطی پر ہیں۔ اگر وہ غلط نہ ہوتیں تو اس قسم کے خدشات کا شکار کیوں ہوتیں۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ اس طرح سے میری طرف کیا دیکھ رہے ہو۔" انہوں نے سمیع کی آنکھوں میں پھیلی سرد مہری کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یس...... آئی ایم فائن...... آپ کیسے ہیں؟" اس نے شہادت کی انگلی سے میز کی ہموار سطح کو کھرچتے ہوئے کہا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ یہ کیس ہسٹری اسٹڈی کر رہا تھا۔ یہ بہت کمپلیکیٹڈ کیس ہے۔ میری زندگی میں تو بس یہی کچھ رہ گیا ہے۔ آج کی رات اسی کیس کو اسٹڈی کرتے گزر جائے گی۔ کبھی کبھی تو شکر کرتا ہوں کہ لوگ ہڈیوں کے عارضے میں بکثرت مبتلا ہوتے ہیں، وگرنہ زندگی میں میرے پاس تو کرنے کے لیے کچھ نہ ہوتا۔ میرا تو وقت ہی نہ گزرتا۔" انہوں نے ہمیشہ کی طرح لہجے میں تمام تر محرومی کو سموتے ہوئے دکھڑا رو دیا۔

"میں خود بھی اکثر یہی سوچتا ہوں کہ آپ کا وقت گزرتا کیسے ہوگا۔" اس نے سابقہ انداز میں کہا۔ اب کی بار مرتضیٰ احسن دل ہی دل میں کچھ جز بز ہوئے۔ سمیع بات بہت سادہ کر رہا تھا مگر اس کا انداز قطعاً سادہ نہیں تھا۔

"اچھا اب میرے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بس دس منٹ میں یہاں سے آف ہو رہا ہوں پھر کسی اچھی جگہ ڈنر کے لیے چلتے ہیں۔" انہوں نے اسے تسلی دی۔ سمیع نے گہری سانس بھری۔ اس کا باپ اس کے سامنے تھا۔ اسے ان کے چہرے پر ہمیشہ ایک تازگی، ایک نور بکھرا نظر آتا تھا جو بہت خوش قسمت لوگوں کے چہرے پر ہوتا ہے۔ وہ اس چہرے سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ چہرہ تھا جو اسے زندگی میں کسی مقام پر مایوس نہیں ہونے دیتا تھا اور اب یہی چہرہ اسے یکدم سیاہ کیوں لگنے لگا تھا۔ تمام تر وجاہت و وقار کے باوجود اس کا سراپا یکدم دھندلا کیوں ہو رہا تھا۔ اس کی ممی تمام زندگی اشاروں میں اسے بہت کچھ بتانے کی کوشش کرتی رہیں، مگر اسے کبھی یقین نہ آیا اور گھنٹہ بھر پہلے ایک لڑکی نے آنسوؤں کی روانی میں اسے جو کچھ بتایا تھا، وہ نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں تھا۔

"پاپا! مجھے...... آپ کے ساتھ ڈنر نہیں کرنا۔" اس نے قطعیت سے کہا۔ مرتضیٰ احسن نے استفہامیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

"مجھے آپ کے ساتھ...... ایک بات کرنی ہے...... بہت ضروری۔" وہ اب کی بار ان کی جانب دیکھ کر بات نہیں کر پایا تھا۔ وہ گناہ گار نہیں تھا مگر شرمساری اسے اس طرح گھیرے ہوئے تھی جیسے وہی گناہ گار ہے۔

"مجھے آپ کو کسی سے ملوانا ہے۔" اس کی بات پر مرتضیٰ احسن نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اس کا کوئی افیئر چل رہا تھا، یہ بات تو وہ جانتے ہی تھے۔

"شیور...... وائی ناٹ ڈیئر! تمہاری خاطر میں کسی سے بھی مل سکتا ہوں۔" انہوں نے بہت محبت سے کہا۔

"پاپا! میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے لڑکی بھی پسند کر لی ہے۔ اندر آجائیے مریم!" اس کی



آواز مزید دھیمی ہوئی تھی۔ لہجے میں نمی کی آمیزش تھی۔ مرتضیٰ احسن نے اسے چونک کر دیکھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کی سمت چل دیا۔ دروازہ کھول کر اس نے کسی کو اندر آنے کے لیے کہا۔

"پلیز مریم! اندر آجائیے، کوئی آپ کو کچھ نہیں کہے گا اور اگر کوئی آپ کو کچھ کہے گا تو میں اس کے ہاتھ توڑ دوں گا۔" آخری بات اس نے ان کی جانب دیکھ کر کہی تھی۔ کمرے کے اندر آنے والی شخصیت کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ ان کو لگنے والا حیرت کا جھٹکا بہت شدید تھا۔

"پاپا! میں مریم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، آپ ان کو بخوبی جانتے ہیں۔ مجھے امید ہے آپ کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔ لیکن مریم کو ذرا سا اعتراض ہے۔ آپ کے کسی دوست کو کچھ دن...... کے لیے مریم کی ضرورت......" وہ اپنی بات مکمل نہیں کر پایا تھا جبکہ مرتضیٰ احسن ہکا بکا ہو کر اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔

"مریم کی ضرورت ہے نا آپ کے دوست کو...... آپ ہی کی عمر کا ہوگا نا وہ۔ میں نے مریم سے کہہ دیا ہے،، وہ آپ کے دوست کے پاس جا سکتی ہے۔ جا سکتی ہے نا پاپا! بولیے نا پاپا؟" اب کی بار شاید اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے تھے۔

"کیا بکواس ہے یہ سب۔ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کون ہے یہ لڑکی، دو ٹکے کی نرس۔ یہ مجھ پر تہمت لگا رہی ہے۔" وہ چلا کر بولے۔

"پاپا! میں...... آپ کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ آپ ایسے تو نہیں تھے پاپا! یہ تو آپ کی بیٹی کے جیسی ہے۔ یہ تو آپ کے لیے ماہین کے جیسی ہے۔ ماہین کہتی تھی، آپ اسے اچھے نہیں لگتے۔ آپ کی موجودگی میں اسے الجھن ہوتی تھی۔ کیا اسے بھی ایسی ہی الجھن ہوتی ہوگی جیسی مریم کو آپ کی موجودگی میں ہوتی ہے۔ کہیے نا پاپا!" وہ رونے لگا تھا۔ اچھا خاصا لمبا چوڑا لڑکا روتا ہوا کس قدر عجیب لگ رہا تھا۔

"یہ بکواس کر رہی ہے سنی! میرے، بیٹے...... یہ چالاک عورتیں تم ان کی چالاکی کو نہیں سمجھ سکتے یہ......" مرتضیٰ احسن کو خود سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو کس طرح وضاحت دیں۔ وہ صفائی سے مکر گئے تھے۔ انہوں نے مریم کی کہانی کو گھڑا ہوا افسانہ قرار دیا تھا مگر کب تک...... وہ بہت دیر تک سمیع کے سامنے ڈٹے نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ ان کے سامنے بیٹھا بلک بلک کر رو رہا تھا۔ نفس کے مارے ہوئے، برائی کی ذلت سے مالا مال شخص کو بیٹے سے محبت تھی، اسی لیے اس نے اب تک، خود کو بیٹے کے سامنے دیوتا بنا کر پیش کیا ہوا تھا اور اب سیاہ چادر میں لپٹی سفید لباس میں ملبوس مسیحائی کی علامت ایک نرس ان کے سارے جھوٹے وقار کو لمحہ بھر میں مٹی میں ملا گئی تھی۔ انہیں بازی کے اس طرح پلٹ جانے کی امید نہیں تھی۔ ان کا بیٹا ان کا حریف کے روپ میں ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ مریم چوہدری نے ان دونوں کی جانب دیکھا۔

"شیطان کے یہاں ہمیشہ ہی شیطان جنم نہیں لیتا۔" اس نے اپنی نم آنکھوں کو صاف کیا۔ اس کا مسئلہ کسی اور کا مسئلہ بن چکا تھا۔ وہ ان دونوں کو چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

اس بات کو تقریباً ساڑھے تین سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ان ساڑھے تین سالوں میں اس کہانی سے جڑے تمام افراد کی زندگی میں کسی قدر سکون آچکا ہے۔ مریم چوہدری جو اسی روز واپس اپنے گھر بھائی پھیرو چلی گئی تھی، اس کے لیے وہ خونناک چھوٹا سا حادثہ ہی کافی تھا۔ اس کے سارے عزائم، سارے خواب پل بھر میں خاک ہو گئے تھے۔ اس نے اگرچہ بھائی پھیرو جانے سے قبل تمام باتوں کو اپنے اندر دفن کر دیا تھا مگر پھر بھی اس کی ذہنی حالت کافی مخدوش تھی۔ اس نے حیدر کو سب واقعات مکمل تفصیل کے ساتھ بتا دیے تھے۔ اس کی اور حیدر کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے گھر میں خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔

تزئین بخاری اپنے شوہر کے ساتھ دمام میں مستقل سیٹل ہو چکی ہے۔ اس کے دل میں اگرچہ اپنی ماں سے چھپ کر کورٹ میرج کرنے کا ملال باقی ہے۔ مگر پھر بھی وہ مطمئن ہے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو اس کی شادی بھی اس کی بہن کی طرح ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ کر دی جاتی۔

روبینہ یاسمین کو نرسنگ کا چار سالہ کورس مکمل کیے ایک سال ہو چکا ہے۔ وہ اب بھی وہیں ہے۔

سمیع مرتضیٰ آج کل سڈنی میں ہے۔ اس کی زندگی میں بہت ٹھہراؤ آچکا ہے۔ وہ پہلے کی طرح غیر ذمہ دار اور کھلنڈرا نہیں رہا۔ اس کی ممی بھی اس کے ساتھ سڈنی میں ہوتی ہیں۔ انہیں اپنے بیٹے پر فخر ہے۔ گزشتہ ساڑھے تین سالوں نے اسے ایک فرمانبردار بیٹے کے روپ میں ڈھال دیا ہے۔ اس کی ممی کو اپنے ان بے جا خدشات پر ہنسی آتی ہے جو انہوں نے خواہ مخواہ سمیع کے حوالے سے پال رکھے تھے۔ وہ بھی اپنے پاپا سے اتنی ہی نفرت کرتا ہے جتنا کہ اس کی ممی۔

سلطانہ (میٹرن) کا چند دن پہلے بائی پاس ہوا ہے۔ ڈاکٹرز بہت زیادہ پر امید نہیں ہیں۔ تمام تر کوشش کے باوجود ان کی صحت میں کوئی بہتری نہیں آپا رہی۔ ان کے گھر میں ان کے لیے بہت ''پڑھائی'' ہو رہی ہے مگر ''پڑھائی'' بھی ادویات کی طرح بے اثر ہے۔

سرجن مرتضیٰ اب بھی اس ہاسپٹل کے ایک اہم ستون گردانے جاتے ہیں۔ وہ اب بھی اتنے ہی شاندار ہیں جتنے کہ ساڑھے تین برس پہلے تھے۔ ان کو دیکھ کر یقین آجاتا ہے کہ کچھ لوگوں کا وقت بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ اب بھی اسی طرح پارٹیز میں شرکت کرتے ہیں اور سوشل سرکل میں موو کرتے ہیں جیسے پہلے کرتے تھے۔ ان سے کسی کو شکایت نہیں ہے، سوائے ان سائیکوتھراپسٹ کے جن کی ہدایات پر سرجن مرتضیٰ بالکل عمل نہیں کرتے۔ سرجن مرتضیٰ کو رات بھر نیند نہ آنے کی بے ضرر سی بیماری ہے، جس کا اثر ان کی آئی سائٹ پر پڑا ہے اور اب انہیں زیادہ موٹے عدسے والا چشمہ استعمال کرنا پڑتا ہے مگر ایسی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کی رسی اللہ نے ابھی تک ڈھیلی رکھی ہوئی ہے۔

زینت آرا ابھی تک اسی ہاسپٹل میں ہیں۔ ان کے عزم اور حوصلے میں رتی برابر فرق نہیں آیا۔ وہ آج بھی نئی آنے والی اسٹوڈنٹ نرسز کے لیے مشعل راہ ہیں۔ وہ آج بھی چھوٹے چھوٹے دیہاتوں سے آنے والی لڑکیوں کو بڑے بڑے مصائب سے بچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کے پاس بہت سے روپے نہیں ہیں مگر وہ



رات کو بہت پرسکون نیند سوتی ہیں۔ ایسی نیند جو بہت نصیب والوں کو نصیب ہوتی ہے۔

ان سب چیزوں کے علاوہ جو چیز ابھی تک ویسی کی ویسی ہے، وہ ہے نرسنگ کے پروفیشن اور نرسز کی طرف ہمارا عمومی رویہ۔ جی ہاں، ہم سب کا رویہ۔ ہم آج بھی نرس کو سسٹر کہتے ضرور ہیں، مگر اسے سسٹر والی عزت نہیں دیتے۔ حالانکہ ایک نرس اتنی ہی قابل عزت ہے جتنا کہ ایک ڈاکٹر۔

ہم ایک ڈاکٹر کی تو عزت کرتے ہیں مگر ایک نرس کی عزت ہم سے نہیں ہوتی۔ حالانکہ یہ ایک عام فہم سی بات ہے کہ جیسے سب ڈاکٹرز اچھے نہیں ہو سکتے، اسی طرح سب نرسز بھی بری نہیں ہوتیں۔ کم عمری میں اس فیلڈ کو جوائن کرنے والی معصوم کلیوں کی مانند نازک لڑکیاں جب اپنی اپنی مجبوریوں کی گٹھڑیاں سمیٹے یہاں آتی ہیں تو ان کو بہکانے کے لیے آسمان سے فرشتے نہیں آتے بلکہ ان کے اردگرد موجود لوگ ہی یہ فریضہ سرانجام دیتے ہیں مگر ایک بات ہم سب دھڑلے سے کہتے ہیں کہ ''نرسیں اچھی نہیں ہوتیں۔'' ہم ایک بار بھی نہیں سوچتے کہ نرس نہ ہو تو مریض کی دیکھ بھال کون کرے۔ ایم بی بی ایس کر کے پانچ پانچ سال کتابوں کی دنیا میں غرق رہنے والے میڈیکل آفیسرز جب ہاؤس جابز کے لیے ہاسپٹلز میں قدم رکھتے ہیں تو انہیں آپریشن تھیٹر کی سمت بھی معلوم نہیں ہوتی۔ آپریشن تھیٹرز کے اندر وہ ایک عام سی قینچی پکڑنے کے لیے بھی نرس کے محتاج ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود ایک نرس کبھی بھی ایک ڈاکٹر کے جتنی قابل عزت نہیں ہوتی۔ دراصل قصور ہم سب کا ہے۔ ہم ڈاکٹرز کو باوقار سمجھ کر عزت دیتے ہیں تو ہمیں اس کی مددگار کو بھی اتنی ہی عزت دینی چاہیے تاکہ ایک باوقار پروفیشن کو تمام تر غلاظت سے پاک کیا جا سکے کیونکہ اچھے لوگ ہر جگہ ہو سکتے ہیں، جوہڑ کے کنول کی طرح۔

یہ کہانی اپنے ادھورے اختتام کے ساتھ یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ شاید کچھ کہانیاں بہت جلد اختتام تک نہیں پہنچ پاتیں، ان کو ختم کرنے کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ آئیے ہم سب مل کر انتظار کرتے ہیں۔

❁......❁......❁

# اھد نا الصراط المستقیم

قرآن کریم کے پانچویں پارے کی چوتھی سورۃ، سورۃ النساء کی 34 ویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''مرد محافظ و نگراں ہیں عورتوں پر۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر اس لیے فضیلت دی ہے کہ مرد ان پر اپنے مال خرچ کرتے ہیں تو نیک عورتیں اطاعت گزار ہوتی ہیں۔ وہ (شوہر کی غیر حاضری میں) وفادار رہتی ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے وفاداری کا حکم دیا اور اگر عورتوں کی نافرمانی کا اندیشہ ہو تو (پہلے نرمی سے) انہیں سمجھاؤ اور (پھر) انہیں خواب گاہوں سے الگ کردو (اور پھر بھی باز نہ آئیں تو) اور انہیں مارو (ضرف غیر شدید) پھر اگر وہ اطاعت کرنے لگیں تو ان پر کوئی زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ بڑا بلند ہے۔''

آسمان پر ستاروں کا سفر ابھی پوری طرح سے اختتام کو بھی نہیں پہنچا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ نیند کا غلبہ اس قدر حاوی تھا کہ چند لمحے تو وہ بے حس و حرکت پڑی رہی پھر بادل نخواستہ جلتی ہوئی آنکھوں سے پلکیں جھپک جھپک کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔

چاند کی تیز روشنی اور ستاروں کا گھٹتا ہوا باہمی فاصلہ ظاہر کر رہا تھا کہ رات کا آخری پہر اختتام کو ہے۔

اس کے خوابیدہ چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے اطمینان ہوا کہ وہ مزید کچھ دیر سو سکتی ہے۔

صحن میں رات کی رانی کی مہک پھیلی ہوئی تھی، جو اس کی مدہوشی میں اضافہ کرنے لگی۔

اس نے پورا منہ کھول کر جماہی لی اور پھر دوبارہ سے آنکھیں موند لیں۔

اس کے اندازے کے مطابق اذان ہونے میں ابھی تقریباً آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ وہ وقت کا اندازہ عموماً مظاہر فطرت کی مدد سے لگالیا کرتی تھی۔ گھڑی پر وقت دیکھنے کی نوبت بہت ہی کم آتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسے گھڑی میں وقت دیکھنا ہی نہیں آتا تھا۔ اگرچہ اس کے گھر میں ایک بہت خوبصورت سنہرے فریم والی دیوار

گیر گھڑی موجود تھی مگر اس پر وقت دیکھنے کے لیے وہ ساجد کی محتاج رہا کرتی۔

یہ گھڑی ساجد نے شادی کے بعد اسے کسی میلے سے دلوائی تھی اور اس بات سے باخبر ہونے کے بعد کہ زینب وقت نہیں دیکھ سکتی وہ وقتاً فوقتاً اسے سکھاتا رہتا۔

''ساجی! تو اپنا وقت کیوں برباد کرتا ہے...... مجھے یہ وَل (طریقہ) نہیں آنے کا۔ وہ پانچ اور پانچ برابر دس کے اس کھیل سے بہت جلد اکتا جاتی تھی۔ ساجد نے بھی اس کی عدم دلچسپی محسوس کر کے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

گھڑی ہی کے ذریعے وقت دیکھنا اتنا ضروری بھی تو نہیں تھا۔ زینب کوئی وزیر' سفیر تو نہیں تھی' جو گھڑی کی سوئیوں کے مطابق کام کرتی۔

دراصل زینب کا تعلق انتہائی غریب گھرانے سے تھا۔ ان کے جھونپڑے میں پانی پینے کا گلاس بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس نے اپنے میکے میں گھڑی جیسی کسی چیز کا وجود نہیں دیکھا تھا' اس کا گزارا سڑکوں سے کوڑا کرکٹ چن کر ملنے والی رقم سے ہوا کرتا تھا۔

شادی نے اس کے حالات بدل دیے تھے۔ اسے کبھی اس بات کی پروا نہیں ہوتی تھی کہ وہ اس طرح کی نئی نئی چیزیں سیکھے۔ وہ ستاروں کی چال سے' سائے کے ڈھلنے سے اور اکثر اوقات گھر میں لگے نیم اور رات کی رانی کے پودے سے وقت کا حساب کتاب کر لیا کرتی تھی اور دلچسپ بات یہ تھی کہ اس کا یہ حساب کتاب ہمیشہ درست ہوتا تھا۔

وہ مزید کچھ دیر اسی سوئی جاگی حالت میں پڑی رہی' پھر جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا تھا۔ اس نے ایک دم سے پوری آنکھیں کھول کر آسمان کی طرف دیکھا' آسمان پر ستاروں کی وہی پوزیشن تھی۔ اس نے گہری سانس بھر کر کروٹ بدلی اور پھر اپنی ساتھ والی چارپائی کی طرف دیکھا۔

اس چارپائی پر ایک شخص گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے خراٹوں کی بہت دھیمی سی آواز زینب کے کروٹ بدلتے ہی صاف سنائی دینے لگی۔

''اے......اٹھو نا......اذان ہونے والی ہے۔''

اس نے بہت دھیمی آواز اور پیار بھری آواز میں اس شخص کو بیدار کرنے کی کوشش کی مگر توقع کے عین مطابق وہ شخص کسمسایا بھی نہیں۔ زینب کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ میں اضافہ ہوا۔

''کنی اوکھی نیند ہے تمہاری...... ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتی...... اٹھ جاؤ' اب...... دن چڑھ گیا تو فیر مجھے الزام نہ دینا کہ جگایا نہیں۔''

اب کی بار اس نے ہاتھ بڑھا کر اس شخص کا کندھا ہلایا۔ اس شخص نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔



''دیکھ تھوڑی دیر ہور سو لینے دے...... جیسے ہی پہلی بانگ ہوگی۔ میں چلا جاؤں گا...... آج زیادہ کام نہیں ہے چوہدری غصہ نہیں کرے گا'' اس نے لجاجت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ مدہوشی اس کی آواز پر غالب تھی۔

''مجھے کیا، سوتا رہ...... چوہدری نے غصہ کیا تو مجھ پر بڑبڑ مت کرنا'' وہ دوبارہ سے رخ بدل کر سیدھی ہوتے ہوئے بولی پھر دونوں بازوؤں کو پھیلا کر انگڑائی لی اور آسمان کو تکنے لگی۔

وہ عموماً اذان کی آواز کے ساتھ اٹھنے کی عادی تھی مگر جس روز ساجد کو چوہدری دوسری ذمہ داریاں سونپ دیتا تو وہ جلدی بیدار ہو جایا کرتی تھی۔ اس نے تساہل سے لیٹے لیٹے ایک بار پھر بڑا سا منہ کھول کر جماہی لی اور سماعتوں پر زور دیتے ہوئے کچھ سننے کی کوشش کی۔

جھینگر اور مینڈکوں کی آوازیں بھی نہیں آ رہی تھیں گویا سناٹا ہی سناٹا تھا جسے کسی کے خراٹے توڑنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ زینب نے دوسری سمت کروٹ بدل لی۔ اب اس کے سامنے نیم کا ننھا سا درخت تھا۔ وہ اس کی شاخوں کو ہوا سے لرزتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں نیند دوبارہ حملہ کر رہی تھی مگر اسے جاگنا تھا' جب تک کہ ساتھ والی چارپائی پر سویا شخص نہ جاگ جاتا۔

چند لمحوں بعد ہی مرغ کے بانگ کی آوازیں آنے لگیں' پھر ساتھ ہی اکلوتی مسجد کا اکلوتا مولوی بھی اونگھتے کھانستے اذان دینے لگا۔ زینب کو مولوی باقر قطعاً پسند نہ تھا۔ وہ چھوٹے قد' چھریرے بدن اور سانولی رنگت والا عام سا آدمی تھا' اس کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ نہایت شریف تھا اور اس کی سب سے بری بات یہ تھی کہ ہمہ وقت اس شرافت کا تذکرہ کرنا پسند کرتا تھا۔

ساجد کی مولوی باقر سے گاڑھی چھنتی تھی اس لیے زینب کو اسے برداشت کرنا پڑتا تھا۔ وہ اذان کے کلمات پر غور کرنے لگی۔ اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔ وہ سونا نہیں چاہتی تھی مگر نجانے کیسے اسے نیند نے گھیر لیا۔ اور جب دوبارہ آنکھ کھلی تو صبح کی نیلگوں روشنی دیواروں پر اتر آئی تھی۔

''ہائے ربا'' زینب نے بے حد گھبرا کر ساتھ والی چارپائی کی طرف دیکھا۔ وہ چارپائی خالی تھی۔ زینب نے سینے پر ہاتھ رکھ کر گہرا سانس بھرا۔

ساجد کے غصے سے وہ ہی نہیں اور بھی ڈرتے تھے۔

☆ ☆ ☆

''Walk in interview'' اس نے اخبار کا اندرونی صفحہ کھولتے ہی اس کیپشن کی طرف دیکھا پھر دلچسپی سے تفصیل پڑھنے لگی۔ مگر کچھ ہی لمحوں بعد اس کی دلچسپی ختم ہوگئی۔ وہ مارکیٹنگ منیجر کی پوسٹ تھی' جس کے لیے کمپنی کی طرف سے MBA مارکیٹنگ کی ڈیمانڈ کی گئی تھی۔

اس کے علاوہ وہ لوگ بھی اپلائی کر سکتے تھے جو کامرس میں ماسٹرز ڈگری ہولڈر تھے۔ عشا۔

ناک چڑھا کر اپنی مطلوبہ ویکینسی کا ایڈ تلاش کرنے لگی۔ اس نے سوشیالوجی میں ماسٹرز کر رکھا تھا بلکہ ڈسٹنکشن کے ساتھ کر رکھا تھا اور اس بات کا اسے زعم بھی بہت تھا۔

وہ بے حد ذہین اور پرعزم واقع ہوئی تھی۔ اس کا ذاتی خیال تھا کہ وہ قوم کی تقدیر بدلنے کے لیے پیدا کی گئی ہے مگر پڑھائی کے فوراً بعد شادی نے اس کے عزائم کو خاک میں ملا کر رکھ دیا تھا اسی لیے اس خاک کا غبار جب کبھی اس کے دماغ کو چڑھتا تو وہ بے حد قنوطیت کا شکار ہو جاتی تھی۔

''Challanging Career'' اب اس کی توجہ اس ایڈ کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔ اس نے باآواز بلند پڑھا پھر نچلی سطروں پر نظر دوڑانے لگی۔

''شخصیت کا پروقار ہونا ضروری ہے...... شخصیت تو میری کافی پروقار ہے۔ انگلش کے علاوہ علاقائی زبان بولنے میں مہارت ہونی چاہیے...... ہاں ٹھیک ہے' نو پرابلم...... میں کر سکتی ہوں...... مقامی لوگوں کو ترجیح دی جائے گی ہم......''

وہ ہنکارا بھر کر کمپنی کا پتہ دیکھنے لگی۔

''مین بولیوارڈ' دوسری منزل گلبرگ III لاہور یعنی عادل کے آفس کے قریب...... ارے یار! یہ تو مسئلہ ہی کوئی نہیں...... مجھے ضرور اپلائی کرنا چاہیے...... میں ضرور اپلائی کروں گی۔''

اس نے دل ہی دل میں تہیہ کیا پھر اس اشتہار پر نشان لگانے کے لیے بال پوائنٹ تلاش کرنے لگی۔ اس نے صوفہ کم بیڈ سے ٹانگیں نیچے فرش پر کیں اور نظریں اخبار کی سمت مبذول کیے پاؤں کی مدد سے ٹٹول کر سلیپر تلاش کرنے لگی اچانک اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا اور ایک ہلکے سے چھنا کے آواز ابھری۔

اس نے اخبار چہرے سے ہٹا کر فرش کی طرف دیکھا۔ بیٹھنے سے پہلے بالوں میں تیل ڈالنے کے لیے اس نے تیل کی بوتل فرش پر رکھی تھی۔ پھر اخبار نظر آ گیا تو اخبار میں ایسی مہمک ہوئی کہ تیل کو بھول ہی گئی۔

''کیا مصیبت ہے...... فٹے منہ تمہارا عشاء خاتون۔''

اس نے کوفت سے ناک چڑھا کر فرش کی طرف دیکھا۔ ماسی کچھ دیر قبل ہی صفائی کر کے گئی تھی اور اب فرش پر ٹھیک ٹھاک پھیلاوا بکھر چکا تھا چونکہ غلطی اپنی تھی اس لیے اسے زیادہ غصہ نہیں آیا تھا اگر یہی حرکت خدانخواستہ عادل سے سرزد ہوئی ہوتی تو اس نے اپنے مجازی خدا کے احترام کو بالائے طاق رکھ کر اسے سخت سست سناتی۔

بڑبڑاتے ہوئے اس نے فرش صاف کیا پھر پاؤں دھوتے ہوئے ناخنوں پر نظر پڑی جو ضرورت سے زیادہ لمبے ہو رہے تھے۔ ان کی تراش خراش سے فارغ ہوئی تو کال بیل بج اٹھی۔



''اس وقت کون آ گیا'' وہ ناگواری سے بڑبڑائی۔ نجانے کیا بات تھی' اسے آج صبح سے ہی بہت غصہ آ رہا تھا۔

''آنٹی! آج کا نیوز پیپر دے دیں۔'' مسز خواجہ کی چھوٹی سی ملازمہ بچی دروازے پر کھڑی کہہ رہی تھی۔

''نجمہ! جلدی واپس کر جانا...... یاد سے ہاں......''

وہ نیم دلی سے اخبار اسے تھما کر تاکید کرتے ہوئے بولی۔ حالانکہ جانتی تھی' اس کی تاکید بے کار ہے۔

دروازہ بند کر کے وہ دوبارہ لونگ روم میں آ گئی۔ مسز خواجہ ان کی مکان مالکہ تھیں' محترمہ حد سے زیادہ تنگ مزاج اور کنجوس واقع ہوئی تھیں۔ دراصل عادل کو کمپنی کی طرف سے گھر ملا ہوا تھا مگر وہ صدر کے علاقے میں تھا اور پھر عادل کو مناسب نہیں لگتا تھا کہ عشاء اکیلی رہے کہ وہ خود تو صبح کا گیا شام کو واپس آتا تھا اسی لیے جوہر ٹاؤن میں یہ گھر کرایہ پر لیا گیا تھا۔

اچھے دنوں میں مسز خواجہ کے شوہر نے اپنے اور اپنے بھائی کے لیے ایک سی طرز پر ساتھ ساتھ دو گھر بنوائے تھے مگر ان کے بھائی شادی کے کچھ عرصہ بعد بوسٹن (امریکہ) سدھار گئے تب سے یہ گھر کرائے پر چڑھا رہتا تھا۔

عادل نے یہ گھر ڈیڑھ سال قبل کرایہ پر حاصل کیا تھا مگر تب وہ اکیلا یہاں رہتا تھا۔ عشاء کو یہاں شفٹ ہوئے چھ ماہ کا عرصہ ہوا تھا اس سے پہلے وہ راولپنڈی میں سسرال والوں کے ساتھ رہتی تھی۔ سسرال میں روٹین لائف بہت مختلف تھی وہاں اسے کبھی یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ بے مصرف سی زندگی گزار رہی ہے۔ مگر جب سے وہ لاہور شفٹ ہوئی تھی۔ تب سے اسے لگنے لگا تھا کہ وہ بہت کچھ کر سکتی ہے مگر کچھ کر نہیں پا رہی۔

صفائی ستھرائی اور کپڑے دھونے کے لئے ماسی تھی پھر دو افراد کا کام ہی کتنا ہوتا ہے کہ وہ اس میں مصروف رہتی۔ ٹی وی سے اسے زیادہ شغف نہیں تھا۔ وہ حقیقتاً آج کل ایک سنجیدہ قسم کے مشاغل کی تلاش میں تھی۔

لونگ روم میں آ کر وہ کچھ دیر منہ بسورے بیٹھی رہی' پھر ٹائم دیکھا۔ ڈیڑھ بجے کے قریب کا وقت تھا۔ اس کی کوفت میں مزید اضافہ ہوا۔

''اف میرے خدا...... اب میں کیا کروں......'' اس نے گویا بے حد زچ ہو کر سوچا۔ پھر لونگ روم سے اٹھ کر وہ بیڈ روم میں آ گئی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے آپ پر نظر ڈالی' ماتھے پر آئی لٹوں سے چھیڑ چھاڑ کی' انہیں سنوارا بگاڑا پھر آئی بروز کو دیکھنے لگی کہ آیا انہیں ''چھانٹی'' کی ضرورت تو نہیں۔

اس کام سے بھی اکتا کر وہ بیڈ پر آڑی ترچھی لیٹ گئی' کچھ دیر چھت کو تکتی رہی پھر سرہانے پڑے اپنے پرس سے موبائل نکال لیا۔

''I Hate you'' کچھ لمحوں بعد وہ کسی کو sms کے ذریعے یہ پیغام دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شرارتی سی مسکراہٹ تھی۔

☆ ☆ ☆

''اس بار واڈیوں (کٹائی) کے بعد میں نے تجھے بہت اچھا سا تحفہ لے کر دینا ہے' بس دعا کر زینب کہ اس بار مولا اپنا کرم کر دے میں نے بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔'' اس نے دیسی گھی میں چپڑی موٹی سی روٹی کا لقمہ منہ میں رکھ کر کچی پیاز کو دانتوں سے کترا۔

اس کے انداز میں بے حد عجلت تھی اور وہ بے حد رغبت سے کھا رہا تھا۔ نیم کے نیچے بچھی چارپائی پر وہ اور زینب بیٹھے دوپہر کا کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ دور کہیں سے آنے والی چکی کی آواز چارپائی کے قریب بڑے پیڈسٹل فین کی کھڑ کھڑ میں گم ہو کر ایک نئی آواز کو جنم دے رہی تھی۔

''مثلاً کیا......؟ کیا سوچ رکھا ہے؟'' زینب نے دلچسپی سے پوچھا۔

اس کی روٹی دیسی گھی کی عیاشی کے بغیر تھی اور اس کا انداز بھی ساجد علی کے انداز کی طرح رغبت لیے ہوئے نہیں تھا۔ گود میں بیٹھے ایک سالہ احمد علی کو اس نے باپ کی روٹی سے لقمہ توڑ کر تھما رکھا تھا جسے بچہ چوس چوس کر کھانے میں مگن تھا۔

''مجھے امید ہے اس واری چنگی رقم ہو جائے گی...... اس سال چوہدری پر اللہ نے بڑا کرم کیا ہے...... بڑی شاندار فصل کھڑی ہوئی ہے۔''

وہ اچار کے تیل میں روٹی کا ٹکڑا بھگوتے ہوئے بولا۔

''ہائے ساجی! ماشاء اللہ تو کہہ دے...... نظر ہو جاتی ہے......'' زینب نے ننھے احمد کو دائیں سے بائیں ٹانگ پر منتقل کرتے ہوئے ٹوکنا ضروری سمجھا۔

''ہاں...... ہاں...... ماشاء اللہ۔'' اس نے عجلت میں کہہ کر لقمہ منہ میں رکھا اور پھر پیاز کترنے لگا۔ اگلے کچھ لمحے اس کے منہ سے آنے والی چپ چپ کر آوازیں ہی گونجتی رہیں۔

زینب اسی کی طرف متوجہ تھی۔

''اس واری روپے ہاتھ آئیں گے تو سب سے پہلے سارے گھر کی لپائی کروانی ہے۔ اور پچھلے کمرے میں باری (کھڑکی) کی مرمت کروانی ہے۔ کوٹھے کا بنیرا (منڈیر) بھی اونچا کرنا ہے۔''

زینب نے چونک کر سر اٹھایا مگر بولی کچھ نہیں' ساجد خود میں مگن کہہ رہا تھا۔

''میرا دل چاہتا ہے ہمارا گھر بوت اچھا لگے...... میں نے اس بار وہ موڑھے تو ضرور لینے ہیں



جو مائی حاجراں کا دیور شہر سے لایا تھا...... سامنے والے کمرے میں رکھیں گے...... تو ان پر کوئی پھول شول والی کڑھائی کر کے غلاف ڈال دینا...... ہمارا کمرہ سج جائے گا اور ہاں یاد آیا...... مولوی باقر کہہ رہا تھا اس کا بیٹا اگلے مہینے گیس والا چولہا لائے گا...... اس کے ساتھ سلنڈر ہوتا ہے۔ گیس سستی ہوگئی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا ہزار بارہ سو میں سب ہو جائے گا۔ میں تیرے لیے اس واری وہ چولہا ضرور لاؤں گا...... بس تو دعا کر زینب۔'' وہ بڑے بڑے نوالے کھاتے ہوئے اپنی خواہشات بھی بیان کرتا جا رہا تھا۔

زینب کو ابھی تک ساری گفتگو میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی' حتی کہ اسے گیس والے چولہے نے بھی خوش نہیں کیا تھا۔

''میں نے...... تجھے ایک اور چیز کا بھی کہا تھا ساجی!'' وہ روٹی کے ٹکڑے کو مسلتے ہوئے فرمائشی لہجے میں بولی۔ ساجد نے استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''ٹی وی......'' وہ بغور اس کی جانب دیکھ کر بولی۔ ساجد نے گردن کے گرد لپٹا میلا سا رومال اتار کر ہاتھ میں پکڑا' پھر ہاتھ اور منہ اچھی طرح صاف کر کے بولا۔

''نہ زینبے...... ہم نے دوزخ کا ٹکٹ نہیں لینا...... یہ بات نہ کیا کر مجھ سے۔'' اس کے انداز میں قطعیت تھی۔ اپنی بات مکمل کر کے اس نے لسی والی ملکی اٹھا کر منہ سے لگائی اور غٹا گٹ پینے لگا۔ اس کے بعد اسی لسی سے کلی کر کے اس نے پاس فرش پر تھوکا۔ زینب نہایت بے دلی سے لقمے توڑ رہی تھی۔

''تجھے بھوک نہیں ہے کیا؟ ٹھیک سے کیوں نہیں کھاتی...... یاد نہیں حکیم جی نے کیا کہا تھا' تو ایسے کی تو احمد علی پہ ماس بوٹی نہیں چڑھنے کی...... ایسا ماڑا (دبلا) ہی رہ جائے گا...... تجھے دودھ پلانا ہوتا ہے...... رج کے کھایا کر زینبے۔''

ساجد کا پیٹ بھر چکا تھا اسے یکدم ہی بیوی کی بے دلی کا اندازہ ہوا۔ اس نے ہاتھ کی کھردری جلد کو چارپائی کی بان سے رگڑ کر کھجایا پھر زینب کو پیار بھرے لہجے میں نصیحت کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے بھوک نہیں لگتی۔'' اس نے سر جھکا کر کہا جیسے بھوک نہ لگنا کوئی گناہ ہو۔ ساجد نے حیرانی سے اس کی جانب دیکھا۔

اس کے نزدیک بھوک نہ لگنا مسئلہ نہیں' چونچلے تھے اور یہ تو بڑے لوگوں کے چونچلے تھے۔

''تجھے گرمی ہو گئی ہے زینبے...... کام بھی تو اتنا کرتی ہے۔...... گرمی بھی تو غضب کی پڑ رہی ہے' یہ لے گنڈا کھا...... ماں کہتی تھی...... گنڈا جی ٹھنڈا...... مطلب اس سے جی ٹھنڈا رہتا ہے۔ چل پکڑ لے اب۔''

اس نے چنگیر سے اٹھا کر پیاز کا ٹکڑا اس کی سمت بڑھایا۔

اس ٹکڑے پر ساجد علی کے دانتوں کے نشان نمایاں تھے۔ چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہی

پھر اس کے ہاتھ سے پیاز پکڑ کر دوبارہ چنگیر میں رکھ دی۔

''مجھے نہیں کھانا...... گھنٹوں منہ سے ہمک آتی ہے' ایویں جی خراب ہوتا ہے۔''

وہ سادہ سے لہجے میں بولی مگر اس کے چہرے پر جو تاثرات تھے وہ ہرگز سادہ نہیں تھے۔ ساجد حیرت سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ زینب کا رویہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

''ہائے زینب! تجھے کیا ہو گیا ہے؟ مجھے تیری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی' خیر تو ہے؟ وہ والی بات تو نہیں ہے نا۔'' وہ اس کے سراپے میں الجھ کر بولا۔

زینب کو اس کی بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا پھر پہلے کی طرح مراقبے میں جا کر بولی۔

''ہاں ساجی! سب خیر ہے...... ''وہ'' بات نہیں ہے۔''

ساجد کی بے اطمینانی میں مزید اضافہ ہوا۔ ''وہ'' بات ہوتی تو اتنی پریشانی بھی نہ ہوتی۔ احمد کی دفعہ بھی زینب کو بھوک نہیں لگتی تھی اور ہر چیز کی ہمک اس کے دماغ کو چڑھنے لگتی تھی۔

''مجھے تیری بڑی فکر ہو رہی ہے زینب!'' اس نے زینب کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر پریشانی سے کہا پھر زینب کی خاموشی سے مزید الجھ کر بولا۔

''مغرب ویلے مولوی باقر کے پاس چلیں گے۔ وہ دم کر دے گا...... تجھے آرام آ جائے گا۔''

وہ متفکر سا اٹھ کر ایک طرف لگے ہینڈ پمپ کی طرف آ گیا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالنے کے بعد وہ دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

''جلدی آؤں گا...... رب راکھا......'' اس نے زینب کی طرف دیکھے بغیر کہا تھا۔

زینب بھی اس کی جانب دیکھنے کی بجائے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چنگیر میں ایک ہی روٹی رہ گئی تھی جو گھی کے بغیر تھی۔ احمد ہمک ہمک کر اچار والی پیالی میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زینب نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ایک ہی انداز میں بیٹھی نجانے کیا سوچ رہی تھی۔

احاطے میں جگالی کرتی بھینسیں منتظر نگاہوں سے اسے تک رہی تھیں۔ یکایک دروازے کی کنڈی پھر بج اٹھی اور اس بار اس کا انداز مختلف تھا۔ زینب ایک جھٹکے سے چارپائی سے اتری اور فوراً احاطے کی سمت چل دی۔ وہاں بھی باہر کی سمت جانے کے لیے ایک دروازہ تھا۔ زینب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆ ☆ ☆

''میں نے جب ایم اے پاس کیا تو بڑے بڑے اخبارات میں میری تصویریں چھپی تھیں۔''

آملیٹ والی پلیٹ عادل کے سامنے رکھتے ہوئے وہ جتانے والے انداز میں بولی۔



یہ اس کا پسندیدہ ڈائیلاگ تھا۔ آملیٹ عادل کے سامنے رکھ کر وہ پراٹھا پلٹنے کے لیے دوبارہ سے کاؤنٹر کی سمت چل دی۔ عادل کچن میں موجود ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھا بے چینی سے ناشتے کا منتظر تھا۔ اس نے عشاء کے انداز کا بغور ملاحظہ کیا۔ مطلع کچھ ابر آلود سا لگ رہا تھا۔

''بڑے بڑے اخبارات......''

''مطلب قالین جتنے بڑے...... کمال ہے مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ 1980ء میں اتنے بڑے بڑے اخبارات نکلا کرتے تھے۔''

اس نے بے حد عام سے لہجے میں کہا تھا۔

بیشتر مردوں کی طرح اسے بھی ہر غیر سنجیدہ بات نہایت سنجیدگی سے کرنے کی عادت تھی۔

توے پر پراٹھا پلٹتی عشاء نے تحمل سے اس کی بات سنی مگر زیادہ غور نہیں کیا کہ ساری توجہ پراٹھے کی طرف تھی۔ جب پراٹھا توے سے اتار کر پلیٹ میں منتقل کیا تو سمجھ میں آیا کہ وہ کہہ کیا رہا تھا۔

''توبہ 1980ء میں ایم اے نہیں کیا تھا میں نے...... تب تو میں پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔''

وہ تنک کر بولی اور پراٹھے والی پلیٹ کاؤنٹر پر رکھ کر ساس پین میں دودھ نکالنے لگی۔

''پیدا نہیں ہوئی تھی مگر تیاری میں تو تھیں نا۔'' وہ سابقہ لہجے میں بولا۔ عشاء نے اس کی بات سمجھی تو ہنسی بھی آئی مگر پھر ناک چڑھا کر استفہامیہ انداز میں بولی۔

''مطلب؟''

اب کی بار عادل نے کوفت میں مبتلا ہو کر اس کی جانب دیکھا پھر آملیٹ کا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھتے ہوئے بولا۔

''مطلب انڈر پروسیس...... 1980ء میں یقیناً تم پیدا ہونے کی تیاریاں کر رہی ہو گی مجھ سے ایک ہی سال تو چھوٹی ہو اور میں 1979ء میں پیدا ہوا تھا۔''

اس کی بات پر عشاء کھل کر مسکرائی مگر عادت سے مجبور تھی۔ سو تصحیح کرنا ضروری سمجھا۔

''ایک سال نہیں ڈیڑھ سال چھوٹی ہوں۔''

''اچھا بھئی! مانتا ہوں ڈیڑھ سال چھوٹی ہو...... حلف بھی اٹھا سکتا ہوں کہ ڈیڑھ سال چھوٹی ہو مگر پلیز اب وہ پراٹھا مجھے عنایت کر دو...... مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے...... آنتیں پہلے ہی ادھم مچا رہی ہیں' اب تو معدے نے بھی دہائی دینا شروع کر دی ہے۔''

وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے منت بھرے لہجے میں بولا۔

''توبہ عادل! آپ بہت ندیدے ہوتے جا رہے ہیں۔''

وہ اس کے سامنے پراٹھا رکھتے ہوئے بولی پھر ساس پین کے نیچے آنچ دھیمی کر کے عادل کے

ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھی۔ وہ ناشتے میں چائے کے ساتھ سلائس لیتی تھی۔ جب کہ عادل کافی بھاری بھرکم ناشتہ کرنے کا عادی تھا۔

''یار! کیسی بیوی ہو تم...... بھوک سے نڈھال شوہر تمہیں ندیدہ لگتا ہے۔ مشرقی بیویاں شوہروں کو کھاتا پیتا دیکھ کر خوش ہوتی ہیں بلکہ......''

''بلکہ گانا بھی گاتی ہیں...... ہے نا......'' عشاء نے ڈائننگ ٹیبل پر پڑے کرسٹل کے جار میں سے۔ بادام نکال کر منہ میں رکھتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

عادل مسکرایا پھر منہ میں موجود نوالہ نگلتے ہوئے۔

''ہاں نا......''

''کون سا گانا......؟ وہ والا؟...... جے میں ہندی ڈھولنا......ڈھولنا ہائے......سونے دی تویتڑی......ٹیاؤں......ٹیاؤں......سونے دی تویتڑی......''

عشاء نے پوچھا پھر مزاحیہ انداز میں گنگنانے لگی۔ اس کا انداز اس قدر بے سرا تھا کہ عادل کو ہنسی آ گئی۔

''بس کر بھئی، محلے والوں نے سن لیا تو تعزیت کرنے آ جائیں گے کہ بہن جی، بہت افسوس ہوا آپ کے شوہر انتقال کر گئے۔''

اس کی بات پر عشاء نے ناگواری سے اسے دیکھا پھر اس کندھے پر چپت رسید کر کے بولی۔

''توبہ ہے عادل! استغفراللہ...... کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔''

اس کے انداز میں اس قدر محبت تھی کہ عادل کے چہرے پر شرارتی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''ہو تو تم بھی مشرقی بیوی...... پکی مشرقی بیوی......'' وہ اس کے ناک کی پھننگ کو انگلی سے چھوتے ہوئے بولا۔

''صبح صبح ایسی باتیں مت کیجیے...... میرا دل دہل جاتا ہے۔'' وہ ابھی بھی گذشتہ بات کے زیر اثر تھی۔ عادل کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

''ہاں ٹھیک ہے، صبح صبح ناشتے کی باتیں کرو اور بس......'' وہ پراٹھا ختم کرنے کے بعد آملیٹ کے بقایاجات پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ عشاء نے پھر ناک چڑھائی۔

''مجھے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ صبح صبح اتنا کچھ اندر کیسے جاتا ہے...... مجھے تو بالکل بھوک نہیں لگتی۔''

''تم کبھی مارننگ واک کے لیے گئی ہو؟''

عادل نے سنجیدگی سے دریافت کیا جیسے اس کی روٹین سے بے خبر ہو۔



عشاء نے مصنوعی حیرانی سے اسے دیکھا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ صبح اتنی جلدی نہیں اٹھتی تھی جب کہ عادل نا صرف جاگنگ کے لیے جاتا تھا بلکہ اس نے فٹ رہنے کے لیے باقاعدہ جم بھی جوائن کر رکھا تھا۔

''کبھی جاگنگ کی ہے؟'' اس نے دوسرا سوال پوچھا۔

''نہیں......'' اس نے نفی میں جواب دیا۔

''ویٹ لفٹنگ''

وہ اکتانے لگی ''نہیں''

''تو پھر تمہیں کیا پتا کہ ناشتا کس چیز کا نام ہے......ارے تم کیا جانو کہ ڈیڑھ گھنٹہ جاگنگ کے بعد جب انسان ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتا ہے تو پیٹ میں چوہے کون سی بیٹ (Beat) پر روک اینڈ رول کرتے ہیں۔''

عشاء نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں اسے دیکھا پھر چائے لانے کے لیے اٹھ کر کاؤنٹر کی سمت آ گئی۔ عادل ہاتھ دھونے والے سنک کی سمت بڑھ گیا۔

''آج میں لیٹ ہو جاؤں گا۔'' عادل نے چائے پیتے ہوئے اسے مطلع کیا۔

''آج پھر......؟'' عشاء نے بیزاری سے اسے دیکھا۔ گزشتہ کچھ دنوں سے عادل کچھ زیادہ ہی مصروف ہوتا جا رہا تھا۔

''ہاں یار!......'' فقط دو دن کی بات ہے اس کے بعد انشاءاللہ تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

وہ محبت سے لبریز لہجے میں بولا۔ عشاء چپ چاپ بغیر چائے کے کپ کو دیکھتی رہی۔

''یہ بات تو آپ تب سے کہہ رہے ہیں، جب سے مجھے پنڈی سے لے کر آئے ہیں۔'' اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ عادل نے ہونٹ سکیڑ کر اس کی جانب دیکھا پھر مسکرا دیا۔ وہ کسی چھوٹی بچی کی طرح روٹھی ہوئی لگ رہی تھی۔

''اے موڈ آف نہیں کرو نا......'' وہ اپنا سر دھیرے سے اس کے سر سے ٹکرا کر بولا۔ عشاء خاموش رہی۔

''آئی پرامس جان...... جسٹ ٹو مور ڈیز......'' وہ چاشنی بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

''عادل! صبح سے شام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ قسم سے سارا دن اس کمرے سے اس کمرے میں پریڈ کرتی رہتی ہوں۔''

''آئی پرامس نا...... اس ویک اینڈ کے بعد میں انور صاحب سے خود کہہ دوں گا کہ سر! میری بیوی

میرے بغیر اداس ہوجاتی ہے۔اس لیے براہ مہربانی مجھے جلدی فارغ کیا کریں۔" وہ پوری کوشش کررہا تھا کہ بیوی کے موڈ کو مزید نہ بگڑنے دے۔

"اسی لیے تو کہتی ہوں مجھے جاب کر لینے دیں...... میں اس فراغت......"

"اوہو...... آئی ایم سوری یار......Getting late پھر بات کریں گے ہاں......لو یو......ٹیک کیئر......اللہ حافظ۔"

وہ اس کی بات کاٹ کر تیزی سے مڑا اور لاؤنج کی سمت چل دیا۔ چند لمحے بعد عشاء نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔

"لو یو...... ہونہہ...... بات کرنے کی فرصت نہیں ہے اور محبت کریں گے یہ مجھ سے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے ٹیبل سے اٹھ گئی تھی۔اس کا منہ پھول کر غبارہ ہو رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ڈھور ڈنگر آج کل بندے سے زیادہ نخرے والے ہوگئے ہیں...... ان کی بھی اتنی ہی خدمت کرنی پڑتی ہے جتنی کہ اپنے ماں پیو (والدین) کی اور اتنے ہی لاڈ اٹھانے پڑتے ہیں جتنے کہ اولاد کے۔"

ساجد، بھوری کی پیٹھ سہلاتے ہوئے زینب سے مخاطب تھا۔بھوری ان کی اکلوتی بھینس کا نام تھا۔بھوری کچھ دنوں سے کافی سست ہو رہی تھی۔دودھ دینا بند نہیں کیا تھا مگر مقدار بہت کم ہوگئی تھی۔ساجد علی کو اس کی بہت فکر ہو رہی تھی۔زینب ایک طرف بنی کھرلی میں گتاوا (بھینس کی خوراک) گھولنے میں مشغول تھی۔

وہ جب کھرلی میں ہاتھ چلاتی تو دائیں بازو میں موجود درجن بھر سرخ اور سنہری چوڑیاں کھنکنے لگتیں۔اسے چوڑیوں کی یہ کھنکناہٹ بہت بھلی لگ رہی تھی جب کہ ساجد علی کو بھوری سے ہی فرصت نہیں تھی کہ وہ زینب کی کلائی میں موجود چوڑیوں کو دیکھتا اور سراہتا۔وہ بھوری کی فکر میں ہلکان ہوا جا رہا تھا۔

"میں نے کہا ڈھور ڈنگر بھی آج کل بندے سے زیادہ......" ساجد زینب کی عدم توجہی محسوس کر کے دوبارہ بولا۔زینب نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر آہستہ سے بولی۔

"ٹھیک کہتا ہے ساجی!"

"اس بھوری کو ہی دیکھ لے...... پنج سال سے میرے ساتھ ہے۔تجھے بیاہ کر اس گھر میں لانے سے دو سال پہلے اس کو جندرا کہ سے لایا تھا۔میرے نانے نے مجھے قرآن ختم کرنے پر اس کا تحفہ دیا تھا مگر میری ماں بیمار رہتی تھی فیر اس کو کون سانبھتا (سنبھالتا) اسی لیے نانے نے اپنے پاس ہی رکھ



لی۔اس نے سوچا کہ دوہتے (نواسے) کو تحفہ تو دے دیا مگر کچھ عرصہ مال پانی بنا لے بس فیر یہ وہیں جندرا کہ میں رہی۔سارا جندرا کہ اسی نمانی کا دودھ پیتا تھا۔فیر پنج سال پہلے میں اس کو یہاں کو ہلے لے آیا۔

چوہدری کے باڑے میں کام کر کے مجھے بھینس پالنے کا بڑا تجربہ ہو گیا تھا......تب سے اب تک یہ دو دفعہ سوئی ہے (بچے دیے ہیں) پر دونوں ہی کٹے تھے۔قصائی کو دے دیے۔دو دو ہزار کے بکے تھے۔فائدہ تو میرا ہی ہوا نا......اس واسطے مجھے یہ نمانی بڑی عزیز رہی ہے مگر اب اس کو اتنا سست دیکھتا ہوں تو دل دکھتا ہے۔کہتے ہیں بندے کے گناہوں کی سزا اس کے ڈھور ڈنگروں کو ملتی ہے...... پتا نہیں ہماری غلطی کی سزا میں تو یہ بیمار نہیں پڑ گئی' ہائے بھوری' میری چندا تجھے کیا ہو گیا ہے۔"

وہ بھینس کی پشت سہلاتا ہوا بولتا چلا جا رہا تھا۔زینب نے یہ قصہ پہلے بھی بہت مرتبہ سن رکھا تھا۔اسے اس قصے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔مگر ساجد کی آخری بات پر وہ پرسوچ انداز میں اس کی جانب دیکھنے لگی۔پھر اپنے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی۔

"اس کو قصائی کو دے دے ساجی...... یہ کھانگڑ (بانجھ) ہو گئی ہے۔"

"ابھی اس کی عمر نہیں ہے کھانگڑے والی......صرف دو کٹے دیے ہیں ابھی...... دیکھنا انشاء اللہ میں اس ایک بھوری سے چار بھوریاں دلاؤں گا تجھے۔بس موسم گرم ہے نا اس لیے یہ ذرا سست ہو گئی ہے۔گرمی ہو گئی ہے اس کو۔"

وہ بھوری کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

زینب نے ناک چڑھا کر نخوت سے اسے دیکھا پھر جان بوجھ کر دائیں ہاتھ سے پیشانی کو صاف کیا تاکہ چوڑیوں کی کھنکناہٹ سے ساجد علی کو متوجہ کر سکے مگر وہ جھک کر بھینس کو کھونٹے سے آزاد کرنے میں مصروف تھا تاکہ اسے کھرلی کے قریب باندھ سکے۔

"اس کو بھی مولوی باقر سے دم کروا لے۔" زینب نے جل کر مشورہ دیا۔

"ہاں ٹھیک...... بہت پتے کی بات کی ہے تو نے......شام کو مولوی باقر کو گھر لاؤں گا۔اس کے دم میں بہت برکت ہے۔بھوری انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گی۔" بھوری کو مناسب جگہ پر باندھتے ہوئے بولا۔

قریب ہی بکری اور اس کا میمنا بھی بندھے ہوئے تھے۔ساجد نے بکری کے پٹھے اٹھانے کے لیے تسلے کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔وہ احاطے کے بیرونی دروازے کے قریب پڑا تھا۔تسلا اٹھاتے ہوئے اس کی نگاہ دروازے کے بالکل پیچھے پڑے ہوئے زرد رنگ کے چھلکوں پر پڑی۔دور سے دیکھنے پر یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ چھلکے کس چیز کے ہیں۔تسلا وہیں رکھ کر وہ دو تین قدم چل کر

دروازے کے بالکل پیچھے پہنچ گیا اور جھک کر جوتے سے ہلا کر ان چھلکوں کو دیکھنے لگا۔ نزدیک آنے پر خوشبو سے ہی پتا چل رہا تھا کہ آم کے چھلکے ہیں۔

یہ تو آم کے (چھلکے) ہیں...... زینبے یہ کہاں سے آئے؟''

اس نے مڑ کر عقب میں کھڑی زینب سے پوچھا۔

زینب کی پیشانی پر پہلے ہی پسینہ چمکنے لگا تھا۔ وہ گڑبڑا سی گئی۔ گھر میں پھل ساجد علی ہی لاتا تھا' وہ آم نہیں لایا تھا تب پھر یہ چھلکے کہاں سے آئے تھے۔

''یہ...... پپو دے کر گیا تھا...... بکری کو ڈالنے کے لیے...... کہہ رہا تھا بکری کو ڈال دینا...... وہ اکثر پھل اور سبزیوں کے چھلکڑ دے جاتا ہے...... میں نے یہاں رکھ دیے کہ پٹھوں کے ساتھ یہ بکری کو ڈال دوں گی۔'' وہ لکنت پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

ساجد بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ ''پپو؟'' اس نے استفہامیہ انداز میں یہ نام دہرایا۔ محلے میں تین چار پپو رہتے تھے۔

''پپو...... بٹ کا پتر...... خالد بٹ کا...... جو گلی میں کنچے کھیلتا رہتا ہے۔ وہی اتنے سخی ہیں کہ ایسے پیلے پیلے آم کھا سکیں۔ ہم جیسے تو بس ان کے چھلڑ ہی دیکھ کر خوش ہو سکتے ہیں۔'' اس نے آواز کو دھیما کرتے ہوئے لہجے میں حسرت سمو کر کہا۔

ساجد اس کی بات پر تڑپ اٹھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچے کو دنیا بھر کی آسائشیں فراہم کرنا چاہتا تھا مگر جب زینب ایسے گاہے بگاہے اس کی غربت کا احساس دلاتی تو وہ بے چین ہو جاتا تھا اور خصوصاً جب کبھی خالد بٹ کا ذکر ہوتا تو اسے خوامخواہ جلن ہونے لگتی۔ وہ خالد بٹ کو سخت ناپسند کرتا تھا۔

''تیرا دل ہے آم کھانے کا تو مجھے کہہ...... میں بھی لے آؤں گا' لیکن وی پچی (بیس پچیس) روپے کے لیے ہرا یرے غیرے سے جلنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خبیث کمینہ آدمی اس قابل نہیں کہ اسے دیکھ دیکھ کر اپنا دل جلائیں۔ ہم اس سے بہت بہتر ہیں۔'' ساجد نے بے حد خشک لہجے میں کہا۔

زینب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر ساجد کے چہرے پر خفگی کے تاثرات دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

''وہ گناہوں کی پوٹلی ہے' سیدھا جہنم میں جائے گا...... پکا دوزخی...... تجھے کیا پتا اس کے کرتوتوں کا...... چوہدری کا خاص آدمی ہے...... آدمی نہیں بلکہ کتا ہے چوہدری کا...... چوہدری نے اسے چھوٹ بھی بہت دے رکھی ہے' اس کے جو من میں آتا ہے وہی کرتا ہے اور چوہدری اس سے پوچھ گچھ بھی نہیں کرتا۔ خیر! میں اس کے بارے میں زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا۔ خراب آدمی کے بارے میں زیادہ بات کرنے سے زبان بھی خراب ہو جاتی ہے۔ اب دوبارہ اس کا پپو یا چند وا اپنے حرام مال کی زکوۃ نکال کر



لائیں تو صاف انکار کر دینا۔ کہہ دینا حرام مال سے خریدے گئے پھل کا چھلکا بھی حرام ہوتا ہے اور ساجد علی خود حرام کھاتا ہے نا اپنے دھور ڈنگر کو کھانے دیتا ہے۔''

وہ پٹھوں والا تسلا بکری کے قریب لا کر پٹھے ان کے سامنے ڈالتے ہوئے بولا۔ زینب خاموشی سے یہ تقریر ہضم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''اب مجھے پتا چلا کہ یہ بھوری جو سست ہو رہی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ اتنے دن سے یہ حرام مال اس کے آس پاس پڑا ہے۔ کیا پتا اس کے کھاجے (خوراک) میں اڑ کر کتنا کچھ گیا ہو...... سب حرام مال کی وجہ سے ہے زینب! میری ماں کہا کرتی تھی حرام مال پر نگاہ بھی پڑ جائے تو خون تک اثر ہو جاتا ہے۔ اللہ بخشے بہت سیانی عورت تھی۔ سو آنے کی بات ایک آنے میں کہہ جاتی تھی۔ دیکھ ابھی یہ چھلڑ یہاں پڑے تھے تو ان کا کتنا اثر ہوا ہے۔ بھوری کتنی کمزور لگ رہی ہے اور میں نے صرف قریب ہو کر جانچنے کی کوشش کی تھی کہ یہ ہے کیا چیز تو نجانے کیوں سر گھومتا ہوا محسوس ہو رہا ہے' عجیب گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ مجھے تو سچی بات ہے ایسی باتوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ جب تک نہا نہیں لوں گا سکون نہیں ملے گا۔''

اس نے گردن کے گرد پڑا صافہ کھینچ کر اتارا اور جھک کر دوبارہ سے ان چھلکوں کو گھور کر دیکھنے لگا۔ ساجد علی کا احاطہ بھی گاؤں کے دوسرے گھروں میں موجود احاطوں کی طرح تھا۔ ایک بھینس' ایک بکری' ایک میمنا اور سات آٹھ مرغیاں اپنے چودہ پندرہ چوزوں کے ساتھ اس احاطے میں مقیم تھیں۔ اسی حساب سے یہاں گندگی اور بدبو بھی تھی مگر ساجد علی کو جس قدر کراہیت ان چھلکوں سے آ رہی تھی اتنی اور کسی چیز سے محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

اس نے اپنا صافہ سر' گردن اور ناک منہ کے گرد لپیٹا اور پھر ان چھلکوں کو ایک غلیظ سے کاغذ کے لفافے میں منتقل کرنے لگا۔

''یہ دیکھ...... یہ کرنا چاہیے ایسی گندی چیزوں کے ساتھ۔'' اس نے احاطے کے کونے میں جا کر وہ لفافہ گھما کر دیوار سے باہر سے پھینک دیا۔ زینب لاتعلقی سے چارپائی پر جا کر بیٹھ گئی۔

اسے ساجد علی کے وعظ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اکتاہٹ میں مبتلا ہونے لگی تھی۔ چھلکوں سے نمٹنے کے بعد ساجد ہینڈ پمپ کے پاس کھڑے ہو کر نہانے کے لیے بالٹی بھرنے لگا۔ اس کے چہرے پر سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ زینب چارپائی پر لیٹے احمد کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔ وہ کھیلتے کھیلتے سو گیا تھا۔ ساجد نے بالٹی بھری اور کونے میں بنے ہوئے غسل خانے میں نہانے کے لیے چل دیا۔

زینب نے ٹین کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تو مڑ کر دیکھا پھر چند لمحے اسی پوزیشن میں بیٹھی دروازے کی سمت دیکھتی رہی۔ جب اسے تسلی ہو گئی کہ ساجد نے نہانا شروع کر دیا ہے تو وہ بہت آہستگی سے چارپائی سے اتری اور مرغیوں کے ڈربے کی طرف آ گئی۔ مرغیاں احاطے میں پھر رہی تھیں۔ ایک

بھی مرغی ڈربے کے اندر نہیں تھی۔ زینب نے ایک نظر غسل خانے کی طرف دیکھا پھر آواز پیدا کیے بغیر ڈربے کا جالی والا دروازہ کھول لیا۔

ڈربے کے نچلے خانے میں کالی سی کوئی چیز پڑی تھی۔ اس نے بہت احتیاط سے وہ چیز باہر نکال لی۔ کن اکھیوں سے وہ غسل خانے کی دیوار کو مسلسل دیکھ رہی تھی۔ وہ کالی سی چیز ایک شاپر بیگ تھا اور اس شاپر بیگ میں ایک بڑا سا تازہ آم تھا۔

زینب نے وہ آم نکالا اور دھوئے بغیر دانتوں کی مدد سے کاٹ کاٹ کر کھانے لگی اس کے انداز میں بے حد عجلت تھی۔ وہ جلدی جلدی جتنا کھا سکتی تھی‘ اس نے کھایا پھر اس شاپر میں ادھ کھایا آم منتقل کر کے اسے دروازے سے باہر پھینک دیا اور دبے قدموں چلتی ہوئی ہینڈ پمپ کے پاس آ گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر کلی کی اور اس کے بعد دوبارہ چارپائی پر اسی انداز میں آ کر بیٹھ گئی جس طرح پہلے بیٹھی تھی۔ کچھ لمحوں بعد ساجد غسل خانے سے نکل آیا۔ اس کے جسم پر قمیص نہیں تھی اور ٹانگوں کے گرد وہ تہہ بند لپیٹے ہوئے تھا۔

”زینبے...... میرا دماغ چل گیا ہے‘ مجھے تو اب یہاں سے بھی آم کی خوشبو آ رہی ہے...... جانے کتنے دن میں اس کا اثر ختم ہوگا۔“

وہ اسی صافے سے بال خشک کرتے ہوئے چارپائی کے نزدیک آ کر بولا اور ساتھ ہی سانس کھینچ کر کچھ سونگھنے کی کوشش کی...... زینب مسکرا دی جیسے اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔

”قسم اللہ کی...... بے شک سونگھ کر دیکھ لے۔“ وہ چارپائی پر اس کے بالکل نزدیک بیٹھ کر بولا تھا۔ زینب نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔ ساجد علی بھی مسکرا دیا پھر کچھ سوچ کر بولا۔

”زینب! تو نے بٹ کے گھر کی کوئی چیز تو نہیں کھائی نا...... تیری طبیت (طبیعت) بھی تو کچھ دنوں سے ٹھیک نہیں چل رہی...... صورت بھی کیسی اتری ہوئی لگ رہی ہے۔ تجھے بھی گرمی ہے نا...... مجھے بہت فکر ہو رہی ہے زینبے!“

”نہیں ساجی! میری فکر مت کر...... مجھے بس اپنے شوہر کی کمائی کی روٹی اچھی لگتی ہے۔“ اس نے احمد کے بالوں کو پیشانی سے ہٹا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

ساجد، احمد کے ساتھ لیٹ گیا جبکہ زینب اپنی کلائی میں موجود چوڑیوں سے کھیلنے لگی۔

☆ ☆ ☆

”یہ کھیرا کاٹ دیں۔“ اس نے عقب سے ایک پلیٹ عادل کے چہرے کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ عادل نے مڑ کر اس کی سمت دیکھا اور مسکرا کر پلیٹ پکڑی جس میں چھری اور چھلا ہوا کھیرا موجود تھا۔



عادل کی مسکراہٹ کے جواب میں عشاء کا چہرہ بے تاثر رہا تھا۔ پلیٹ اسے تھما کر وہ واپس کچن کی سمت چل دی۔ اس کے انداز میں عجلت تھی۔ وہ ایسے ظاہر کر رہی تھی جیسے اسے کچن میں بہت زیادہ کام ہے مگر دراصل وہ عادل سے ناراضی کا اظہار اس طرح سے کر رہی تھی کہ خود کو بے وجہ کام میں مصروف کر رکھا تھا۔

پہلے ماسی کو بے وجہ چھٹی دے دی اور سارے گھر کی صفائی کی‘ پھر واشنگ مشین لگائی۔ سارے گھر کے پردے‘ صوفہ کورز اور بیڈ کورز دھو ڈالے۔ حالانکہ جانتی تھی کہ عادل کو چھٹی والے روز اس قسم کے کاموں سے نفرت تھی۔ وہ اتوار کے دن بھی زیادہ دیر سونے کا عادی نہیں تھا۔ جاگنگ اور جم سے واپس آ کر وہ گارڈننگ وغیرہ میں لگ جاتا یا پھر CDs اور DVDs کی ترتیب درست کرنے اور اپنے ہفتہ بھر کے کپڑے پریس کرنے میں مگن رہتا۔

وہ حقیقتاً شوہروں کی نہایت معصوم قسم سے تعلق رکھتا تھا لیکن یہ عادل کی خود اپنے بارے میں رائے تھی۔ عشاء کا خیال تھا عادل ایک ایسا مرد ہے جو بیویوں کو تگنی کا ناچ نچائے رکھتے ہیں۔ اسی بات کو لے کر گزشتہ رات بھی ان کی بحث نے چھوٹے سے جھگڑے کی شکل اختیار کر لی تھی اور اسی لیے اب عشاء نے منہ پھلا رکھا تھا۔ بول چال بند تھی لیکن اتنی بھی بند نہیں تھی کہ وہ ایک دوسرے کو مخاطب ہی نہ کرتے۔

”میں کھیرا کاٹوں؟“ عشاء کے ہاتھ سے پلیٹ پکڑ کر عادل نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ درپردہ مقصد عشاء کو تنگ کرنا تھا۔ عشاء کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

عادل نے ریموٹ سے ٹی وی کی آواز کم کی اور پلیٹ ہاتھ میں لے کر کچن میں آ گیا۔ عشاء نے برنر کے پاس کھڑی پریشر ککر میں چمچہ چلا رہی تھی۔ عادل نے ڈائننگ ٹیبل کی چیئر گھسیٹی اور اس رخ پر بیٹھ گیا جہاں سے عشاء کی شکل بھی نظر آ رہی تھی۔

”میں کھیرا کاٹوں...... ؟ یعنی کہ میں...... بی بی میں تمہارا شوہر ہوں شوہر...... اردو میں جسے مجازی خدا بھی کہتے ہیں...... میری خدمت تم پر واجب ہے اور تم مجھ سے کھیرا کٹوا رہی ہو...... تمہاری گردن نہ کاٹ دوں۔......“ وہ جان بوجھ کر قدرے اونچی آواز میں بولا۔ عشاء کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ وہ ہرا دھنیا کترنے لگی تھی۔

عادل کھیرے کے سلائسز کرنے کے ساتھ ساتھ کن اکھیوں سے اس کی جانب بھی دیکھ رہا تھا۔ عشاء نے دھنیا کے پتوں کو پکے ہوئے سالن میں چھڑکا اور ڈھکن سے ڈھانپ دیا پھر نچلے کیبنٹ سے روٹیاں پکانے کے لیے بیلن اور توا نکالنے لگی۔

”عشاء!“ عادل نے آواز میں دنیا بھر کی مٹھاس سمو کر اسے پکارا۔

عشاء خاموش رہی مگر دل ہی دل میں مسکرائی کیونکہ عادل کا لہجہ اور انداز چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا

کہ وہ صلح میں پہل کرے گا' ان کے درمیان یہ پہلا جھگڑا تھا جو گزشتہ اٹھارہ گھنٹے سے چل رہا تھا۔

''ناراض ہو؟'' وہ اس کی پکار کو نظر انداز کرتے ہوئے برنر آن کر رہی تھی' جب عادل نے پوچھا، پلان کے مطابق عشاء کو اب بھی خاموش رہنا تھا۔

''یار! جواب تو دو' بے شک مجھ سے بات مت کرو مگر سوال کا جواب تو دے دو' میں بھی مسلمان ہوں...... دینی اسلامی بھائی سمجھ کر ہی سہی مگر جواب تو دو یار......! اچھا بابا ماموں زاد بھائی سمجھ کر ......یار! کچھ تو بولو۔''

وہ نہایت لاڈ سے اپنے مخصوص انداز میں بات کر رہا تھا۔ عادل اس کے ماموں کا بیٹا تھا۔ وہ انجان بنی روٹی بیلتی رہی۔

''ارے کہیں تم چار آپشنز کا انتظار تو نہیں کر رہیں......؟ اس ٹی وی شو نے ہماری قوم کا دماغ خراب کر دیا ہے' کوئی سوال پوچھو' چار آپشنز مانگنے لگتے ہیں لوگ...... اب اس بات سے ایک لطیفہ یاد آ گیا ہے مجھے...... ذرا غور سے سننا پلیز...... عرض کیا ہے۔ ایک دفعہ کسی سکھ سے کسی نے......''

''آپ کھانا شروع کریں' میں گرم گرم روٹی اتارتی ہوں۔'' عشاء نے اس کی بات کاٹ کر کوفتوں والا باؤل اس کے سامنے رکھا اور پلٹ کر دوبارہ برنر کے پاس آ گئی۔ بقیہ برتن اور لوازمات وغیرہ وہ پہلے ہی ٹیبل پر سجا چکی تھی۔

عادل خاموشی سے کوفتوں کے باؤل کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے اکیلے کھانا کھانا اچھا نہیں لگتا تھا اور عشاء اس بات سے بخوبی واقف تھی۔

''تم نہیں آؤ گی؟'' عادل نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔ عشاء کا انداز اسے اب برہم کرنے لگا تھا۔

''نہیں۔'' روٹی بیلتے ہوئے اس نے یک لفظی جواب دیا۔

''کیوں؟'' عادل نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے پھر پوچھا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے...... آپ کھا لیجئے...... میں بعد میں کھاؤں گی۔'' وہ روٹی توے پر ڈالتے ہوئے بولی۔

عادل اس کے بالکل قریب پہنچا پھر کیبنٹ سے ٹیک لگا کر بغور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ عشاء نے اپنی توجہ توے پر ہی رکھی کیونکہ اگر وہ عادل کی جانب دیکھ لیتی تو اسے ہنسی آ جانی تھی اور پھر وہ بات نہیں ہو سکتی تھی جو عشاء اس سے کرنا چاہ رہی تھی۔

عادل کا ارتکاز اسے بے چین کر رہا تھا کیونکہ اب وہ خاموشی سے اسے دیکھنے میں مگن تھا۔

''اب کیا ہے......؟ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں مجھے؟'' چمٹے کی مدد سے وہ روٹی ہاٹ پاٹ میں



رکھتے ہوئے بولی۔

''بھوک کیوں نہیں ہے؟'' عادل نے دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''صبح ناشتے میں پراٹھا کھا لیا تھا۔'' عادل نے آگے بڑھ کر برنر بند کر دیا پھر شیلف سے پانی کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ ایک سانس میں گلاس خالی کر کے اس نے پٹخ کر شیلف پر رکھا پھر منہ پھلا کر بولا۔

''مجھے بھی بھوک نہیں ہے۔'' وہ کہہ کر رکا نہیں بلکہ تیزی سے لاؤنج کی سمت بڑھ گیا۔ عشاء کا دل دھڑکا۔ وہ خفگی کو اس نہج پر لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

''کم آن عادل! میں نے یہ کوفتے آپ کے کہنے پر بنائے تھے......'' اس نے لہجے کو نرم کر کے عادل کو پکارا تھا مگر اب اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔

''بہت مہربانی آپ کی...... شکریہ آپ نے اتنی زحمت کی۔'' وہ تڑخ کر بولا۔

عشاء چند لمحے تو اس راستے کی طرف دیکھتی رہی' جہاں سے گزر کر عادل لاؤنج کی طرف گیا تھا پھر کچھ سوچ کر خود بھی لاؤنج کی طرف آ گئی۔

''آئی ایم سوری عادل......! کھانے سے کیا ناراضی...... چلئے کھانا کھا لیجئے۔'' اس نے مصالحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

عادل چہرے کے سامنے اس طرح اخبار پھیلائے بیٹھا تھا کہ اس کا چہرہ بالکل چھپ گیا تھا۔

''اوہ رئیلی...... مطلب کھانے سے کوئی ناراضی نہیں ہوتی...... ساری ناراضی شوہر سے ہوتی ہے...... ایک برکت والا دن ہوتا ہے سنڈے کہ جس روز بیوی کے ساتھ اطمینان سے بیٹھ کر لنچ کرنے کا موقع ملتا ہے اور وہ بھی بیوی صاحبہ کی ناراضی میں نکل جاتا ہے...... کہہ دیا نا مجھے کچھ بھی نہیں کھانا۔''

وہ اخبار ہٹائے بغیر بولا۔ عشاء آگے بڑھی اور جھپٹ کر اخبار اس کے چہرے سے ہٹا دیا۔

اخبار ہٹتے ہی عادل کو ہنسی آ گئی کہ عشاء کا چہرہ غصے سے کے مارے لال ہو رہا تھا۔

''کیوں نہیں کھانا؟'' وہ دونوں ہاتھ کمر پر ٹکا کر بولی۔ عادل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اسے صوفے پر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

''اس لیے میری ناراض سہیلی کہ مجھے اکیلے کھانا کھانا بالکل اچھا نہیں لگتا اور......''

''اور جو میں سارا ہفتہ اکیلے کھانا کھاتی ہوں......؟ کبھی سوچا ہے آپ نے کہ مجھے یہ اچھا لگتا ہے یا نہیں...... میں ناراض ہوں مگر آپ کے سامنے تو ہوں اور آپ تو یہاں موجود ہی نہیں ہوتے۔ میں دیواروں سے باتیں کرتی ہوں اور دیواروں کی باتیں سنتی ہوں...... ذرا سوچئے مجھے غصہ آنا چاہیے یا

نہیں۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

عادل خاموشی سے اس کی بات سنتا اور اس کی جانب دیکھتا رہا۔

''اتنا غصہ نہیں کرتے جان! مجھے احساس ہے کہ تم بہت اکیلی ہوتی ہو...... بور ہو جاتی ہو...... اس روٹین لائف سے اکتانے لگتی ہو...... یقین کرو آفس میں بھی تمہاری طرف دھیان لگا رہتا ہے' اسی لیے......'' عادل کے محبت بھرے لہجے کا نوٹس لیے بغیر عشاء نے اس کی بات کاٹ دی۔

''اوہ ہاں...... تب ہی تو آپ مجھے ایک ہزار ایک فون کرتے ہیں آفس سے...... میں کام کرنے لگتی ہوں آپ کا فون آجاتا ہے' ہم گھنٹہ بھر باتیں کرتے ہیں پھر فون رکھ کر میں کچن کی طرف جانے لگتی ہوں کہ آپ کا فون کر لیتے ہیں اور دوسری بار ہم دو گھنٹے تک باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ مجھے موبائل میسجیز کرتے رہتے ہیں۔ میں میسیج کرتی ہوں تو آپ فوراً جوابی میسیج دیتے ہیں۔'' اس کا طنزیہ لہجہ عادل کو کھل کر ہنسنے پر مجبور کر گیا۔

''یار! سرتاج' مجازی خدا ہوتا ہے' اس کو بھگو بھگو کر نہیں لگاتے...... گناہ ہوتا ہے۔'' اس کی بات پر عشاء کچھ دیر اس کی جانب دیکھتی رہی پھر گہری سانس بھر کر بولی۔

''وہ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' اس سے پہلے کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھتی عادل نے دوبارہ ہاتھ کھینچ کر اسے بٹھا دیا پھر بغور اس کی جانب دیکھ کر بولا۔

''اوکے...... سیز فائر...... آئی ایم سوری...... دیکھو کان پکڑ رہا ہوں۔'' اس نے سچ مچ کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''آئندہ کبھی لیٹ نہیں آؤں گا...... آفس سے تمہیں ایک ہزار ایک مرتبہ نہ سہی مگر کم از کم دو بار ضرور فون کر لیا کروں گا۔ تمہارے ہر SMS کا فوراً جواب دوں گا' چاہے تم مجھے I hate you ہی کیوں نہ ٹائپ کر کے بھیجو...... روزانہ ڈرائیو پر لے جاؤں گا۔ اگر تم چاہو گی تو کھانا بھی باہر کھا لیا کریں گے' ورنہ تمہاری فیورٹ آئس کریم تو تمہیں ضرور کھلایا کروں گا' ہر ہفتہ شاپنگ کروایا کروں گا۔ جب تمہاری کسی سہیلی کا فون آیا کرے گا تو میں یاد سے اس کے ہسبینڈ کی خیریت دریافت کیا کروں گا بلکہ انہیں گھر آنے کی دعوت بھی دوں گا' اور بتاؤ۔'' آنکھوں میں شرارت کے رنگ لیے وہ باتوں باتوں میں عشاء کے تمام گلے دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کے اتنے لمبے چوڑے وعدوں پر بھی عشاء کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں ابھری تھی۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں موجود نازک سی رنگ کو کبھی اتار اور کبھی پہن رہی تھی۔ یہ اضطراری کیفیت اس کی عادت تھی۔ وہ جب بھی کسی الجھن میں ہوتی تھی تو اسی طرح اس رنگ کو پریڈ کروانے لگتی جبکہ عادل کو اس کی اس حرکت سے چڑ ہوتی تھی۔ اب بھی اس نے عشاء کے بائیں ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں



تھام کر اس پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا۔ عشاء کا ہاتھ اس کے دونوں ہاتھوں میں سینڈوچ ہو کر رہ گیا تھا۔

''کیا سوچ رہی ہو......؟ کہہ دو نا۔'' عادل اس کے ہر رنگ سے واقف تھا۔

''عادل! مجھے ضائع نہ کریں عادل...... مجھ میں بہت پوٹینشل ہے' اسے زنگ نہ لگنے دیں...... اللہ نے مجھے اس چار دیواری میں رہ کر ایک لگے بندھے معمول کے لئے پیدا نہیں کیا۔ پلیز عادل! لیٹ می ڈو سم تھنگ پوزیٹو...... پلیز......'' وہ التجائیہ لہجے میں بولی۔

عادل کچھ لمحے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کا ہاتھ چھوڑ کر کچن کی سمت چل دیا۔

عشاء وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی انگلی میں موجود انگوٹھی کو تکنے لگی۔

☆ ☆ ☆

''سو گیا؟'' چارپائی پر چت لیٹے ساجد نے بہت دھیمے لہجے میں احمد کی بابت استفسار کیا۔ وہ زینب کی طرف دیکھنے کے بجائے یک ٹک آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں گم ہے۔

''نہیں۔'' زینب نے بغور اس کی جانب دیکھ کر جواب دیا۔

وہ گود میں لیٹے احمد کو مسلسل تھپکنے میں مصروف تھی۔ مغرب کی اذان ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اور اب گہرے نیلے آسمان پر سیاہ رنگ غالب آنے لگا تھا۔ ساجد نے ابھی تک کھانے کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اسے مغرب کے فوراً کھانا کھانے کی عادت تھی۔ احاطے میں جھینگر اور مینڈک کی آوازوں کے علاوہ بھوری کے گلے میں بندھی گھنٹی کی وقفے وقفے کے بعد آنے والی ٹن ٹن ارتعاش پیدا کر دیتی وگرنہ وہ دونوں میاں بیوی اپنی اپنی سوچوں میں الجھے ہوئے تھے۔

احمد کو صبح سے بخار تھا۔ وہ سویا نہیں تھا مگر دوا کے باعث مدہوشی کے زیر اثر تھا۔ دو دو تین تین منٹ کے وقفے سے وہ سسکاری بھر کر کراہنے لگتا تو زینب کے ہاتھوں میں چستی آجاتی اور وہ ممتا بھرا لمس بچے کو چند لمحوں کے لیے پرسکون کر دیتا۔ اس کا جسم اب بھی بخار کے باعث تپ رہا تھا۔ حالانکہ دوا کھلائے گھنٹہ ہو چلا تھا۔

زینب نے کن اکھیوں سے ساجد کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بکھری الجھن کی پرچھائیاں زینب کو اندھیرے میں بھی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے ساجد کے رویے سے پریشانی ہو رہی تھیں ساجد جب سے احمد کو دم کروا کر لایا تھا' تب سے پریشان بیٹھا تھا۔ نجانے مولوی باقر نے ایسا کون سا فتویٰ صادر کر دیا تھا کہ ساجد اس قدر الجھن میں گھر گیا تھا۔

''لا اسے مجھے دے...... اپنے پتر کو میں اپنے ساتھ سلا لیتا ہوں۔'' اس نے یکدم گردن موڑ کر زینب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

زینب اسی کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس اچانک فرمائشی حملے کے لیے تیار نہیں تھی سو گڑبڑا سی گئی۔ اس

نے ساجد کے چہرے سے بمشکل نظر ہٹائی پھر اس سے پہلے کہ وہ خود اٹھ کر احمد کو اس کی گود میں دیتی' وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور احمد کو تھام لیا۔

''میرا منا...... میرا کاکا...... میرا چاند...... تاپ (بخار) چڑھ گیا میرے شیر کو...... ابھی ٹھیک ہو جائے گا......سو جا میری جان۔''

چند لمحوں بعد وہ احمد کو سینے پر لٹائے بہت محنت سے تھپکنے میں مصروف تھا۔

زینب اس کے انداز اب بھی بغور دیکھ رہی تھی۔ ساجد کا برہم مزاج اسے اپنی ان تمام غلطیوں کا اعتراف کرنے کے لیے مجبور کر رہا تھا جو اس سے ہوتی رہی تھیں۔

اس نے ساجد کے بار بار کہنے پر بھی گیارہویں شریف کا ختم نہیں دلایا تھا اور ساجد کے پوچھنے پر کہہ دیا تھا کہ وہ ختم دلا چکی ہے۔

اس نے ساجد کی غیر موجودگی میں بھوری کا دودھ خالد بٹ کی بیوی کے ہاتھ بیچ دیا تھا کیونکہ ان کا گوالا دودھ دے کر نہیں گیا تھا پھر آج سارا دن احمد دھوپ میں کھیلتا رہا تھا اور اب بخار میں پھنک رہا تھا، ان سب سے بڑھ کر ساجد پچھلے احاطے میں سویا ہوا تھا اور زینب نے مولوی باقر کو یہ کہہ کر گھر نہیں آنے دیا تھا کہ ساجد شہر گیا ہوا ہے، جب وہ آ جائے تب آنا۔ حالانکہ وہ زینب ہی کے لیے تعویذ لکھ کر لایا تھا۔

مولوی باقر کو دھوپ کی وجہ سے آنکھوں کی بیماری لگ گئی تھی۔ اس نے ساجد سے شہر سے سرمہ لانے کے لیے کہا تھا اور ساجد پچھلے چکر میں سرمہ لایا بھی تھا مگر زینب نے ٹرنک میں وہ چھوٹی سی شیشی چھپا کر رکھ دی تھی اور ساجد کو کہہ دیا تھا کہ احمد نے وہ شیشی توڑ دی ہے۔

وہ ان تمام باتوں کو سوچنے کے بعد اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ جملے سوچنے لگی۔ پریشان کن بات یہ تھی کہ ساجد کچھ بول ہی نہیں رہا تھا۔ وہ نجانے کون سی پہیلیاں سلجھانے میں غرق تھا۔

وہ خود سے سوال جواب شروع کر کے اپنے پاؤں کلہاڑی نہیں مار سکتی تھی، اسی لیے انتظار کر رہی تھی کہ وہ خود گفتگو کا آغاز کرے۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اگر مولوی باقر کی کسی شکایت کی وجہ سے ساجد خفا ہے تو وہ سب کچھ صاف صاف بتا دے گی۔

مولوی باقر کے خلاف زینب نے یک طرفہ ایک محاذ بنا لیا تھا۔ حالانکہ وہ بے چارہ اسے تو کچھ بھی نہیں کہتا تھا۔ فقط ساجد کو اچھی باتیں بتاتا رہتا تھا تا کہ ساجد صراط مستقیم پر چل سکے۔ زینب کو مولوی باقر پر اس لیے بھی شک ہو رہا تھا کہ جب سے ساجد، احمد کو بخار توڑنے والا دم کروا کر لایا تھا تب سے ہی خاموش خاموش سا تھا۔

''ساجی! تیرے لیے روٹی لے آؤں؟'' اس نے بہت ہمت کر کے پوچھا۔

ساجد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ زینب اٹھ کر بیٹھی پھر ٹانگیں چارپائی سے لٹکا کر جوتے پہننے لگی۔



ساجد نے پھر سے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا۔

زینب کو چارپائی سے اترتا دیکھ [illegible] اس نے گہری سانس بھری پھر ہاتھ کے اشارے سے احمد کو اٹھا لینے کے لیے کہا۔ احمد گہری نیند میں تھا۔

''میں نے پوچھا تھا تیرے لیے روٹی لے آؤں یا آج بھوکا سونا ہے۔'' احمد کو اس کے سینے سے اٹھا کر چارپائی پر منتقل کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

احمد کو لٹاتے ہوئے اس کی کلائی میں موجود کانچ کی چوڑیاں کھنکنے لگیں۔ ساجد نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا تاسف بھرا تھا۔ زینب، احمد کو [illegible] کے کپڑوں سے ڈھکنے میں مصروف تھی تا کہ مچھر اور مکوڑے اسے تنگ نہ کریں۔

''مجھے تجھ سے ایک بات کرنی ہے زینب!'' زینب کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

وہ پڑھی لکھی نہیں تھی مگر اس نے قرآن پاک پڑھ رکھا تھا مگر ناظرہ میں اسے فقط سورۃ فاتحہ ہی آتی تھی۔ اس نے وہی پڑھ لی۔

''یہاں میرے پاس آ کر بیٹھ۔'' ساجد کی اگلی فرمائش نے اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیے۔ اسے ایک ایک کر کے اپنی غلطیاں یاد آ رہی تھیں جن کی بنا پر اسے ساجد سے ڈانٹ پڑ سکتی تھی۔

وہ اپنی چارپائی سے اٹھ کر ساجد کی چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی۔ ساجد بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آسمان پر آخری تاریخوں کا زرد چاند تھا جس کی روشنی چہرے کے رنگوں کو پڑھنے کے لیے ناکافی تھی مگر پھر بھی زینب کو اپنے چہرے پر ساجد کی آنکھوں کی تپش صاف محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کے چہرے پر نجانے کیا کھوج رہا تھا۔

''تیری چوڑیاں بہت اچھی ہیں...... ماسی برکتے سے چڑھوائی تھیں نا؟'' اس نے یک دم زینب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

زینب کو کرنٹ سا لگا۔ بہت دن پہلے اس نے ساجد کو یہی بتایا تھا کہ اس نے یہ چوڑیاں ماسی برکتے سے تیس روپے درجن میں خریدی تھیں۔

''ہاں...... ہاں...... تجھے آج یاد آئی ان چوڑیاں کی...... اب تو آدھی رہ گئی ہیں۔'' وہ اٹھلا کر بولی جیسے ساجد سے شکوہ کرنا چاہتی ہو کہ اسے اتنے دن بعد چوڑیاں دیکھنے کا دھیان آیا۔

ساجد نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پھر اپنے ہاتھوں سے پیشانی کو مسلنے لگا۔

''زینب! آج میں چوہدری کے ڈیرے پر گیا تھا...... وہاں میں نے ایسی ہی چوڑیاں دیکھیں۔ ایک کونے میں ٹوٹی ہوئی پڑی تھیں...... ڈھیر تھا ڈھیر۔'' وہ اس کی جانب دیکھ کر بولا مگر اس کے لہجے میں سختی نہیں تھی بلکہ عجیب بے چارگی تھی۔

زینب کا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ اسے لگا وہ مر جائے گی۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''آ...... ایسی...... ایسی چوڑیاں؟'' اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ ساجد نے جواب دینے کے بجائے سر جھکالیا۔ زینب کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔

اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح اپنی صفائی پیش کرے۔ اس کی خاموشی ساجد کو مشکوک کرسکتی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی ساجد نے جھکے ہوئے سر اور دھیمے لہجے میں انکشاف کیا۔

''ڈیرے کے پیچھے والے کھو (کنویں) سے کسی زنانی کی لاش وی نکلی ہے۔''

''ہائے میں مرگئی...... تو سچ کہہ رہا ہے ساجی!'' اس نے دہل کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

چوہدریوں کے ''کارنامے'' کوئی ایسی ''نئی'' یا ''انہونی'' بات نہیں تھی مگر لاش کا ملنا سچ مچ خوف ناک تھا۔ چوہدری باہمی رضامندی سے معاملات نبٹانے والے لوگ تھے۔

''کسی ہور سے بات نہ کرنا زینبے...... چوہدری سے دشمنی ہم جیسے لوگوں کو راس نہیں آسکتی...... بس تو اپنی زبان بند رکھنا...... کسی سے کہنے کا فائدہ وی کیا ہے۔'' ساجد نے اسے نصیحت کرنا ضروری سمجھا تھا۔

زینب دل ہی دل میں درود شریف کا ورد کرتی وہاں سے اٹھ گئی۔ اس کے دل کی حالت عجیب ہورہی تھی۔

☆ ☆ ☆

میں نے کچھ عرصہ R-Lintas والوں کے لیے بھی کام کیا ہے۔ وہ ایک زبردست ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہے۔ وہاں آپ کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے اور پھر کام کے ساتھ ساتھ انجوائے منٹ کا بھی فل مارجن...... میرے پاس ان کا دیا ہوا ''Experience Letter'' بھی ہے۔ ان کے MD میرے کام سے بہت امپریس تھے۔'' تانیہ درانی نامی اس لڑکی نے اپنے کافی براؤن بالوں میں بایاں ہاتھ چلاتے ہوئے رسمی انداز میں مسکرائے ہوئے کہا۔

عشاء نے اپنے لبوں پر جوابی مسکراہٹ سجانے کی کوشش نہیں کی۔ اس لڑکی کے چہرے سے ہی اندازہ ہورہا تھا کہ وہ صرف آس پاس بیٹھی لڑکیوں پر رعب ڈالنے کے لیے جھوٹ پر جھوٹ بول رہی ہے۔

''میرا ارادہ R-Lintas کو چھوڑنے کا نہیں مگر......'' اس نے پھر بات شروع کی اور آنکھیں گھما کو عشاء کی جانب دیکھا پھر لمحہ کو رک کر بولی۔

''وہ لوگ میرے پیچھے ہی پڑ گئے تھے، اصرار کررہے کہ میں ان کے کسی کلائنٹ کی خصوصی فرمائش پر ان کی کسی پراڈکٹ میں ماڈلنگ کروں......؟ ہاں ٹھیک ہے یہ بھی ایک اچھا پروفیشن ہوگا مگر میرے جیسی لڑکی کے لیے مشکل تھا کہ میں ایک تھرڈ کلاس سیلز گرل بن کر دانتوں کی نمائش کرتی پھرتی......؟ بھئی میں تو ماڈلز کو سیلز گرل ہی سمجھتی ہوں۔ اپنا آپ سجا سنوار کر کسی پروڈکٹ کی تشہیری مہم میں حصہ لینا بہت چیپ لگتا ہے۔''

وہ اپنی دائیں ٹانگ پر رکھتے ہوئے بولی۔ انتہائی ٹائٹ جینز کے پائنچے پر بنے کٹ نے پھیل کر اس



کی دودھیا ٹانگ کو پنڈلی تک نمایاں کردیا تھا جبکہ شرٹ کے نام پر دھبہ اس کی شرٹ پشت کے قریب اکٹھی ہوکر اس کے پیٹ کو عریاں کررہی تھی مگر اسے پروا نہیں تھی۔

اس ویٹنگ روم میں ضرورت مند لڑکی تو کوئی بھی نہیں لگ رہی تھی۔ سب ہی اپنے حلیے اور رکھ رکھاؤ سے ''شوقیہ'' کے زمرے میں گنی جاسکتی تھیں مگر تانیہ درانی کا تو انداز ہی نرالا تھا۔

''دیسے بھی ماڈلنگ کی مجھے اجازت نہیں ملنی تھی۔ میرے پیرنٹس بہت مذہبی ہیں' ہمارے گھر کا ماحول ایسا نہیں ہے کہ اس قسم کے کاموں کی اجازت اتنی آسانی سے مل جائے اور پھر میں ضد بھی کیوں کرتی جبکہ میں خود بھی انٹرسٹڈ نہیں تھی۔ بائی داوے عشاء! آپ چہرے پر کیا لگاتی ہیں' آپ کی اسکرین بہت فریش ہے۔'' اپنی داستان امیر حمزہ سناتے سناتے وہ پھر عشاء کو چھیڑ بیٹھی تھی۔

عشاء نے مصنوعی رسمی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا پھر بولی۔

''اللہ کی رحمت ہے جی...... بس جھوٹ بولنے سے پرہیز کرتی ہوں۔'' تانیہ درانی نے سر ہلا کر تائید کی پھر وہ جھوٹ کی برائیاں کرنے میں مگن ہوگئی تھی۔

عشاء کو کچھ دیر بعد ہی کال کرلیا گیا۔ وہ اپنے بے شکن لباس کو جھاڑتے ہوئے اٹھی اور اس کمرے کی سمت چل دی جہاں انٹرویو ہونا تھا۔ اس کمرے کا ماحول قطعاً آفس کی طرز کا نہیں تھا۔ وہ آفس سے زیادہ ایک پرتعیش لونگ روم لگ رہا تھا۔

لائٹ گرین کورز والے بھاری صوفے' لائٹ اور ڈارک گرین کنٹراسٹڈ پردے کارنر میں موجود قیمتی ان ڈور پلانٹس مہنگے ڈیکوریشن پیسز اور پینٹنگز سب ہی کچھ مل جل کر اس ڈرائنگ روم نما آفس کی شان بڑھا رہے تھے۔

پینل میں دو عورتیں اور ایک مرد شامل تھا۔ ان تینوں کے چہروں پر سختی اور رعونت کے بجائے دوستانہ سی مسکراہٹ تھی۔

''مس عشاء عادل...... بیٹھے پلیز۔'' اس شخص نے مسکرا کر اسے بیٹھنے کی دعوت دی۔ عشاء کے Particulars والی فائل پہلے سے ہی اس کی میز پر موجود تھی۔

''مسز عشاء عادل! عشاء نے بیٹھتے ہوئے تصیح کرنا ضروری سمجھا۔ ان تینوں کے چہروں پر مسکراہٹ کی پرچھائیں گہری ہوئی۔

''اوہ سوری...... مسز عشاء عادل...... میں اسفند رحیم یہ مس شیریں اور وہ مس ضوبا ہیں۔'' اس شخص نے مسکراتے ہوئے معذرت کی اور پھر اپنا اور ان دو خواتین کا تعارف کروانے لگا۔

عشاء نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ انٹرویو پینل اس کی توقع سے زیادہ خوش اخلاق و خوش گفتار تھا۔

''میں ایک بات کی وضاحت کر دینا چاہتی ہوں۔ ہم ایک سیمی گورنمنٹ ادارہ چلا رہے ہیں ہمارا مقصد انسانیت کی خدمت ہے اور اس کے لیے ہمیں ایسے حوصلہ مند اور ہمدرد لوگوں کی ضرورت ہے جو اس مشن میں ہمارا ساتھ دے سکیں۔''

مس شیریں بغور اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ خاموش ہوئیں تو مس ضویا نے اپنی زبان پر لگا قفل کھولا۔

''ہو سکتا ہے آپ کو یہ انٹرویو کچھ مختلف لگے۔ ان تمام انٹرویو سے مختلف جو آج تک آپ دیتی آئی ہیں۔ اس غیر رسمی انٹرویو کا مقصد دراصل امیدوار کی خصوصیات کو جانچنا اور ان کی ذہنی اپروچ کا پتا لگانا ہے۔ تاکہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ آیا آپ ہمارے ساتھ کام کر سکتی ہیں یا نہیں۔''

مس ضویا خاموش ہوئیں تو کمرے میں صرف فائل کھولنے اور بند کرنے کی ہلکی سی سرسراہٹ گونجتی رہی پھر اسفند صاحب صوفے پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

''What do you thhink about love'' اچانک اسفند صاحب نے پوچھا تھا۔

عشاء لمحہ بھر کے لیے سوچ میں پڑ گئی اسے اس قسم کے غیر روایتی انٹرویو کی امید نہیں تھی۔

''محبت......؟'' عشاء نے ہونٹ بھینچ کر کچھ سوچنے والے انداز میں کہا۔

اس نے زندگی میں کبھی بھی دلچسپی سے کسی ادبی صنف کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ انتہائی پریکٹیکل قسم کی ذہنی اپروچ رکھنے والی مسز عشاء عادل کے لیے اس سوال کا جواب دینا مشکل نہ سہی مگر مختلف ضرور تھا۔ اس نے ان تینوں کی جانب دیکھا وہ اسی کی طرف متوجہ تھے۔

''دراصل ہم محبت کو Define نہیں کر سکتے...... یہ ایک ایسی چیز ہے جو کبھی جمود کا شکار نہیں ہوتی...... ہر گزرتے لمحے کے ساتھ Variations آتی ہیں جو اسے گلنے سڑنے نہیں دیتیں...... محبت جو کل تھی وہ آج نہیں ہے اور جو محبت آج ہے وہ کل نہیں ہوگی۔ آج کی محبت پریکٹیکل ہے۔ گزشتہ زمانے میں حکمران اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ''تاج محل'' جیسا شاہکار تخلیق کروا سکتے تھے مگر آج کوئی بھی ایسی غلطی نہیں کرے گا۔''

اس نے بہت سوچ کر جواب دیا مگر اسفند صاحب کے چہرے پر پھیلنے والی مسکراہٹ دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی۔

اس شخص کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو۔

''تاج محل اور غلطی......؟'' اس نے استہزائیہ انداز میں مسکراتے ہوئے یہ دو لفظ دہرائے۔

''یس سر! غلطی...... کم از کم میں تو اسے غلطی ہی کہوں گی۔ ایک عام سی عمارت کھڑی کر کے اس کے پیچھے ایک محبت بھری کہانی منسوب کر دی گئی اور اس کے بجائے اگر کوئی لائبریری کوئی انسٹی ٹیوٹ بنا دیا جاتا تو بہتر ہوتا...... لیکن بہر حال یہ میری ناقص رائے ہے۔ آپ کا یا کسی کا بھی مجھ سے متفق ہونا ضروری نہیں۔'' اسفند نے اپنی آنکھوں میں در آنے والی ستائش کو چھپا لیا تھا۔



''مس عشاء...... آئی مین مسز عشاء عادل......! کیا آپ یہ کہنا چاہتی ہے کہ گزشتہ زمانے کے لوگ محبت کے معاملے میں اتنے Calculative نہیں ہوا کرتے تھے۔'' اس نے بغور عشا کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

''جی...... میں یہی کہنا چاہتی تھی۔'' عشاء نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔

ان بے تکی باتوں سے اسے چڑ ہونے لگی تھی۔ عشاء کی بات سن کر وہ عجیب سے انداز میں مسکرانے لگا پھر میز پر بالکل آگے ہو کر بولا۔

''کیا آپ اس لفظ کی وضاحت کرنا پسند کریں گی؟''

عشاء دل ہی دل میں جز بز ہوئی۔ اب وہ اس سوال کا کیا جواب دیتی۔

حقیقت تو یہ تھی کہ اسے اس طرح کی باتوں کا کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔ وہ کرنٹ افیرز پر بات کر سکتی تھی۔ ملک میں امن وعامہ کی صورت حال پر ٹھیک ٹھاک تنقید کر سکتی تھی۔ سوشلزم اور کمیونزم کی وضاحت کر سکتی تھی۔ مگر محبت جیسی چیز کے بارے میں وہ کیا کہتی۔

''اسفند پلیز......! اسٹاپ اٹ ہاں...... اب تم وہی اولڈ اینڈ اوڈ باتیں نہ شروع کر دینا...... ہم وہ الف لیلوی باتیں سننے کے موڈ میں نہیں ہیں! اسفی......؟''

مس ضویا نے اسفند کو کچھ کہنے کے لیے پر تولتے دیکھ کر فوراً ٹوکا جبکہ مس شیریں دھیمے سے مسکرائیں۔

''آپ لو میرج کو ارینج میرج کے مقابلے میں کتنے مارکس دیں گی۔''

''دھت تیرے کی...... وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔'' عشاء نے دل ہی دل میں ناگواری سے سوچا۔

اسے یکدم ہی اپنا آپ ہونق لگنے لگا۔

''میری ارینجڈ میرج ہے اور میں اپنی میرڈ لائف سے ماشاءاللہ بہت مطمئن ہوں۔ اس لیے ظاہر ہے میں تو ارینجڈ میرج کو ترجیح دوں گی۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

وہ کوفت کا شکار ہونے لگی تھی۔ اس کے جواب پر دونوں خواتین نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا عشاء کا دل اچاٹ ہو چکا تھا۔

''او کے مس...... آپ کے خیال میں آزادی اظہار کیا ہے؟'' اسفند نے پھر گفتگو میں حصہ لیا۔

وہ شاید عہد کر کے اس جگہ پہ بیٹھا تھا کہ وہ کسی خاتون کو بولنے کا موقع نہیں دے گا عشاء ابھی اس سوال کا جواب سوچ رہی تھی کہ وہ پھر بول اٹھا۔

''اگر میں یہ کہوں کہ آزادی اظہار یہ ہے کہ آپ مجھے اچھی لگ رہی ہیں تو مجھے برملا اس بات کا اظہار کر دینا چاہیے اور آپ کو بتا دینا چاہیے کہ سفید رنگ آپ کے لیے ہی بنا ہے اور یہ آپ پر بہت جچ رہا ہے۔''

آپ اس لباس میں بہت خوبصورت لگ رہی ہیں اور کیا آج رات آپ میرے ساتھ لانگ ڈرائیو پر چلنا پسند کریں گی تو آپ کیا کہیں گی...... از دس فریڈم آف اسپیچ...... ہاں...... بولیے۔'' اس کا لہجہ سادہ تھا مگر آنکھوں کی چبھن عشاء کو اپنے وجود کے آر پار ہوتی...... محسوس ہوئی۔

عشاء کے مزاج کو برہم ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی تھی اور جب وہ برہم ہو جاتی تھی تو پھر اپنے سامنے موجود کسی بھی شخص کو منٹوں میں کھری کھری سنا دیا کرتی تھی۔ جذباتیت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

''اس ساری بکواس کے جواب میں مجھے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ آپ عقل سے پیدل ایک گھٹیا اور جاہل شخص ہیں۔ آپ کو شاید مینرز کے اسپیلنگ بھی نہیں آتے ہوں گے اور یہ ساری باتیں جو آپ نے کی ہیں یہ بھی بکواس ہیں آپ نے شاید اسی ساری بکواس کی تشہیر کے لیے ملک کے اچھے اخبارات میں ایڈ دیا تھا۔ وہ تمام اخبارات جن میں یہ ایڈ چھپا تھا وہ بھی بکواس ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اب مجھے بھی اپنا آپ بکواس لگنے لگا ہے۔ کہ آخر میں یہاں کر کیا رہی ہوں۔ دیٹس آل...... میرے دل میں آپ کے حوالے سے جو جذبات ابھرے میں نے کہہ دیے۔'' عشاء نے خلاف توقع نہایت تحمل سے بات مکمل کی پھر گہری سانس بھر کر بولی۔

''میرا خیال ہے یہی آزادی اظہار ہے ناسر؟''

وہ یک ٹک اسفند کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بات کر رہی تھی۔

اسفند صاحب کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ اس شخص کو شاید اپنے اعصاب پر مکمل کنٹرول تھا۔ اگر اسے برا بھی لگا تھا تو اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

''ونڈر فل مسز عادل...... !سمپلی امیزنگ۔'' اس کے لہجے میں ستائش تھی۔ جبکہ مس شیریں مسکرا رہی تھیں۔

البتہ مس ضوبیا کا چہرہ سپاٹ رہا۔

''اوکے...... تھینک یو مسز عادل!'' اس نے سپاٹ چہرے کے ساتھ گویا عشاء کو پروانہ آزادی دیا تھا۔ عشاء اٹھ کر باہر نکل آئی۔

اس کے قدموں میں کم ہمتی یا مایوسی والی لرزش نہیں تھی۔ وہ اس جاب کو گویا ''طلاق'' دے کر باہر آئی تھی۔ دروازے سے باہر نکلنے تک دو آنکھوں نے اس کا پیچھا کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

''تیرا آج گھر جانے کا اردہ نہیں ہے؟'' نذیراں نے ناک چڑھا کر اس کی سست روی پر تنقید کی۔

وہ مرے مرے ہاتھوں سے گھاٹ پر ایک میلی قمیص رگڑنے میں مصروف تھی جبکہ نذیراں سمیت اس کے ساتھ آئی باقی عورتیں نا صرف کپڑے دھو کر فارغ ہو گئی تھیں بلکہ ایک دوسرے کے سر سے جوئیں نکالنے تیل ڈالنے اور بچوں کو نہلانے کے ساتھ ساتھ لگائی بجھائی جیسے اہم فرائض بھی نبٹا چکی تھی۔ یہ دھوبی گھاٹ آبادی سے



ذرا ہٹ کر چوہدری کے کھیتوں کے قریب ہی واقع تھا چونکہ اندر ہی اندر سب ہی چوہدری کی تازہ واردات سے واقف تھے۔ اس لیے تمام عورتیں آج کل اکٹھی گھاٹ پر آتی تھیں۔ سب کے مردوں نے رازداری سے سب کو ہی خبردار کر رکھا تھا۔

''ارادہ کیوں نہیں ہے......؟ ہے ارادہ...... گھر نئیں جاؤں گی تو ہور کدھر جاؤں گی۔'' نذیراں کی طرف دیکھے بغیر اس نے جواب دیا پھر گدلے پانی میں پڑے پتھر پر صابن لگی قیمص کو زور سے ملنے لگی۔

وہ فطرتاً لڑاکا نہیں تھا مگر اس کے ماضی سے واقفیت کی بنا پر کم ہی عورتیں اس سے میل جول رکھتی تھیں۔

''میں نے آج بڑی سستی دکھائی...... گھر جانے کی جلدی نئیں تھی نا...... ساجی شہر گیا ہے...... شامی (شام) واپس آئے گا...... ہانڈی میری پکی ہوئی ہے سویرے کی...... ہم تو جی دو (افراد) ہیں۔ روٹی میں ساجی کے لیے تازی بناتی ہوں۔'' وہ صابن لگی قیمص کو خشک قیمص پر نچوڑ کر سارا جھاگ اس پر منتقل کرتے ہوئے بولی۔

''اس کا مطلب تجھے تو آج بہت ٹیم (ٹائم) لگ جائے گا ہم سب تو کام مکا کر فارغ ہو چکی ہیں۔ وہ سب تو گھر جا رہی ہیں۔'' نذیراں نے عقب میں اپنی چیزیں سمیٹتی دوسری عورتوں کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہاتھ میں پکڑی کیری کترنے میں مصروف تھی۔

زینب اس کی کسی بات کا جواب دیے بغیر وہ دونوں قمیصیں نتھار کر دوسری طرف پڑی سوکھی جھاڑیوں پر پھیلانے چل دی۔ اس کے واپس آنے تک نذیراں وہیں بیٹھی رہی۔

''اس کا مطلب تجھے ابھی ہور گھنٹہ چاہیے؟'' نذیراں نے بات دہرائی۔

زینب نذیراں کا تذبذب سمجھ رہی تھی۔ وہ یقیناً گھر جانا چاہتی تھی مگر زینب اکیلی تھی۔ اس وجہ سے وہ جا نہیں سکتی تھی۔ شاید وہ یہ چاہ رہی تھی کہ زینب اپنے منہ سے اسے جانے کے لیے کہہ دے۔

''باقی سب تو چل دی ہیں...... سب کے گھر کے کام پڑے ہیں...... میری اپنی ہانڈی پکانے والی پڑی ہے...... میری وڈی تو کسی کام کی نئیں...... یہ دو مہینے بعد پورے بارہ سال کی ہو جائے گی مگر عقل اس کو رتی وی نئیں آئی اس سے تو سادی مونگ کی دال وی چنگی طرح نئیں پکائی جاتی...... اب گھر جاؤں گی تو خالی ہانڈی منہ چڑھا رہی ہو گی...... ہانڈی تو مجھے ہی پکانی ہے نا کرمو بھوک کا بڑا کچا ہے۔ دیر سویر ہو جائے روٹی کو تو اس کا غصہ دیکھنے والا ہوتا ہے۔ میں تیرے پاس رک جاتی مگر کرمو کا غصہ......'' نذیراں لہجے میں بے چارگی سموتے ہوئے بولی۔ یہ حقیقت تھی کہ اس کا خاوند بہت سخت مزاج واقع ہوا تھا۔

''ہاں ہاں نذیراں! تو جا...... میرا تو ابھی اتنا کپڑا دھونے والا پڑا ہے...... مجھے تو ابھی دیر لگے گی۔ تیری ہانڈی کو دیر ہوئی تو بھائی کرم دین ڈکراتا پھرے گا تو جا...... میری فکر نہ کر میں اکیلی سو پر بھاری ہوں اور اب تو میرا پتر وی جوان ہو گیا اے...... مجھے کاہے کی فکر؟'' زینب نے احمد کی جانب محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

نذیراں مطمئن ہو کر اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ سب اپنی پوٹلیاں سنبھالے آبادی کی

طرف چل دیں۔

گھاٹ کے دائیں بائیں چوہدری رب نواز کی ہی زمینیں تھیں وہ ایک اوسط درجے کا زمیندار تھا مگر اس پر اللہ کا فضل تھا۔ تھوڑی زمین پر بھی جو بوتا وہ سونا بن کر نکلتا تھا۔ دھوبی گھاٹ کے دائیں طرف مشرقی سمت میں مکئی کی فصل تیار کھڑی تھی جبکہ مغربی سمت میں چاول کی پنیری لگ چکی تھی۔

زینب جس جگہ بیٹھی تھی اس کے بالکل عقب میں پگڈنڈی پر سیدھی طرف چوہدری کا ڈیرا تھا جبکہ اسی پگڈنڈی پر اگر کچے میں اتر کر آگے کی سمت بڑھتے تو اس کا چھوٹا سا اصطبل تھا جس میں شاید ایک آدھ گھوڑی بھی موجود تھی۔ اصطبل کے ساتھ بھینسوں کا باڑہ تھا یہ باڑہ ملکوں کا تھا۔ ملکوں کی چوہدریوں سے ٹھیک ٹھاک یاری تھی اس لیے زیادہ لڑائی جھگڑے نہیں ہوتے تھے اور اگر ہوتے بھی تھے تو وہ لوگ مل بیٹھ کر سلجھا لیا کرتے تھے۔

ان عورتوں کے جانے کے بعد زینب اپنی میلی چنری کو گھاٹ پر پٹخ پٹخ کر دھوتی رہی پھر جب اسے اطمینان ہو گیا کہ سب جا چکی ہیں تو وہ گھاٹ سے اتر آئی۔ احمد نمی والی جگہ سے دور بیٹھا مٹی کھانے میں مصروف تھا۔ ابھی حال ہی میں اس کا بخار اترا تھا اس لیے کافی چڑچڑا ہو رہا تھا۔ زینب نے اسے مٹی کھانے سے نہیں روکا تھا۔ زینب نے اپنی چیزیں سمیٹنا شروع کر دیں۔ گیلے سوکھے کپڑوں کو اس نے ایک گٹھری میں باندھ کر ایک طرف رکھا اور پھر گھاٹ کے پانی سے منہ دھونے لگی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے دھلی صاف چادر اوڑھی اور کپڑوں والی گٹھری کو درخت کی کھوہ میں ایک طرف کر کے رکھ دیا کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔ اس کے بعد اس نے احمد کو گود میں بھرا اور پگڈنڈی کی سمت چل دی۔ گھاٹ سے پگڈنڈی کا فاصلہ بیس پچیس قدموں کا تھا۔ وہ پگڈنڈی پر سیدھی چلتی جا رہی تھی۔

''بھرجائی......'' اسے کسی نے پکارا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس آواز کو وہ بخوبی پہچانتی تھی۔ بمشکل اپنے چہرے کے تاثرات کو قابو کرتے ہوئے وہ مڑی اور تڑخ کر بولی۔

''ہاں۔'' مولوی باقر نے اس کے لٹھ مار کہ انداز کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا تھا۔

''اس ویلے کدھر جا رہی ہو بھرجائی۔'' جھکی آنکھوں کے ساتھ مولوی باقر نے بہت ملائم لہجے میں دریافت کیا تھا۔ زینب کے ماتھے کے بلوں میں کچھ اور اضافہ ہوا جسے مولوی باقر نے فوراً محسوس کر لیا تھا۔

''میرا مطلب تھا یہ راستہ تو چوہدری کے ڈیرے کی طرف جاتا ہے اس ویلے ڈیرے پر کیا کرنے جا رہی ہو؟ اگر یہ دیکھنے جا رہی ہو کہ وہاں تندور بل (جل) رہا ہے یا نہیں تو میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ چوہدری نے ڈیرے والا تندور بند کر دیا ہے۔'' وہ وضاحت آمیز انداز میں بولا۔

اس کی پلکیں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔ وہ زینب کا ایسے احترام کرتا تھا جیسے زینب اس سے کئی سال بڑی ہو۔

''تمہاری مہربانی باقر بھائی! کہ تم نے مجھے بتا دیا کہ وہاں تندور بند ہے مگر تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ میں تندور پر نہیں جا رہی تھی۔ میں کسی ہور کام سے جا رہی تھی اور میں چوہدری کے ڈیرے پر نہیں جا رہی ہوں بھلا ایک زنانی کا کیا کام......اب تمہاری اجازت ہو تو میں چلی جاؤں؟'' وہ کاٹ کھانے والے انداز میں



بولی۔

مولوی باقر نے شرمندہ سی نظریں اٹھا کر اسے دیکھا' پھر دھیمی آواز میں بولا۔

''بھرجائی! تم میری چھوٹی بہنوں کی طرح ہو اور پھر تم ساجد علی کی بیوی ہو۔ مجھے بہنوں سے بڑھ کر عزیز ہو۔ میری بات کا غلط مطلب نہ لینا۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے تمہیں میری کوئی بات بری لگی ہے۔ تم مجھ سے نراض (ناراض) ہو تب ہی تمہارا رویہ میرے ساتھ بہت بدل گیا ہے۔ تمہیں کسی بات کا غصہ ہے نا تب ہی تم اپنے بھائی سے کچھا کھڑی سی رہتی ہو۔ میری طرف سے اگر کوئی بھول چوک ہو گئی تو میں معافی مانگ لیتا ہوں۔ بہنوں سے معافی مانگنے میں بھائیوں کا شملہ نیچا نہیں ہوتا۔''

اس کی اتنی لمبی تقریر بھی زینب کو پرسکون نہ کر سکی۔

''مجھے ایک بات بتاؤ بھائی باقر! تمہارا اصل کیا ہے؟ یہ جو تمہارے چہرے کے پیچھے ایک چہرہ ہے' وہ کیا ہے بھائی باقر! تم مجھے بہن کہتے ہو اور اس طرح سے میرا پیچھا کرتے ہو۔ ساجد علی کو پتا چلے گا تو کیا عزت رہ جائے گی تمہاری۔ کہنے کو تم مجھے بہن کہتے ہو اور لفنگوں کی طرح میرے پیچھے پیچھے آتے ہو......اس بات کی ٹوہ میں رہتے ہو کہ میں کہاں جا رہی ہوں؟ کہاں سے آ رہی ہو؟ یہ عزت ہے تمہاری نظر میں میری؟'' زینب جنگلی بلی کی طرح غراتے ہوئے بول رہی تھی۔ زینب کے اس قدر سخت لہجے پر وہ ہکا بکا رہ گیا جبکہ زینب کو اس کی خاموشی سے مزید حوصلہ ہوا۔

''تم نے تو دین کی بہت سی باتیں پڑھ رکھی ہیں۔ تم تو مجھ سے زیادہ سیانے ہو۔ تم مجھے بتاؤ کہ یہ مناسب لگتا ہے کہ تم ایک زنانی کے پیچھے پیچھے آؤ۔ اپنی عمر کا نہ سہی اپنے رتبے کا خیال کر لو۔ سارے زمانے کو نصیحتیں کرتے ہو کہ نیک انسان بن کر رہنے کا ول (طریقہ) کیا ہے اور خود تمہیں ایسی باتوں کا ول نہیں ہے۔ ساجد علی کو منع کر دیا کہ ٹی وی نہ لو...... یہ دوزخ کا ٹکٹ ہے اس سے انسان غلط باتیں سیکھتا ہے۔ تمہارے گھر تو ٹی وی نہیں ہے تم نے یہ غلط باتیں کہاں سے سیکھیں؟'' وہ تیز آواز میں نہایت حقارت سے بات کر رہی تھی۔

اپنی بات ختم کر کے وہ لحہ بھر بھی نہیں رکی تھی جبکہ مولوی باقر کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک رنگ جا رہا تھا۔ وہ تو ملکوں کی بھینسوں کو دم کرنے آیا تھا۔ بھرجائی کو اکیلے راستے پر جاتے دیکھا تو ہمدردی کے مارے پوچھنے چلا آیا اس ہمدردی کا یہ صلہ ملا تھا۔

''بھرجائی نے ٹی وی والی بات کو دل سے ہی لگا لیا ہے۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔

زینب پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر آگے ہی آگے چلی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ چوہدری کا ڈیرا کہیں پیچھے رہ گیا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ وہ کافی آگے نکل آئی ہے تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ناگواری سے گہرا سانس بھرا اور دوبارہ سے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

☆ ☆ ☆

پونے بارہ بجے وہ انٹرویو دے کر آئی تھی اور ساڑھے پانچ بجے اسے ''فلاح'' والوں کی جانب سے فون آ گیا۔

''ہماری NGO کو آپ جیسی ایکٹو اور حوصلہ مند خواتین کی ضرورت ہے۔ ہمیں خوشی ہو گی اگر ہم آپ کی سروسز حاصل کر سکیں۔ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو کل آ کر جوائننگ رپورٹ پر سائن کر کے پیکج کے متعلق معلوم کر لیجیے گا۔'' مس ضویا کی سیکرٹری نے گھسے پٹے ڈائیلاگ روبوٹ کی طرح سنا کر فون بند کر دیا۔

''ارے واہ...... مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔'' فون رکھ کر عشاء نے مسکراتے ہوئے خود کلامی کی۔

اگرچہ وہ ''فلاح'' والوں کے آفس کو چھوڑتے وقت اس جاب کو نہ کرنے کا تہیہ کر چکی تھی مگر اب ان کی جانب سے موصول ہونے والی ویلکم کال نے اسے متحرک کر دیا تھا۔ عادل آٹھ بجے تک آتا تھا اور اسے یہ خوشخبری تب تک سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ اسے موبائل پر کال کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ آٹھ بجے کے قریب وہ آیا تو عشاء نے دروازہ کھولتے ہی اسے خوشخبری سنائی تھی۔

''اوہ...... واؤ...... مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا...... میں مٹھائی لے آتا۔'' وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔

عشاء خوشی سے بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے عادل کے چہرے کے بیزار کن تاثرات پر غور نہیں کیا تھا۔ وہ خود بھی لابی سے گزر کر لاؤنج میں آ گئی۔ عادل اپنی فائلز صوفے پر پھینک کر ٹائی ڈھیلی کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ شروع ہو گیا۔

''اب بھی دیر نہیں ہوئی...... میں اب لے آتا ہوں۔ ڈیڑھ گھنٹے کی تو ڈرائیو ہے بس ابھی گیا اور ابھی آیا۔ کس کی مٹھائی کھانی ہے؟ نرالا سویٹس سے لاؤں یا فضل والوں کی چلے گی یا پھر بٹ سویٹس تک جانا پڑے گا۔ ویسے اگر تم کہو تو گورمے سے بھی کچھ لا سکتا ہوں۔ شیزان والوں کے ڈونٹس تمہیں ویسے بھی بہت پسند ہیں۔ بات بھی اس قدر خوشی کی ہے۔''

ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے اس نے شرٹ کے سارے بٹن کھول دیے تھے اور اب لاؤنج میں رکھے ڈیپ فریزر سے پانی کی بوتل نکال رہا تھا۔ اس کی مسلسل چلتی زبان پر عشاء نے بھنویں اچکا کر اس کی جانب دیکھا۔

''مذاق کر رہے ہیں؟'' وہ بے یقینی سے بولی۔ عادل کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ مذاق اور طنز کو الگ الگ چیز نہیں سمجھتا تھا۔

''ارے نہیں نہیں یار! میری یہ مجال...... توبہ توبہ......'' صوفے پر گرنے والے انداز میں بیٹھ کر وہ گھونٹ گھونٹ پانی اپنے اندر منتقل کرنے لگا۔

اس کا موڈ آف دیکھ کر عشاء کچن کی طرف آ گئی۔ واپس آئی تو پھر ہاتھ میں گلاس تھا۔ اس نے فریزر سے جگ نکالا اور صوفے پر عادل کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

''میں نے آپ کے لیے Tang بنا کر رکھا تھا...... بہت گرمی ہے نا۔'' وہ مصالحت کے موڈ میں تھی اس لیے نرمی سے بولی۔

''اوہ! بہت جلدی یاد آ گیا۔'' وہ تڑخ کر بولا۔ عشاء نے حیرانی سے اسے دیکھا۔



آج اس کا مزاج کچھ زیادہ ہی برہم تھا اور وہ اپنا غصہ چھپانے کی کوشش بھی نہیں کر رہا تھا۔ عشاء اس سے باقاعدہ اجازت لے کر انٹرویو دینے گئی تھی اور اب جب وہ کامیاب ہو چکی تھی تو عادل کی خفگی کی وجہ اسے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے گلاس بھر کر اس کے سامنے رکھا اور پیر پٹختی کچن میں آ گئی۔

''اونہہ...... پتا نہیں کیا سمجھتے ہیں اپنے آپ کو...... میں بھی اب بات نہیں کروں گی۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے چولہا جلایا۔

''آج کھانے کو کیا ملے گا؟'' عادل نے لاؤنج میں بیٹھے بیٹھے پوچھا تھا اور وہ جو اس سے بات نہ کرنے کا عہد کر کے کچن میں آئی تھی ایک لمحہ خاموش نہ رہ سکی۔

''طعنے......'' اس کے پھاڑ کھاتے لہجے نے عادل کی طبیعت کو کافی فریش کر دیا۔

''کبھی مینیو چینج بھی کر لیا کرو۔'' اس نے جوابی حملہ کیا۔ عشاء کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر عادل بیڈروم کی طرف بڑھ گیا۔ عشاء نے کھانا گرم کر کے ٹیبل بھی سجا لی مگر وہ کمرے سے باہر نہیں تھا۔

''میں بس نوکرانی بنی رہوں، ان کے کپڑے دھوؤں ان کے لیے کھانا پکاؤں ان کا انتظار کروں ان کی خدمت کروں...... یہ خوش ہوں تو میں بھی خوش ہو لوں...... یہ سانس لیں تو میں بھی سانس لے لوں...... میرا اپنا تو کوئی وجود ہی نہیں ہے...... میں بس گھٹ گھٹ کر مر جاؤں...... کسی کو کیا پروا۔'' اس کی بڑبڑاہٹ عروج پر تھی۔

''ابھی سے فاتحہ مت پڑھو...... ابھی تو میرے مرنے میں چالیس پچاس سال پڑے ہیں۔'' عادل نے دائیں طرف کی کرسی سنبھالتے ہوئے کہا تھا۔

لہجے میں پہلے جیسی کاٹ نہیں تھی، آنکھوں میں شرارت بھی تھی۔ اس کی دل دہلا دینے والی بات پر عشاء نے اسے گھور کر دیکھا اور بے ساختہ ایک دھموکا جڑا۔

''توبہ کتنا مارتی ہو مجھے۔'' وہ شانہ سہلاتے ہوئے بولا۔

''آپ کی طرح لفظوں سے لہولہان نہیں کرتی۔'' عشاء پر جواب دینا فرض تھا۔

''فلاح'' والوں کے ایڈ میں یہ بات درج تھی نا کہ انہیں ایک زبان دراز عورت کی ضرورت ہے اس لیے تمہیں اپائنٹ کیا گیا ہے ورنہ اس کے علاوہ اگر تم میں کوئی خصوصیت ہے تو بندہ اس سے قطعی لاعلم ہے۔''

عادل نے پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے جان بوجھ کر بات کو یہ رخ دیا تا کہ پھر سے آج کی تازہ خبر کو زیر بحث لایا جا سکے۔

''عورت ہوں گے آپ خود۔'' عشاء چڑ کر بولی۔ سب عورتوں کی طرح اسے بھی خود کو عورت کہلوانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ عادل اس کی بات پر کھل کر ہنسا۔ یہ اس کی سب سے اچھی بات تھی کہ اس کا غصہ جلدی اتر جاتا تھا۔

''آہستہ بولو دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اتنا بڑا راز اتنی اونچی آواز میں فاش نہیں کرتے۔ ڈیئر۔''

وہ رغبت سے کھاتے ہوئے بھی اپنی زبان کے جوہر دکھانا نہیں بھولتا تھا جبکہ عشاء اس معاملے میں ذرا سست واقع ہوئی تھی۔ سو وہ خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف رہی۔ عادل نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش بھی کی اور کھانے کی تعریف بھی کی مگر وہ ''ہوں ہاں'' میں جواب دیتی رہی۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔

اس کے بعد عادل ٹی وی آن کر کے بیٹھ گیا جبکہ عشاء کچن میں آ گئی۔ پھیلاوا سمیٹنے کے بعد وہ عادل کے ساتھ لاؤنج میں ہی بیٹھ جایا کرتی تھی۔ دن بھر کی مصروفیت شیئر کرنے یا ٹی وی دیکھنے میں وقت گزر جاتا تھا یا پھر انٹرنیٹ پر گھر والوں سے بات ہو جاتی تھی مگر عشاء ناراضی کا اظہار کرنے کے لیے بیڈروم میں چلی آئی۔ صبح پہننے کے لیے کپڑے منتخب کیے پھر استری کرنے لگی کیونکہ وہ جانتی تھی عادل جلد یا بدیر اسے جوائننگ رپورٹ پر سائن کرنے کے لیے کہہ دے گا کیونکہ وہ اسے اجازت تو دے ہی چکا تھا۔

''آئس کریم کھانے چلو گی؟'' اس کی خاموشی سے اکتا عادل بیڈروم میں آ کر بولا۔ عشاء نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔ وہ انکار کرتی تو معاملہ کل پرسوں تک ٹل جاتا اور یہ اسے منظور نہیں تھا۔ سو فوراً تیار ہو گئی۔

''کب سے جوائن کرنا ہے۔'' گاڑی میں بیٹھ کر عادل نے پوچھا۔ عشاء کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کل۔''

''ٹھیک ہے۔'' عادل نے مسکرا کر گویا اپنے برے رویے کی تلافی کی تھی۔

''دل سے کہہ رہے ہیں نا؟'' عشاء نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں...... زبان سے......'' وہ بولا پھر بایاں ہاتھ اسٹیئرنگ سے ہٹا کر اس کے سر پر چپت لگا کر بولا۔

''ظاہر ہے دل سے کہہ رہا ہوں۔'' عادل نے سنجیدگی سے کہا۔

عشاء کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس نے سی ڈی پلیئر آن کر دیا اور ونڈ اسکرین سے گلے ملنے والی روشنیوں کو تکنے لگی۔ اس کے چہرے پر کچھ، بہت خوب پا لینے کی تمنا تھی۔ عادل نے دو ایک بار اسے دیکھا، کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر اس کے چہرے پر پھیلی خوشی کو دیکھ کر خاموش رہا۔

''کیا سوچ رہے ہیں۔'' ایسے ہی ایک لمحے میں جب وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا عشاء نے پوچھا۔

''ہاں میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر میں یہ کہوں کہ میں باپ بننے والا ہوں تو کیا تم جاب کا خیال دل سے نکال دو گی؟'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ عشاء نے نا سمجھی کے انداز میں اس کی جانب دیکھا عادل مسکرایا۔

''موویز میں ایسے ہی ہوتا ہے نا...... ہیروئن...... اگر وہ شادی شدہ ہو تو...... کسی کام کا ارادہ کرلے تو اگلے روز اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ اور ڈاکٹر آ کر خوشخبری سناتا ہے۔ کہ مبارک ہو جی......''

''عادل! آپ پاگل ہیں۔'' اس کی بات نے عشاء کو بھی ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ وہ یہ سمجھنے کو تیار نہیں تھی



کہ عادل نہیں چاہتا کہ وہ جاب کرے مگر اس کے سامنے ہار مان کر وہ رضامند ہوا ہے۔

''ارے بھئی! اس میں ایسا کیا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔'' عادل نے آئس کریم پارلر کے آگے گاڑی پارک کر کے ہارن بجانے کے بعد کہا۔

''پارلر کا ''چھوٹا'' آ کر آرڈر لینے لگا۔ عشاء خاموش تھی۔ عادل کو یکایک احساس ہوا کہ اس کی غیر سنجیدہ بات کو عشاء نے سنجیدگی سے محسوس کیا ہے۔

شادی کے دو سال بعد بھی ان کے گھر کوئی ''خوشخبری'' نہیں تھی۔ ایک دوسرے کا دل نہ دکھے، اس لیے وہ اس ایشو پر کبھی بات ہی نہیں کرتے تھے۔ اب بھی عادل کا مقصد اسے ہرٹ کرنا نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں بس ایک خیال آیا اور اس نے کہہ ڈالا۔

''ارے واہ...... کتنی خوبصورت لڑکی ہے۔'' عادل نے اس کا موڈ بحال کرنے کے لیے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

عشاء بھی اس فیز کے اثر کو ختم کرنے کے لیے فوراً اسے غیرت دلانے لگی۔

''کعبہ کس منہ سے جاؤ گے عادل! شرم تم کو مگر نہیں آتی۔'' عادل نے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

☆ ☆ ☆

''میرا دل چاہ رہا ہے تجھے قتل کر دوں۔'' ساجد علی نے پھنکار کر کہا۔

زینب نے بھیگی بھیگی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا پھر اس کی آنکھوں میں لپکتے خفگی و بے اعتباری کے شعلے دیکھ کر دوبارہ منہ پر میلا سا دوپٹہ رکھ کر رونے لگی۔

''یہ سوں سوں نہ کر...... مت دلا مجھے غصہ...... میں تیری ان باتوں سے بہلنے والا نہیں ہوں۔ مجھے سیدھی طرح سے بتا دے تو چوہدری کے ڈیرے پر کیا کرنے گئی تھی۔'' وہ اس کے پاس کھڑا غراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

اس نے زینب سے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ اس کا یہ لب و لہجہ اور انداز زینب کے لیے بہت حیران کن تھا۔ وہ تو بڑی بڑی باتوں پر بھی صبر و برداشت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

''میں...... چوہدری کے ڈیرے پر نہیں گئی تھی...... میں۔'' وہ سسکتے ہوئے اسے حقیقت بتانا چاہ رہی تھی مگر ساجد نے اس کی بات کاٹ دی۔

''جھوٹ مت بول زینب! میرے ساتھ جھوٹ مت بول۔ دیکھ مجھے صاف صاف بتا دے تو اس جگہ کیا کرنے گئی تھی۔'' ساجد نے اس کے سر پر ہاتھ مار کر کہا۔

اس کے ہاتھ کی ضرب اتنی شدید تھی کہ زینب اپنی جگہ سے ہل کر پیچھے کی طرف ہو گئی۔ اسے ساجد سے اب خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ مغرب سے پہلے ہی واپس آ گیا تھا اور اپنے ساتھ مولوی باقر کے لئے سرے کا تحفہ بھی لایا تھا۔

زینب نے بہت چاہا کہ وہ آج یہ تحفہ مولوی کو نہ دے پائے تاکہ زینب اپنے منہ سے حقیقت بتا

دے مگر وہ ناکام رہی تھی۔ ساجد اسی وقت یہ تحفہ لے کر مولوی باقر کے پاس گیا تھا اور واپسی میں شکوک سے بھرا دل لے کر واپس آ گیا تھا۔

''سابی! تو ایک بار میری بات سن لے...... اطمینان سے...... غصہ کیے بغیر۔ یہ غصہ بڑا شیطانی ہوتا ہے ساجی...... یہ گھر برباد کر دیتا ہے۔ تو میری بات آرام سے بیٹھ کر سن تو سہی۔'' زینب نے متواتر سوں سوں کرتے ہوئے بات مکمل کی تھی۔

احمد ماں باپ کی جنگ سے بےخبر زمین پر بیٹھ کر مٹی کھانے میں مصروف تھا۔ باپ کی آواز اونچی ہوتی تو سر اٹھا کر دیکھنے لگتا پھر اکتا کر دوبارہ سے اپنے مشغلے میں مصروف ہو جاتا۔

''میں غصہ کیوں نہ کروں زینب! یہ چھوٹی بات نہیں ہے۔ مولوی باقر نے تجھے خود ڈیرے کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ وہ کہتا ہے جب اس نے تجھے روکنے کی کوشش کی تو تجھے غصہ آ گیا اور تو بھڑک اٹھی۔ تجھے اس لیے غصہ آیا کہ تو غلط تھی اسی لیے تو نے مولوی باقر کو ایک کی دس سنا دیں۔ وہ بھلا مانس تجھے سیدھی راہ دکھانا چاہتا تھا اور تو...... تو بھی ایسی ہو سکتی ہے زینب...... مجھے یقین نہیں آتا اور یہ...... یہ تیری چوڑیاں......'' اس نے یکدم زینب کی کلائی پکڑ لی جس میں فقط دو چوڑیاں رہ گئی تھیں جبکہ صبح تک اس کی کلائی میں کافی ساری چوڑیاں تھیں۔

شہر کے لیے نکلنے سے پہلے ساجد نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ اور تب ہی اس کے ذہن میں یہ بات رہ گئی تھی کہ زینب کی کلائی میں چوڑیاں موجود ہیں سو اسے شہر سے اس کے لیے چوڑیوں کے بجائے کچھ اور تحفہ لانا چاہیے اور اب یہی کلائی چوڑیاں سے خالی تھی۔

زینب نے دکھ بھرے بوجھل دل کے ساتھ ساجد کی شک بھری نظروں کو برداشت کیا۔ زینب کی خاموشی کو اس کا خاوند پشیمانی سمجھ رہا تھا۔ اس نے جھٹکے سے زینب کی کلائی چھوڑ دی چونکہ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ کلائی چارپائی کے چوکھٹے سے ٹکرائی تھی زینب نے درد کی لہر کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا مگر اف تک نہ کیا۔

اس کے لیے ساجد کی آنکھوں میں نظر آنے والے رنگ زیادہ تکلیف دہ تھے جبکہ اس کی سونی کلائی نے ساجد کے دل میں رہی سہی گنجائش بھی ختم کر دی وہ وہیں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زینب کو الٹا لٹکا کر لمحہ بھر سے بھی بیشتر ساری حقیقت اگلوا لیتا۔

اسے آج سے پہلے کبھی زینب کی شرافت پر شک نہیں ہوا تھا اور اگر مولوی باقر اس کو آج اپنی اور زینب کی ہونے والی مڈبھیڑ کے متعلق نہ بتاتا تو شاید ایسا کبھی نہ ہوتا۔

''میں تیری عورت ہوں ساجی...... میری فطرت بری نہیں ہے اور اگر میری فطرت بری ہوتی تو میں اب تک تیرے ساتھ نہ ہوتی شادی سے ہفتہ بعد ہی دھندہ شروع کر دیتی۔ تو نے آج تک مجھ میں کون سی ایسی بات دیکھی ہے کہ تو مجھ پر شک کر رہا ہے۔ تو نے مجھے اپنی آنکھوں سے ڈیرے کی طرف جاتے دیکھا۔ نہیں نا۔ صرف مولوی باقر نے تجھ سے کچھ الٹی سیدھی باتیں کہہ ڈالیں اور تو مجھ پر شک کرنے لگا۔ یہی ہے تیرا پیار اسی لیے بیاہ کر لایا تھا مجھے اسی لیے خاندان والوں سے پنگا لیا تھا۔'' پھر رونے لگی۔



عشاء کی اذان ہونے لگی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی بہت جلد سو جانے کے عادی تھے بلکہ ان پر ہی کیا موقوف گاؤں کے سب ہی لوگ اسی طرح سرشام سو جانے والے لوگوں میں سے تھے کہ فجر کے وقت کے اٹھے ہوئے ہوتے۔ ایسے میں ساجد علی کی معاشقی آواز اور گاؤں کے گھروں میں ایک نئی اور چٹپٹی کہانی تخلیق کر رہی تھی۔

یہ کہانی اس لیے بھی تھی کہ اس سے پہلے یہاں کے لوگوں نے ساجد علی کو اپنی بیوی پر اس طرح چلاتے ہوئے کبھی دیکھا سنا نہیں تھا۔ زینب کی بات نے ساجد کو دل ہی دل میں کسی قدر شرمندہ ضرور کیا۔ واقعی اس نے اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا تھا مگر مولوی باقر اس کے اعتبار کا بندہ تھا۔ وہ اس سے جھوٹ کیسے بول سکتا تھا۔

''کیا تیری بیوی تیرے اعتبار کی نہیں...... کیا وہ تجھ سے جھوٹ بول سکتی ہے۔'' وہ فطرتاً نیک انسان تھا اس لیے ضمیر کی آواز نے ساجد کو ذرا کی ذرا نرمی اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

''فیر تو مجھے بتا کیوں نہیں رہی کہ تو ڈیرے پر کیا کرنے گئی تھی؟'' اب کی بار اس کا لہجہ پہلے کی طرح سخت نہیں تھا۔

''میں ڈیرے پر نہیں گئی تھی۔'' زینب نے اپنے بھیگے رخساروں کو صاف کر کے قطعیت سے کہا۔

احمد کھیل کود سے تنگ آ کر رینگتا ہوا ماں کے قریب آ گیا تھا۔ زینب نے اسے زمین سے اٹھا کر گود میں بٹھا لیا اور اپنے دوپٹے سے اس کا منہ صاف کرنے لگی۔ اس کے انداز میں عجیب سا استحقاق تھا جسے محسوس کر کے ساجد آگ بگولا سا ہو گیا۔

''کیوں جھوٹ بولتی ہے کیوں جھوٹ بولتی ہے زینب! مولوی باقر کہتا ہے اس نے تجھے اپنی آنکھوں سے ڈیرے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔'' وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ اس کی نظروں میں جو کاٹ تھی وہ زینب کا دل جلا رہی تھی۔

''تجھے مجھ سے زیادہ مولوی کی بات پر یقین ہے...... تجھے مجھ پر اعتبار نہیں ہے...... میں تجھے سچ بتاؤں گی اور تو سمجھے گا کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ میری گواہی کون دے گا ساجی! میرا تو بیٹا بھی بہت چھوٹا ہے...... ہائے احمد کاش تو جوان ہوتا...... کاش تو اس قابل ہوتا کہ اپنی ماں کی گواہی دے سکتا...... ہائے احمد......'' اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔

ساجد کو اس کے رونے سے الجھن ہو رہی تھی۔ وہ اسے چپ کروانا چاہتا تھا مگر اسے حقیقت جاننے کی بھی بےچینی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زینب کے رونے سے گھبرا کر وہ اسے دلاسہ دینے میں مگن ہو اور حقیقت پھر مخفی رہ جائے۔

''میں اس روز ڈیرے کی طرف گئی تھی۔'' زینب نے سسکیوں کے درمیان بالآخر اعتراف کر لیا۔

ساجد نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ دل ہی دل میں کہیں وہ پر یقین ہو چلا تھا کہ زینب باکردار ہے مگر اب اس کا اعتراف دھماکے سے کم نہیں تھا۔

''مگر میں ڈیرے پر نہیں گئی تھی ساجی! دراصل ڈیرے والی زمین پر آج کل ایک باباجی نے اپنی جھونپڑی ڈال رکھی ہے۔ وہ پکا والا تعویذ دیتے ہیں جس سے من کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ میں ان کے پاس گئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا گیارہویں سے پہلے کسی کو اس تعویذ کے بارے میں بتایا تو وہ مراد پوری نہیں ہونے کی۔ میرا رب جانتا ہے میرے دل میں چور نہیں ہے میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا میرے دل میں چور نہیں ہے میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا میری ٹوٹی چوڑیاں دیکھ کر تو مجھ پر شک کر رہا ہے نا۔ آج سارے کپڑے دھوئے ہیں۔ گھاٹ پر کپڑے۔ رل مل کر یہ ساری ٹوٹ گئیں مگر مجھے ان کے ٹوٹنے کا دکھ نہیں ہے دکھ اس بات کا ہے کہ تو......''
اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔

اس کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ساجد علی کو اس کی بات پر یقین ہو چلا تھا کہ معاملہ غلط فہمی کا تھا۔ زینب اس طرف گئی تھی اور مولوی باقر نے اسے دیکھا بھی تھا مگر زینب اس طرف کسی غلط ارادے سے نہیں گئی تھی۔

''تو نے پہلے تو کسی بابے کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی تو نے مجھے یہ بتایا کہ تیرے دل میں ایسی کوئی مراد ہے کہ تجھے تعویذ تاگے کے لیے کسی بابے کے پاس جانا پڑے۔'' وہ پشیمانی چھپاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ مرد تھا شرمندہ ہونے سے اس کی مردانگی پر حرف آتا تھا۔

''مجھے سویرے نذیراں نے بتایا تھا...... وہ بھی اس بابے سے تعویذ لائی تھی۔ تجھے یقین نہیں تو چل ابھی چل بھائی کرم دین کے گھر چلتے ہیں۔ تجھے سب پتا چل جائے گا اس نے بجھے بجھے دل سے کہا۔
اس کے انداز نے ساجد کو مزید شرمندہ کیا۔ وہ حقیقتاً معصوم انسان تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔
''چل اب ختم کر اس فضول قصے کو۔ مولوی باقر سے ہو گئی غلطی اور میرا بھی کیا قصور...... تو خود بتا مولوی باقر غلط تو نہیں کہہ رہا تا تو اس طرف گئی تھی مگر...... خیر دفع کر...... مٹی ڈال...... چل بہت بھوک لگی ہے۔ روٹی لے آ...... توبہ...... پتا نہیں کیا ہوا تھا مجھے...... آج کا دن ہی برا تھا......''
وہ ساری بات سن کر بڑبڑاتا ہوا اٹھ کر غسل خانے میں گھس گیا۔
زینب ایک طرف بنے مٹی کے چولہے کی طرف آ گئی۔ احمد اب بھی اس کی گود میں تھا زینب کا دل مطمئن ہو چکا تھا وہ رو نہیں رہی تھی۔
''شکر ہے ساجی نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کس مراد کے لیے تعویذ لینے گئی تھی ورنہ...... میں کیا جواب دیتی؟''

وہ چولہے میں پھونکنی سے آگ سلگاتے ہوئے مسلسل سوچ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

''پاکستانی معاشرے میں عورت کی حیثیت کیا ہے؟'' اس سوٹڈ بوٹڈ شخص نے آنکھوں پر لگا چشمہ اتار کر سب کی طرف دیکھتے ہوئے استفہامیہ انداز میں کہا۔
جاب شروع ہونے کے بعد یہ پہلا سیمنار تھا جو عشاء اٹینڈ کر رہی تھی۔ سیمینار روم میں عشاء کو کچھ



ایسے چہرے بھی نظر آئے جو اس نے اس سے قبل صرف میگزین اور ٹی وی پر ہی دیکھے تھے۔'' ہالیڈے ان'' میں ہونے والے اس سیمینار میں فارنرز بھی نظر آ رہے تھے۔ تاخیر سے آنے کے باعث عشاء کو پچھلی نشستوں پر جگہ ملی تھی۔ اس کی کوئی کولیگ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسی لیے عشاء کی تمام تر توجہ ادھر ادھر کی بجائے ڈائس کے پیچھے آنے والوں کی تقریروں کی طرف ہی تھی۔
''ابتدا سے ہی پاکستانی معاشرے کی تفہیم جنسی تخصیص کی بنا پر کی جاتی رہی ہے۔ مرد کو ہمیشہ سے عورت پر فوقیت دی جاتی ہے۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے تو یہ بہت گھسی پٹی بات لگتی ہے۔ لیکن بہرحال یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ عورت سے روا رکھے جانے والا متعصبانہ رویے کا اندازہ ہمارے لوکل رسم و رواج میں موجود خاص رویوں سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔
ہمارے یہاں عورت کو ہمیشہ سے ماں بہن بیٹی اور بیوی کے خانے میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے۔ مزید برآں اسے چار دیواری میں قید رکھا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی تمام تر صلاحیتیں دب جاتی ہیں۔
عورت کو ایک کمزور مخلوق سمجھ کر اس پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں اور ریاست و خاندان کی طرف سے عورت کو بہت کم توجہ ملتی ہے۔ یہی عدم توجہ آدمی کی سو کالڈ آئیڈیالوجی آف آنر کے ساتھ مل کر عورت کے اندر ایک احساس کمتری کو جنم دیتا چلا جاتا ہے۔
وہ اپنے آپ کو ایک بے چاری قسم کی مخلوق سمجھتی رہتی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ عورت کے اندر آدمی کی نسبت کہیں زیادہ Potentiol ہوتا ہے مگر معاشرے کی نام نہاد متعصبانہ سوچ سونے پر سہاگہ کرتا ہوا عورت کا پردہ اور اس کی خود ساختہ سوچ مل جل کر اس کے اندر کی صلاحیت کو ختم کر کے اسے چار دیواری کے اندر محدود سے محدود کرتے جاتے ہیں جس کی وجہ سے عورت کے اندر وہ مثبت سوچ پنپ ہی نہیں پاتی جو کسی معاشرے کو صحت مند معاشرہ بناتی ہے اور یہی سب چیزیں مل جل کر پاکستان کے تمام لوگوں میں صنفی تفریق کا باعث بنتی ہے۔''
وہ سوٹڈ بوٹڈ شخص سانس لینے کے لیے رکا تو ہال میں تالیوں کی آواز گونجنے لگی۔
عشاء کے لیے یہ سب باتیں نئی نہیں تھیں۔ نئی بات یہ تھی کہ ایک مرد کے منہ سے اس طرح کی باتیں اس نے پہلی مرتبہ سنی تھی۔
''یار! یہ صنفی تفریق کیا ہوتا ہے؟''
عشاء کے عقب میں بیٹھے کسی لڑکے نے بہت دھیمی آواز میں کسی سے پوچھا تھا۔ عشاء کی توجہ نا چاہتے ہوئے بھی پیچھے کی طرف مبذول ہو گئی۔
''مجھے کیا پتا کہ یہ سیاپا کیا ہوتا ہے۔ مجھے تو میرا کام کرنے دو اور پلیز یار! تم بھی اپنا کام کرو۔''
دوسری آواز نہایت اکتائی ہوئی تھی۔ عشاء کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
''مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر ہم یہاں کر کیا رہے ہیں۔ قسم سے مجھے تو دو دن تک بدہضمی رہنی ہے اتنی مشکل اور اسٹوپڈ باتیں سن کر۔'' یہ کوئی تیسری آواز تھی۔ جھلاہٹ اس میں بھی نمایاں تھی۔

''یار! تم لوگ اپنی بکواس بند کیوں نہیں کرتے۔ خدا کے لیے اپنا اپنا کام کرو۔'' پہلی والی اکتاہٹ بھری آواز دوبارہ آئی۔

ڈائس کے پیچھے کھڑا شخص تقریر کرنے میں مگن تھا جبکہ پیچھے بیٹھے لڑکے بھی مسلسل بول رہے تھے۔ اس لیے عشاء کا دھیان بھی بٹ رہا تھا۔

''قسم سے یار! میں کوئی کام وام کرنے نہیں آیا۔ میں گھر میں اطمینان سے کمپیوٹر کے آگے بیٹھا اپنے پراجیکٹ کے سلسلے میں امپروومنٹ آف سوشل لاز کے متعلق میٹیریل ڈاؤن لوڈ کر رہا تھا کہ جبار صاحب کا فون آ گیا۔ کہنے لگے۔ کسی این جی او کا پروگرام ہے کوریج کے لیے اوپر سے فون آیا ہے۔ تم بھی چلے جاؤ۔ یقین کرو خاور! اگر یہ نہ کہتے کہ آخر میں زبردست ریفریشمنٹ ہے تو میں کبھی نہ آتا۔''

''میرا دماغ خراب ہے کہ میں بغیر کسی لالچ کے یہاں ''عورت نامہ'' سن کر بیمار پڑوں۔ میرے تو کان پک گئے ہیں۔''

''او بھئی! بس کرو...... دیکھ تجھے اللہ کا واسطہ...... تیری یہ فضولیات کوئی نہیں سن رہا۔ چپ کر جا اور ڈائس سے ہٹ جا۔'' اس آواز میں بھی جھنجلاہٹ تھی۔

عشاء نے بے ساختہ گردن ترچھی کر کے ان کی جانب دیکھا۔ وہ تینوں ہی ایک دم الرٹ ہو گئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں اپنے کیمرے تھے۔ ایک لڑکا مائیکرو ریکارڈ لیے بیٹھا تھا۔ جبکہ دوسرے کے ہاتھ میں Palmtop تھا۔

''یار! پٹوا نہ دینا۔'' عشاء کی نظروں کو محسوس کر کے وہی لڑکا نہایت دھیمے لہجے میں بولا جس کے ہاتھ میں Palmtop تھا۔ عشاء مسکراتے ہوئے سیدھی ہو گئی۔

''1973ء میں جو آئین پیش کیا گیا تھا وہ بھی عورتوں کو ان کے جائز حقوق دلوانے میں بری طرح ناکام ہوا۔ ایک طرف اس میں ایسی شق موجود تھی جو یہ کہتی تھی کہ ملک میں جنس کی بنا پر کوئی تخصیص نہیں برتی جائے گی جبکہ دوسری طرف اس میں ایسی شقیں ہیں جو عدم مساوات کو پروان چڑھاتی ہیں۔

اس طرح حدود آرڈیننس متعارف کروا دیا گیا اور جس میں تقریباً تقریباً زنا اور زبردستی کو برابر قرار دینے کی کوشش کی گئی۔ عورت کو یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسے زبردستی نشانہ بنایا گیا چار مسلمان فرد گواہ پیش کرنے پڑتے ہیں۔ جبکہ زیادہ تر کیسز میں سزا بھی اسے ہی سہنی پڑتی ہے۔

اس طرح کے قوانین نے معاشرے میں عورت کی حیثیت پر بہت اثر ڈالا۔ آج بھی پاکستانی جیلوں میں ایسی بہت سی خواتین ہیں جو نا کردہ گناہوں کی سزا بھگت رہی ہیں۔'' وہ شخص تقریر کے دوران اب پانی پینے کے لیے رکا تھا۔

عشاء نے پیچھے بیٹھے لڑکوں کی باتوں کی طرف دھیان لگانے کی کوشش کی مگر وہاں خاموشی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے ان کی جانب دیکھا۔ وہ تیزی سے نوٹس لینے میں مگن تھے۔ عشاء نے اپنی رسٹ واچ کی طرف دیکھا ساڑھے چھ کے قریب کا وقت تھا۔ اس کے آفس ٹائمنگ بارہ سے چھ بجے تک کے تھے اور پک اینڈ



ڈراپ آفس کی طرف سے تھا مگر آج کانفرنس کی وجہ سے ساڑھے آٹھ تک کا ٹائم دیا گیا تھا۔

اس کا اور عادل کا پروگرام تھا کہ کانفرنس کے بعد وہ اسے ہالیڈے ان سے پک کرے گا پھر وہاں سے شاپنگ کے لیے جانے کا ارادہ تھا۔ عشاء بور ہونے لگی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ صرف باتوں سے کسی کی تقدیر نہیں بدلی جاسکتی۔ سوائے اس کانفرنس میں اور اس کے شرکاء کی باتوں میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

اس کا دل چاہا کہ عادل کو فون کر کے ابھی بلا لے مگر جانتی تھی کہ عادل آفس سے اس ٹائم نہیں آ سکتا تھا۔ سو وہ بے دلی سے تقریر میں دلچسپی لینے لگی۔ وہ شخص اب پاکستانی عورت کی ثانوی حیثیت پر بحث کر رہا تھا۔

''پاکستان کے جوڈیشل سسٹم میں عورتوں کی شمولیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ آپ کو بار کونسل میں صرف 5٪ فی میل لائرز جبکہ سپریم اور ہائی کورٹ میں صرف 2٪ فی میل سول ججز ملیں گی۔''

عشاء نے ابھی اتنا ہی سنا تھا کہ اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھے حضرات اٹھ کر پیچھے کی طرف چلے گئے اور پھر وہ نشست جس شخص نے سنبھالی اسے عشاء جانتی تھی اور وہ اسفند رحیم تھا۔

''کیسی ہیں آپ؟'' اس نے مسکرا کر بغور اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں عجیب مقناطیسیت تھی۔ گرے رنگ کے ڈنر سوٹ میں اس کی شخصیت مزید شاندار لگ رہی تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی Eternity کی تیز مہک نے عشاء کا گھیراؤ کیا تھا۔

''فائن...... تھینکس...... آپ کیسے ہیں۔؟'' اس کی شاندار شخصیت سے مرعوب ہوتے ہوئے عشاء نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔

''مجھے خوشی ہے کہ آپ ہمارے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ مجھے آپ کی آنکھوں میں وہ عزم نظر آتا ہے جو میں اپنے ساتھ کام کرنے والی سب خواتین کی آنکھوں میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ یقیناً بہت آگے جائیں گی۔ میں ہر ایک کے بارے میں اس قسم کی پیش گوئیاں نہیں کرتا مگر جس کے بارے میں بھی کرتا ہوں وہ سو فیصد درست ثابت ہوتی ہیں۔''

وہ اپنی کرسی پر ذرا سا ترچھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

اس کا انداز میں بے حد دوستانہ تھا۔ عشاء کو اپنی تعریف سننا ہمیشہ اچھا لگتا تھا سو وہ چند لمحوں بعد ہی بے تکلفی سے اسفند رحیم سے باتیں کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

''صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے خطبہ میں فرمایا کہ اے لوگو! عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ تم نے اللہ کی امانت سے انہیں لیا ہے۔ اور اللہ کے کلمہ سے انہیں اپنے لیے حلال کیا ہے۔ عورتوں پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ تمہارے فرش پر کسی ایسے کو نہ آنے دیں جس سے تم ناراض ہو اگر وہ ایسا کریں تو انہیں مارو لیکن مار ایسی نہ ہو کہ ظاہر ہو۔ ان کا تم پر یہ حق ہے کہ انہیں اپنی بساط کے مطابق کھلاؤ، پلاؤ، اڑھاؤ۔''

آپا جی نے مخصوص دھیمے لہجے میں درس دیتے ہوئے ایک اہم حدیث مبارکہ بیان کی تھی اور آنکھوں

ہی آنکھوں میں سامنے بیٹھی عورتوں کو سرزنش کی تھی۔ وہ عورتیں درس کو سننے کی بجائے وقتاً فوقتاً گفتگو میں مصروف ہوجاتی تھیں جس کی بنا پر درس میں خلل پڑ رہا تھا۔

''میری بہنو! یہ جو حدیث میں نے بیان کی ہے اس کی وضاحت کرنے سے پہلے میں ایک اہم نکتہ واضح کردینا چاہتی ہوں۔ دین اسلام نے عورتوں کو حقوق کے معاملے میں بہت نوازا ہے۔ مرد کو عورت سے برتر بنایا گیا ہے جب کہ عورت پھر بھی زیادہ معتبر ہے۔ کیا عورت کے قدموں کے نیچے جنت کا ہونا اس بات کا ثبوت نہیں؟''

آپا جی نے استفہامیہ انداز میں کچھ عورتوں کی جانب دیکھا جن کو بات سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ سبحان اللہ سبحان اللہ کا ورد کرنے لگی تھیں اور جن کو سمجھ میں نہیں آئی تھی وہ تقلید میں سر ہلانے میں مصروف تھیں۔

چودھری کا بڑا کمرہ مزارعین کی عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا چودھرائن کی طرف سے مزارعین کی عورتوں کے لیے سالانہ میلاد کا اہتمام واہ واہ سمیٹنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ درس کے بعد مرغ پلاؤ سے تواضع کی جاتی تھی جس کی خوشبو سب عورتوں کو یہاں کھینچ لائی تھی۔

اسی مرغ پلاؤ کا کرشمہ تھا کہ عورتیں گود کے بچوں کو گھٹنوں میں دیے جلد از جلد درس ختم ہونے جانے کا انتظار کر رہی تھیں۔

''جب پیارے نبی ﷺ صحابہ کرام میں آ کر بیٹھتے اور صحابہ کرام ان کے احترام میں اپنی نشستوں سے اٹھ کر کھڑے ہوتے تو نبی پاک ان کی اس عادت کو ناپسند فرماتے تھے۔ ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ حضرت فاطمہؓ کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر انہیں تکریم دیتے اور ان کے لیے محبت کا اظہار فرماتے تھے۔ کیا نبی ﷺ کے اس اقدام سے بھی عورت کی وہ عظمت ثابت نہیں ہوتی جو اللہ اور رسول ﷺ نے اسے دی؟ کیا عورت کی حیثیت کو ثابت کرنے کے لیے اس سے بڑی کسی مثال کی ضرورت ہے؟''

آپا جی نے رک کر ہونٹوں پر زبان پھیری۔ چوہدرائن ان ہی کی جانب متوجہ تھی۔ اس نے فوراً ملازمہ کو اشارہ کیا۔ ملازمہ جو بہت انہماک سے آپا جی کا درس سن رہی تھی چوہدرائن کا اشارہ سمجھ کر عقبی صحن کی طرف بھاگی' جہاں ملازم بڑے بڑے ٹب میں روح افزا گھولنے میں مصروف تھے۔ آپا جی نے درس شروع کرنا چاہا تو چودھرائن نے ٹوک دیا۔

''آپا جی! صغریٰ پانی لا رہی ہے...... پہلے تسی پانی پی لو۔'' آپا جی نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

آپا جی کی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر عورتیں فٹافٹ ایک دوسرے کا حال پوچھنے لگیں اور ایک دوسرے کی تیاری سے اپنی تیاری کا مقابلہ کرنے لگیں۔ نذیراں سامنے کی طرف بیٹھی تھی۔ اس نے کونے میں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی زینب کو دیکھ کر سر کے اشارے سے سلام کیا اور آنکھ کے اشارے سے احوال بھی دریافت کیا۔

اتنی دیر میں صغریٰ اسٹیل کی ٹرے میں شیشے کے جگ گلاس رکھ کر لے آئی۔ سرخ مشروب دیکھ کر سب عورتیں دل ہی دل میں مسکرا دیں۔ گزشتہ سال میلاد پر کچی لسی پلائی گئی تھی۔



''اے صغریٰ...... تھوڑا سا میرے احمد کو بھی دے دے...... پیاس سے برا حال ہے۔'' زینب نے دھیمی آواز میں صغریٰ سے فرمائش کی تھی۔

صغریٰ کو زینب نے دو مہینے پہلے ایک سوٹ قمیص کاڑھ کر دی تھی اور ایک روپیہ بھی نہیں لیا تھا۔ سو اس کی بے ضرر فرمائش اس کا حق تھی۔ صغریٰ نے آنکھوں آنکھوں میں زینب کو صبر و برداشت کا مظاہرہ کرنے کی درخواست کی۔

''پیاری بہنو! آدمی پر عورت سے زیادہ ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ کیا آپ نے کبھی عورت کو ایسی باتوں کے لیے پریشان دیکھا ہے کہ اسے باپ بھائی شوہر یا بیٹے کو اپنی جائیداد میں سے حصّہ دینا ہے جب کہ آدمی ایسی باتوں کے لیے پریشان ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ یاد رہے میں ان لوگوں کی بات کر رہی ہوں جو حقیقتاً اسلامی شعار پر چلتے ہیں۔

قرآن یا حدیث میں بھی عورت کے لیے یہ حکم یا تاکید نظر نہیں آتی کہ وہ مرد کے نان نفقے کی ذمہ دار ہے۔ میری بہنو! گھر سے باہر نکل کر کمانا بہت مشکل ہے۔ ان مشکلات کے متعلق آپ عورت سے پوچھو جو گھر کی ذمہ داری بھی اٹھاتی ہے اور گھر سے باہر نکل کر فکر معاش میں بھی مبتلا ہوتی ہے۔''

بی بی جان نے آپا جی کا ہاتھ دبا کر انہیں خاموش رہنے کی تاکید کی یہ درس یہاں دینے کے لیے انہیں مناسب نہیں لگا تھا۔ کیونکہ یہ تو خالصتاً شہری خواتین کے لیے تیار کیا گیا تھا جب کہ گاؤں کی عورتیں تو مردوں سے زیادہ جفاکش ہوتی ہیں۔ آپا جی بی بی جان کا اشارہ سمجھ کر ذرا خاموش ہوئیں پھر بولیں۔

''چند لمحے قبل جو حدیث میں نے بیان کی تھی وہ یقیناً آپ کو سمجھ میں آگئی ہوگی۔ مرد کے اوپر عورت کو کھلانے پلانے اوڑھانے کی ذمہ داری ڈال کر اسلام عورت سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ عورت اپنے مرد کی وفادار رہے۔

وہ اس کے گھر اور اس کی نسل کی پرورش میں کوئی کسر نہ چھوڑے۔ اگر آپ غور کریں تو آپ کو احساس ہوگا کہ مرد کی ذمہ داری زیادہ مشکل ہے جبکہ عورت کو جو ذمہ داری سونپی گئی وہ عبادت ہے۔ اسی لیے اس حدیث میں نبی پاک ﷺ نے عورت کو اپنے گھر اور گھر والوں سے وفادار رہنے کی تلقین کی اور اگر عورت اپنی راہ سے بھٹک جائے تو اسے راہ راست پر لانے کے لیے مرد اس پر ہاتھ اٹھا سکتا ہے۔''

''آپا جی مزید کچھ کہنے میں مگن تھیں مگر صغریٰ کا اشارہ پا کر زینب احمد کو گود میں لیے عقبی حصّے کی طرف چل دی جہاں سرخ مشروب اس کا انتظار کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

''مجھے لگتا ہے میں پھر سے زندہ ہوگئی ہوں۔'' عشاء نجانے فون پر کس سے کہہ رہی تھی۔

عادل ٹی وی لاؤنج کے درمیان میں پڑے صوفے پر بیٹھا ٹی وی دیکھنے میں مگن تھا۔ صوفے پر ہی پڑے کرسٹل باؤل میں تازہ جامن پڑے تھے۔ جامن عادل کا پسندیدہ پھل تھا۔ اب بھی وہ رغبت سے ایک کے بعد ایک جامن کھاتا چلا جا رہا تھا۔ مگر اس کا دھیان عشاء کی طرف ہی تھا۔

ویک اینڈ کی وجہ سے وہ جلدی آ گیا تھا اور اب انتظار کر رہا تھا کہ عشاء فون سے فارغ ہو تو وہ شاپنگ کے لیے جاسکیں۔ عشاء کو پہلی تنخواہ ملی تھی اور وہ اس رقم کو جلد از جلد خرچ کرنے کے لیے بے چین تھی ی

''یار! ابھی تو پہلی پے ملی ہے...... مطلب صرف ایک ماہ ہوا ہے مجھے ''فلاح'' کے لیے کام کرتے ہوئے مگر میں بہت انجوائے کر رہی ہوں۔ یہ NGO کیثر المقاصد ایجنڈے کے تحت کام کر رہی ہے۔ خواتین اور ان کے بنیادی حقوق کی جدوجہد ہمارا اولین مقصد ہے۔

ہم فنڈ ریزنگ اور جلسے جلوسوں میں ٹائم برباد نہیں کرتے۔ بلکہ لوگوں کے لیے بالعموم اور خواتین کے لیے بالخصوص کام کرنا ''فلاح'' کے منشور کا حصہ ہے۔ ہمارے چیئرمین اسفندرحیم بہت اچھے انسان ہیں۔''

وہ بات کرتے ہوئے ہنسی تھی جیسے دوسری طرف سے فون پر کسی نے لطیفہ سنایا ہو۔ عادل صوفہ پر اس کی ٹوہ لینے کے لیے نہیں بٹھا تھا۔ مگر نجانے کیسے ''اسفندرحیم'' کے ذکر پر اس کی ساری حسیات عشاء کی طرف مبذول ہوگئی تھیں۔ عشاء کی باتوں میں اس شخص کا تذکرہ دن بدن بڑھنے لگا تھا۔

''اس شخص کے دل میں انسانیت کا بڑا درد ہے یار! میں اس کے اس جذبے سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔ وہ صرف باتیں نہیں کرتا بلکہ کام کرنا بھی جانتا ہے۔ سیمنار میں اس کے ریسرچ پیپر کو بہت پسند کیا گیا۔ تم خود بتاؤ کیا عورت ڈبے میں بند کر کے رکھی جانے والی چیز ہے۔ کیا اسے اسی لیے پیدا کیا گیا کہ وہ چار دیواری کی قید میں زندگی گزار دے۔ ہانڈی روٹی بچے شوہر صرف یہی ہم سب کی زندگیوں کا مقصد نہیں ہے۔ ہمیں اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنا چاہیے۔

اسفندرحیم بس ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔ اس کے پاس کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاؤ تو آپ جان جاتے ہیں کہ آپ کیا چیز ہیں۔ مجھے اس شخص نے ایک نظر میں پہچان لیا تھا کہنے لگا آپ بہت آگے جائیں گی مسز عادل۔''

وہ اپنی تعریف میں بلا تکان بول سکتی تھی۔ اور بول رہی تھی۔

وہ کرسٹل باؤل جس میں جامن بھرے تھے پہلے جس تیزی سے خالی ہو رہا تھا یکدم اس کی رفتار میں کمی آ گئی اور ٹی وی کا والیوم بھی اونچا ہو گیا بے ہنگم سا میوزک لاؤنج میں گونجنے لگا تھا۔ عشاء نے مڑ کر ٹی وی کی سمت دیکھا پھر اشارے سے عادل کو والیوم کم کرنے کے لیے کہا۔

لیکن اس نے گویا اس کا اشارہ دیکھا ہی نہیں۔ بہرحال اس کا دھیان عشاء کی طرف ہی تھا۔

''اس معاشرے میں جو مخلوق سب سے زیادہ تباہی کا شکار ہے اس کا نام عورت ہے اور یہ تو تم جانتی ہو کہ مرد سے بڑا استحصال کرنے والا کوئی نہیں۔ یہ مرد بہت بے حس اور خود غرض چیز ہوتے ہیں یار...... ان کی زندگیوں کا ایک مقصد ہے کہ کسی نہ کسی طرح عورت کو دبا کر رکھا جائے تاکہ اس کی قدرتی صلاحیتیں بتدریج ختم ہو کر رہ جائیں اور اس کوشش میں حکومت برابر کی شریک ہے ظاہر ہے مردوں کی حکومت ہے۔

''یار! معاشرہ مردوں کا ہے۔''

وہ اس قدر تلخ لہجے میں بات کر رہی تھی کہ عادل حیران پریشان ہو کر اس کی شکل تکنے لگا۔



اس کا یہ روپ عادل کے لیے بہت انوکھا تھا۔ اسے جاب کرتے ایک مہینہ ہوا تھا اور اس ایک ماہ نے اس کی شخصیت میں بہت تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ وہ کچھ لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر اس خیال سے پیچھا چھڑانے لگا۔

آزادی نسواں و حقوق نسواں کے متعلق اس کے یہ خیالات عادل کے لیے نئے نہیں تھے مگر اس کا لہجہ و انداز یقیناً نیا تھا۔

''یار! جلدی کرو...... کیا بوریت پھیلا رکھی ہے۔'' وہ اکتا کر اسے ٹوک بیٹھا۔

عشاء نے اسے گھور کر دیکھا پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کی تاکید کی۔ عادل منہ پھلا کر دوبارہ ٹی وی دیکھنے لگا۔ عشاء نے شاید اس کی خفگی کو محسوس کر لیا تھا۔ تب ہی پانچ منٹ بعد فون بند کر کے وہ اس کے قریب صوفے پر آ بیٹھی اور پھل والا باؤل صوفے سے اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔

''آپ کو سلام کہہ رہی تھی۔'' ایک جامن منہ رکھتے ہوئے اس نے گویا اطلاع دی تھی۔

''وسلام......'' عادل نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

اس کی پوری توجہ ٹی وی کی جانب تھی۔ اب لڑکیوں کی ریسلنگ شروع ہوگئی تھی۔ کاسٹیومز میں ملبوس اپنے جسموں کی نمائش کرتی ہوئی وہ عورتیں فی الحال عادل کی توجہ کا مرکز لگ رہی تھیں۔

''یہ نہیں پوچھا کہ کون سلام کہہ رہی تھی اور جواب دے دیا...... یعنی کہ حد ہوگئی ان بے ڈھنگیوں کو دیکھنے سے فرصت ملے تو میری بات سنی جائے۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی۔

پھر عادل کی گود میں پڑا ریموٹ اٹھا کر چینل تبدیل کر دیا عادل نے اس کی اس حرکت پر ناک چڑھا کر اسے دیکھا اور پھر اس کے ہاتھ سے ریموٹ چھین کر دوبارہ Sports ten لگا دیا۔

عشاء نے اس کے درشت انداز کو بہت شدت سے محسوس کیا تھا۔ اکثر اوقات چینل ٹیوننگ پر ان کی بحث ہو جاتی تھی مگر بات مذاق کی حد تک رہتی تھی۔ لیکن آج عادل کا انداز جارحانہ تھا

''اتنی ولگر لگ رہی ہیں یہ سب...... بھلا عورتیں بھی یہ سب کام کرتی اچھی لگتی ہیں۔ کیا۔''

وہ بمشکل خود پر قابو پا کر نسبتاً نرم لہجے میں بولی۔

''اس میں کوئی حیرانی والی بات تو نہیں...... اکیسویں صدی کی عورت ہر کام کر سکتی ہے تو پھر ریسلنگ میں کیا برائی ہے۔'' عادل ہنوز ٹی وی اسکرین کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہر کام میں کپڑے اتار کر ریسلنگ کرنا شامل نہیں ہے...... اور پھر......'' ابھی عشاء نے یہی کہا تھا کہ عادل نے چڑ کر اس کی بات کاٹ دی۔

''کم آن عشاء! اگر دوپٹے اُتار کر سڑکوں پر جلسے جلوس کرنا ٹھیک ہے تو پھر ریسلنگ میں کیا برائی ہے۔ تم خود ہی تو کہتی ہو آج کی عورت ہر کام کر سکتی ہے۔ جو مرد کر سکتا ہے۔ تو پھر جب مرد اس طرح رنگ میں آ کر اپنی مردانگی کا مظاہرہ کر سکتا ہے تو پھر عورت کیوں ایسا نہیں کر سکتی۔'' استہزائیہ سی ہنسی کے ساتھ عادل نے اپنی بات مکمل کی تھی۔

عشاء چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہی۔ وہ در پردہ اسے کیا سنانا چاہ رہا تھا یہ تو بخوبی سمجھ میں آ رہا تھا۔ عادل کے ساتھ جب کبھی کسی بات پر بحث ہوتی تھی تو عادل ہی خاموش ہو کر بحث ختم کر دیا کرتا مگر آج ،
عشاء مصالحت آمیز انداز میں بولی۔

''او کے...... آپ دیکھیں یہ ریلسنگ...... میں چینج کر کے آتی ہوں۔'' عادل کچھ کہنے کے بجائے ٹی وی کی طرف دیکھتا رہا۔ دس پندرہ منٹ بعد ہی وہ آ بھی گئی تھی۔

''آج کسی نئے ریسٹورنٹ میں کھانا کھائیں گے...... میں ''طباق'' کا کھانا کھا کھا کر تھک گئی ہوں۔''

وہ صوفے پر بیٹھ کر جوتے کا اسٹیپر بند کرتے ہوئے بولی۔

اس پوزیشن میں بیٹھنے سے اس کا باریک دوپٹہ جھولی میں آ گرا تھا۔ عادل جو اپنی جگہ سے اٹھ رہا تھا یکدم مکمل توجہ سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ پنک کلر کے لان کے سوٹ میں کھلی کھلی سی عشاء بلاشبہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ مگر عادل کی توجہ اس کے بازوؤں کی طرف تھی۔

کوارٹر سلیو شرٹ میں اس کے دودھیا بازو چاندنی کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کا سوٹ بہت اسٹائلش انداز میں سلا تھا۔ فٹنگ والی شرٹ میں اس کا وجود بہت اچھا لگ رہا تھا۔ مگر یہ حلیہ باہر جانے کے لیے قطعاً نامناسب تھا۔

''سلیوز کچھ زیادہ ہی شارٹ نہیں ہو گئیں۔ اپنی جینز کی جیب میں ہاتھ پھنساتے ہوئے وہ اس کا بھرپور تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

''آج کل شارٹ سلویز کا ہی تو فیشن ہے۔ اچھی لگ رہی ہیں نا۔'' عشاء مسکراتے ہوئے بولی۔

اس میں تو کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ اچھی لگ رہی تھی۔

''ہاں...... ٹھیک ہے۔ مگر دوپٹہ بدل لو...... ایک تو ماشاء اللہ تمہاری شرٹ کی سلویز اتنی شارٹ ہیں اور پھر تم نے دوپٹہ بھی باریک لیا ہے...... ایسا کرو کسی ڈارک کلر کا دوپٹہ لے لو...... پبلک پلیسز پر اس طرح کا حلیہ اوڈ لگتا ہے۔''

گھر سے نکلتے ہوئے عادل اس کا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے نرم لہجے میں بولا

''توبہ ہے عادل! اس میں کیا اوڈ ہے...... سارا زمانہ اس قسم کی ڈریسنگ کرتا ہے۔ آپ تو چھوٹی چھوٹی باتیں پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مائنڈ مت کیجئے گا مگر آپ کچھ زیادہ ہی کنزرویٹو ہوتے جا رہے ہیں۔'' عشاء منہ بنا کر بولی۔

اس کا خیال تھا کہ وہ اتنی اچھی لگ رہی ہے تو عادل اسے دل کھول کر سراہے گا مگر وہ تو اسے ٹوک رہا تھا۔

''اس میں مائنڈ کرنے والی کیا بات ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں بہت کنزرویٹو ہوں۔ اب جاؤ اور بڑا دوپٹہ لے آؤ۔''



عادل نے ٹھنڈے لہجے میں قطعیت سے کہا۔

عشاء چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہی پھر کندھے سے لٹکا بیگ اتار کر صوفے پر پھینکتے ہوئے بولی۔

''مجھے نہیں جانا کہیں بھی۔'' وہ کہہ کر رکی نہیں بلکہ پیر پٹختی بیڈروم کی طرف بڑھ گئی۔

''او کے...... ایز یو وش......'' عادل نے گویا پھنکارتے ہوئے کہا اور دوبارہ سے اپنی جگہ پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگا اب کی بار ٹی وی کا والیوم بہت زیادہ اونچا تھا۔

☆ ☆ ☆

''ارے میرا بچہ...... روتا کیوں ہے...... یہ دیکھ دودھ میں شکر ڈال دی ہے اور یہ دیکھ اب چاول ڈال رہی ہوں...... تیرے لیے ہی تو بنا رہی ہوں کھیر...... فیروی تو روتا چلا جا رہا ہے...... پنج منٹ کی بات ہے ابھی کھیر بن جائے گی۔''

وہ مٹی کی ہانڈی میں لکڑی کا چمچہ زور زور سے چلا رہی تھی۔ اور ساتھ چارپائی پر لیٹے احمد کو بہلانے میں مصروف تھی۔

وہ کچھ دیر قبل سو کر اٹھا تھا اور اب کسلمندی سے منہ بسور رہا تھا۔ وہ دانت نکال رہا تھا جس کی وجہ سے وہ بے حد سست ہو چکا تھا۔ پیٹ بھی خراب تھا اور صبح سے بخار بھی تھا۔ ساجد علی کام پر جانے سے پہلے خصوصی تاکید کر کے گیا تھا۔

''اس کے جبڑے کو ٹکور کی ضرورت ہے۔ اسے کھیر بنا کر دینا...... سکون ملے گا...... میری ماں کہا کرتی ہے کہ شکر اور دودھ تے تھوڑا سا شہد مرض میں شفا دیتا ہے۔ تو جانتی ہے نا زینب...... میری ماں کتنی سیانی عورت تھی۔ سو آنے کی بات ایک سانس میں کہہ جاتی تھی۔'' زینب اس کی بات پر مسکراتی رہی۔

ساجد کو دن میں کئی مرتبہ اپنی ماں کا قصیدہ کہنے کی عادت تھی۔ ساجد کے جانے کے بعد اس نے برتن دھو کر احاطے میں جھاڑو دیا۔ کمرے میں بچھے واحد پلنگ کی چادر جھاڑ کر تکیہ وغیرہ درست کر کے رکھا سب سے آخر میں اس نے احاطے میں چارپائی بچھا کر پیڈسٹل فین آن کر دیا تھا۔

احمد کو اس چارپائی پر لٹا کر لکڑیوں کی مدد سے آگ جلا کر اس نے دودھ کی پتیلی چڑھا دی۔ پھر جب احمد سو کر اٹھا زینب تقریباً کھیر تیار کر چکی تھی۔

''یہ لے...... تیری ماں نے کھیر تیار کر لی ہے...... تیری ماں تیری دادی جتنی سیانی نہیں...... وہ سو آنے کی بات ایک سانس میں نہیں کر سکتی...... مگر وہ تجھ سے بہت پیار کرتی ہے...... اور اسے بہت مزیدار کھیر پکانی آتی ہے۔''

وہ اسٹیل کی تھالی میں کھیر نکال کر احمد کے پاس چارپائی پر آ بیٹھی۔ احمد ابھی امی ابا اور بھوری کے ناموں سے واقف تھا۔ سو اسے باتیں سکھانے کی خاطر زینب سارا دن اس سے باتیں کرتی رہتی تھی۔

اسٹیل کی تھالی میں موجود وہ ملغوبہ احمد کو پسند نہیں آیا تھا۔ اس نے ماں کے ہاتھ سے ایک لقمہ لینے

کے بعد منہ پھرلیا۔ زینب اسے لاڈ پیار سے پہلا کروہ زردملغوبہ کھلانے کی کوشش کرتی رہی مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

پلیٹ چارپائی کے نیچے رکھ کر وہ وہیں احمد کے ساتھ لیٹ گئی اور اسے تھپتھپا کر سلانے کی کوشش کرنے لگی۔ احمد کچھ دیر بعد سو گیا۔ زینب کو آج فراغت ہی فراغت تھی۔ ساجی کی واپسی پر وہ روٹی پکاتی تھی اور سالن کے نام پر شکر اور چاولوں کا ملغوبہ موجود تھا۔

وہ چارپائی پر لیٹ کر عجیب وغریب سوچوں میں الجھتی رہی۔ اس نے نذیراں کی بیٹی کو سرخ رنگ کا بڑا خوبصورت جوڑا پہنے دیکھا تھا۔ اس کا دل بہت شدت سے چاہ رہا تھا کہ وہ بھی ایسا ہی جوڑا لے مگر فی الحال پیسے نہیں تھے۔ اس نے نذیراں سے میل جول بہت کم کر دیا تھا۔

اسے خدشہ تھا کہ جس روز نذیراں اس کے پاس فرصت سے بیٹھ گئی اس روز ساجد کی اور اس کی جھڑپ کے متعلق ضرور سوال کرے گی۔ حالانکہ اس جھڑپ کے بعد ان کی ملاقات ہوئی تھی مگر یہ ملاقات اس قدر سرسری تھی کہ تفصیلی باتیں ناممکن تھیں۔ زینب خود ہی کافی محتاط ہو چکی تھی۔ اس نے ڈیرے کی طرف جانا چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ وہ کپڑے دھونے بھی سب کے ساتھ نہیں جاتی تھی۔

یوں ہی لیٹے لیٹے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی اور جب اس کی آنکھ کھلی تو احاطے کا پچھلا دروازہ ایک مخصوص انداز میں بج رہا تھا۔ اس کی آنکھ دروازہ بجنے کی آواز سے ہی کھلی تھی۔ وہ یکدم اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس کا دل ایک عجیب لے پر دھڑ کا تھا۔ اس نے بہت آہستہ سے زمین پر قدم رکھا اور دبے پاؤں چلتے ہوئے دروازے کے قریب آگئی۔ احمد کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ منہ بسورنے لگا تھا۔

''کون......!'' اس کی آواز اس کے قدموں کی چاپ سے بھی زیادہ مدہم تھی۔

''ارے ہاں......اب تو کیوں پہچانے ن ہم تیرے لگتے کیا ہیں؟'' کسی نے شریر لہجے میں کہا۔ احمد کے رونے کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

''ہائے ربا......'' زینب نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ اس کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔

☆ ☆ ☆

''کیا ساری زندگی ناراض رہیں گے......کبھی بات نہیں کریں گے مجھ سے۔'' موبائل پر پیغام ٹائپ کرنے کے لیے وہ کچھ دیر تک Send کے بٹن کی جانب دیکھتی رہی تذبذب کے عالم میں سوچتی رہی۔

اس نے کبھی بھی جھگڑے کے بعد صلح میں پہل نہیں کی تھی ہمیشہ عادل ہی اسے منایا کرتا تھا بلکہ ان کے جھگڑے کبھی اتنے طویل ہی نہیں ہوئے تھے کہ یہ سوچنے کی نوبت آئی ہو کہ کون منائے گا۔ پھر یہ بھی پہلی بار ہی ہوا تھا کہ ان کی بول چال چار دن سے بند تھی۔

عادل ناشتہ کیے بغیر گھر سے نکلتا اور رات گئے آتا۔ آفس میں عشاء کی ذمہ داری بھی کسی قدر بڑھ گئی تھیں اور کچھ وہ اپنی خفگی بھی ظاہر کرنا چاہتی تھی اسی لیے گزشتہ چار دن سے عادل کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگا رہی



تھی۔ اب بھی نجانے کیا سوچ کر اس نے میسج کیا تھا۔

لنچ آورز میں سب لوگ لنچ کے لیے اسفند صاحب کے آفس میں اکٹھے ہو جاتے تھے۔ سب لوگ وہاں ہی تھے اسی لیے عشاء ایڈمن آفس کے باہر بنے ہوئے لاؤنج کمرے میں صوفے پر بیٹھی اطمینان سے عادل کو میسج کر رہی تھی۔

اس آفس کا ماحول کافی دوستانہ تھا لوگ ایک دوسرے کے ذاتی معاملات پر ڈسکس کرنا بہت پسند کرتے تھے۔ کیونکہ اس NGO کا موٹو ہی یہ تھا۔

''فلاح سے نہیں کہیں گے تو کس سے کہیں گے اسی لیے اسفند صاحب کی طرف سے خصوصی ہدایات تھیں کولیگز کے درمیان تعلقات بہت دوستانہ ہونا چاہیے۔

عشاء کافی دیر اسی طرح موبائل ہاتھ میں لئے بیٹھی رہی۔ اسے امید تھی کہ اس پیغام کے بعد عادل اسے فون کرے گا مگر اس نے SMS کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔

کافی دیر سوچنے کے بعد عشاء نے اپنے موبائل سے عادل کا نمبر ملایا مگر اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ عشاء کا موڈ آف ہونے لگا۔

''اونہہ......نہیں تو نا سہی...... میں بھی بات نہیں کروں گی۔'' اس نے نخوت بھرے انداز میں خود کلامی کی مگر اس سے پانچ منٹ بھی صبر نہ ہو سکا۔ وہ پھر سے اسے کال کر رہی تھی۔ مگر اس بار عادل نے شاید موبائل آف کر دیا تھا۔

کوئی رسپانس نہ پا کر وہ اپنے کیبن کی طرف آگئی مگر اس کا دل کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ اپنی ٹیبل پر آ کر بھی وہ کمپیوٹر اسکرین کو گھورنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکی۔ اگر اس نے عادل کو SMS نہ کیا ہوتا یا Miss call نہ دی ہوتی تو شاید اس قدر بے چینی بھی نہ ہوتی۔ اب تو یہ سوچ کر زیادہ غصہ آ رہا تھا۔ کہ عادل نے اس کی صلح میں پہل کو بھی اہمیت نہیں دی۔

''کس قدر نخرے ہو گئے ہیں عادل آپ کے۔'' اس نے کلس کر سوچا۔

''تم نے مجھ سے کچھ کہا عشاء......'' رحمہ نے چونک کر پوچھا۔ اس کا اور رحمہ کا کیبن ایک ہی تھا۔

عشاء نے بمشکل سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔

''تم نے لنچ بھی نہیں کیا۔ اسفند صاحب پوچھ رہے تھے تمہارا ان فیکٹ دیہی علاقوں کے وزٹ کا پلان فائنل ہو گیا ہے۔ اسی سلسلے میں وہ تم سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ تم ان کے آفس میں چلی جاؤ۔'' رحمہ نے اسے مشورہ دیا پھر بیگ سے آئینہ نکال کر لپ اسٹک درست کرنے لگی۔

عشاء کچھ دیر سوچتی رہی پھر بیگ اٹھا کر اسفند صاحب کے آفس کی طرف آگئی۔ کھڑکی کے بلائنڈ سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے وہ موبائل پر کسی سے بات کر رہے تھے چونکہ عشاء بے دھیانی میں دستک دیے بغیر ہی اندر آگئی تھی۔ اس لیے شرمندگی سے اب کوئی بات ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ کمرے سے باہر جاتی۔ اسفند رحیم نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔

"اوکے ڈیئر...... میں تفصیل سے ساری بات تب بتاؤں گا جب ہم ایک ساتھ ڈنر کریں گے۔ابھی میں بزی ہوں۔ٹیک کیئر......سی یو۔" ایک جملے میں ہی وہ بات مکمل کر کے عشاء کی جانب متوجہ ہوا۔

"جی مسز عادل......زہے نصیب...... ہمارے آفس کو رونق بخشنے کا بہت شکریہ۔" وہ ایک طرف لگے صوفے کی جانب اشارہ کر کے مودبانہ انداز میں بولا۔

"مجھے امید ہے کہ آپ ہمارے ساتھ ضرور چلیں گی۔"

ابتدائی رسمی گفتگو کے بعد وہ یکدم بولا تھا شاید رحمہ نے اسے عشاء کے بارے میں بتا دیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ نہیں جا رہی۔

وہ لوگ اوکاڑہ کے قریب ایک دو گاؤں کا وزٹ کر رہے تھے تاکہ غریب اور ان پڑھ عورتوں کو ان کے حقوق کے بارے میں آگاہ کیا جا سکے۔عشاء کا ارادہ تھا کہ وہ ان کے ساتھ نہیں جائے گی۔اگرچہ اسے یہ سب بہت دلچسپ لگ رہا تھا مگر عادل کی خفگی دور کرنے کے لیے وہ اس سارے پروگرام کے لیے دلچسپی ظاہر نہیں کر رہی تھی۔

"ایکسکیوزمی مسز عادل......! کہاں گم ہیں آپ......بس میں نے کہہ دیا ہے آپ ہمارے ساتھ ضرور چلیں گی...... آپ ان خواتین سے ملیں گی تو احساس ہو گا کہ کیسے کیسے لوگ ہماری توجہ و ہمدردی کے مستحق ہیں۔آپ اس جاب کو ذمہ داری نہ سمجھیں بلکہ عبادت سمجھیں۔"

اس کی خاموشی میں چھپی ہوئی نیم رضامندی کو محسوس کر کے وہ استحقاق بھرے انداز میں بولا۔

"ان فیکٹ...... میرے ہسبینڈ شاید مجھے اس بات کی اجازت نہ دیں۔" عشاء نے یہ کہہ کر گویا بات ختم کرنے کی کوشش کی۔

اس کا خیال تھا اسفند رحیم مزید اصرار نہیں کرے گا مگر وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔

"واٹ...... واٹ ربش...... آپ دودھ پیتی بچی نہیں ہیں۔کہ آپ کو اجازت کی ضرورت پڑے......بائی دا وے کیا آپ کے ہسبینڈ اس قدر نیرو مائنڈڈ ہیں کہ آپ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے ان کی اجازت لینا پڑتی ہے۔اور پھر اجازت......؟ واٹ ربش...... مجھے تو آپ کے منہ سے یہ لفظ سن کر حیرت ہوئی ہے۔اس قدر براڈ مائنڈڈ خاتون اور اس قدر کنزرویٹو ہسبینڈ۔"

وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

عشاء کو چاہیے تھا کہ وہ اپنے شوہر کی صفائی میں کچھ کہتی، کچھ تو کہتی مگر وہ خاموش رہی...... قدامت پسندی کی شکایت تو اسے بھی عادل سے ہونے لگی تھی۔

"زمانہ مریخ پر رہائش اختیار کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے اور میرے ہسبینڈ کو سلیولیس پہننا چاہیے یا نہیں چاہیے جیسی باتوں پر کڑھنے سے فرصت نہیں۔" اس نے گزشتہ چار دنوں میں کئی بار سوچا تھا۔

عشاء کا ذاتی خیال تھا کہ وہ پختہ سوچ کی حامل، بہت ذہین لڑکی ہے۔وہ چاہتی تھی کہ سارے زمانے کو اس کی فہم و فراست کا قائل ہونا چاہیے۔



"مجھے بہت دکھ ہوتا ہے یہ دیکھ کر ایک مرد عورت کے لیے جینے کے اسباب بھی ختم کر دینا چاہتا ہے...... ہمارے یہاں ستر فیصد مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔

ارے بھئی کچھ تو Speace دو عورت ہے کوئی سنڈی تو نہیں کہ بند بوتل میں بھی جینے کا جواز تلاش کر لے...... مسز عادل آپ کیسے ایک کنزرویٹو مرد کے ساتھ گزارا کر رہی ہیں۔آپ یہ سب پابندیاں برداشت کیسے کرتی ہیں؟"

اس کے اس قدر جارحانہ انداز کو دیکھ کر عشاء بوکھلا سی گئی۔

عادل نے اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی جتنی کہ اسفند رحیم بیان کر رہا تھا۔اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا مگر اسفند رحیم اسے بات کرنے کا موقع بھی نہیں دینا چاہ رہا تھا۔

"ہم "فلاح" کی طرف سے آپ کے بی ہاف پر ان سے باقاعدہ پرمیشن حاصل کریں؟" اس نے استفسار کیا۔عشاء نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا۔

"نہیں نہیں سر......! میں نے ان فیکٹ عادل سے ابھی بات ہی نہیں کی کہ آپ لوگوں کا سنڈے کا پروگرام ہے اور اس دن ظاہر ہے عادل کا بھی آف ہے۔ایک ہی دن تو ہوتا ہے ہمارے پاس......ان کا شیڈول سارے ہفتے بہت ٹف رہتا ہے......بس اسی لیے۔"

عشاء کا انداز پُراعتماد تھا مگر الفاظ نہیں۔اسفند کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"ویل......فائن......ہم منڈے کا پلان کر لیتے ہیں۔آپ ابھی اپنے ہسبینڈ کو فون کیجیے اور انہیں انفارم کر دیجیے۔" وہ ریوالونگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کر دونوں ہاتھ ہونٹوں پر رکھتے ہوئے بولا۔

نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کے مصداق عشاء نے پرس میں اپنا موبائل نکال کر ایک بار پھر عادل کا نمبر ملانا شروع کیا اسے یقین تھا کہ عادل اب بھی کال ریسیو نہیں کرے گا مگر دوسری جانب سے "ہیلو" کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔

مگر یہ "ہیلو" عادل کی نہیں تھی۔کسی عورت کی بھدی سی آواز کے ساتھ پس منظر میں گھنگھروؤں کی صدا صاف سنائی دے رہی تھی۔

"اری کون ہے......نہیں بولتی تو فون بند کر دے نا......کہہ دے تیرا آدمی یہ موبائل تجھے توفہ (تحفہ) دے کر گیا ہے۔"

کسی اور عورت کی چنگھاڑتی ہوئی آواز نے عشاء کے رہے سہے حواس بھی معطل کر دیے۔اس نے گھبرا کر فون بند کر دیا۔

"عادل کا سیل آف ہے......میں گھر جا کر ڈسکس کر لوں گی۔" وہ اتنا کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی اور پھر اسفند کے اصرار کے باوجود رکی نہیں اپنے کیبن کی طرف آ گئی۔

اس کی روح کو کوئی چٹکیوں میں مسل رہا تھا اس نے ڈائلڈ نمبر کو دوبارہ چیک کیا کہ کہیں کوئی غلط نمبر نہ ملا بیٹھی ہو مگر نمبر بالکل ٹھیک تھا۔

عادل کا تعلق مردوں کی اس قسم سے نہیں تھا جو غلط قسم کے شوق رکھتے ہیں یا شاید عشاء اسے پہچان نہیں پائی تھی۔ وہ جتنی دیر تک آفس میں رہی گویا کونکوں پر رقص کرتی رہی۔ اس نے دوبارہ عادل کا نمبر ملا کر چیک کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گھر آ کر اس نے نکسڈ لائن سے عادل کا نمبر ملایا اور اس بار جس آواز نے کال ریسیور کی وہ پہلے والی آواز سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔

''کون بات کر رہا ہے؟'' ایک مردانہ کرخت آواز عشاء کی سماعت سے ٹکرائی۔

''میں مسز عادل سے بات کر سکتی ہوں؟'' عشاء نے ہمت کر کے کہا۔

''آپ کون بات کر رہی ہو؟''

''میں ان کی مسز ہوں......آپ......آپ......کون؟'' اس نے دوسرا سوال کیا۔

''او جی......کیسی مسز ہو آپ......شوہر نہیں قابو ہوتا آپ سے......کوٹھے سے پکڑ کر لائے ہیں......اب حوالات میں ہیں......آپ کے شوہر......ٹن ہو رہے ہیں......نام بھی نہیں بتا رہے......کیا نام بتایا آپ نے......؟'' عشاء نے گھبرا کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

یہ تسلی بھی نہیں کی کہ جو شخص اس سے فون پر بات کر رہا تھا وہ پولیس آفسر ہے بھی یا نہیں۔ پریشانی سے اس کا برا حال تھا۔ اس شہر میں ایسا کون جاننے والا تھا کہ جس کو وہ فون کر کے مدد کے لیے کہہ سکتی۔ لاؤنج سے باہر گیٹ تک وہ چکر لگا کر تھک گئی۔ مگر عادل آیا نہ کوئی راہ سجھائی دی۔

آفس فون کیا تو پتا چلا کہ وہ تو آج صبح سے ہی کسی ضروری کام کے لیے نکلا ہوا ہے۔ وہ اس کے ایک ہی دوست کو جانتی تھی اسے بھی فون کر کے دیکھ لیا۔

''بھابھی! عادل تو عید کا چاند ہو چکا میرے لیے......کبھی ملتا ہی نہیں ویسے آپ فکر مت کریں......آ جائے گا......'' نبیل کی تسلی بھی اسے مطمئن نہ کر سکی۔

وہ اسے یہ تو نہیں بتا سکتی تھی کہ عادل پولیس اسٹیشن میں ہے۔ آٹھ بجے تک وہ پریشانی سے اس کا انتظار کرتی رہی پھر تھک ہار کر اس نے دوبارہ نبیل کو فون کر کے گھر بلوایا اور روتے ہوئے ساری صورت حال اسے بتا دی۔ وہ بھی بے حد پریشان ہو گیا۔

اس نے عادل کا سیل نمبر ملانے کی کوشش کی مگر موبائل آف ہو چکا تھا۔ نبیل کے ساتھ فاطمہ بھابھی بھی تھیں۔ ان دونوں کی تسلیاں بھی عشاء کو مطمئن نہیں کر پا رہی تھیں۔ دس بجے کے قریب عادل کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور چند لمحے بعد وہ ڈپلی کیٹ چابی کی مدد سے گیٹ کھول کر اندر داخل ہو چکا تھا۔ عشاء دوڑتی ہوئی لاؤنج سے گیراج تک چلی آئی۔

''آئی ایم سوری یار......! دراصل! اس نے عادل کی بات پوری بھی نہیں سنی اور کھینچ کر ایک تھپڑ اس کے گال پر رسید کر دیا تھا۔ نبیل بھائی اور فاطمہ بھابھی لاؤنج کے دروازے میں کھڑے ان ہی کی جانب دیکھ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆



''جو لوگ کہتے ہیں گوانتانا موبے سے بڑا کوئی ٹارچر سیل ہو ہی نہیں سکتا۔ میں ان لوگوں کو دعوت دیتی ہوں کہ وہ ایک بار ان پاکستانی ایریاز کا ضرور وزٹ کریں انہیں خود پتا چل جائے گا کہ دنیا میں ایک موبے ہے جبکہ پاکستان میں کئی ایک گوانتانا موبے ہیں۔''

مس شیریں نے نخوت سے ناک چڑھا کر بات مکمل کی پھر اپنے پرس سے بینسن اینڈ ہیجز کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگانے لگی تھی۔ چھیالیس سیٹ والی اس اے سی کوچ میں رحمہ اور عشاء کو نکال کر باقی سب معزز خواتین چین اسموکر تھیں۔

مس شیریں کی بات سن کر رحمہ کے چہرے پر استہزائیہ سی مسکراہٹ بکھر گئی جس کا عشاء نے بغور نوٹس لیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

''مس شیریں کا وسیع و عریض بنگلہ کسی ٹارچر سیل سے کم نہیں ہے۔ موصوفہ اپنے باپ اور بھائیوں کو تگنی کا ناچ نچائے رکھتی ہے۔'' رحمہ نے عشاء کے کان میں سرگوشی کی۔

عشاء گہری سانس بھر کر بدقت مسکرائی اسے فی الحال اتنی تھکن محسوس ہو رہی تھی کہ اس کا مسکرانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ آ تو گئی تھی مگر اس کا ذہن اپنے گھریلو مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ عادل نے بلا چوں و چرا اس کی بات مان کر گویا اسے مزید دو کوڑی کا کر دیا تھا۔

''میری ایک فرینڈ کا مس شیریں کے چھوٹے بھائی کے ساتھ ٹھیک ٹھاک افیئر ہے۔ مجھے تو اس بندے کی باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ اکثر اوقات میری فرینڈ کو اپنے گھریلو مسائل کے بارے میں بتاتا رہتا ہے اور وہ مجھ سے ذکر کرتی رہتی ہے۔'' رحمہ نے پھر جھک کر عشاء کے کان میں سرگوشی کی۔

عشاء کو ایک بار پھر دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے چہرے پر ''اچھا......آآآآ'' والی کیفیت پیدا کرنا پڑی۔ رحمہ کو اپنی باتوں سے لوگوں کو حیران کرنے کا شوق بھی بہت تھا۔ گاڑی میں بتیس کے لگ بھگ لوگ تھے جن میں سات آٹھ مرد جبکہ باقی تعداد عورتوں پر مشتمل تھی۔ سب لوگ آتے وقت جس قدر پرجوش تھے اب تھکن اور گاؤں کی دھول مٹی نے اتنا ہی بے حال کر رکھا تھا۔ سات بج چکے تھے مگر گرمیوں کی وجہ سے آسمان پر نیلگوں روشنی موجود تھی۔

عشاء پہلے کبھی اس طرف نہیں آئی تھی۔ جن علاقوں کا وزٹ انہیں کروایا گیا تھا وہاں کا معیار زندگی دیکھ کر کم از کم عشاء کافی حیران ہوئی تھی۔

وہ گاؤں کسی بھی چھوٹے شہر کے برابر تھے۔ گلیاں بھی صاف ستھری تھیں اور لوگ بھی اسے کم از کم دیہاتی تو نہیں لگے تھے۔ دراصل انہیں گاؤں کی گلیوں میں پیدل نہیں گھمایا گیا تھا کیونکہ سب ہی نازک مزاج خواتین اس قدر گرمی میں پیدل چلنے کے حق میں نہیں تھیں۔

ان کا پہلا پڑاؤ اختر آباد میں تھا جہاں ایک معزز شخص اکرم علی کے اسفند صاحب کے ساتھ گہرے مراسم تھے۔ ان کے بڑے سے ڈرائنگ روم میں اے سی کی ٹھنڈک میں کھانا کھایا گیا۔

بیگم اکرم علی کافی سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ انہوں نے ''فلاح'' کے اسٹاف کو بہت سی مجبور و بے کس

خواتین سے ملوانے کا بندوبست کر رکھا تھا۔

کسان، رینالہ خورد حبیب آباد، گوگیرہ نامی چھوٹے قصبوں میں دس دس پندرہ منٹ کے لیے جانے کا اتفاق ہوا مگر نجانے کیوں یہ سب ایک تفریحی ٹور سے زیادہ نہیں لگ رہا تھا۔ گرمی اور دھول کے باعث بہت سی خواتین نے اے سی کوچ سے اتر کر کسی سے ملنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ خود عشاء جو آتے وقت بہت پر جوش تھی۔ گرمی کی شدت سے سارا وقت اکتائی بیٹھی رہی۔ واحد ایک شخص جو گرمی غلاظت اور دھول کی پروا کیے بغیر ہر جگہ تصویریں لینے اور خواتین کے ویوز اکٹھے کرنے میں مصروف رہا تھا وہ وجاہت علی تھا۔ وہ اس گروپ کا عمر کے لحاظ میں سب سے چھوٹا تھا۔ وہ پنجاب یونیورسٹی سے سوشل ورک میں ماسٹرز کر رہا تھا اور "فلاح" میں پارٹ ٹائم جاب کرتا تھا۔

دیپال پور میں انہوں نے کسی ٹیوب ویل میں سی سائیڈ کا مزا لیا تصاویر بنوائیں اور آم کھائے۔ اس کے باوجود مس شیریں کو نجانے ایسے کون سے ٹارچ سیل نظر آئے تھے جو وہ ان علاقوں کو گوانتا ناموبے سے ملا رہی تھیں۔

"مس شیریں کو شاید پتا بھی نہ ہو کہ گوانتا ناموبے کیا ہے...... کس چیز کا نام ہے۔ مگر اپنی عقلمندی ثابت کرنے کے لیے ایسی فضول باتیں کرنا جیسے لازم ہے ان پر۔" وجاہت نے اپنے ہینڈی کیم کی جانب دیکھتے ہوئے خود کلامی کی تھی۔ وہ عشاء اور رحمہ کے بالکل پیچھے بیٹھا تھا۔

"اور رئیلی...... ہاہاہا...... کتنا شارپ سینس آف ہیومر ہے تمہارا وجاہت...... اچھا ویسے گوانتا ناموبے کیا ہے......؟ ان فیکٹ میری اردو بہت ویک ہے...... انگلش میں گوانتا ناموبے کو کیا کہتے ہیں۔" رحمہ نے اپنی بتیسی کی نمائش کرتے ہوئے پیچھے مڑ کر سوال کیا۔

وجاہت کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھری مگر اس مسکراہٹ کا دورانیہ بہت مختصر تھا۔ عشاء اگر عادل کی وجہ سے اپ سیٹ نہ ہوتی تو یقیناً رحمہ کے سر پر چپت لگا کر اس سوال کا جواب دیتی اس نے فقط ایک نظر رحمہ پر ڈالی اور دوبارہ سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"میں پہلی ملاقات میں ہی آپ کے انٹلیکچوئل لیول سے بہت متاثر ہوا تھا مگر افسوس مجھے خود بھی نہیں پتا تھا کہ گوانتا ناموبے کو انگلش میں کیا کہتے ہیں۔ آپ ڈکشنری میں دیکھ لیجئے گا۔" اس نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔

عشاء کو اس کے اس سادہ سے طنز نے ایک بار پھر عادل کی یاد دلا دی۔ عادل یہاں موجود ہوتا تو رحمہ کو اس سے بھی زیادہ کرارا جواب دیتا۔

اس کی ذہنی رو پھر بھٹکنے لگی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا جلد از جلد اڑ کر گھر پہنچ جائے۔

"عادل! آپ بہت بدل گئے ہیں۔" اس نے دل ہی دل میں اسے مخاطب کر کے کہا۔ سب کا ہی تھکن کے مارے برا حال تھا اسی لیے کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ عشاء کی طرف دھیان دیتا۔

صبح رحمہ کے علاوہ دو تین اور لوگوں نے بھی اس کا چہرہ اترا ہوا دیکھ کر تشویش سے اس کی طبیعت کا



پوچھا تھا مگر اس نے سب کو کسی نہ کسی طرح مطمئن کر دیا۔ فقط خود کو ہی مطمئن نہیں کر پا رہی تھی۔ اسے اب خود پر غصہ بھی آنے لگا تھا کہ وہ آئی کیوں۔ اسے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ وہ جس ٹرپ کو بہت سنجیدہ سمجھ رہی تھی وہ اس قسم کا ایک تفریحی ٹور ہے۔

اگر اس کا مزاج عادل کے رویے کی وجہ سے خراب نہ ہوتا تو شاید وہ بھی اس ایڈونچرس ٹور کا لطف لیتی کیوں کہ بہر حال وہ گھومنے پھرنے کی بہت شوقین تھی۔

"ہم ادھر پتوکی میں تھوڑی دیر کو رک کر نماز ادا کرے گا...... آپ میں سے کسی نے نماز پڑھنی ہے تو آجاؤ۔"

ان کے بزرگ پٹھان ڈرائیور نے بلند آواز میں کہا۔

"نہیں پلیز...... اوہ نہیں...... خان بھائی! سفر میں کوئی نماز نہیں ہوتی...... گھر جا کر پڑھ لینا...... معاف کرو خان بھائی...... آل ریڈی گیٹنگ لیٹ...... پینلٹی (قضا) بھی تو ہوتی ہے۔ نماز کی۔" خان صاحب کو جواب میں مختلف قسم کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"خان بھائی تمہارا ہمارا آٹھ بجے تک کا ٹائم تھا اگر یہاں رک گئے تو لاہور پہنچنے تک آٹھ سے اوپر کا ٹائم ہو جائے گا۔ پھر تمہارا مالک ہم سے زیادہ پیسے مانگے گا۔ اگر تم وعدہ کرو کہ آٹھ بجے سے پہلے ہمیں لاہور پہنچا دو گے تو ہمیں تمہارے یہاں رکنے پر اعتراض نہیں۔" اسفند رحیم نے گویا آخری فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

"امارا بات سنو صاحب! ام تم کو دس منٹ میں لاہور لے جائے گا مگر اس بات کا وعدہ ام نہیں کرتا کہ تم کو زندہ لاہور لے جائے گا۔ شیر خان کو اپنی جان کا فکر نہیں۔ آپ لوگوں کا واسطے ام گاڑی کو اتنا ڈھیلا رکھا ہے کہ آپ کے ساتھ آپ کا عورتیں ہیں اور آپ کی عورتیں تو ہوا کو دیکھ کر ہائے ہائے کرنے لگتی ہیں۔ فرض نماز پڑھنے میں کتا (کتنا) ٹیم لگ جائے گا اور دیر امارا وجہ سے نہیں ہوا۔ آپ لوگوں نے کھود (خود) لیٹ کیا۔" خان صاحب تڑپ کر بولتے چلے گئے تھے۔ اسفند رحیم خاموش ہو گیا مگر معزز خواتین غصے سے آگ بگولا ہو گئیں۔

"ارے اس میں اتنی بدتمیزی کرنے کی ضرورت نہیں ہے پڑھ لو تم نماز۔ ادا کر دیں گے تمہارے مالک کو زیادہ پیسے بس اب دماغ مت کھاؤ۔" ضویا درانی تڑپ کر بولی۔

خان روایات کا لحاظ کرنے والا آدمی تھا اس لیے ضویا کے سخت لہجے کو برداشت کر گیا مگر پھر بھی حق بات کہنے پر باز نہیں آیا۔

"میری بات سنو بی بی! جب تم لوگوں نے گاڑی کا بکنگ کرایا تو بولا کہ تم حقوق کی بات کرتے ہو اور گاؤں میں جا کر عورت کو اس کے حقوق کی بات سکھائے گا مگر تم لوگوں کو اللہ کے حقوق کی کوئی خبر نہیں ہے۔ تم انسان کے بچے کو کیا حقوق کی تعلیم دے گا۔" اس نے گاڑی ایک ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی کرتے ہوئے سب لوگوں کو غیرت دلانے کی کوشش کی۔

"اونہہ...... مولوی نہ ہو تو۔" ضویا درانی نے اپنے بیگ سے منرل واٹر کی بوتل نکال کر منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

خان صاحب نماز کے لیے اتر گئے جبکہ باقی لوگ ہوا کھانے یا چائے پانی وغیرہ کے لیے ایک کے بعد ایک اترتے چکے تھے۔ دس پندرہ منٹ بعد خان صاحب نماز پڑھ کر واپس آ بھی گئے مگر وہ تمام جوان جو پیچھے ہوا خوری کے لیے اترے تھے۔ وہ ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔

وہ لوگ جو دس منٹ کے قیام کے لئے تیار نہیں تھے وہی لوگ آدھ گھنٹے کی تاخیر سے دوبارہ گاڑی میں اپنی نشست پر آ کر بیٹھے۔ خدا خدا کر کے گاڑی پھر چلی مگر بیس پچیس منٹ کے بعد ایک جھٹکا کھا کر رک گئی۔ نازک مزاج لوگ تھے اس لیے ذرا سے جھٹکے نے ہلا کر رکھ دیا۔

خان صاحب بڑبڑاتے ہوئے گاڑی سے اترے تھے۔ گاڑی میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ دراصل خان صاحب کو شک گزرا تھا کہ کوئی جانور گاڑی سے ٹکرایا ہے۔ خان صاحب کے پیچھے سب سے پہلے وجاہت اترا پھر ایک ایک کر کے باقی مرد بھی اتر گئے۔

''اب اسٹوپڈ خان کو کیا مصیبت ہے؟'' یہ رحمہ کی آواز تھی۔

''ایک عورت گاڑی سے ٹکرائی تھی شاید مر گئی ہے۔'' وجاہت نے دروازے سے منہ نکال کر دھماکا کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

''نہیں عشاء ایسی کوئی بات نہیں۔'' عادل نے ایک ہی جملے میں اس کی بات کو رد کر دیا۔ ہمیشہ کی طرح عشاء اس کے لہجے سے اس کے مزاج کا اندازہ نہیں لگا پائی تھی۔ عادل کی توجہ لیموں کے پیڑ کی جانب تھی جس پر بہت سے کچے پکے لیموں لگے ہوئے تھے۔

عشاء کو یکسر نظر انداز کر کے وہ پکے ہوئے لیموں شاخوں سے علیحدہ کرنے میں لگا ہوا تھا۔ ان کی لینڈ لیڈی نے گھر کا پیچھے والا سارا حصہ ان کے تصرف میں دے رکھا تھا۔ سامنے کے حصے کے مقابلے میں عقبی حصے میں لان کا فقط ایک چھوٹا سا قطعہ تھا مگر یہ ننھا قطعہ سامنے والے قطعے سے زیادہ شاندار لگتا تھا اور اس کا سارا کریڈٹ عادل کو جاتا تھا۔ گارڈننگ اس کا شوق تھا۔ اس نے اس حصے کو کچن گارڈن کی شکل دے رکھی تھی۔

وہ آج مہینے کی آخری تاریخ کی وجہ سے جلدی گھر آ گیا تھا اسی وجہ سے اب فراغت میں وہ لان میں نظر آ رہا تھا۔ عشاء نے ٹور کی تھکاوٹ کی وجہ سے چھٹی کی تھی اور عادل کو بیڈ روم میں محو استراحت دیکھ کر اس نے سوچا تھا کہ موقع اچھا ہے آج کھل کر عادل کو اس کے بدصورت رویے کا احساس دلایا جائے مگر ابھی وہ بات کرنے کا سوچ رہی تھی کہ عادل خود باہر آ گیا۔

مجبوراً عشاء کو اس کے پیچھے آنا پڑا تھا مگر عادل کا سرد رویہ اس کی حوصلہ شکنی کرنے کو کافی تھا۔

''میرا خیال ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے ورنہ اگر مجھ میں یا میرے رویے میں کوئی تبدیلی آئی ہوتی تو کم از کم کوئی اور بھی ایسی شکایت کرتا۔'' اسے اپنی جانب مسلسل دیکھتا پا کر عادل نے سادہ سے لہجے میں کہا۔

عشاء کچھ لمحے خاموشی سے اس کی جانب دیکھتی رہی۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن اور خاندان بھر کی



پہلی پوتی و نواسی ہونے کی بنا پر اس کو ہمیشہ توقعات سے بڑھ کر پیار اور توجہ ملی تھی اسی لیے اس کی طبیعت میں ہٹ دھرمی تھی جو اسے ہمیشہ اپنے دل کی مرضی ماننے پر اکساتی تھی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ عادل سے اس معاملے پر کھل کر بات کرے تاکہ کم از کم دلوں میں موجود کثافت دور ہو جائے مگر نجانے کیا چیز تھی جو اسے روک رہی تھی' دوسری طرف عادل سوچ رہا تھا کہ ایک دفعہ عشاء اپنے رویے کی معافی مانگ لے تو وہ سب کچھ بھول بھال کر اپنا مزاج ٹھیک کر لے گا۔

''میں جھوٹ بول رہی ہوں کیا......؟ اتنے دن سے آپ مجھ سے ٹھیک سے بات نہیں کر رہے ہیں، بات کرنا چاہتی ہوں تو میری بات کا جواب نہیں دیتے اور پھر آپ نے مجھ سے ایکسکیوز بھی نہیں کیا......'' وہ ابھی اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ عادل نے اس کی بات کاٹ دی۔

''اوہ یس...... آئی ایم سوری...... میں بھول گیا تھا کہ مجھے آپ سے ایکسکیوز کرنا تھا میں نے مس بی ہیو کیا تھا آپ کے ساتھ۔ پلیز مجھے معاف کر دیجئے۔ مجھ سے آپ کی شان میں گستاخی ہوئی۔''

اس کی ساری توجہ لیموں کے پیڑ کی جانب ہی تھی مگر زبان سے نکلتے شعلوں کا رخ عشاء کی جانب تھا۔

''عادل! پلیز اب بس کیجئے۔ ایسا کیا کر دیا ہے میں نے کہ آپ کا غصہ ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ آپ خود بھی تو اپنی غلطی مانیے۔'' وہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔

آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے تھے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ عادل ان آنسوؤں کو دیکھے۔ عادل کن اکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں در آنے والی نمی سے واقف تھا مگر ابھی اسے معاف کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

وہ اس کی وجہ سے کتنے ہی دن اپ سیٹ رہا تھا اور پھر دو دن قبل نبیل اور فاطمہ بھابھی کے سامنے جو ڈرامہ ہوا تھا' اس کے بعد تو وہ عشاء کو اتنی جلدی معاف کر ہی نہیں سکتا تھا۔

''بی بی عشاء میں نے آپ کو کب کہا کہ میری غلطی نہیں۔ میری ہی غلطی ہے سب میری غلطی ہے۔'' وہ اس انداز میں بات کر رہا تھا جیسے اپنے نہیں کسی اور کے بارے میں بات کر رہا ہو۔

''پلیز عادل! فار گاڈ سیک۔ میں کہہ تو رہی ہوں کہ میری غلطی ہے۔ آئی ایم سوری مگر آپ ایک بار خود کو میری جگہ رکھ کر سوچیے۔ جو واقعات اس دن میرے ساتھ پیش آئے اگر آپ کے ساتھ پیش آتے تو آپ بھی غلط فہمی کا شکار ہو جاتے آپ خود بتایئے کہ اگر آپ مجھے فون کریں اور میرا فون کوئی اور ریسیو کر لے اور آپ کے ساتھ الٹی سیدھی باتیں کرے تو آپ غلط فہمی کا شکار نہیں ہوں گے کیا۔ اس عورت کی آواز اتنی گندی تھی۔'' عشاء بولتے بولتے رونے لگی۔

''اور...... اور پھر گھنگھروؤں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ اس عورت نے اتنی گندی باتیں کیں پھر...... دوسری بار ایک آدمی نے کال ریسیو کی اور بولا میں پولیس آفیسر ہوں۔ اس نے کہا اس نے موبائل فون والے کو کوٹھے سے پکڑا ہے۔ آپ خود بتایئے مجھے غلط فہمی نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ مجھے الہام تو ہونے سے رہا کہ آپ

کا سیل چوری ہو گیا ہے۔ کیا آپ نے مجھے انفارم کیا تھا کہ میرا موبائل چوری ہو گیا ہے۔ حالانکہ یہ اتنی صبح کی بات تھی اور سیل چوری ہونے کے بعد تقریباً میں نے سات آٹھ گھنٹے بعد فون کیا تھا۔“

اس کی آواز قدرے اونچی ہو گئی تھی۔ عادل نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر کی جانب چلا آیا۔ لاؤنج میں بیٹھنے کی بجائے وہ اسے بیڈروم میں ہی لے آیا پھر اسے صوفے پر بٹھا کر خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

”اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا عشاء! کہ میرا کردار ہی بدل گیا۔ ارے سیل چوری ہوا تھا میں تو نہیں کہ تم نے آتے ہی مجھ پر یلغار کر دی۔ توبہ نبیل اور بھابھی کے سامنے تم نے مجھے تھپڑ دے مارا۔ مجھے اتنا برا محسوس ہوا کہ بس...... یقین کرو دل چاہا زمین میں سما جاؤں...... گاڈ...... سامنے میرا لنگوٹیا یار کھڑا تھا جو مجھے آج تک اس بات کے طعنے دیتا ہے کہ مجھے یونیورسٹی میں ہر لڑکی ”نو ویکنسی“ کا بورڈ دکھا دیتی تھی۔ اب تو ساری زندگی کے لیے اس کو جواز مل گیا مجھے طعنے دینے کا کہ میری بیوی مجھے مارتی ہے۔“

عادل نے سنجیدگی سے بات شروع کی مگر زیادہ دیر سنجیدہ رہنا اسے آتا ہی نہیں تھا۔ نجانے کیسے وہ اتنے دن تک اپنے آپ کو سنجیدہ رکھے ہوئے تھا اور پھر عشاء کے ایک چھوٹے سے ایکسکیوز نے اس کے مزاج کی شگفتگی بحال کر دی تھی۔

”میں آپ کو مارتی نہیں ہوں...... سمجھے آپ...... بس اس روز نجانے کیسے...... آئی ایم سوری عادل...... دراصل میں اتنی ڈپریس ہو گئی تھی اس روز...... میں اپنے آپ کو کمپوز کرنا چاہتی تھی۔ مگر......“ عشاء نے رخساروں پر آئی نمی کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

اس کا لہجہ و انداز اس کی شرمندگی کا احساس دلا رہے تھے۔ عادل کو اس سے زیادہ نہیں چاہیے تھا۔ وہ بہت صابر و شاکر قسم کا بندہ تھا۔ بیوی نے غلطی کی پھر معافی مانگ لی تو اس کا مطلب شوہر کو کھلے دل سے معاف کر دینا چاہیے۔

”اٹس اوکے...... کچھ قصور میرا بھی ہے...... مجھے تمہیں انفارم کرنا چاہیے تھا کہ میرا سیل چوری ہو گیا ہے۔ ان فیکٹ اس روز گاڑی کچھ پرابلم کر رہی تھی۔ میں ورکشاپ پر لے گیا تھا۔ وہاں شاید کہیں گر گیا یا کوئی اٹھا کر لے گیا مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں نے غلطی سے کہیں گرا دیا۔ بہر حال رات گئی بات گئی اب جھگڑے ختم کرو اور پیار کی باتیں کرو۔“ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”ہاں ٹھیک ہے میں چائے بنا کر لاتی ہوں پھر ساری باتیں کریں گے اور میں آپ کو کل والے ٹرپ کی ساری باتیں بتاؤں گی۔ آپ خود سے تو کچھ پوچھتے ہی نہیں ہیں۔ پتا ہے کتنی عجیب بات ہوئی ایک عورت ٹکرا گئی تھی ہماری گاڑی سے۔ ابھی آ کر تفصیل بتاتی ہوں۔ پہلے چائے اور بسکٹ وسکٹ لے آؤں بہت بھوک لگی ہے۔ توبہ صبح سے کچھ نہیں کھایا میں نے۔“ وہ صوفے سے اٹھتے ہوئے بولی۔

عادل نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا لیا۔

☆ ☆ ☆

”میرا نام زینب ہے جی!“ اس نے اپنے ہاتھوں کو تکتے ہوئے بمشکل یہ فقرہ ادا کیا۔



اس کی پیشانی اور ہاتھوں پر پٹی بندھی تھی مگر اس کے علاوہ بظاہر اسے کوئی بڑی چوٹ نہیں آئی تھی۔ لاہور پہنچتے ہی سب سے پہلے اس کا تفصیلی میڈیکل چیک اپ کروایا گیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد یہ پہلا مکمل فقرہ تھا جو اس نے ادا کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ مسلسل سوال پوچھنے پر بھی کچھ نہیں بول رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی سے بہت بہت زیادہ خوف زدہ ہے۔

”بی بی! نام سے فرق نہیں پڑتا۔ ہمیں حقیقت بتاؤ کس سے ڈر کر بھاگ رہی تھیں تم...... قتل کیا ہے......؟ عشق و عاشقی کا چکر ہے یا جائیداد کے تنازعے ہیں۔“

اطہر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ نہایت تلخ تھا۔ وہ واحد شخص تھا جو اس عورت کو اس روز سڑک سے اٹھا کر اپنے ساتھ لانے کو تیار نہیں تھا وہ اطہر بخاری تھا۔ وہ اب بھی اس عورت کو گھورنے میں مصروف تھا۔ اطہر کی بات پر اس نے مزید سر جھکا لیا۔

”سیدھا سادا پولیس کیس ہے اسفند! یہ عورت شکل سے ہی ڈرامہ باز لگتی ہے۔“ اطہر اسفند کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

اسفند نے اسے گھور کر دیکھا اور خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ کمرے میں ان دونوں مرد حضرات کے علاوہ ضویا اور شیریں بھی موجود تھیں۔

”آپ کو گھبرانے یا کسی سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں مگر یہ تب ہی ممکن ہے جب آپ ہمیں اپنے متعلق سب کچھ سچ سچ بتائیں گی۔“ اسفند نے لہجے میں حتی الامکان مٹھاس سموتے ہوئے کہا تھا۔

اطہر...... اسفند کے پر حلاوت لہجے پر ناک بھوں چڑھاتا باہر نکل گیا۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی اسفند صوفے پر مزید مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔ اطہر زبان کا کچھ زیادہ ہی تلخ تھا۔ وہ عورت اب بھی کچھ نہیں بولی۔ اس کی نظروں کا ارتکاز اس کے ہاتھوں کی جانب ہی رہا تھا۔ شیریں اسفند کا اشارہ پا کر اس عورت کے پاس جا کر بیٹھ گئی پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ حالانکہ ایسا کرنے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

اس عورت کو ضویا نے اپنا ایک پرانا جوڑا دے دیا تھا۔ وہ اس وقت اسی لباس میں تھی مگر ایسا لگ رہا تھا کہ لباس کی اہمیت بھی کم ہو گئی ہے۔ سانولی سلونی سی وہ عورت گلابی رنگ کے شلوار قمیص میں مزید سانولی لگ رہی تھی۔

مس شیریں کے ہاتھ پکڑنے پر اس عورت نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا پھر منت بھرے انداز میں بولی۔

”باجی! مجھے پنڈ (گاؤں) جانے والی لاری میں بٹھا دیں۔ مجھے واپس جانا ہے۔“

”باجی......؟ واٹ ربش...... میں تمہاری باجی نہیں ہوں...... یہاں کوئی تمہاری باجی نہیں ہے...... اسٹوپڈ عورت...... اونہہ......“ مس شیریں نے یکدم اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ناک چڑھا کر بولی۔

”کون سے پنڈ (گاؤں) جانا ہے تمہیں......؟ ہم تمہیں بس میں بٹھا دیں گے۔ مگر جب سے آئی ہو

تم نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ انجکشنز اور ڈرپ پر گزارا کر رہی ہو۔ کھانا کھالو پھر چلی جانا'' اسفند نے بغور اسے دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

وہ عورت کچھ نہیں بولی۔ یقیناً وہ کچھ کھانا چاہ رہی تھی۔ اسفند کے اشارے پر ملازم بہترین ریسٹورنٹ سے کھانا لے آیا تھا۔ چند منٹوں بعد اس عورت کے سامنے انواع واقسام کے کھانے سج گئے تھے اور اس عورت نے بھی کسی کو مایوس نہیں کیا تھا وہ کھانے پر ٹوٹ پڑی تھی۔

وہ سب لوگ اس عورت کو اس قدر رغبت سے کھاتا دیکھ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

''وہ اپنا نام زینب بتاتی ہے اور بہت مظلوم عورت ہے۔ اس کا شوہر اسے قتل کرنے والا تھا مگر وہ بھاگ کر بس اسٹینڈ تک آ گئی مگر اس کے پاس کرائے کی رقم نہیں تھی اس لیے اس کو بس سے پتوکی کے قریب اتا ردیا گیا تھا۔ وہ بھاگ رہی تھی مگر انجانے میں ہماری کوچ سے ٹکرا گئی۔''

رحمہ نے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے عشاء کو تفصیل بتائی کیونکہ عشاء ایک دن کی چھٹی کے بعد آئی تھی۔

''کاروکاری کا معاملہ ہے۔ قسمت کی بات ہے نا اس عورت کو بھاگنے سے پہلے پتا ہی نہیں ہوگا کہ وہ اسفند صاحب جیسے ہمدرد انسان تک پہنچ جائے گی۔ اسفند صاحب کل یا پرسوں ایک پریس کانفرنس کرنے والے ہیں۔ وہ اس عورت کو اس کے حقوق دلوا کر ہی دم لیں گے۔''

سارے اسٹاف کی طرح رحمہ بھی اسفند صاحب کی انسان دوستی کی دل سے معترف تھی۔

''اس عورت کا شوہر اسے قتل کیوں کرنا چاہ رہا تھا؟''

عشاء نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

اخبار میں اس قسم کی خبریں پڑھنا اور بات تھی اور اپنی آنکھوں کے سامنے کسی کو اس طرح ظلم کا نشانہ بنتے دیکھنا بالکل الگ کیفیت تھی۔

''یار! کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کیوں اس بے چاری کو قتل کرنا چاہتا تھا جو بات اہم ہے وہ یہ کہ اس کا شوہر اسے قتل کرنا چاہتا تھا۔ یار! پاکستان میں ایسے ہی مرد ہوتے ہیں ظالم خونخوار اور ہوس پرست......

وجہ کچھ بھی ہوسکتی ہے۔ جائیداد یا پھر وہی اسٹوپڈ کاروکاری...... یونو' گاؤں میں مرد اپنی عورتوں کو اس لیے بھی ٹارچر کرتے ہیں کہ وہ ان کی مرضی کے کام کرنے پر تیار نہیں ہوتیں۔ خیر یہ تو شہروں میں بھی ہوتا ہے۔ مرد عورت کو خوش دیکھ ہی نہیں سکتا۔'' رحمہ نفرت وحقارت سے کہہ رہی تھی۔

عشاء اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ ابھی وہ باتیں کر ہی رہی تھیں کہ انہیں اسفند صاحب کے روم میں میٹنگ کے لیے کال کر لیا گیا۔

روم میں داخل ہوتے ہی عشاء کی نظر اس معصوم ومظلوم عورت پر پڑیں۔ وہ شکل سے ہی اس قدر لاچار مفلس لگ رہی تھی کہ ان سب کا دل اس کے لیے ترحم سے بھر گیا۔



''یہ زینب ہیں یہ بھی ان مظلوم خواتین میں سے ایک ہے جو مرد کے ظلم کا شکار ہوئیں۔ اس عورت کی غلطی اتنی بڑی نہیں جتنی بڑی اس کو سزا دی گئی۔ اس کے شوہر نے اس پر بدکرداری کا الزام لگا کر اس پر ٹارچر کیا اسے محلے کی گلیوں میں گھسیٹا گیا اس کے کپڑے پھاڑ دیے گئے اور اسے مارا پیٹا گیا پھر یہ وہاں سے اپنی جان بچا کر بھاگی اور ''فلاح'' پہنچ کر دم لیا۔'' شیریں ان سب کے چہروں کو بغور دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''میڈیا اور پریس کے سامنے کوئی یہ نہیں کہے گا کہ یہ ہمیں پتوکی میں ملی تھی بلکہ ہم یہی کہیں گے کہ یہ خود ہمارے پاس مدد کے لیے آئی تھی۔ ٹھیک ہے نا زینب۔'' اسفند نے اس عورت کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس عورت نے سر اٹھایا نہیں تھا مگر اثبات میں ہلا ضرور دیا تھا۔

''رونا مت...... تم کمزور نہیں ہو...... کوئی عورت کمزور نہیں ہوتی...... ہم تمہارے ساتھ ہیں...... تم فکر نہیں کرو...... تمہارے شوہر کو ایک نہ ایک دن تم سے معافی مانگنی پڑے گی...... شاباش رونا نہیں۔'' ضویا جو اس عورت کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''باجی...... وہ مجھے مار دے گا...... مجھے......'' سہارا ملتے ہی وہ سسک کر بولی۔

''اف...... پھر وہی باجی......'' ضویا اس کی حرکت سے چڑ کر بولی۔

مس ضویا کی اکتاہٹ دیکھ کر اس سنجیدہ صورت حال میں بھی اکثر لوگوں کو ہنسی آ گئی۔

''میڈیا کے سامنے اتنا سا جھوٹ بولنا مبالغہ آرائی نہیں مصلحت ہے اور پھر اگر اس عورت کو اس کا حق دلوانا ہے تو ہمیں اتنا کرنا ہی پڑے گا۔ خیر رحمہ اور عشاء! آپ پلیز زینب کو تھوڑی شاپنگ وغیرہ کروا دیں اور تھوڑا گائیڈ کر دیں کہ میڈیا کے سامنے خود کو کس طرح پیش کرنا ہے۔ ضویا! آپ اس کے بیان کی فوٹو اسٹیٹ کروا کے ایک ایک سارے اسٹاف کو دے دیں تاکہ سب کو اس بے چاری پر ہونے والے ظلم کی خبر ہو سکے۔''

اسفند نے ہدایات دیں۔

☆ ☆ ☆

''میں یہ ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ آج کی عورت کمزور نہیں ہے۔ فردوس نے دوپہر کو نکلنے والے ایک نچلے درجے کے اخبار کی سرخی با آواز بلند پڑھتے ہوئے ستائش بھری نظروں سے اسفند رحیم اور اس کی جانب دیکھا۔

''آج سے پانچ سال قبل ''فلاح'' نامی اس NGO کو بنانے کا خیال فردوس کریم کے زرخیز ذہن کی پیداوار تھا۔ وہ گزشتہ کئی سالوں سے امریکہ میں رہائش پذیر تھی اسی حساب سے اس کی شناسائی امریکن پارلیمنٹ تک تھی جبکہ پاکستان میں اس نے اسفند رحیم جیسے دانا اور زیرک شخص کو اپنا دست راست بنایا تھا۔

اسفند رحیم کی پی آر بھی فردوس کریم سے کم نہیں تھی۔ فردوس کی دلچسپی دیکھ کر اسفند نے مزید اخبارات اس کے سامنے رکھے۔ یہ سب دوپہر اور شام کے وقت نکلنے والے اخبارات تھے جن کا بنیادی مقصد سنسنی پھیلانا تھا۔ اس قسم کے تقریباً سب اخبارات نے ''زینب علی'' کی پریس کانفرنس کو بہت مناسب قسم کی کوریج دی تھی۔

''انگلش نیوز پیپر میں خبر لگ جاتی تو زیادہ اچھا تھا۔ تم جانتے ہی ہو غریب اور مظلوم کو تب تک مدد نہیں ملتی جب تک ''بڑے'' اس کا ساتھ نہ دیں اور ''بڑوں'' کی مدد حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ تمام اچھے انگلش اخبارات بھی اس ''خبر'' کو اچھی کوریج دیں۔'' فردوس نے اخبارات کو میز پر رکھ کر چائے کا مگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''آپ کہہ تو ٹھیک رہے ہیں مگر آپ کو نہیں پتا کہ اس عورت کو دو پرا پر اردو کے فقرے بھی کتنی مشکل سے ازبر کروائے ہیں۔ وہ بہت انوسینٹ اور سادہ ہے۔ ہمارا پلان دراصل یہ تھا کہ اس کی شخصیت کو تھوڑا پالش کر دیں پھر انٹرنیشنل میڈیا کے سامنے لائیں تاکہ مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ ابھی تو وہ اعتماد سے اپنی بات بھی دوسرے تک نہیں پہنچا سکتی۔ بہت جلدی کنفیوز ہو جاتی ہے۔

ایسا نہ ہو کہ وہ بے چاری بات کرتے وقت پزل ہو اور میڈیا اسے جھوٹی قرار دے دے۔ یہ امریکہ نہیں ہے۔ جناب! یہاں جو جتنا سچا ہے اتنا ہی ڈرپوک ہے۔''

اسفند رحیم نے اسنیکس کی پلیٹ اس کے سامنے کرتے ہوئے مودبانہ انداز میں کہا تھا۔ فردوس سر ہلانے لگا گویا وہ اس کی بات سے متفق تھا۔

''ایک بات بتاؤ اسفند! تمہیں وہ کتنی سچی اور کتنی جھوٹی لگتی ہے۔''

بسکٹ کو دانتوں سے کترتے ہوئے فردوس کریم نے اسفند کی آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اسفند رحیم نے اپنے ساتھ بیٹھے وجاہت کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ ایک پرسینٹ بھی جھوٹی نہیں ہے۔ یہ بات میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ جھوٹ کی آمیزش ہم نے کی ہے اور وہ بھی اس لیے کہ اپنی NGO کو پروموٹ کرنے کے لیے ہمیں اس قسم کے جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ اس عورت کی کہانی میں آپ کو سناتا ہوں آپ خود فیصلہ کر لیجئے گا۔'' وہ بہت مضبوط لہجے میں بولا۔

''یہ عورت کوہلا نامی ایک چھوٹے سے گاؤں کی رہنے والی ہے۔ دوسری تمام عورتوں کی طرح اسے بھی کپڑے اور زیورات وغیرہ جیسی چیزوں سے عشق ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ان چیزوں کے حصول کے لیے کوئی غلط کام کرتی ہے یا وہ کوئی بدکردار عورت ہے۔ اس نے ہمیشہ صاف ستھری زندگی گزاری ہے۔ دراصل اس کا تعلق خانہ بدوشوں سے ہے۔ اس کا باپ پیدائشی نشئی تھی۔ یعنی چھوٹی عمر سے سستے قسم کے گھٹیا نشے وغیرہ کرتا تھا اور اس کی ماں بھیک مانگ کر گزارا کرتی تھی کیونکہ وہ کچھ اور نہیں کر سکتی تھی جبکہ اس کی دو بڑی بہنیں اپنا آپ بیچ کر زندگی گذار رہی تھیں۔

چودہ سال کی عمر میں اس کے باپ نے ایک شخص کے ہاتھ اس کو پانچ ہزار میں بیچ ڈالا اور خریدنے والا شخص اس کے شوہر کا چچازاد بھائی تھا۔ ساجد علی نے اپنے چچازاد بھائی سے اس کو خرید کر اس سے شادی کی تھی۔ ابتدا میں ساجد علی کے خاندان نے زینب کو قبول نہیں کیا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ صورت حال بہتر ہوتی چلی گئی۔ ساجد علی نے زینب سے شادی تو کر لی مگر اس کے دل میں شکوک و شبہات جنم لیتے رہتے تھے۔

وہ زینب پر شک کرتا تھا اور مار پیٹ بھی کرتا تھا۔ زینب پھر بھی اس کی مشکور تھی کہ ساجد علی نے اسے



بیوی کا درجہ دیا اور بقول اس کے زندگی کی ہر سہولت دی مگر اس کے بیک گراؤنڈ کی وجہ سے ساجد علی ہمیشہ زینب کے متعلق شکوک کا شکار رہا۔ سونے پر سہاگہ گاؤں کے امام مسجد نے کیا۔ وہ زینب کے شوہر کے کان بھرتا رہتا تھا۔ زینب کا کہنا ہے کہ وہ زینب کو بری نظر سے دیکھتا تھا۔

ان ہی دنوں کوئی پیر صاحب کوہلا میں وارد ہوا۔ وہ ہر مسئلے کے حل کے لیے تعویذ دیتا تھا۔ زینب چاہتی تھی کہ ساجد علی مولوی باقر کے تسلط سے آزادی حاصل کرلے سو وہ بھی پیر صاحب سے تعویذ لے آئی۔ پیر صاحب نے سختی سے منع کیا کہ اس بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہنا ورنہ عمل بیکار ہو جائے گا۔ مولوی باقر نے زینب کو پیر صاحب کے ڈیرے پر جاتے دیکھا تو اس کے شوہر سے شکایت کر دی۔ وہ شقی القلب بیوی سے اس بات کو بنیاد بنا کر خود لڑا اور اس پر ہاتھ بھی اٹھایا۔

اس کے کچھ دن بعد ساجد علی کا چچازاد بھائی ان کے گھر کے قریب سے گذرا تو احمد یعنی زینب اور ساجد کے بیٹے کے رونے کی آواز سن کر گھر کے اندر آ گیا۔ وہ ابھی احمد کے متعلق استفسار کر رہا تھا کہ ساجد علی گھر آ گیا۔ اس نے زینب کو صفائی کا موقع دیے بغیر اسے مارنا شروع کر دیا۔ اس کے کپڑے پھاڑ دیے اور پھر محلے والوں کے سامنے اس پر کلہاڑی کے وار کر کے قتل کرنے لگا تھا مگر یہ وہاں سے بھاگ نکلی اور پھر یہ ہم تک پہنچ گئی۔

یہ باتیں ہم نے اپنے ذرائع سے معلوم کی ہیں۔ یعنی صرف زینب کے کہنے کا بھروسہ نہیں کیا۔ باقی سب تو آپ کے سامنے ہے سر! زینب کا کہنا کہ احمد کو سر میں چوٹ لگ گئی تھی سوائے ساجد علی کے کزن کو گھر بلانا پڑا۔ آپ خود بتایئے سر! کیا اس زمانے میں عورت کو یہ حق بھی نہیں کہ وہ مصیبت میں کسی سے مدد لے سکے۔''

وجاہت نے وہ تمام تفصیلات ان کے گوش گزار کر دیں جو اتنے دنوں میں اس نے جمع کی تھیں۔ اس نے ان عورتوں کے ویوز بھی اکٹھے کیے تھے جو اس واقعہ کے روز وہاں موجود تھیں۔

''یہ سب سن کر کس قدر افسوس ناک لگتا ہے۔'' فردوس صاحب تاسف سے سر ہلاتے ہوئے بولے۔ کمرے میں کافی دیر تک خاموشی چھائی رہی پھر مس شیریں نے اس خاموشی کو توڑا۔

''سر! آپ ذرا فنڈز کی سالانہ رپورٹ بھی چیک کر لیں پھر آپ کو رخشندہ جیلانی صاحبہ کو فون کرنا ہے۔ ہم چاہتے ہیں زینب کے خلع کے سلسلے میں ان ہی کی خدمات حاصل کی جائیں۔''

اوہ یس...... شیور...... مسز رخشندہ جیلانی بہت نائس ہیں۔ وہ ضرور زینب کی مدد کریں گی۔ ویسے کیا زینب خلع لینا بھی چاہتی ہے یا دباؤ میں آ کر ایسا کر رہی ہے۔ فردوس کریم نے ایک اور سوال اٹھایا۔

''دباؤ کیسا......! وہ دل و جان سے تیار ہے۔ ایسے شقی القلب ظالم انسان کے ساتھ کون گزارا کر سکتا ہے۔'' اسفند رحیم نے ذرا کی ذرا چڑ کر کہا۔

فردوس کریم چند لمحے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد مس شیریں کے ساتھ اکاؤنٹس سیکشن کی طرف چلا گیا۔

''ضویا! تم ذرا اس عورت پر زیادہ محنت کرو اس کا بولنے کا اسٹائل تھوڑا امپرود کرو اور سب سے پہلے

اس کو بہتر قسم کے کپڑے اور جوتے دلواؤ۔ اس کی ظاہری شخصیت کو نکھارنا بے حد ضروری ہے تاکہ انگلش اخبارات میں جب اس کی رنگین تصاویر شائع ہوں تو وہ ایک شاندار خاتون دکھائی دے۔'' اسفند نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے اسے ہدایت کی۔

اس کے بعد بہت سی ایسی NGOs جن کا لحاق یورپین یا امریکن NGOs سے تھا' نے وقتاً فوقتاً ان لوگوں سے رابطے کیے تھے۔

ملک کے کئی سماجی رہنماؤں نے بھی فون یا ملاقات کے ذریعے زینب کو مدد کا یقین دلایا تھا۔ وہ ہی عام سی عورت جو شوہر کے ظلم سے عاجز ہو کر گھر سے بھاگی تھی۔ یکدم اس طرح لائم لائٹ میں آئی تھی کہ خود اس کو اپنا آپ پہچاننا مشکل لگنے لگا تھا۔ اس کے پاؤں کے ناخن سے لے کر اس کے بالوں کے رنگ تک ہر چیز تبدیل کر دی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

''زینب ظلم کے خلاف آواز اٹھائے گی۔'' ظہور بھائی نے عشاء کی طرف دیکھتے ہوئے شرارتی انداز میں کسی میگزین میں چھپنے والے آرٹیکل کی سرخی کا حوالہ دیا۔

زینب نامی ایک مظلوم عورت کا قصہ اکثر میگزین میں کور اسٹوری کے طور پر لگنے بہت سے اخبارات میں کثرت سے چھپنے کے باعث ہر خاص و عام کے لیے موضوع بحث بن چکا تھا۔

بہت عرصہ بعد وہ سب لوگ اس طرح سے اکٹھے ہوئے تھے۔ عشاء کی سب سے چھوٹی نند کی منگنی تھی۔ باقی سب لوگ راولپنڈی اور اسلام آباد میں ہی رہائش پذیر تھے اور ہر ویک اینڈ پر ملنا ملانا ہو جاتا تھا۔ جبکہ عشاء اور عادل مہینوں بعد ہی آ پاتے تھے اسی لیے ان کو پروٹوکول بھی زیادہ ملتا تھا۔ منگنی کی رسم سے فراغت پا کر اب سب لاؤنج میں چائے کافی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے باتوں میں مصروف تھے۔

''زینب علی سے تمہاری ملاقات بھی ہوئی ہو گی نا لائیو دیکھنے میں کیسی لگتی ہیں؟'' صبا آپی نے عشاء سے استفسار کیا وہ اس کی بڑی نند تھی۔

''ملاقات......؟ محترمہ لنچ اور ڈنر بھی زینب علی صاحبہ کے ساتھ کرتی ہیں۔'' عادل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

عشاء کو اس کے انداز میں عجب سا طنز محسوس ہوا۔ سسرال میں اس کی ہمیشہ ہی خوب عزت ہوتی تھی۔ منگنی سے پہلے بھی ایک اچھی اسٹوڈنٹ ہونے کی وجہ سے اس کے ماموں جو اس کے سسر بھی تھے اس کو خوب سراہا کرتے تھے۔ عادل کی بات پر اس نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''بتاؤ نا زینب کیسی ہے؟'' میرا مطلب اخبارات میں جتنی کیوٹ اور معصوم سی لگتی ہے۔ حقیقت میں بھی ایسی ہی ہے؟'' صبا آپی کو اس ذکر سے بہت دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

''جی بالکل...... بہت معصوم سی ہے...... باتیں بھی بہت سادہ انداز میں کرتی ہے۔ جب گاؤں سے آئی تھی تب تو بہت بے وقوف سی لگتی تھی۔ کسی بھی چیز کے بارے میں کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ گھڑی سے ٹائم



دیکھنا بھی نہیں آتا تھا اور اب تو اس قدر پالش ہو گئی ہے کہ سب سیکھ گئی ہے۔''

عشاء کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ عادل ہنسنے لگا۔ ظہور بھائی بھی مسکرا رہے تھے۔ ظہور بھائی صبا آپی کے شوہر اور ان کی خالہ کے بیٹے تھے۔

''یعنی اب اسے گھڑی پر ٹائم دیکھنا آ گیا ہے۔ بہت خوب یہ سب سیکھنا تو بہت ضروری تھا۔ انسان کو گھڑی پر ٹائم دیکھنے کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے۔'' عادل نے ایک اور ٹکڑا لگایا اور ساتھ ہی چائے کا کپ لبوں سے لگا لیا۔

عشاء اس کے طنز پر جل بھن گئی۔

''اس قدر فضول بات آپ ہی کر سکتے تھے عادل! ساری دنیا ایک عورت کی ہمدردی میں پاگل ہوئی جا رہی ہے اور آپ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ درست فرما رہے ہیں، آپ، عورت کو کپڑے دھونے برتن اٹھانے لگانے اور بالآخر ایک دن گل سڑ کر مر جانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔'' وہ اتنے تلخ لہجے میں بولی کہ سب خاموش ہو کر حیرانی سے اس کی جانب دیکھنے لگے۔

اگر یہی بات وہ مذاق میں کہتی تو شاید کسی کو محسوس بھی نہ ہوتا مگر اب سب کسی قدر محتاط ہو گئے تھے۔

عادل کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

''نگین کو کمرے سے باہر نکالو بھئی! اس سے کہو شرمانا ورمانا کل پر موقوف کرے اور اب یہاں سب کے درمیان آ کر بیٹھے۔ ہم نے تو کل چلے جانا ہے پھر فون پر کہے گی ظہور بھائی! میرے پاس تو بیٹھے ہی نہیں آپ۔'' ظہور بھائی نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے فوراً بات پلٹ دی جبکہ صبا آپی بھی ان کی بات پر عمل کرنے کے لیے فوراً اٹھیں۔

''ہاں ٹھیک ہے میں اسے لے کر آتی ہوں۔ اس کی ساس نے پانچ ہزار روپے تحفتاً دیے ہیں۔ ہم سب کو آئس کریم کھلوانا اس کا فرض ہے۔'' صبا آپی کے اٹھتے ہی عشاء بھی ''ایکسکیوز می'' کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

''عشاء بھابھی بہت بدل گئی ہے نا؟'' عادل سے کچھ فاصلے پر بیٹھے طلحہ نے نہایت دھیمی آواز میں اپنے ساتھ بیٹھے ارحم سے کہا۔

عادل جو پہلے ہی اندر سے سلگ رہا تھا اس کی بات پر گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ طلحہ نے عشاء کے رویے کے متعلق جو شکایت کی تھی وہی شکایت تو عادل کو بھی اس سے تھی مگر وہ کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا جبکہ عشاء لگنے لگا کہ عادل میل شاؤنزم کا شکار ہے اور اس کی کامیابیوں سے جیلس ہے۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہونے لگے تھے۔ وہی کپل جو پہلے ہی اتنی انڈرسٹینڈنگ کی وجہ سے آئیڈیل کپل کہلاتا تھا۔ یکایک نجانے اس کپل کو کس کی نظر لگتی جا رہی تھی۔ اس روز تو حد ہو گئی۔ نبیل اور فاطمہ بھابھی کی ویڈنگ اینی ورسری تھی۔ عادل پہلے ان لوگوں کی اینی ورسری پر ریسٹورنٹ میں ڈ... دیا کرتا تھا جبکہ اس بار عشاء لاہور میں تھی سو اس نے ان دونوں کو گھر پر انوائٹ کر لیا کیونکہ فاطمہ بھابھی عوامی

مقامات پر زیادہ شوق سے نہیں جاتی تھیں۔

''عادل! آج کل کوئی کسی کو گھر پہ ڈنر یا لنچ پر انوائٹ نہیں کرتا۔ اب وہ پچھلا زمانہ نہیں رہا۔ آپ تو نجانے کیوں اس قدر کنزرویٹو ہوتے جا رہے ہیں۔ کتنا برا لگے گا جب میں ملازمہ کی طرح ان کے آگے برتن رکھوں گی۔'' عشاء نے سنتے ہی سب سے پہلا اعتراض کیا تھا۔ عادل کا موڈ یکدم ہی بگڑ گیا۔

''عشاء تمہارے اتنے نخرے کیوں ہو گئے ہیں۔ تم نے گھر کے کام کاج کو ملازمین کا کام کب سے سمجھنا شروع کر دیا اور ملازمین کیا انسان نہیں ہوتے۔ تم جو ہر وقت مجھے کنزرویٹو ہونے کا طعنہ دیتی ہو میں تمہیں کیا طعنہ دوں؟ تمہیں نہیں لگتا کہ تمہارا دماغ آج کل ساتویں آسمان پر رہنے لگا تھا۔ تمہاری اور میری امی تمہاری اور میری بہنیں یہی کام کرتی آئی ہیں۔ کھانا پکانا سرو کرنا اتنا برا کام نہیں جتنا تم سمجھتی ہو۔ ہماری کلاس کی عورتیں اس کام کو برا نہیں سمجھتیں۔'' وہ خفگی سے بولا۔

''آپ کی کلاس کی عورتیں کچھ بھی نہیں سمجھتیں۔ کیونکہ آپ جیسے مرد انہیں سیل بند پیکٹ میں رکھ کر ان کی ساری عقل چھین لیتے ہیں۔ اور جب عقل ہی نہیں ہو گی تو کوئی سوچے سمجھے گا کیا میں ایسی نہیں ہوں۔ کم از کم میں ایسی کبھی نہیں ہو سکتی۔ مجھے اللہ نے عقل دی ہے اور اچھے برے کی تمیز بھی۔ مجھے پتا ہے کہ میرے کیا حقوق ہیں اور......'' عشاء اس سے زیادہ تلخ لہجے میں بول رہی تھی۔

''اسی چیز نے تو تمہارا دماغ خراب کیا ہے۔ یہ جس اسٹوپڈ جگہ پر تم جاب کر رہی ہو یہ سارے احمقانہ خیالات اسی جاب کا نتیجہ ہیں۔ حد ہو گئی یعنی کہ سب حقوق تو بخوبی از بر ہیں مگر جو فرائض ہیں وہ بھول گئے ہیں۔ یہ جس ''فلاح'' کا نعرہ تم ہر وقت لگاتی ہو نا یہ تمہیں تمہاری ''فلاح'' سے دور کر دے گا۔

یار! صرف اونچی آواز میں چلانے سے حقوق ملا کرتے تو ہمارے اس معاشرے میں سب سے زیادہ حقوق گدھے کو ملتے مگر افسوس...... چہ چہ...... چہ چہ...... ایسا ہوتا نہیں ہے ایسا ہو ہی نہیں سکتا میری ذہین وفطین زوجہ۔''

عادل کے چہرے پر ابھی بھی استہزائیہ مسکراہٹ تھی مگر لہجے کی تلخی کو اس نے جان بوجھ کر کم کر لیا کہ بہرحال آج کا ڈنر کینسل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''تم کچھ بھی مت کرنا فقط ایک اچھا سا ڈریس پہن کر ڈرائنگ روم میں ان کے ساتھ بیٹھ جانا۔ میں ''ولیج'' سے کھانا لاؤں گا ٹیبل لگاؤں گا تم ان کو ڈرائنگ روم سے ڈائننگ روم میں لے آنا۔ بانو کو رات تک روک لینا وہ کچن صاف کر دے گی۔ اتنا تو کر سکتی ہو نا۔ انٹرنیٹ ایج کی ایک لکھی باشعور خاتون یہ کام تو کر سکتی ہے نا! تھینک یو سوچ اب آؤ مینیو ڈسکس کر لیں۔''

عشاء کو خاموش دیکھ کر اس نے مصلحت سے کام لے کر بات ختم کر دی۔ اس وقت تو دونوں خاموش ہو گئے۔ کھانا باہر سے آیا اور عشاء ڈریس اپ ہو کر مہمانوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی۔ شارٹ شرٹ اور ٹراؤزر کے ساتھ عشاء عادل کاٹن کے سادہ انداز میں سلے کڑھائی والے شلوار قمیص اور سلیقے سے اوڑھے گئے دوپٹے میں فاطمہ اور نبیل کے سامنے بیٹھی ماڈرن ایج کی کوئی ماڈل لگ رہی تھی۔



عادل کی خواہش تھی کہ عشاء آج ذرا سادہ ڈریسنگ کر لیتی مگر اس نے اسے ٹوکا نہیں تھا مبادا مزید بحث ہونے لگتی۔ نبیل اور عادل بہت گہرے دوست تھے۔ نبیل کی فیملی بہت روایتی واقع ہوئی تھی۔ اور فاطمہ بھابی کے اوپر بھی مذہب کی گہری چھاپ تھی۔ حالانکہ وہ نومسلم تھیں اور نبیل سے شادی سے پہلے انہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔

''مرد اور عورت برابر ہیں وہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو برتر سمجھتے ہیں۔'' کھانا کھانے کے دوران نبیل کی کسی بات پر عشاء نے کہا تھا۔

''میں نے قرآن میں پڑھا ہے کہ مرد کو عورت پر برتری حاصل ہے اور ان پر نان نفقے کی ذمہ داری ہے۔'' فاطمہ بھابی نے فرائیڈ رائس سے بھرا چمچ منہ میں رکھتے ہوئے اپنے برٹش لہجے کے ساتھ مگر اردو زبان میں بولی تھی۔

''مرد اگر عورت کو فائنانشلی سپورٹ کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ برتر اور عورت کمتر ہے۔'' عشاء نخوت سے ناک چڑھا کر بولی۔

اس کی اونچی آواز پر فاطمہ بھابی نے اس کی جانب دیکھا پھر اپنی پلیٹ پر جھک کر بولیں۔

''ہاں...... پتا نہیں...... آپ ٹھیک کہہ رہی ہوں گی...... ان فیکٹ میں نے قرآن پاک کا ترجمہ پڑھا تھا۔''

''فاطمہ بھابی! یہ ساگ لیجئے نا۔ نبیل بتا رہا تھا آپ کو ساگ پسند ہے۔'' عادل نے فوراً ساگ کا باؤل ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔

''اوہ شیور...... آئی لو دس گرین ڈش۔'' انہوں نے فوراً باؤل لے کر ساگ فرائیڈ رائس کے اوپر انڈیلا۔

''میری بیوی بہت سویٹ ہے۔ ایک بار میں نے کہا تھا کہ مجھے سبز رنگ کی ساری سبزیاں پسند ہیں۔ تب سے پالک ساگ بہت شوق سے کھاتی ہے۔ کہتی ہے اسلام یہی سکھاتا ہے کہ شوہر کے ساتھ تابعداری کی حد تک وفادار رہو۔ یہ وفاداری اور محبت کو ایک ہی معنی پہناتی ہے۔''

نبیل میز پر جھک کر عادل کی طرف دیکھ کر پنجابی میں بولا۔ عادل مسکرا کر رہ گیا۔ نبیل نے مشی گن یونیورسٹی سے MS کیا تھا۔ تب ہی اس کی کلاس فیلو کو اس سے محبت ہو گئی تھی۔ اور یہ محبت شادی کے بعد مزید بڑھ گئی تھی۔

فاطمہ بھابی نے نبیل کے لیے اپنا کیریئر بھی پس پشت ڈال دیا تھا۔ پاکستان آ کر وہ بہت گھریلو قسم کی زندگی گزار رہی تھیں اور اسی میں خوش تھیں۔

''عشاء! آپ کیا کہہ رہی تھیں؟'' فاطمہ بھابی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھیں۔ سو انہوں نے وہی موضوع چھیڑ دیا۔ حالانکہ عادل اسی موضوع سے فرار حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔

''مجھے کیا کہنا ہے فقط یہی کہہ رہی تھی کہ اب زمانہ تبدیل ہو چکا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ آدمی کو

خدا بنا کر پوجا جائے۔ یہ مخلوق اس قابل نہیں ہے۔ یہ آدمی عورت کو جانور سمجھتے ہیں جبکہ جانور یہ خود ہیں۔ انہیں برتر کہہ کہہ کر ہم نے ان لوگوں کے دماغ خراب کیے ہیں۔ میرا خیال ہے اب اس اولڈ فیشن تھیوری کو ختم کر دیا جانا چاہیے۔''

چکن پیس کو کانٹے کی مدد سے کاٹ کر کھاتے ہوئے عشاء کے منہ سے لفظ نہیں گویا شعلے نکل رہے تھے۔ عادل نے اسے گھور کر دیکھا۔ یہ وہ عشاء نہیں تھی صرف چار ماہ ایک جگہ جاب کرنے سے وہ عشاء نہیں رہی تھی۔ کچھ اور بن چکی تھی۔ اس کی بات پر فاطمہ بھابھی نے چمچہ پلیٹ میں رکھ کر اس کی جانب دیکھنا شروع کر دیا۔

''آئی ایم سوری عیشہ!'' وہ ''عشاء'' کو عیشہ کہا کرتی تھیں۔ ''میں زیادہ تو نہیں جانتی بٹ جتنا بھی میں نے پڑھا ہے...... قرآن اور حدیث سے جو سیکھا ہے وہ یہ سب نہیں ہے۔ اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ عورت کا بہت رتبہ ہے جیسے مرد کی ریسپیکٹ لازم ہے ویسے ہی عورت کی ریسپیکٹ کرنا مرد پر لازم ہے۔ معاشرہ اسی طرح متوازن ہوتا ہے مگر اسلام یہ نہیں کہتا ہے کہ عورت کی ذمہ داریاں مرد کی ذمہ داریوں سے مختلف ہیں۔''

عدیل اور نبیل بھی ان دونوں خواتین کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

''ساری دنیا میں یہی ہوتا ہے جو زیادہ ذمہ داری نبھاتا ہے اس کو زیادہ **Regard** ملتا ہے۔ مرد کی ذمہ داریاں عورت سے تھوڑی سی زیادہ ہیں۔ اسی لیے مرد کو عورت سے برتر کہا گیا ہے کہ وہ زیادہ ذمہ داری نبھاتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ مرد عورتوں پر قوام ہیں مگر یہ برتری فخر کے زمرے میں نہیں آتی اور میں نے اپنے گھر میں اور ارد گرد ایسا دیکھا بھی نہیں ہے۔

نبیل میری ریسپیکٹ کرتے ہیں۔ اپنے ہر فیصلے میں مجھے شریک کرتے ہیں۔ میری مرضی کو اپنی مرضی پر مقدم خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح انکل اور شرجیل بھی مجھے بہت اہمیت دیتے ہیں۔ مجھے تو کبھی یہ فیل (محسوس) نہیں ہوا کہ ہمارے معاشرے میں مرد عورت کو دبا کر رکھتے ہیں۔ میری دو سسٹران لا (نندیں) ہیں۔ ان کے گھروں میں بھی سب مرد بہت سلجھے ہوئے ہیں۔ اسلامی ویلیوز (اقدار) نے ان کو سکھایا ہے کہ عورت کے ساتھ کس طرح ڈیل کرتے ہیں سو وہ ہم سب خواتین کے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آتے ہیں۔''

ان کے اس لمبے چوڑے اظہار خیال نے عشاء کو اچھا خاصا تلملانے پر مجبور کر دیا تھا۔ بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

''آپ نے بات کا رخ کسی اور طرف موڑ دیا ہے میں ایک عام بات کر رہی تھی۔ ہمارے معاشرے میں اسی طرح ہوتا ہے۔'' وہ اس سے زیادہ کچھ کہہ نہیں پائی

''فلاح'' کے آفس میں بیٹھ کر اظہار خیال کرنا ایک الگ بات تھی کیونکہ وہاں کوئی اس قسم کی باتوں سے اختلاف نہیں کرتا تھا۔ وہاں تقریباً سب لوگ ایک ہی سوچ کے مالک تھے۔

''عیشہ بھابھی! آپ...... نارمل نہیں ہیں۔ آئی ایم سوری۔ میرا مطلب ہے ایسی باتیں کوئی نارمل دماغ نہیں سوچتا۔ یہ تو ابنارمل خیالات ہیں۔ میں تو ایسے نہیں سوچتی۔'' فاطمہ نے بہت جھجکتے ہوئے کہا۔



''بہت خوب یعنی آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ یہ جو اتنے سارے لوگ اس قسم کے آئیڈیاز رکھتے ہیں کیا وہ سب ابنارمل ہیں؟ کیا وہ نارمل نہیں ہیں؟'' عشاء استہزائیہ مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے بولی۔

''جی ہاں۔'' فاطمہ نے دو ٹوک جواب دیا تھا۔

''حقوق تو حقوق ہوتے ہیں ان میں مرد عورت کی تخصیص کہاں سے آ گئی۔ جب ہم بچوں کے حقوق کی بات کرتے ہیں تب تو ہم یہ نہیں کہتے کہ بچے کے الگ حقوق ہیں اور بچی کے الگ حقوق ہیں۔ یا جب ہم بوڑھے لوگوں کے حقوق کو الگ الگ خانے میں نہیں رکھتے عیشہ! میں نے زندگی کا بڑا حصہ امریکہ میں گزارا ہے۔ ظاہر ہے میری پرورش اسی ماحول میں ہوئی۔ میں نے اپنی زندگی کے پچیس سالوں میں کبھی وہاں کسی کو ایسی باتیں کرتے نہیں سنا۔ یہ تو یہاں پاکستان میں ہی ہوتا ہے۔

ایسا لگتا ہے ایک ابنارمل سوچ یہاں کی خواتین میں پیدا کی جا رہی ہے اور معاف کیجیے گا صرف کم عقل خواتین ان باتوں میں آ رہی ہیں۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں یورپ میں ''حقوق نسواں'' کی بے شمار تحریکیں اٹھیں۔

نتیجتاً آج کا یورپ معرض وجود میں آیا۔ امریکہ پر بھی اس کے اثرات ہیں۔ یہ انتہائی غیر فطری ہے۔ اسی قسم کی غیر فطری معاشرہ ہمارے یہاں تشکیل دینے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ یہ مسائل نہیں ہیں کہ کسی بہن کا بھائی اسے اس کی مرضی کے کپڑے نہیں پہننے دیتا یا کسی بچی کا باپ اسے گھر سے نکلنے سے پہلے دوپٹہ اوڑھنے کی تلقین کرتا ہے اور کسی بیوی کا شوہر اسے کچھ لوگوں سے ملنے سے روکتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بہت مختلف قسم مسائل ہیں جن کا ہمیں سامنا ہے۔ ہمارے اہم مسائل کو ثانوی قرار دے کر ہمیں غیر ضروری اور غیر صحت مندانہ سوچ میں الجھایا جا رہا ہے۔

میں یہ نہیں کہتی کہ عورت کو مسائل کا سامنا نہیں یقیناً ہے مگر یہ مسائل نہیں ہیں صرف اچھی سوچ کے فقدان کے باعث پیدا ہونے والی کیا صورت حال ہیں۔ رائی کا پہاڑ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ ایک ماں یعنی ایک عورت اپنے بیٹے کی پرورش اسلامی اصولوں کے مطابق کرنا شروع کر دے تو ایسی صورت حال سے بچا جا سکتا ہے۔ مگر آج کی عورت کم فہمی و کم عقلی کی بنا پر ایسے مشاغل میں خود کو الجھانا زیادہ پسند کرتی ہے جو آؤٹ ڈور ہوتے ہیں جبکہ بچے کی پرورش جیسی مقدس ذمہ داری ان ڈور ہے۔

معاشرہ خراب ہو گا تو اس کا الزام معاشرے کے افراد کی تربیت کرنے والی ہستیوں پر ہی ہو گا۔ اب آپ خود سمجھدار ہیں سمجھ سکتی ہیں کہ معاشرہ اس قدر بگڑ کیوں رہا ہے۔ پورے معاشرے کی بات کیا کرنا آپ ایک گھر کی مثال لے لیجیے۔ باپ کما کر نہیں لائے گا تو گھر میں معاشی مسائل جنم لیں گے۔ جب کہ اگر عورت اپنی ذمہ داریاں نبھانے سے انکار کر دے تو ذہنی جسمانی نفسیاتی روحانی مسائل جنم لیں گے۔ کیا چیز زیادہ نقصان کا باعث بنے گی یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں۔'' فاطمہ بھابھی چند لمحے کو رکیں۔

عادل تو عادل خود نبیل بھی حیران ہو کر فاطمہ کی شکل دیکھنے لگا۔ مجھ سے زیادہ ''لبرل'' کوئی نہیں۔ ''لبرل'' ہوتا کیا ہے؟ براڈ مائنڈڈ ہوتا کیا ہے؟ ہم ان لفظوں کا بہت غلط استعمال کرتے ہیں۔ ان لفظوں میں

بہت وسعت ہے۔ جس انسان کا ذہن وسیع ہے وہی لبرل ہے وہی براڈ مائنڈڈ ہے۔ جانتی ہیں آپ کا پرابلم کیا ہے؟ فطرت سے بغاوت کررہی ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ مرد کو اللہ نے برتر بنادیا تو آپ اسے کمتر قرار دیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس فضول بحث سے نکل کر مل کر کام کیا جائے۔ فرائض کو پہچان لیا جائے تو حقوق کے لیے کبھی جنگ نہیں لڑنا پڑتی۔

روٹی، تعلیم، روزگار رہائش اس قسم کے مسائل کے حل تلاش کرنے کے لیے بحث کی جائے تو کوئی فائدہ بھی ہو۔ افریقہ کے ممالک میں مڈل ایسٹ میں، آسٹریلیا میں، یو ایس اے اور یو کے میں...... ایسی باتیں زیر بحث نہیں لائی جاتیں کیونکہ وہ لوگ پراپر مسائل کو ٹارگٹ بناتے ہیں جبکہ ہم مرد عورت کی لڑائی میں اپنی توانائی برباد کردیتے ہیں۔ ہم ایسی باتیں سوچنے کے بجائے صرف یہ سوچ لیں کہ جو خدا نے کہا وہ بہتر ہے تو یقین کیجئے ہمیں ایسے اسٹوپڈ مسائل میں الجھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

فاطمہ بھابھی اب پانی پی رہی تھیں۔ عشاء کے چہرے کا رنگ سرخ ہو چلا تھا۔ نبیل نے فاطمہ کو روکنے کے لیے آنکھوں سے اشارہ کرنا چاہا تو عادل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ باتیں وہ خود عشاء سے کرنا چاہتا تھا۔ مگر اب ایک عورت کے منہ سے یہ سب سن کر اسے زیادہ اچھا لگا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عشاء کے ذہن سے یہ خناس نکل جائے۔

''میں نے اخبار میں اس عورت کے متعلق پڑھا۔ زینب...... یہی نام تھا اس کا۔ مجھے بہت دکھ ہوا اس کے بارے میں پڑھ کر۔ مجھے بھی اس کے ساتھ ہمدردی ہے لیکن میرے ذہن میں ایک سوال اٹھتا ہے کہ اس عورت نے شوہر کی مرضی کے خلاف ایک نامحرم کو اپنی خلوت میں آنے کی اجازت کیوں دی جبکہ اللہ تعالیٰ ایسی باتوں کو سخت ناپسند فرماتا ہے۔

ایک حدیث شریف میں بھی میں نے یہ پڑھا تھا جس کا مفہوم یہی تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود کسی نے بھی اس عورت کو یہ سمجھانے کی کوشش نہیں کی بی بی! غلطی میں پہل تم نے کی ہے۔ اس کے شوہر نے بھی اگر اس کو قتل کرنے کی کوشش کی تو غلطی کی مگر آپ کی NGO نے اس ایشو کو اس قدر میڈیا کوریج دلوائی کہ اب چاہتے ہوئے بھی اس عورت کو سمجھایا نہیں جاسکتا۔ وہ کبھی اپنے شوہر کے ساتھ مصالحت پر راضی نہیں ہوگی۔ حالانکہ سب سے پہلے ان کے درمیان مصالحت کی کوشش ہی کی جانی چاہیے تھی۔

اب کیا ہوگا اس عورت کا کیا کریں گے آپ؟ ہر ایک کو تو امریکن اور کینیڈین ایمبیسی ویزا دینے سے رہی۔ آپ لوگوں نے اس عورت کو ایک ایسی دنیا میں لا کھڑا کیا ہے۔ جہاں بہت چکا چوند ہے۔ یہ عورت اب اپنی دنیا میں واپس چلی بھی گئی تو کیا یہ ان حالات میں جی پائے گی جن میں پہلے جیتی آئی تھی۔

آپ کی NGO نے اس عورت کا فقط استعمال کیا ہے تا کہ آپ بھی اپنی NGO کے لیے حکومت سے زیادہ سے زیادہ گرانٹ حاصل کرسکیں۔ یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ حکومت جب کسی ایک ضرورت مند کی دادرسی کرتی ہے تو ایسے جھوٹے سچے مزید کیسز سامنے آجاتے ہیں۔ میں نے پبلک ایڈمنسٹریشن میں ڈگری لی ہے۔ میں نے اس فیلڈ میں ریسرچ ورک کی حد تک کام کیا ہے مگر وہاں امریکہ میں ایسا تو کبھی نہیں ہوتا۔ وہاں



ضرورت مند کی مدد اس طرح سے نہیں کی جاتی کہ پہلے اس کا تماشا بنا دیا جائے اور پھر اس کو مدد دی جائے لیکن اس کے باوجود وہ معاشرہ بھی صحت مند معاشرہ نہیں کہلاسکتا۔

وہاں جس قسم کی آلائشیں پائی جاتی ہیں یہاں کی عورتیں سن لیں تو پھر ایسی باتوں پر کبھی احتجاج نہ کریں کہ ان کے مرد ان کی مرغی کی طرح حفاظت کرتے ہیں اور ان کی صلاحیتوں کو دباتے ہیں۔'' فاطمہ بھابھی نے بات ختم کرتے ہوئے دائیں ہاتھ کی طرف پڑے لبالب بھرے پانی کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگالیا۔

چند لمحے سب خاموشی سے اپنی اپنی پلیٹ کی جانب تکتے رہے پھر عشاء نے خاموشی توڑ دی تھی۔

''آپ تو بہت اچھی تقریر کرسکتی ہیں۔ کسی فورم میں اظہار خیال کرتیں تو یقیناً بہت ستائش ملتی اب تو خیر صرف یہ دونوں مرد حضرات ہی سراہ سکتے ہیں کیونکہ آپ ان کی حمایت میں ہی بولی ہیں۔ مجھے تو آپ کی باتوں میں کوئی صداقت نظر نہیں آئی میں سب کلئیر کرسکتی ہوں مگر...... کھانا ٹھنڈا ہورہا ہے۔'' اس کا لہجہ سخت نہیں تھا مگر پھر بھی اس کے چہرے سے اس کی خفگی کا اندازہ ہورہا تھا۔

فاطمہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''مائی گاڈ...... میں بہت احمق ہوں...... آپ کو شاید برا لگا...... میں اپنی دھن میں بولتی چلی گئی۔ مجھے خیال کرنا چاہیے تھا...... ان فیکٹ میں نے پڑھا تھا کہ ایک مسلمان اگر کوئی اچھی بات سیکھے تو اسے دوسرے مسلمان سے شئیر کرنا چاہیے اور حق بات کہنے سے ڈرنا نہیں چاہیے۔''

''ارے نہیں...... نو پرابلم...... ہم سب کا اپنا اپنا پوائنٹ آف ویو ہوتا ہے۔ میں نے مائنڈ نہیں کیا...... آپ پلیز یہ مکس سبزی لیجئے...... بہت اچھی ہے۔'' عشاء نے چہرے کے تاثرات بحال کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

کھانا بہرحال کھالیا گیا۔ کھانے کے بعد آئس کریم بھی تھی۔ فاطمہ کے عشاء کی نماز پڑھنے پر بھی عشاء نے ذرا کی ذرا ناک چڑھائی۔

''مجھے ایسے نئے نئے مسلمانوں سے سخت نفرت ہے۔ ہم تو بچپن سے مسلمان ہیں۔ انہوں نے ابھی اسلام قبول کیا ہے تب ہی اس قسم کی باتیں کرتی ہیں۔ ہر بات میں ٹوکنا تو جیسے ان کی عادت ہے۔ جب بھی فراغت ملتی ہے دوپٹہ اوڑھ کر خطبہ دینے لگتی ہیں۔ اونہہ...... یہ وہی فاطمہ صاحبہ ہیں جو ہاف شرٹ اور ٹائٹس میں ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھی رہتی تھیں اور ان کی ساس دیکھ دیکھ کر کڑھا کرتی تھیں کہ ان کے ہونہار بیٹے کو چڑیل نے پھنسالیا۔''

رات کو بیڈروم میں ہاتھوں پر کریم کا مساج کرتے ہوئے اس نے کھولتے ہوئے عادل سے کہا۔

بظاہر عادل ٹی وی دیکھنے میں مگن تھا مگر اس کے اندر بھی ایک عجب کشمکش چل رہی تھی۔ فاطمہ بھابھی کی لمبی چوڑی تقریر نے سوچ کے کتنے در وا کردیے تھے۔

''اور مزے کی بات سنیے۔'' عشاء نے اٹھتے ہوئے کہا۔ عادل نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ سادہ سے حلیے میں کتنی اچھی لگ رہی تھی یہ کوئی اس سے پوچھتا۔ اس نے عشاء سے پہلے محبت کی

تھی اور بعد میں شادی......شادی کے بعد بھی اس کی محبت میں کمی نہیں آئی تھی۔ مگر گزشتہ کچھ دنوں سے عشاء جس طرح بدلتی جا رہی تھی عادل کو اس کے رویے سے الجھن ہونے لگی تھی۔

''یہ فاطمہ بھابھی پاگل ہیں۔ چائے کپ میں انڈیلتے ہوئے تھوڑی سی چائے چھلک گئی۔ میں نے عادت کے مطابق کہا۔ فٹے منہ تمہارا عشاء! تو کہنے لگیں ایسے مت کہا کریں عیشہ! گناہ ہوتا ہے۔ آپ کا نام نماز کے نام پر ہے۔ آپ کو چاہیے ''عشاء'' کی بجائے خود کو ''عیشہ'' کہا کریں تا کہ اگر کبھی غلطی ہو جائے تو گناہ نہ ہو۔''

عشاء ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ جبکہ عادل خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں پایا کہ۔

''عشاء! پاگل تم ہو فاطمہ بھابھی نہیں۔''

☆ ☆ ☆

''عادل بھائی! مائنڈ مت کیجئے گا مگر مجھے لگتا ہے عیشہ بھابھی کے ساتھ کوئی نفسیاتی پرابلم ہے۔ ان کے اندر مثبت سوچ کی سخت کمی ہے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے گھر کے مرد حضرات بہت سخت گیر تھے۔ یعنی ان کے بھائی یا فادر...... ہوسکتا ہے ان کی مدر نے ان کی پرورش میں کوتاہی کی ہو کہ ان کے اندر یہ خلا پیدا ہو گیا ہے۔ برا مت مانیے گا مگر آپ کا سخت رویہ بھی ان کی اس قسم کی سوچ کا باعث ہو سکتا ہے۔ وہ کچھ عجیب عجیب باتیں کرتی ہیں۔ ایک نارمل سوچ رکھنے والی خاتون ایسی گفتگو نہیں کر سکتی۔ میں نے اسی لیے آپ کو فون کیا تھا کہ آپ انہیں اس جمعرات کو ہمارے گھر لائیے۔ آنٹی (نبیل کی امی) ہر اسلامی مہینے کی پہلی کی پہلی جمعرات کو درس دیتی ہیں۔ عیشہ! بھابھی کی سوچ میں اگر ان کے درس سے کوئی تبدیلی آسکے تو یقین کیجئے مجھے دلی خوشی ہوگی۔'' فاطمہ بھابھی کی بات اسے مزید پریشان کر گئی۔

''میں آپ کو کیسے بتاؤں فاطمہ بھابھی! کہ عشاء صاحبہ کے فادر اور بھائی کتنے اچھے انسان ہیں۔ اور ان کی امی کی فہم فراست کی تو ان کے دشمن بھی مثال دیتے ہیں۔'' عادل نے یہ بات خود سے کہی تھی۔ ایسی باتیں وہ کسی اور سے کیسے کہہ سکتا تھا۔ ویسے بھی اسے اپنے ذاتی معاملات کسی سے ڈسکس کرنے کی عادت نہیں تھی۔ اس کے سر میں شدید درد ہونے لگا تھا۔ نجانے کیوں آج کل سر درد زیادہ ہی رہنے لگا تھا۔ اس نے آفس سے آدھے دن کی چھٹی لی اور ڈاکٹر سجاد کے آئی کلینک جانے کے لیے آفس سے نکل آیا۔

''آئی سائٹ تو تمہاری بالکل ٹھیک ہے ایک دم پرفیکٹ۔'' ڈاکٹر سجاد نے مکمل چیک اپ کے بعد اس کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ عادل اس کے انداز پر ذرا کی ذرا مسکرایا۔

''تو پھر میرے سر میں اس قدر درد کیوں ہوتا ہے۔ یار!'' اس نے کنپٹی کو انگلیوں سے دباتے ہوئے سوال کیا۔

''بلڈ پریشر تو ہائی نہیں ہے؟'' ڈاکٹر نے اس کے بازو کے گرد اپریٹس کا فلیپ چڑھاتے ہوئے کہا۔ عادل نے ہونٹ بھینچ کر لاعلمی کا اظہار کیا۔



''سارا دن ہی سر میں درد رہتا ہے۔ رات کو تکیے پر سر رکھتا ہوں تو لگتا ہے جیسے کسی سخت چیز پر سر رکھ دیا ہو۔ حالانکہ نیند پوری لیتا ہوں۔ مگر نجانے کیوں صبح اٹھتا ہوں تو نا صرف سر بھاری ہو رہا ہوتا ہے۔ بلکہ آنکھیں بھی سوجی ہوئی ہوتی ہیں۔ میں نے سوچا شاید آئی سائٹ ویک ہے اسی لیے چیک اپ کے لیے تمہارے پاس آ گیا۔'' عادل دائیں آنکھ کو مسلتے ہوئے مزید تفصیل سے بتا رہا تھا۔

سجاد سے اس کے پرانے مراسم تھے۔ سجاد اور عادل پڑھائی کے سلسلے میں کافی عرصہ ایک ہی کمرہ شیئر کرتے رہے تھے۔

''آج کل آفس میں زیادہ کام ہے کیا......؟ یا پھر خدانخواستہ کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟'' سجاد نے اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں نہیں یار! شکر ہے اللہ کا، سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ بس شاید موسم کی تبدیلی کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔ برسات کے دنوں میں میرا حشر خراب ہو ہی جایا کرتا ہے۔'' عادل فوراً بولا۔ سجاد نے اسے کڑی نگاہوں سے گھورا۔

''یہ برسات کے دن ہیں......؟ بھائی میرے برسات ختم ہوئے بھی عرصہ ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر سے کوئی بات نہیں چھپا سکتے تم...... سچ بتاؤ کوئی مالی پریشانی تو نہیں ہے نا؟'' سجاد نے دوستانہ استحقاق سے پوچھا۔

عادل اس کے انداز پر کھل کر مسکرایا۔

''نہیں یار! کہا نا رب کی مہربانی ہے۔ میری جاب بہت شاندار ہے کم از کم تیری ڈاکٹری سے زیادہ روپے کما لیتا ہوں۔ تو میری فکر مت کر بس مجھے اچھی سی میڈیسن لکھ دے تا کہ اس سر درد سے نجات ملے۔'' عادل بے تکلفی سے بولا۔

''بلڈ پریشر بزرگو! ہائی ہے آپ کا۔ اس کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک ٹیبلٹ لکھ دیتا ہوں۔ اور ساتھ ملٹی وٹامنز دے رہا ہوں۔ ڈائٹ پر اپر لو اور ہاں چالیس سال کے بعد تم جیسے سب بڈھوں کو مارننگ واک شروع کر دینی چاہیے اور تم تو اکتالیس سال کے ہو چکے ہو سو میرا مشورہ ہے کہ واک کے لیے جایا کرو۔''

سجاد نے رائٹنگ پیڈ پر تیزی سے قلم چلاتے ہوئے مشورہ دیا۔ عادل کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

''ہائی داوے تم نے واک شروع کر دی۔ تم تو مجھ سے پہلے کی پیداوار ہو'' اس نے سجاد کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ مزاج خوشگوار ہو چلا تھا۔

''یہ بات تو تم مجھے پہلے بھی جتاتے رہے ہو۔ یاد ہے جب ہم اکٹھے رہا کرتے تھے اور اکٹھے ہی بس اسٹاپ تک جایا کرتے تھے۔ تب بھی تم اس گھٹیا فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھ سے پہلے تھک جاتے اور بس اسٹاپ تک پیدل چل کر جانے میں تمہارا حشر خراب ہو جاتا تھا۔ تم تب بھی یہ بات تسلیم نہیں کرتے تھے کہ تم مجھ سے عمر میں دس بارہ سال بڑے ہو۔ حالانکہ اس زمانے میں بھی ہر آنٹی ٹائپ خاتون تم پر عاشق ہو جایا کرتی تھی۔'' سجاد نے ماضی کی یاد دلاتے ہوئے اسے چھیڑا۔

''ہاں تو بچپن سے ہی کیوٹ تھا۔ پہلی نظر میں ہی سب کا دل موہ لیا کرتا تھا۔'' عادل کہاں چوکنے

والوں میں سے تھا۔ سجاد کی بات کے جواب میں اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یار! تم نے مجھے ماضی کی یاد دلا کر نوسٹلیجک کر دیا ہے۔ اب یہ لازم ہے کہ ہم ایک ساتھ چائے یا کھانا وغیرہ کھائیں اور ان پرانے دنوں کی یاد تازہ کریں۔'' سجاد مسکراتے ہوئے بولا۔

''اوکے شیور...... اب تو میرا بھی دل کر رہا ہے وہ سب پرانی باتیں یاد کرنے کو...... تم کلینک سے فارغ ہو جاؤ پھر چلتے ہیں کہیں۔'' عادل نے فوراً فیصلہ کیا۔

''چل ٹھیک ہے۔ بس یہ آخری مریض چیک کر لوں پھر چلتے ہیں اور ہاں مجھے ''میڈیم بتول'' والا قصہ بھی سنانا ہے۔ یاد ہے کتنے پاگل رہا کرتے تھے تم میڈم بتول کے عشق میں۔'' سجاد نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔ عادل کو پھر ہنسی آ گئی۔

''پاگل میں رہا کرتا تھا مگر لفٹ وہ تمہیں کرواتی تھی۔'' سجاد قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

اسی اثناء میں وہ آخری مریض کے لیے بیل بجا چکا تھا۔ ایک ملگجے سے شلوار قمیص میں ملبوس دیہاتی خدوخال کا آدمی اندر داخل ہوا۔ اس نے گود میں ایک کمزور سا بچہ اٹھا رکھا تھا۔ عادل سجاد کی میز کے قریب پڑی کرسی سے اٹھ کر دوسری سمت میں پڑے صوفے پر جا بیٹھا۔ صوفے کے سامنے ایک چھوٹی سی میز پڑی تھی۔ جس پر کچھ اخبارات اور میگزینز وغیرہ تھے۔ عادل نے ایک اخبار اٹھا کر دیکھنا شروع کر دیا۔

''تسی اپنے بچے نوں زہر دے کر مار دو۔'' سجاد کی تلخ آواز پر عادل نے اخبار سے نظریں ہٹا کر اس طرف دیکھا۔ چیک اپ اس آدمی کا نہیں بلکہ بچے کا ہو رہا تھا۔

''یعنی حد ہو گئی جہالت کی۔ بچے کی آنکھ تباہ کر کے رکھ دی ہے۔ اتنی بڑی نعمت ہے یہ بینائی آپ نے اسے مذاق سمجھا ہے۔ بائی داوے آپ کا ہی بچہ ہے یا کوئی دے گیا تھا۔'' سجاد کا لہجہ تلخ تر ہوتا جا رہا تھا۔

وہ دیہاتی شخص منمنا کر کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر سجاد اس کی کوئی بات سننے پر تیار نہیں تھا۔

''آپ وہاں جا کر بیٹھ جائیے پلیز'' وہ شخص سجاد کے لہجے سے خائف ہو کر عادل کے قریب پڑی کرسی پر آ بیٹھا۔

عادل نے بچے کی جانب دیکھا۔ انتہائی کمزور گندمی سی رنگت والا بچہ گندے حلیے میں تھا۔ اس کے جسم پر جو کپڑے تھے وہ کبھی سفید رہے ہوں گے مگر اب وہ سرمئی رنگ کے ہو چکے تھے۔ اس کی ایک آنکھ بہت زیادہ سوجی ہوئی تھی بلکہ آنکھ کا حصہ باہر کو لٹکا ہوا لگ رہا تھا۔ آنکھ کے اردگرد شاید پیپ رسنے کے باعث کچھ زرد سا مواد چپکا تھا۔

بچے کی آنکھ کی طرف دیکھ کر عجیب کراہیت کا احساس ہو رہا تھا۔ سجاد نے بیل بجا کر میل اٹینڈنٹ کو اندر بلایا اور بچے کی آنکھ کی بینڈیج کرنے لگا۔ عادل نے رسٹ واچ کی جانب دیکھا پھر ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر پاس پڑا میگزین اٹھا لیا۔ چند صفحات دیکھ کر ہی اس نے میگزین دوبارہ میز پر رکھ دیا۔ ''زینب علی'' کا انٹرویو تصاویر کے ساتھ درمیانی صفحات پر جگمگا رہا تھا۔ عادل نے میگزین میز پر رکھا سامنے وہی صفحات نکل آئے تھے۔ وہ دیہاتی شخص آگے ہو کر میز کی طرف جھکتے ہوئے ان ہی صفحات کو غور سے دیکھنے لگا اور کافی دیر تک دیکھتا چلا گیا۔



عادل کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے۔'' اس نے دل ہی دل میں اس شخص کی محویت دیکھ کر سوچا۔ اسی اثناء میں اس کے موبائل کی بیپ بجنے لگی۔

بے دھیانی میں بھی اس کا دھیان اس شخص کی طرف تھا جبکہ بظاہر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ فون سننے میں مگن ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس شخص نے وہ میگزین ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس کے انداز کچھ عجیب سے تھے۔ عادل اپنی جگہ سے اٹھ کر دور کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا مگر دیکھ پھر بھی وہ اس دیہاتی کی طرف ہی رہا تھا۔

اس شخص نے پہلے سجاد کی طرف دیکھا پھر عادل کی طرف۔ عادل فوراً باہر دیکھنے لگا۔ اس شخص نے وہ میگزین فولڈ کیا اور اپنی قمیص کے نیچے شلوار کے نیفے میں اڑس لیا۔ عادل کسی قدر حیران ہوا مگر اس نے اس شخص کو ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس شخص کو اندازہ بھی نہیں ہوا کہ موبائل فون پر بات کرتا ''صاحب'' اس کو دیکھ رہا ہے۔

''ساجد صاحب! ادھر تشریف لائیے۔'' ڈاکٹر سجاد نے طنزیہ انداز میں اس شخص کو مخاطب کیا۔ وہ کندھے پر پڑے میلے سے رومال سے چہرہ صاف کرتے ہوئے اس کی سمت بڑھتا چلا گیا۔ عادل کو فون پر آفس کال کیا گیا تھا۔ وہ سجاد سے معذرت کر کے باہر آ گیا۔

کلینک کے باہر ایک بڑی سی لیبارٹری اور میڈیکل اسٹور تھا۔ اس کے بعد مختصر سا پارکنگ ایریا تھا۔ عادل اسی پارکنگ ایریا میں آ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے پھر ایک فون آ گیا۔ اس نے موبائل کان سے لگایا اور سننے لگا۔ اس دوران وہی شخص اپنے بچے کو گود میں لیے کلینک سے باہر نکلتا نظر آ رہا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ پارکنگ میں کھڑا ایک شخص اس کی جانب دیکھ رہا ہے۔ وہ شخص پارکنگ کی سمت آیا اور ایک کونے میں چلا گیا جہاں ایک گٹھری سی پڑی تھی۔ اس نے وہ گٹھری اٹھائی تو میگزین زمین پر گر پڑا۔

''یہ دیکھ احمد...... تیری ماں کی تصویر چھپی ہے...... دیکھ اس بدذات عورت کو...... یہ اب تیری ماں نہیں رہی...... یہ کسی کی ماں نہیں ہے۔''

وہ شخص میگزین نکال کر وہی تصاویر اپنے بچے کو دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ عادل ہکا بکا ہو کر اس شخص کو اور کبھی میگزین میں چھپی زینب علی کی تصاویر کو دیکھ رہا تھا۔ موبائل ابھی بھی اس کے کان سے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ دن اس کی زندگی کا بدترین دن تھا۔ احمد کی طبیعت بہتر نہیں تھی۔ کھیتوں میں پہنچ کر بھی اس کا دھیان احمد کی طرف رہا۔ سورج سوا نیزے پر تھا جب اسے ہل چلانے سے فرصت ملی۔ اس نے احمد کی طبیعت کے پیش نظر زینب کو گڑ کی کھیر پکانے کی خصوصی تاکید کی تھی۔ اس نے سوچا آج جلدی گھر چلا جائے تاکہ احمد کو بھی دیکھ کر تسلی کر لے اور کھانا بھی کھا لے سو وہ منشی سے خصوصی اجازت لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔

راستے میں اس نے اپنے چچا زاد بھائی کو کلف لگے شلوار قمیص میں کہیں جاتے دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے تھا اس لیے اس کے کزن کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی۔ وہ سر جھٹک کر اپنے رستے پر چلتا رہا۔ اس نے رفتار جان بوجھ کر کم کر لی تاکہ خالد بٹ سے سامنا ہونے کا امکان ہی نہ رہے۔ اسے خالد بٹ سے سخت نفرت تھی۔

اگرچہ خالد بٹ کی وجہ سے ہی اسے زینب جیسی بیوی ملی تھی مگر پھر بھی خالد بٹ کی بری عادات کے باعث وہ اسے سخت ناپسند کرتا تھا۔

وہ مخصوص رفتار سے چلتا جب اپنے گھر کی سمت مڑا تو اس نے خالد بٹ کو بھی اسی سمت جاتے دیکھا۔ اسے قدرے حیرت ہوئی مگر وہ برداشت کرتے ہوئے ذرا کی ذرا مزید پیچھے ہوگیا تاکہ خالد بٹ کی نظر اس پر نہ پڑ سکے۔ اگلا منظر اس کے لیے زیادہ حیران کن تھا۔ خالد بٹ اس کے گھر کا پچھلا دروازہ بجا رہا تھا۔ ساجد اپنی حیرت پر قابو پا کر مزید پیچھے ہٹ گیا۔ اور جب اس نے خالد کو گھر کے اندر جاتے دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''یہ کمینہ میرے گھر کیوں گیا ہے؟'' اس نے باآواز بلند خود سے کہا تھا۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا سامنے کے حصے کی طرف گیا اور دروازہ بجانا چاہا۔ نجانے وہ کون سی طاقت تھی جس نے اسے دروازہ بجانے سے روک دیا۔ وہ چند لمحے دروازے کے باہر کھڑا صورت حال پر غور کرتا رہا۔

اسے زینب پر یقین تھا اس کے باوجود دروازے کے بجائے دیوار پھاند کر بہت آہستگی سے اندر کود گیا۔ سامنے کے صحن اور پیچھے کے صحن میں خاصا فاصلہ تھا ساجد بے پاؤں چلتا اس دروازے کے پیچھے جا کر کھڑا ہوگیا جہاں سے پچھلا دروازہ صاف نظر آتا تھا اور ایک کونے میں بنے کمرے میں بھی نظر پڑتی تھی۔

زینب کا پریشان چہرہ بھی اسے نظر آ رہا تھا۔ مگر اس پریشانی میں خوف تھا حیرت نہیں تھی۔ یعنی زینب اس شخص کو گھر کے اندر اپنی مرضی سے لائی تھی اور اس کی موجودگی سے متحیر نہیں تھی۔

''تم...... اس وقت...... یہاں کیوں آئے ہو؟'' زینب کی آواز نے ساجد کو حیران کر دیا تھا۔

''اس وقت...... مطلب...... اس کے آنے کا وقت مقرر ہے۔'' ساجد نے حیرت سے سوچا۔ مولوی باقر نے اسے زینب سے متعلق کچھ پریشان کن باتیں بتائی تھیں مگر اسے ان باتوں پر یقین نہیں تھا۔

''بلے بھئی بلے...... اتنے نخرے...... وہ بھی میرے سامنے۔'' خالد بٹ کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

''تم...... یہاں کیا کرنے آئے ہو؟'' زینب کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

''ارے واہ...... جب تم ہمارے پاس آتی ہو تو ہم تو ایسے سوال نہیں کرتے۔'' خالد بٹ کے اس جملے نے ساجد کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔

''زینب...... اس کے پاس...... کیا کرنے جاتی ہے...... اور کیوں؟'' ساجد نے سن ہوتے ہوئے دماغ کے ساتھ سوچا۔ اس نے خالد بٹ کو زینب کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دیکھا پھر وہ اس کی کمر میں بازو ڈال کر اندر والے کمرے کی سمت چل دیا۔

''میرا آدمی بہت غصے والا ہے...... اسے اتنی جلدی غصہ آتا ہے کہ شاید کسی کو اتنی جلدی سانس بھی نہیں آتا ہوگا...... اسے خبر ہوگئی تو وہ میری گردن کاٹ دے گا...... میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔'' اس نے زینب کی آواز سنی۔ اب وہ انہیں دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ مگر ان کی آوازیں بخوبی اس تک پہنچ رہی تھی۔



''ارے جاؤ جاؤ...... تمہارا آدمی...... اونہہ...... میں اسے جانتا نہیں ہوں کیا؟ مجھے کس سے ڈرانے کی کوشش کر رہی ہے؟ میں نہیں اس سے ڈرتا ورتا۔'' خالد بٹ کی شوخ آواز سنائی دی۔ ساجد کے ماتھے کی رگیں غصے کے مارے نمایاں ہونے لگی تھیں۔

''تم سمجھتے کیوں نہیں ہو...... ساجد آ جائے گا۔'' زینب کی پریشان کن آواز سنائی دی۔ خالد بٹ کھل کر ہنسا تھا۔

''ارے میری شہزادی اتنا ڈرتی ہو اپنے اس سنڈی جتنے ساجی سے۔ ایک پھونک کی مار ہے مت ڈر اس سے یہاں میرے پاس آ کر بیٹھ۔'' ساجد بہت آہستگی سے احاطے میں داخل ہو کر مرغی کے ڈربے کے پیچھے چھپ گیا۔

یہاں سے کمرے کا منظر کافی واضح تھا۔ خالد بٹ کمرے میں بچھی واحد چارپائی پر نیم دراز تھا اسی اثناء میں زینب لپک کر اس کے قریب گئی اور اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''رب کا واسطہ ہے۔ کیوں مجھے تنگ کرتے ہو تمہیں کیا پتا یہاں کیا کیا نہیں ہوا۔ میں نے بڑی مشکل سے بات سنبھالی تھی ورنہ ساجی کو تو اس مولوی نے بھڑکا دیا تھا۔ وہ میرے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ میں ہمت کر کے اسے نہ سنبھالتی تو آج تم مجھے یہاں دیکھنے کے بجائے وڈے قبرستان میں دیکھتے توبہ توبہ...... تم ساجی کی شکل دیکھتے تو ساری مستی بھول جاتے۔ میں بس کہہ رہی ہوں تم سے...... یہاں سے چلے جاؤ۔''

زینب کی منت بھری آواز سنائی دی۔ خالد بٹ کے چہرے کی مسکراہٹ بڑھ رہی تھی۔

''یہ دیکھو میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ چلے جاؤ نا۔'' ساجد نے اپنی بیوی کو اپنے دشمن کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے دیکھا پھر خالد بٹ نے اس کے ہاتھوں کو پکڑ لیا تھا۔

''ہاں ہاں چلا جاتا ہوں میں واپس جانے کے ارادے سے ہی یہاں آتا ہوں۔ یہ تو تیرے ''ساجی'' کا گھر ہے بھئی! میں یہاں کیسے رہ سکتا ہوں تو مجھے رہنے کب دے گی یہاں کبھی میرے گھر آنا تجھے بھی ایسے بے عزت کر کے نہیں نکالوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تجھ سے۔''

وہ کسی فلمی ہیرو کی طرح بول رہا تھا اس کے بعد کافی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

''میں جا رہا ہوں مگر میں پھر ضرور آؤں گا...... تو مجھے آنے سے روک نہیں سکتی...... بتا روک سکتی ہے......؟ بتا......؟ بول......؟ وہ چارپائی سے اٹھ کر اس کے مقابل آ کر بولا۔

''ذلیل عورت! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ غصے سے بھر کر کمرے کے اندر داخل ہوا تھا۔

زینب اور خالد بٹ اس ناگہانی آفت سے گھبرا کر یکدم چونکے تھے۔ ساجد نے اندر آتے ہی زینب کے بازو کھینچ کر اسے پیچھے کی طرف دھکیلا تھا۔ اس کے سر پر خون سوار تھا۔ اس نے خالد بٹ کا گریبان پکڑنا چاہا مگر وہ جھک کر صاف بچ نکلا اور زینب کو دھکا دے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ ساجد اس کے پیچھے تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ اس پر قابو پاتا خالد نے چارپائی پر لیٹے احمد کو گود میں اٹھا لیا۔

''اگر تو نے ایک قدم آگے بڑھایا تو...... میں اس چھچھڑے کو جلتے ہوئے تندور میں پھینک دوں گا۔''

وہ پھنکار کر دھمکی دینے والے انداز میں بولا۔ ساجد کے قدم وہیں رک گئے۔

"میرے بیٹے کو چھوڑ دے میں......" وہ چلایا مگر خالد نے اس کی بات کاٹ دی۔

"چھوڑ دوں گا تیرے بیٹے کو...... پہلے سکون میں آ...... اندر بیٹھ کر میری بات سن۔" خالد چلا کر بولا۔

ساجد غصے میں آگ بگولا ہوا جا رہا تھا مگر احمد کی وجہ سے اسے خود پر قابو پانا پڑا تھا۔

"اے زینب......! میری بات غور سے سن۔" خالد نے زینب کو پکارا۔ اپنی چنری اتار کر پھینک اور زور زور سے چلا۔ جیسے تیرا ساجی تجھ پہ ہاتھ اٹھا رہا ہے۔" اس نے حکمیہ انداز میں کہا۔

ساجد کی حیرانی کی انتہا نہ رہی جب اس نے زینب کو یہ حکم مانتے ہوئے دیکھا تو وہ آگے بڑھا اور اس نے زینب کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ دے مارا۔

"تجھے حیا نہ آئی ذلیل عورت!" وہ غرا کر بولا۔ اسے لگ رہا تھا جو زینب اس کے سامنے کھڑی ہے وہ اس زینب سے بہت مختلف ہے جسے وہ جانتا تھا جو اس کے گھر میں اس کے ساتھ رہتی تھی۔ جو اس کے احمد کی ماں تھی۔

"شاباش...... ایک ایسا ہی تھپڑ دوسرے گال پر بھی مار۔ کس لیے خوف زدہ ہے...... مارتا کیوں نہیں۔" خالد بٹ نے کمینی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

ساجد کا دل چاہا اس شخص کا منہ نوچ لے مگر اس کے بازو کے حلقے میں پھنسا بلکتا ہوا احمد اسے کوئی بھی ردعمل ظاہر کرنے سے روک رہا تھا۔

"میری بات سن زینب! باہر نکل اور لوگوں کو بتا دے کہ یہ تجھے قتل کرنے والا ہے...... جلدی کر زینب...... مرنا نہیں چاہتی تو باہر نکل کر لوگوں کو بتا دے تو صرف اتنا کام کر...... باقی میں سنبھال لوں گا۔" خالد بٹ نے چلا کر زینب کو مزید ہدایات دیں۔ زینب نے سوچنے میں لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔ وہ باہر صحن میں نکل گئی۔

"ہائے مجھے مت مارو...... مجھے مت مار ساجی......! میں نے کچھ نہیں کیا...... قسم اللہ پاک کی میں بے قصور ہوں۔" وہ نا صرف چلا رہی تھی بلکہ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

اس کے صحن میں نکلتے ہی خالد بٹ پچھلے دروازے سے گلی میں نکلا اور سرپٹ بھاگنے لگا۔ احمد اب بھی اس کے بازو میں دبکا تھا۔ ساجد نے واویلا مچاتی زینب کو دیکھا اور پھر پچھلے دروازے سے باہر نکلا تاکہ خالد بٹ کے شکنجے سے احمد کو چھڑا سکے۔

خالد اس سے کافی فاصلے پر تھا جبکہ احمد کے رونے کی آوازیں ساجد تک پہنچ کر اسے مزید تیز بھاگنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ اتنی ساری افتاد ایک ساتھ اس پر آ گئی تھیں کہ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ خالد بٹ پھرتیلا تھا اور اس سے کہیں تیز بھاگ رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے خالد بٹ نے احمد کو اچھال کر دور کھیتوں میں پھینک دیا۔

"کتے...... تجھے موت آئے...... ہائے میرا بچہ......" ساجد چلا کر بولا۔ خالد کہیں آگے نکل گیا تھا



جبکہ ساجد کے قدم اس مقام پر آ کر رک گئے جہاں اس کا بیٹا مٹی میں لتھڑ چکا تھا۔

ساجد نے اس کی حالت پر تڑپتے ہوئے اسے سیدھا کیا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ اس کی آنکھ میں شاید کوئی کانٹا چبھا تھا کیونکہ وہاں سے خون کی دھار نکل رہی تھی۔

اس نے احمد کو بانہوں میں تھام لیا۔ کافی دیر وہ اس کی آنکھ سے ٹپکنے والے خون کو اپنی قمیص کے کونے سے صاف کرنے میں لگا رہا تھا بلکہ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

ساجد کی اپنی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا تھا۔ اس نے احمد کو اٹھایا اور اسی سمت میں تیز تیز چلنا شروع کر دیا جس سمت میں خالد بٹ گیا تھا۔ مگر اب اس کا مقصد اس کو پکڑنا نہیں تھا بلکہ وہ احمد کو حکیم صاحب کے پاس لے جا رہا تھا۔

علاقے کے نزدیک تو کسی ڈاکٹر کا کلینک بھی نہیں تھا۔ حکیم صاحب کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ انہوں نے کھانا ختم کرنے میں کافی وقت لیا تب تک ساجد جلے پیر کی بلی کی طرح ان کے دواخانے میں چکر لگاتا رہا۔

"ساجد...... یہ تو نے کاکے کی آنکھ کو کیا کر دیا...... میں اس پر پٹی کر دیتا ہوں مگر تو اسے ڈاکٹر کو دکھالا...... آنکھ رہ گئی اس کی...... ہائے ہائے کیوں دھیان نہیں رکھتے اپنے بچوں کا۔" حکیم نے اسے مزید پریشان کر دیا۔

وہ حکیم صاحب سے عارضی پٹی کروا کر گھر کی طرف بھاگا تھا۔ گھر پہنچا تو مولوی باقر اس کے گھر کے صحن میں چارپائی پر بیٹھا تھا۔

"ساجد...... میرے بھائی...... یہ کیا ہو گیا......؟" وہ احمد کی حالت دیکھ کر تڑپ کر بولا تھا۔ زینب اسے کہیں نظر نہیں آئی نجانے وہ کہاں چلی گئی تھی۔ فی الحال ساجد اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ مولوی باقر نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ ساجد نے گھر میں موجود برے وقت کے لیے بچا کر رکھی ہوئی چند ہزار کی رقم نکالنی چاہی تو اسے وہاں بھی مایوسی ہوئی۔

رقم وہاں موجود نہیں تھی۔ اس نے مولوی باقر سے نو سو پچھتر روپے ادھار پکڑے اور اوکاڑہ کی طرف جانے کے لیے بس میں سوار ہو گیا۔ یہ شہر اس کے گاؤں کے قریب تھا۔ گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ حالانکہ اس نے اپنے گھر کے قریب رہنے والوں میں سے کچھ لوگوں کو متجسس اور کھوجتی ہوئی نظروں سے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ زینب کے شور وغل نے انہیں یہ موقع دیا اور وہ خود نجانے کہاں غائب ہو چکی تھی۔

"بھائی باقر! میرے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔" اس نے مولوی باقر سے صرف اتنا کہا اور اس کے بعد وہ بس میں سوار ہو گیا تھا۔

"اس کو پانی دو یار!" عادل نے بہت بوجھل لہجے میں ساجد کو اشارہ کیا تھا۔ وہ خود ہکا بکا
داستان ہضم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ساجد علی نامی یہ دیہاتی بہت دن سے اس کے پاس اپنے بیٹے کے علاج کے لیے آ رہا تھا۔ مالی مشکلات کا شکار یہ شخص اسے کبھی بھی قابل ذکر نہیں لگا تھا اور اب اپنے کلینک کے ریٹائرنگ روم میں بیٹھے اس شخص کی داستان سن کر اس کی دلچسپی ایک دم بڑھ گئی تھی۔

اخبارات میں جس طرح اس شخص کے ظلم وستم کی داستان کو پیش کیا جارہا تھا وہ شخص اس سے بالکل مختلف کہانی سنا رہا تھا۔ سجاد نے میز پر پڑا پانی کا گلاس اس کی طرف سرکا دیا۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ اس کا بیمار بچہ اس کی گود میں گہری نیند سو چکا تھا۔

''میرے بھائی! مجھے تو تمہیں تسلی دینے کے لیے الفاظ بھی نہیں مل رہے۔ جو کچھ تم نے مجھے بتایا ہے اگر یہی حقیقت ہے تو یقین کرو میرے کانوں نے اس سے پہلے اس قدر خوفناک حقیقت نہیں سنی۔'' عادل اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی آمیز انداز میں بولا۔

''قسم لے لو صاحب جی! ایک ایک لفظ سچا ہے۔ میں نے آپ کو جو بھی کہا ہے سچ کہا ہے آپ کو یقین نہیں تو میں اپنے احمد کے سر کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔'' وہ تڑپ کر بولا۔

''میں جب احمد کو اوکاڑہ لایا تو مجھے بڑی امید تھی کہ وڈے ہسپتال کا ڈاکٹر میرے بیٹے کو ٹھیک کر دے گا مگر انہوں نے کہا۔ پہلے ثابت کرو یہ تمہارا بچہ ہے تم کہیں سے اٹھا کر تو نہیں لائے کہ بھیک منگوانے کو بٹھا دو۔ فیر وہاں میرا ماما ہسپتال کے باغ کا مالی ہے اس نے کہہ سن کر احمد کو داخل کروایا۔ اگلے دن سے علاج شروع ہوا تو یہاں کو ملے کی پولیس چوکی نے پرچہ کاٹ کر مجھے مفرور قرار دے دیا۔ اس کے بعد اخبار میں خبر لگ گئی کہ میں اپنی بیوی کو قتل کرنے لگا تھا اور میں بڑا ہی کوئی کمینہ آدمی ہوں۔''

وہ ان دونوں کے مزید کسی سوال سے بچنے کے لیے خود ہی مزید تفصیلات بتانے لگا۔

''میں زینب کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں کہ میں ایک بلی کا بچہ مار سکوں تو بھلا میں ایک جیتی جاگتی زنانی کو کیسے مار سکتا ہوں مگر پولیس نے میرے خلاف جو پرچہ کاٹا ہے وہ قتل کا ہے جی...... میرے وڈوں میں آج تک کسی نے تھانے کچہری کی شکل نہیں دیکھی۔

ہم شریف لوگ ہیں جی مگر ایک ذرا سی غلطی نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا.......... مجھے پتا ہی نہ چل سکا کہ زینب اچھی عورت نہیں جب خالد نے اس کو اس کے پکھی واس ماں پیو (خانہ بدوش ماں باپ) سے خریدا تو اس نے خود میرے پاؤں میں بیٹھ کر کہا تھا کہ مجھ سے شادی کر لو۔ خالد اس کو ورنہ بوت ذلیل کرتا وہ بوت برا آدمی ہے۔ اور فیر وی زینب نے اس سے یاری لگا لی۔

میں اس دن سے پچھتا رہا ہوں۔ اوکاڑے میں ڈاکٹر نے جواب دے دیا تو میں یہاں (لاہور) اپنے احمد کو ہسپتال لایا مگر میرے ماما نے کہا۔ ڈاکٹر کو گھر پر دکھاؤ ورنہ ہسپتال میں تو پولیس کا وی ڈر رہتا ہے۔ میں تو جی بس ایک اسٹوری (قصہ) بن کر رہ گیا ہوں۔ بھلا ایسا بھی سنا کبھی کسی نے کہ ایک زنانی جو بدکردار ہو اور فیر وی سب اس کا ساتھ دیں۔



مجھے میرے مامے نے بتایا تھا کہ اخبارات میں زینے کے متعلق بہت ساری باتیں آئی ہیں۔ مگر آپ یقین کریں صاحب جی! وہ جو بھی کہتی ہے جھوٹ کہتی ہے بکواس کرتی ہے۔ ہاں میں مانتا ہوں میں نے اسے تھپڑ مارا تھا مگر آپ یہ بھی تو دیکھیں وہ غلط عورت ہے۔ مجھے اس کو خالد بٹ کے ساتھ دیکھ کر غصہ آ گیا تھا۔ آپ خود بتایئے صاب جی! آپ اپنی زنانی کو کسی غیر مرد کے ساتھ......''

''لاحولا ولاقوۃ......تم اپنی بات کرو بھائی......'' سجاد اس کی بات کاٹ کر فوراً بولا۔

''میں اپنے پنڈ واپس نہیں جا سکتا کیونکہ وہاں سب میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ حالانکہ سب کو پتا ہے کہ میرا کوئی قصور نہیں مگر فیر وی سب کو لگتا ہے جیسے میں کوئی لطیفہ ہوں اور فیر پولیس میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہے۔

میری یہی غلطی ہے نا کہ میں نے ایک بدکردار عورت کے ساتھ شادی کی اور اس شادی کو نبھایا بھی۔ اب وہی میرا منہ کالا کر گئی تو میں کیا کروں صاب جی! میں نے آج تک اسے سکھ ہی دیا میرا کیا قصور جی......اس کا پلہ اس لیے بھاری ہے کہ شہر کی زنانیوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔ وہ سب بھی ایسی ہی بدذات ہوں گی نا۔''

ساجد علی کی بات پر عادل تڑپ کر رہ گیا۔ وہ سادہ لوحی میں اس کی شاہ رگ پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''میں نے زینب کی تصویریں اخبار میں دیکھی ہیں۔ وہ تو جی وڈی میم بن گئی ہے اور یہاں اس کا پتر اس کی وجہ سے اپنی آنکھ گنوا بیٹھا مگر اس عورت کو کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ تو مزے میں ہے۔'' وہ اپنے بیٹے کو بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''اللہ وڈے لوگوں کا ہی تو نہیں ...... ہمارا بھی ہے...... میں پیدا ہوا تو میرے ابا نے وی میرے کان میں ویسی ہی اذان دی تھی جیسی خالد بٹ کے کان میں اس کے باپ نے دی ہوگی۔ فیر ایسا تو نہیں ہو سکتا نا کہ وہ گناہ کر کے سزا سے بچا رہے اور میں مظلوم ہو کر وی مصیبت میں پھنسا رہوں۔''

وہ دھچکے اور دکھ کی اس کیفیت سے گزر رہا تھا جہاں انسان کو باتیں کرنے کے لیے کسی دوسرے انسان کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔

''تم یہ پھل کھاؤ...... پانی شانی پیو...... ہم ابھی آتے ہیں۔'' سجاد نے عادل کو اشارہ کیا اور خود بھی کمرے سے باہر نکل گیا۔ عادل دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا اس کے پیچھے باہر نکل گیا۔

''یہ گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے اپنے بچے کے سلسلے میں میرے پاس آ رہا ہے۔ میں اس کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اس کا تعلق اس اخبار میں مسلسل چھپنے والی عورت کے ساتھ نہ ہوتا تو اتنی دیر اس کے پاس بیٹھ کر اس کی باتیں کبھی نہ سنتا۔ اس کی باتوں میں کس قدر صداقت ہے یہ حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ مان بھی لیا جائے تو پھر اس عورت کے اس مقام پر ہونے کا کیا جواز پیش جائے گا۔ وہ عورت نیشنل انٹرنیشنل میڈیا کو اتنے اطمینان کے ساتھ فیس کر رہی ہے وہ حکومتی اہلکاروں سے بات چیت کرنا چاہ رہی ہے۔ ہم اتنے اطمینان سے اسے جھوٹا قرار نہیں دے سکتے اور پھر یہ بات تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے یہاں عورت کو

تشدد اور استحصال کا سامنا ہے۔'' سجاد اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہا تھا۔

عادل چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا پھر ایک طرف صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

مجھے یہ شخص جھوٹا نہیں لگتا...... میں خود بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے مگر پھر بھی اس شخص نے اس عورت سے نکاح کر کے اسے تحفظ فراہم کیا۔ اس کے ساتھ بناہ کیا جبکہ وہ عورت کیا کرتی رہی اور پھر بھی تم کہتے ہو کہ ہمارے یہاں عورت استحصال کا شکار ہے کیسا استحصال۔

میں تو اس فقرے سے عاجز آ گیا ہوں۔ خواہ مرد ہوں یا عورت ہر شخص ہی کہتا ہے کہ ہمارے یہاں مردوں نے عورت کی زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے۔ مجھے تو خود اپنے آپ سے شرمندگی ہونے لگتی ہے۔'' عادل کا انداز گفتگو کسی قدر جارحانہ تھا۔

سجاد نے اسے پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

''او کے مولوی...... ایسی کٹر باتیں کہاں سے آتی ہیں تیرے ذہن میں...... یہ جو غیر ملکی چیخ رہے ہیں باہر کے اخبارات جو چھاپ رہے ہیں۔ تیرے خیال میں یہ سب جھوٹے ہیں۔''

''توبہ استغفراللہ۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ سب جھوٹ ہے۔ مگر ان کی دیکھا دیکھی جو جھوٹی عورت اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے لائم لائٹ میں آنے یا روپے کمانے کے لیے ایسے اوچھے ہتھکنڈے اپنا رہی ہیں جیسے زینب علی نے اپنائے تو خود تم بتاؤ انہیں کس طرح جسٹی فائی کیا جائے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ بہت لوگ انہیں سپورٹ کرتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ہمارے ہونے کا کیا جواز ہے...... ہم سب برے ہیں...... میں بھی تو مرد ہوں۔''

''میرا بھائی' باپ' میرے دوست' تم' تمہارے جاننے والے مرد کیا سب برے ہیں...... نہیں نا...... اور ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ کہ صرف ہم اچھے ہیں یا اللہ نے ہمارے حلقہ احباب میں فرشتے پیدا کر دیے جبکہ باقی سب لوگ شیطان ہیں۔ کم از کم یہ غیر ملکی چینلز اخبارات تو پاکستانی مسلمان مردوں کی ایسی ہی تصویریں پیش کر رہے ہیں جیسے دنیا کے اس خطے میں صرف شیاطین پیدا ہوتے ہیں۔''

عادل کے دل میں نجانے کتنے دنوں کا غبار تھا جو باہر نکل آیا۔

''یار...... تو تو سچ مچ مولوی بن گیا ہے۔'' وہ فقط اتنا ہی کہہ سکا۔

''اوہ شٹ اپ یار! یہ کیا بکواس ہے...... یہی تو ہم لوگوں کا المیہ ہے۔ ہم مسلمان جب اپنی پوزیشن کو واضح کرنے کے لیے کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہیں تو سب کہہ دیتے ہیں۔ یہ ''مولوی'' ہو گیا ہے۔ یہ ایسی سوچ کا نتیجہ ہے کہ ہمارے یہاں کے عالم بھی ڈر ڈر کر بولتے ہیں۔'' عادل نے تڑخ کر کہا۔

سجاد خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔

''تجھے اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے۔ میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا یار! بہت دیر خاموش رہنے کے بعد سجاد بولا۔



''نہیں یار...... غصہ کب کر رہا ہوں...... بڑھتی ہوئی عمر کا اثر ہے جلدی جذباتی ہو جاتا ہوں۔'' عادل نے ذرا کی ذرا مسکراتے ہوئے بولا۔

اسے خود بھی اپنے لہجے کا احساس تھا۔ جو باتیں وہ عشاء کو سمجھانا چاہتا تھا وہ سجاد کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اب مذاق مت کر...... اتنا بوڑھا بھی نہیں ہوا تو اور پھر غلط بھی نہیں کہا تو نے۔ ظلم و زبردستی استحصال تو ہر جگہ ہوتا ہے مگر ہمارے خطے میں جو بات اس قسم کی ہو جاتی ہے۔'' اسے سو سے ضرب دے کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے اور پھر اس طرح سے ہائی لائٹ کیا جاتا ہے کہ ہم اپنے آپ سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔

یہ جو یورپ' امریکہ' آسٹریلیا میں ہوتا ہے یہ بھی کسی سے ڈھکی چھپی بات تو نہیں مگر وہاں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جسے یہ لوگ فطرت قرار دے کر ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں جبکہ ہم ایسا نہیں کر سکتے اور یہی چیز ان فرنگیوں سے برداشت نہیں ہوتی۔

یہ جو جھگڑے ہیں نا یہ آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ہوتے ہیں یہ ہماری آئیڈیالوجی تبدیل کر دینا چاہتے ہیں۔ تب ہی اس قسم کی باتیں پھیلاتے رہتے ہیں۔'' سجاد نے بھی اپنی بھڑاس نکالی۔

''ہم بھی تو احمق ہیں ان کی باتوں میں آ جاتے ہیں اور پھر یہ NGOs...... توبہ۔'' عادل نے اپنی کنپٹیاں دباتے ہوئے کہا سجاد مسکرا دیا۔

''خیر اب سب کو ایک ہی صف میں کھڑا مت کرو۔ میں ایسی ڈھیروں NGOs کے نام لے سکتا ہوں جو بہت گرانقدر خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔'' وہ فقط سر ہلا کر رہ گیا۔

''اب اس شخص کا کیا کرنا ہے؟'' اس نے سب سے اہم سوال اٹھایا۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں...... جو کرنا ہے اللہ نے کرنا ہے۔ باقی جو کچھ اخبارات میں چھپ رہا ہے ہم اس کو کس بنیاد پر جھٹلا سکتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے حقیقت اصل میں کیا ہے اور پھر وہ عورت خود ایک NGO تک آئی تھی مدد مانگنے کے لیے۔ NGO کو کیا پتا کہ وہ عورت جھوٹی ہے۔'' سجاد کا انداز سوچتا ہوا تھا جب عادل کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

عشاء نے بتایا تھا کہ ان لوگوں کو زینب کے متعلق کافی انکوائری کی ہے۔ اگر وہ انکوائری ٹھیک تھی اور حقیقت پر مبنی تھی تو پھر اندر کمرے میں بیٹھا وہ شخص جھوٹا تھا۔ وہ عجیب شش و پنج میں پڑ گیا۔

''اس کو کچھ روپے دے کر رخصت کر دیتے ہیں۔' سجاد نے مشورہ کیا۔

''ہاں...... ٹھیک ہے...... مگر اس کا ایڈریس وغیرہ لے لینا۔'' عادل والٹ نکالتے ہوئے بولا۔

''کیوں؟'' سجاد نے پوچھا۔

''جنرل نالج کے لیے۔'' عادل نے مسکرا کر جواب دیا مگر دل ہی دل میں وہ بہت سنجیدہ تھا۔

☆ ☆ ☆

ہجر میں کیوں رلاتے ہو' کہاں ہوتے ہو
لوٹ کر کیوں نہیں آتے ہو' کہاں ہوتے ہو
مجھ سے بچھڑے ہو تو محبوب نظر ہو کس کے
آج کل کس کو مناتے ہو' کہاں ہوتے ہو

کسی کو دھیمے لہجے میں شعر سنانے کے بعد اس نے بہت زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ گود میں میگزین لے کر بیٹھی عشاء نے چونک کر اسے دیکھا۔ شعر و شاعری سے تو اس کے مجازی خدا کو کبھی بھی شغف نہیں رہا تھا۔ اس کے اندر بہت زور کا الارم بجا۔

''اب اگر میں نے یہ کہا کہ عادل آپ کے انداز بدلے بدلے سے نظر آتے ہیں تو منہ پھول جائے حالانکہ آج اس سے پہلے تو ایسے رومانٹک شعر کسی کو نہیں سنائے گئے۔''

''اللہ خیر...... یقیناً کسی لڑکی سے بات کر رہے ہیں۔ بتیسی تو اندر ہی نہیں جارہی۔'' اس نے بڑبڑا کر خود سے کہا اور ساتھ ہی میگزین کا صفحہ پلٹ دیا۔ وہ عادل پر اپنا تجسس ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''نہیں یار! ایسی بات نہیں...... تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں...... اکثر تمہاری یاد آتی ہے۔ تم میں ہی مروت کی سخت کمی ہے کبھی فون ہی نہیں کیا۔'' وہ بہت پیار بھرے لہجے میں شکوہ کر رہا تھا۔

دوسری جانب سے نجانے کیا کہا گیا۔ عادل نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

''نہیں یار...... قسم سے...... شادی کے بعد تو اور بھی زیادہ یاد آتی ہے۔'' عشاء نے اسے گھور کر دیکھا۔

اس کی ساری توجہ فون کی جانب تھی۔

''ارے نہیں بھئی...... وہ بہت لبرل لڑکی ہے۔ اسے اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ میں ایک گرل فرینڈ کے ساتھ گھومتا ہوں یا ایک وقت میں چار چار گرل فرینڈ کے ساتھ......'' وہ بہت براڈ مائنڈڈ' ہے بھئی۔'' اس نے ''بہت'' پر خوب زور دیتے ہوئے کہا تھا۔

عشاء اس کے طنز بخوبی سمجھ رہی تھی مگر منہ سے کچھ نہیں بولی۔ آج کل اسے عادل کے مزاج سے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ بہت جلدی غصہ میں آجاتا تھا۔ اور طنزیہ گفتگو کرنے سے تو کبھی چوکتا ہی نہیں تھا۔ پہلے بھی اس معاملے میں وہ بہت تیز واقع ہوا تھا مگر وہی باتیں جو پہلے مذاق مذاق میں ختم ہو جایا کرتی تھی۔ اب وہی سب باتیں ان کے جھگڑوں پر ختم ہونے لگی تھیں۔

بہت دن کے بعد انہیں فرصت ملی تھی۔ عشاء کا دل چاہ رہا تھا کہ اتنے دن سے جو باتیں جمع کر رکھی ہیں وہ سب شیئر کرلے بہت سی باتیں عادل کو بتانا تھیں بہت سے مشورے کرنے تھے مگر وہ تو آج کل اسے مسلسل نظرانداز کرتا رہتا تھا۔

''میں سیدھا سادہ بندہ ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا یار...... تم اخباری بندے ایسے لوگوں کو پہلی



نظر میں پہچان لیتے ہو۔''

اب وہ سنجیدہ نوعیت کی گفتگو کرنے لگا تھا۔

عشاء کے دل کو تسلی ہوئی کہ کم از کم وہ کسی لڑکی سے باتیں نہیں کر رہا۔ وہ آنکھیں جھکا کر میگزین میں گم ہونے کی ایکٹنگ کرنے لگی۔

''نہیں گھامڑ! تم اس سے ایک بار مل لو...... تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا آئی سوئیر جھوٹ نہیں بول رہا اور پھر اس طرح کا جھوٹ کیوں بولوں گا میں تم سے...... اسٹوپڈ ایک بار کوشش کرلے دوبارہ نہیں کہوں گا۔ ہاں بابا! میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں ایک بزدل انسان ہوں اور تو کمینہ دنیا کا بہترین انسان ہے۔ بس خوش۔ اب سن میں کل لنچ بریک میں تیرا انتظار کروں گا...... جرنلسٹ بن کر مت آنا بلکہ ایک ہمدرد انسان بن کر آنا...... مسئلہ سنجیدہ نوعیت کا ہے...... ہاں میرے باپ! بل میں ہی دوں گا۔''

عشاء کے کانوں میں وقتاً فوقتاً آوازیں پڑتی رہیں۔ اس کے بعد اس نے ریسیور کریڈل پر رکھنے کی آواز سنی۔

''الو کا پٹھا...... بالکل سیاستدانوں کی طرح بات کرتا ہے۔'' عادل نے سائڈ پر پڑے ریموٹ کو ٹیبل پر رکھ کر صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے خودکلامی کی تھی۔

''کس سے بات ہو رہی تھی؟'' عشاء نے مسکراتے ہوئے پوچھا مگر عادل کے چہرے پر ایسے کوئی تاثرات نہیں تھے۔

''تم نہیں جانتیں...... اچھے وقتوں کا دوست ہے۔'' سنجیدہ سے انداز میں جواب دے کر وہ پھر گویا کچھ سوچنے لگا تھا۔ عشاء کا دل جل کر خاک ہو گیا۔

''یعنی یہ آپ کا برا وقت ہے؟'' دل میں اٹھنے والے سوال کو وہ زیادہ دیر تک زبان پر آنے سے روک نہیں سکی تھی۔

عادل جواب دیے بغیر سابقہ انداز میں بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کچھ سوچتا رہا۔ عشاء کا پارہ ہائی ہونے لگا تھا۔ مگر وہ کنٹرول کر کے بیٹھی رہی۔ وہ خود اب حالات کی اس سنگینی سے ڈرنے لگی تھی۔ ان کے درمیان بہت فاصلے حائل ہوتے جارہے تھے۔

''چائے بناؤں؟'' عشاء نے پھر پوچھا مگر عادل کی خاموشی نہ ٹوٹی۔

''میں نے پوچھا چائے بنالاؤں......؟'' عشاء دل گرفتہ ہو کر بولی۔

''اوں ہوں...... دل نہیں چاہ رہا......'' وہ ناک چڑھا کر بولا۔ عشاء نے جل کر گود میں پڑا میگزین ٹیبل پر پٹخ دیا اور تڑخ کر بولی۔

''جانتی ہوں...... آپ کا دل تو مجھ سے بات کرنے کو ہی نہیں چاہتا''

''اچھا آ...... آ...... زوجہ محترمہ! یہ آپ فرما رہی ہیں...... آپ کو اس بات سے کوئی فرق نہیں

نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ عادل آج آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔ حالانکہ پہلے تو ہر ہفتے تم مجھ سے ضد کرتی تھیں کہ آئس کریم کھانے جانا ہے۔ کل میں نے فریزر کھولا تو اس میں آئس کریم موجود تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ابھی بھی آئس کریم کھانا پسند کرتی ہو مگر میرے ساتھ جا کر کھانا نہیں اور پھر جب کبھی ہم شاپنگ کے لیے گئے ساری پے منٹ تم نے کی جب میں نے پیسے دینے چاہے تو تم نے کہا میرے پاس پیسے ہیں۔''

یقین جانو عشاء! مجھے اتنا برا لگا کہ میں بیان بھی نہیں کر سکتا...... ہاں ٹھیک ہے میں کنزرویٹو ہوں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میری بیوی میری موجودگی میں رقم خرچ کرے جب یہ میری ذمہ داری ہے۔''

وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بات کر رہا تھا مگر اس کا ہاتھ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

''اتنی سی بات...... یہ تو بہت چھوٹی سی بات ہے عادل پھر......'' عشاء صفائی دینے والے انداز میں بولی مگر عادل نے اس کی بات کاٹ دی۔

''نہیں عشاء! یہ چھوٹی بات نہیں ہے کم از کم میرے لیے یہ چھوٹی بات نہیں ہے۔

تمہیں یاد ہے جب پنڈی سے لاہور آئی تھیں اور تب صبح تمہاری آنکھ نہیں کھلا کرتی تھی۔ میں خود ناشتہ بنا کر کھا لیا کرتا تھا تب تم نے مجھ پر کتنا غصہ کیا تھا اور تم نے کہا تھا کہ تمہیں یہ بات سخت ناپسند ہے کہ تمہاری موجودگی میں ناشتہ میں بناؤں میں نے کبھی تمہیں یہ باور نہیں کروایا کہ تم کنزرویٹو ہو یا شاؤنسٹک ہو۔'' وہ نہایت سنجیدہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔

عشاء کو اس کی مثال پر حیرت ہوئی۔ اس نے کس کو کس بات سے ملا دیا تھا۔

تم جانتی ہو تمہارے پاس اب میرے لیے وقت نہیں ہوتا۔ میں انتظار ہی کرتا رہ جاتا ہوں کہ تم میرے پاس بیٹھو گی باتیں کرو گی مگر...... گاڈ عشاء شاید میں حقیقتاً بہت کنزرویٹو ہوں۔''

وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر اپنے دونوں ہاتھ پیشانی پر رکھ کر بولا۔

عشاء کو اس کے انداز پر ازحد بے چینی محسوس ہوئی۔

''نہیں...... عادل! دراصل آئی ایم سوری...... آپ کنزرویٹو نہیں ہیں...... آپ بالکل بھی کنزرویٹو نہیں ہیں۔ شاید میں ہی زیادہ ماڈرن ہو گئی ہوں شاید یہ میری غلطی ہے۔''

''شاید نہیں...... یقیناً...... آپ ہی کی غلطی ہے زوجہ...... شکر ہے آپ نے خود ہی تسلیم کر لیا۔''

عادل اس کی بات کاٹ کر جلدی سے بولا۔

عشاء نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر جو تاثرات تھے وہ عشاء کے لیے بالکل بھی نئے نہیں تھے۔

''ارے یہ تو بالکل بھی نہیں بدلے۔ یہ تو بالکل پہلے جیسے عادل ہیں۔'' اس نے دل میں سوچا مگر منہ سے نہیں کہا۔

ایسی بات کہہ کر وہ اسے سر نہیں چڑھانا چاہتی تھی اس نے اپنے مجازی خدا کے کندھے پر ایک زور



دار ہاتھ مارا۔

''ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی۔ آپ کنزرویٹو نہیں ہیں مگر بہت خود غرض ہیں آپ کو احساس ہوا کہ جب میں یہ رونا روتی تھی کہ میرے پاس دو گھڑی بیٹھ کر میری باتیں سن لیں میں اکیلی ہوتی ہوں مجھے ٹائم دیا کریں تب کیسے نخرے کیا کرتے تھے اور اب آپ مجھ سے وہی شکوے کر رہے ہیں جو کبھی میں آپ سے کیا کرتی تھی۔''

وہ اس کی غلطی کا احساس دلا رہی تھی۔ عادل بہت عرصے بعد دل سے مسکرایا تھا۔

''میں ایکسکیوز کر لیتا ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''کان بھی پکڑنے پڑیں گے۔'' عشاء پھیلتے ہوئے بولی۔

''اوہ ہاں...... شیور...... کیوں نہیں جی......'' اس نے کہا پھر جھٹ سے عشاء کے کان پکڑ لیے۔''

عشاء نے اس کے کندھے پر چپت رسید کی۔

''میرے نہیں اپنے کان پکڑیں۔''

''ارے تو یہ کس کے ہیں...... یہ بھی تو میرے ہی ہیں۔'' وہ آنکھ مار کر بولا تھا۔ عشاء کھلکھلا کر ہنس دی۔

''ایسی باتوں میں کتنا دماغ چلتا ہے آپ کا۔'' وہ اس کے بال بگاڑ کر بولی۔ عادل کو اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

''اچھا بتاؤ تمہارا آفس کیسا چل رہا ہے اور ہاں وہ محترمہ زینب علی کیسی ہیں؟'' عادل نے ذرا کی ذرا سنجیدہ ہو کر پوچھا تھا۔

عشاء نے چپل اتار کر دونوں پاؤں صوفے کے اوپر چڑھا لیے۔

''محترمہ زینب علی ٹھیک ہی ہوں گی...... ہم کون سا اس سے روز ملتے ہیں۔ اس کی سیکیورٹی بہت ٹائٹ ہے۔ اس کا شوہر بہت ظالم اور سائیکک سا انسان ہے جس کی وجہ سے ''فلاح'' والوں نے اس عورت کو سات پردوں میں چھپا کر رکھا ہے۔'' عادل کی نظروں میں وہ ''ظالم'' اور ''سائیکک'' شخص گھوم کر رہ گیا جو اپنے بیمار بچے کو سینے سے لگائے جگہ جگہ فریاد کرتا پھر رہا تھا۔

''کس قدر گھٹیا اور فضول انسان ہے وہ شخص...... میرے ہاتھ لگ جائے تو قسم سے میں تو اسے فوراً شوٹ کر دوں۔''

عشاء نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

عادل نے اسے دیکھا پھر لمحہ بھر میں ہی اسے سب بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

''تم ملو گی اس شخص سے؟'' اس نے بے ساختگی سے کہا۔ عشاء نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا پھر سر جھٹک کر مسکرائی گویا اس کے مذاق کو محسوس کر لیا ہو۔

پڑنا چاہیے کہ میرا دل کیا کرنے کو چاہتا ہے اور کیا نہیں۔" وہ بہت نرم لہجے میں بولا تھا۔

اس کا یہی لہجہ عشاء کو تاؤ دلاتا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور عادل کے قریب سے گزر کر باہر جانے لگی تھی۔ مگر عادل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا پھر اسے اپنے قریب بٹھا کر بولا۔

"اچھا...... اب ایسے موڈ کو آف مت کرو...... تم جانتی ہو میری تو عادت ہی ایسی ہے۔" عشاء خاموش کھڑی رہی۔

اس کی طرف دیکھنے کی بھی کوشش نہیں کی ورنہ آنکھوں میں آئی نمی چھپانا مشکل ہو جاتا۔

"سوری یار...... کہا نا سوری......" وہ اس کا ہاتھ دبا کر بولا۔ پھر اسے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا۔ عشاء تامل کیے بغیر اس کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔

"چلو آج میرے پاس فرصت ہی فرصت ہے...... آؤ آج اپنی باتیں کرلیں ورنہ کل تو شاید تمہارے پاس میری باتیں سننے کا بھی وقت نہ ہو۔"

اس کے انداز دوستانہ تھے مگر چہرے پر عجیب سی سنجیدگی تھی۔

"پلیز عادل...... آپ بس بھی کریں اتنے طنز کے تیر چلاتے ہیں کہ میں برداشت کرتے کرتے بھی عاجز آ جاتی ہوں۔"

وہ روہانسی ہو کر بول ہی پڑی۔

عادل نے اس کی جانب دیکھا اس کا ہاتھ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس کے ہاتھ کو تھپتھپانے لگا۔

"تم نے کبھی سوچا کہ اس کی وجہ کیا ہے...... ہم پہلے بھی تو جھگڑتے تھے مگر وہ جھگڑے ایسے نہیں ہوتے تھے...... پہلے......"

"پہلے میں جاب بھی تو نہیں کرتی تھی۔" عشاء اس کی بات کاٹ کر بولی۔

عادل جو اس کے ہاتھ کو سہلا رہا تھا یکدم رک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

"آپ کو میرا جاب کرنا پسند نہیں ہے...... ہے نا؟" وہ ذرا سا ترچھا ہو کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر استفہامیہ انداز میں بولی۔

"نہیں...... تم غلط سمجھیں...... مجھے تمہارے جاب کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر جس نوعیت کی جاب تم کر رہی ہو مجھے اس پر اعتراض ہے...... تمہیں اندازہ ہے تم کتنی بدل گئی ہو۔ اب پلیز کوئی آرگیومنٹ دیے بغیر میری بات تسلی سے سن لو۔ تمہیں مجھ سے شکایت رہتی ہے کہ میں بدل گیا ہوں حالانکہ حقیقت یہ ہے عشا کہ تم بہت بدل گئی ہو۔ تمہارے آئیڈیاز تمہارے انداز تمہارا رویہ تمہاری اپروچ ہر چیز بالکل تبدیل ہو چکی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم خود یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔"

مجھے بتاؤ کتنے دن ہوئے تم نے اپنے ہاتھ سے میرے لیے کوئی ڈش نہیں بنائی کتنے دن ہوئے تم



"عشاء! میں مذاق نہیں کر رہا۔ میں اس شخص سے ملا ہوں اگر تم ملنا چاہتی ہو تو میں تمہیں اس سے ملوا سکتا ہوں۔"

وہ بہت سنجیدگی سے بولا۔

عشاء تو حیرانی سے اس کی جانب تکنے لگی۔

"جی نہیں...... مجھے نہیں ملنا ایسے شقی القلب انسان سے...... اور پلیز آپ بھی مت ملیے گا ایسے شخص سے...... توبہ آپ کیا اخبار نہیں پڑھتے بہت خطرناک شخص ہے وہ۔" عشاء دہل کر بولی۔

عادل نیم دلی سے مسکرایا۔

"مائی سویٹ وائف! میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ وہ بالکل بھی خطرناک نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ مظلوم اور مجبور شاید ہی کوئی اور ہو......"

"ایک ایسا مرد جو اپنی بیوی پر ہاتھ اٹھاتا ہو اسے آپ ہی مظلوم و مجبور کہہ سکتے ہیں۔"

"اور اگر بیوی شوہر پر ہاتھ اٹھائے؟" عادل کے سوال پر عشاء چپ سی ہو گئی۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" بہت دیر بعد اس نے پوچھا تھا۔

"ایک سمپل سا سوال پوچھا ہے کہ اگر شوہر بیوی پر ہاتھ اٹھائے تو یہ انتہائی غلط بات ہے مگر بیوی شوہر پر ہاتھ اٹھائے تو یہ بری بات نہیں ہے...... کیا یہ بری بات نہیں عشاء......؟ اور اگر یہ بری بات ہے تو پھر یہ بری بات نہیں ہے...... تم نے بھی مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا...... ایک بار نہیں دو بار...... اگر زینب علی کو یہ حق ہے کہ وہ اس ظلم کے خلاف احتجاج کرے تو پھر یہ حق مجھے بھی حاصل ہے۔"

وہ بہت رک رک کر بات کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ عشاء کا چہرہ بھی دیکھ رہا تھا جہاں تاثرات لمحہ لمحہ بدل رہے تھے۔

"عادل......! آپ مجھے اس شخص سے کمپیئر کر رہے ہیں...... آپ جانتے ہیں مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی اور...... اور میں نے ایکسکیوز کیا تھا عادل!" وہ شرمندہ سے لہجے میں بولی۔

اسے عادل سے اس طرح سے جتانے کا دکھ بھی ہوا تھا۔ عادل نے اس کا چہرہ دیکھا پھر دوبارہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"یہی تو میں سمجھانا چاہ رہا تھا میری جان کہ اس شخص کو بھی غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ اسے بھی تو معافی کا موقع ملنا چاہیے۔ کیا پتا اسے ایک موقع دیا جائے تو وہ بھی معافی مانگ لے یا پھر تم لوگ زینب اور اس کے خاوند کو مصالحت کا موقع ہی نہیں دینا چاہتے۔"

"نہیں عادل! وہ شخص اچھا نہیں ہے۔ بہت برا ہے۔ آپ نے کیا سچ مچ اخبار نہیں پڑھا؟" وہ تڑپ کر بولی تھی۔

"میں اس شخص سے ملا ہوں اور جو کہانی وہ سنا رہا ہے وہ میں نے بھی اپنے کانوں سے سنی ہے۔ اسے

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کیا تم نے اس عورت کی کہانی اپنے کانوں سے سنی ہے؟'' عادل کے سوال پر وہ پھرلا جواب ہوگئی۔

''تم جانتی ہو اس عورت کا ایک بچہ بھی ہے...... بہت چھوٹا سا اور وہ بیمار ہے۔ اس بچے کو اپنی ماں کی وجہ سے ایک آنکھ کی بینائی سے محروم ہونا پڑا مگر اس عورت نے اپنے کسی بیان میں اپنے کسی بچے کا ذکر نہیں کیا...... اس بات سے اس عورت کا کھوکھلا پن ثابت نہیں ہوتا؟ پھر...... میں تمہیں اس شخص سے ملواؤں گا۔'' عادل کی بات پر عشاء چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر سر ہلا کر بولی۔

''نہیں...... میں یقین نہیں کرسکتی...... اتنا بڑا جھوٹ اور پھر یہ فراڈ ہے......''

''ہاں...... میں جانتا ہوں...... یہ فراڈ ہے اور اس فراڈ میں نجانے کتنے لوگ شامل ہیں مگر یہ دیکھو کہ یہ فراڈ دنیا کے سامنے کتنی خوبصورتی سے پیش کیا گیا کہ اب تک کسی کو جھوٹ سچ کا پتا ہی نہیں چل سکا۔'' عادل نے فوراً تسلیم کرلیا تھا۔

عشاء تو عجیب شش و پنج میں پڑ گئی تھی۔

''اچھا میں تمہیں تفصیل سے بتاتا ہوں دراصل میں سجاد کے کلینک پر آئی سائٹ چیک کروانے گیا تھا اور وہاں......''

وہ اسے اپنی اور ساجد علی کی ملاقات کے متعلق بتانے لگا۔ عشاء حیرانی سے یہ سب سن رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

''آج کیسی فضول ڈریسنگ کی ہے تم نے؟'' شہلا نے اسے دیکھ کر ناک چڑھاتے ہوئے بے تکلفی سے تنقید کی۔

''کیوں......؟'' اس ڈریس میں کیا برائی ہے؟'' عشاء نے بھی اسی کے انداز میں ناک چڑھا کر پوچھا۔

فیروزی رنگ کا اچھا خاصا خوبصورت شلوار قمیص سوٹ تھا ہاں مگر شرٹ کی فٹنگ ڈھیلی تھی اور آستین بھی پوری تھی۔

''برائی نہیں ہے...... مگر......'' شہلا نے لمحہ بھر توقف کرکے اس کا بھرپور جائزہ لیا پھر منہ کے زاویے بگاڑتے ہوئے بولی۔

''ہر جگہ کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور اسی حساب سے انسان کو ڈریسنگ وغیرہ کا دھیان رکھنا چاہیے اور پھر یار اتنا زبردست فگر ہے تمہارا...... اس قسم کی ڈبہ بند ٹائپ ڈریسنگ سب بیڑا غرق کردیتی ہے۔''

عشاء سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

اس سے کچھ بھی کہنا فضول تھا۔ وہ ابھی تک اسی رنگ میں رنگی تھی جس میں کچھ دن پہلے تک عشاء رنگی نظر آرہی تھی۔ کینچلی شہلا کی نہیں اتری تھی بلکہ عشاء کی اتری تھی۔ تب ہی اسے کچھ کچھ حقیقت سمجھ میں آنے لگی



تھی۔ دراصل عادل کے ساتھ ایک لمبی چوڑی بحث، ساجد علی کی کہانی اس کی زبانی سن کر فاطمہ بھابھی کی نصیحت سے بھری گفتگو اور سب سے بڑھ کر اسفند رحیم کے بدلے بدلے انداز اسے بہت سی حقیقتیں باور کروا گئے تھے اور ایک ایسی بات بھی جو فی الحال اس نے کسی سے بھی نہیں کی تھی۔

وہ شخص بے تکلفی کی ہر حد کراس کرنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ بے جا تعریف کرنا اور فرنگیوں کے انداز میں تعریف کرنا تو اس کی عادت تھی ہی مگر اب وہ تعریف کرتے کرتے ہاتھ پکڑنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ ایک آدھ بار عشاء کے ساتھ یہ ''حادثہ'' پیش آیا تو وہ اسے اتفاق دے کر برداشت کرگئی مگر ایک دن جب وہ اس کے روم میں کسی کام سے گئی تو باتوں کے دوران اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا سہلاتے ہوئے بولا۔

''اللہ نے ایک ناشکرے بندے کو آپ جیسا تحفہ دے کر سخت ناانصافی کی۔''

عشاء نے اپنا ہاتھ تو چھڑا لیا تھا مگر اسے ڈانٹ پھٹکار نہیں کی تھی حالانکہ وہ کوئی بزدل یا عدم اعتماد کا شکار نازک سی لڑکی نہیں تھی۔ وہ شادی شدہ تھی اور اس میں اتنی ہمت تھی کہ وہ اسفند رحیم کو ایک آدھ جھڑکی تو ضرور دیتی مگر پھر بھی نجانے کیوں اس نے کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنے آپ کو بہت ''ویل مینرڈ'' سمجھتی تھی۔

''تم جانتی ہو تم کس سمت میں جارہی ہو...... اب پھر مجھے کنزرویٹو کہہ دینا مگر میں پھر بھی خود کو یہ کہنے سے نہیں روک سکتا کہ تم خود بھولتی جارہی ہو کہ اخلاقیات کسے کہتے ہیں اور جو اخلاقیات تم سیکھتی جارہی ہو وہ آپ کو یہ سکھاتی ہے پورے کپڑے نہ پہنو آپ بدصورت لگو گے اور جو یہ سکھاتی ہے کہ جب کوئی مرد آپ کو سراہے تو اس تعریف کو خندہ پیشانی سے برداشت کرو۔ بے شک یہ تعریف اور یہ سراہنا اخلاقیات سے گرا ہوا ہی کیوں نہ ہو...... یہ سو کالڈ ماڈرن سوسائٹی کے مینرز ہیں بھئی۔''

عادل نے بہت سلجھے ہوئے لہجے میں سے بہت کچھ سمجھا دینا چاہا تھا اور وہ اندر ہی اندر ہل کر رہ گئی تھی۔

''عادل کو اندازہ تو نہیں ہوگیا کہ اسفند اس قماش کا آدمی ہے۔'' اس نے سوچا تھا۔

''کس دنیا میں گم ہو بھئی۔'' رحمہ نے کی بورڈ پر انگلیاں چلانے کے ساتھ ساتھ اسے ٹوک کر پوچھا۔ وہ جب سے آئی تھی ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔

''یہ زینب علی کے ڈائی وورس پیپرز ہیں...... اسفند چاہتا ہے کہ یہ کام جلد سے جلد نبٹ جائے۔''

رحمہ اس کی خاموشی سے اکتا کر بولی۔

عشاء نے ''اسفند'' کے ذکر پر اس کی جانب دیکھا۔ نجانے کب سے اس نے اسفند کے ساتھ صاحب کا لاحقہ لگانا چھوڑ دیا تھا۔

''اسفند بہت اچھا انسان ہے یار...... ایک آئیڈیل بندہ ہے...... میں تو کم از کم اس سے بہت امپریس ہوں۔''

وہ کمپیوٹر اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

عشاء نے اسے روکنا یا ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔

''یہ زینب علی طلاق لے کر کیا کرے گی؟'' اس نے رحمہ سے پوچھا۔

''اسفند نے کچھ تو سوچا ہوگا اس کے متعلق...... اور یقیناً کچھ اچھا ہی سوچا ہوگا۔'' وہ کمپیوٹر اسکرین پر نظریں ہٹائے بغیر بولی۔

اس کے لہجے میں لفظ اسفند کے لیے بہت مٹھاس تھی۔

''وہ شخص اس عورت کو طلاق دلوا کر کیا کرے گا...... نکاح تو نہیں کرے گا...... حالانکہ اگر اسے اس عورت سے اتنی ہمدردی ہے تو پھر اس سے نکاح کر لے نا۔''

عادل نے کل ہی اس سے یہ بات کہی تھی کل اس نے عشاء سے بہت کچھ کہہ ڈالا تھا۔

''وجاہت کو ٹرمینیٹ کر دیا گیا ہے۔'' رحمہ نے ایک اور اطلاع دی۔ اب کی بار عشاء چونکی۔ وہ وجاہت سے آج زینب علی کے متعلق تفصیلی بات چیت کرنا چاہ رہی تھی۔ آخر وہی تو تھا جو انکوائری کرنے والوں میں پیش پیش تھا۔

''وجاہت کا نمبر ہے تمہارے پاس؟'' اس نے رحمہ سے سوال کیا۔

رحمہ نے ناک چڑھا کر اسے نمبر دے دیا۔ وہ چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے لوگوں میں سے تھی۔ وجاہت کو نکال دیا گیا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ اب اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی عشاء رحمہ کے کیبن سے جانے کا انتظار کرتی رہی پھر اس نے وجاہت کا نمبر ملایا۔

''عشاء بی بی! یہ لوگ سمجھتے ہیں دنیا بے وقوف ہے اور یہ بالکل غلط سمجھتے ہیں۔'' وجاہت نے اس کے استفسار پر کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر کہا۔

''یہاں بہت فراڈ ہے...... آہستہ آہستہ سب کچھ سمجھ جائیں گی اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وجاہت کو نکال دیا گیا ہے ان کی خدمت میں میرا دست بستہ سلام عرض کر کے یہ پیغام دے دیجیے گا کہ وجاہت خود یہ گھٹیا جگہ چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ میں پہلے ان کی گیم کو کیوں نہیں سمجھ سکا۔ ہم نے جب اس عورت کو سڑک پر سے اٹھا کر کوچ میں ڈالا تھا یہ ہم ہی جانتے ہیں اسفند سمیت کوئی بھی اسے وہاں سے اٹھا کر مدد کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اگر میں اور خان اسے اٹھانے پر اصرار نہ کرتے تو یہ کھڑاک ہی پیدا نہ ہوتا۔

آپ کو پتا ہے انہوں نے یہ ساری اسٹوری بند کمرے میں بیٹھ کر پلان کی بلکہ مجھے لگتا ہے کسی ڈرامہ رائٹر کو بلا کر سب لکھوایا گیا اور اس کے بعد اسے کوہلہ نامی اس چھوٹی سی جگہ پر چیدہ چیدہ لوگوں میں پیسہ دے کر پھیلا دیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ حقیقت کسی کو پتہ ہی نہیں۔ میں جب وہاں پہنچا تو سب سے پہلی ملاقات مجھے وہاں کے ''وڈے چوہدری صاحب'' سے کروائی گئی اور اس نے مجھے جو کچھ بتایا۔ وہ میں نے یہاں آ کر ان سب کو بتا دیا۔



آپ یقین کیجیے عشاء! مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ اسٹوری ایک بوگس ڈرامہ ہے اور ''فلاح'' والوں نے میری ''فلاح'' خراب کرنے کے لیے مجھے اس کام میں پھنسوا دیا۔ ایک تو وہاں چوہدری کے ڈر سے کوئی سچ بولا ہی نہیں اور جو بولا وہ بھی جھوٹ ہی بولا۔ اس کے بعد جو کچھ اخبارات میں آیا وہ تو نری بکواس باتیں تھیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ میں کوئی با اختیار بندہ نہیں ہوں۔ میں جو کر سکتا تھا میں نے وہی کیا۔ میں نے اسفند کو بہت سمجھایا کہ اس ڈرامے کو ختم کر دے مگر تب تک وہ اس عورت کو میڈیا میں ٹھیک ٹھاک شہرت دلوا چکا تھا ایسی صورت حال میں مجھے یہی بہتر لگا کہ میں اس سب سے دور ہو جاؤں۔'' وہ تو اسے ایک کے بعد ایک سچ بتاتا چلا گیا۔

''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ سب جھوٹ ہے؟'' اس نے بے یقینی سے سوال کیا۔

''سب جھوٹ نہیں ہے...... وہ عورت گھر سے بھاگی تھی اور اس کا شوہر اس پر شک بھی کرتا تھا شاید وہ اسے مارنا بھی چاہتا تھا۔ پر میں اس کے بارے میں پر یقین نہیں ہوں۔ کچھ ایسا ہے جو ابھی بھی پوشیدہ ہے...... خیر کب تک، میں پتا چلا لوں گا۔''

عشاء کو اس کے جواب نے پھر مخمصے میں ڈال دیا۔ وہ تو خود پر یقین نہیں تھا۔

''آپ کو اسفند صاحب بلا رہے ہیں۔'' وہ ابھی فون پر مصروف تھی۔ کہ چپراسی پیغام لے آیا۔ وہ فون بند کر کے اس کے آفس کی طرف آ گئی۔ اسے تسلی تھی کہ رحمہ وہیں موجود ہوگی مگر اسفند اپنے آفس میں اکیلا ہی ریوالنگ چیئر پر بیٹھا ٹیبل پر پڑے پیپر ویٹ کو گھمانے میں مصروف تھا۔

''آیئے مس...... میرا مطلب مسز عشاء...... آپ تو بہت کم کم نظر آنے لگی ہیں آج کل۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ عشاء نے اس ہفتے میں دو چھٹیاں کی تھیں۔ وہ اسی وجہ سے اس سے کم کم نظر آنے کا شکوہ کر رہا تھا۔

''کیسی ہیں آپ......؟ اور آپ کے کنزروٹیو ہسبینڈ؟'' اس نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ عشاء نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا مگر یہ مسکراہٹ بہت مصنوعی تھی۔

''یقین کیجیے...... مجھے افسوس ہوتا ہے یہ دیکھ کر آپ جیسی زبردست شخصیت کا ہسبینڈ اتنا گیا گزرا ہے...... کاش میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں کہہ رہا تھا۔

عشاء کے اندر ابال اٹھنے لگے مگر اس نے خود پر قابو پایا۔ اسے اسفند سے حقیقت اگلوانا تھی۔

''آپ میرے لیے کچھ کر سکتے ہیں اسفند صاحب؟'' اس نے چہرے پر بے چارگی طاری کر کے وہی سوال پوچھ لیا جو اسفند کی دلی خواہش تھی۔

''ارے...... آپ کے لیے تو ہماری جان بھی حاضر ہے۔ آپ کہیں آپ کو کس قسم کی مدد درکار ہے۔'' اس نے نہایت دلچسپی سے پوچھا۔

عشاء کو دل ہی دل میں اس کے انداز پر مزید غصہ آنے لگا۔

''میں...... مجھے کیا پتا...... مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں؟'' وہ مزید بے چارگی لہجے میں

سمو کر بولی۔

''آہم...... نو پرابلم...... ڈائی وورس...... وری سمپل...... اس مسئلے کا یہی حل ہے۔ ارے بھئی آپ نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے کہ جس کی سزا کے طور پر آپ کو ایسا شوہر ملا ہے جو آپ کے قابل نہیں ہے۔ آپ بہت زیادہ ڈیزرو کرتی ہیں عشاء اور یہ شخص آپ کو کچھ نہیں دے سکتا۔'' وہ پرجوش لہجے میں بولا۔

''عادل مجھے آسانی سے طلاق نہیں دیں گے۔ کبھی بھی نہیں۔'' وہ سر جھکا کر اپنے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے بولی اور دل ہی دل میں خود کو بے شمار گالیوں سے بھی نوازا۔

''ارے یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں...... میں آپ کو دلوادوں گا' طلاق...... آئی مین۔ میں آپ کی مدد کروں گا...... اگر میں زینب علی کی ساجد علی سے طلاق لینے میں ہیلپ کر سکتا ہوں تو پھر آپ تو میری...... آپ تو میری بہت اچھی فرینڈ ہیں۔'' وہ میز کی طرف جھک کر بولا۔

''وہ عورت تو بہت مظلوم ہے اور وہ حقیقتاً یہ ڈیزرو کرتی ہے کہ اسے ساجد علی جیسے شخص سے چھٹکارا دلوایا جائے مگر میں اس قدر انوسینٹ (معصوم) نہیں ہوں۔''

اس نے اپنی طرف سے آخری وار کیا۔

اسفند نے ایک بلند و بانگ قہقہہ لگایا۔

''زینب علی...... انوسینٹ؟'' اتنا کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگا۔

''مائی گاڈ عشاء...... شی از نوٹ انوسینٹ ایٹ آل...... آپ کو کیا پتا اس کو کس قدر پالش کیا گیا ہے۔ ایک نمبر کی کرپٹ عورت تھی۔ اپنے شوہر کو دھوکا دیتی رہی تھی۔ یہ تو اس کی شکل پر ہی لکھا تھا کہ وہ بدکردار ہے۔ اس نے اپنے منہ سے ہمارے سامنے اعتراف کیا تھا اس کے کسی آشنا نے اسے اس کے گاؤں سے بھاگنے کا موقع فراہم کیا تھا اب یہ اس کی گڈ لک تھی کہ یہ ہماری کوچ سے ٹکرا گئی۔ اب دیکھنا ہم اس کی قسمت کو کس طرح بدل دیں گے۔ امریکہ کا ویزا تو اسے ملا ہی سمجھو......''

وہ جیسے کوئی بہت دلچسپ کہانی سنا رہا تھا۔ عشاء کو اس شاندار شخصیت سے نہایت خوف محسوس ہوا۔

''یعنی...... یہ سب ڈرامہ تھا...... اس میں حقیقت نہیں تھی۔'' عشاء گہری سانس بھر کر بولی تھی۔ اس کے انداز پر اسفند مسکرایا۔

''آف کورس مائی ڈیئر...... شیکسپیئر کو تو پڑھا ہوگا نا دنیا ایک اسٹیج ہے یہاں یہی ہوتا ہے...... اگر یہ ڈرامہ نہ کرتے تو اس عورت کو اس کا حق کیسے دلواتے۔ ہم یہاں بیٹھے کس لیے ہیں۔ ہمیں تو فنڈز ہی مظلوم عورتوں کی وجہ سے ملتے ہیں بھئی۔''

وہ کمینی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ عشاء کو مزید سننے کی حاجت نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

''مرد محافظ نگراں ہیں عورتوں پر اس لیے کہ اللہ نے ان میں ایک کو دوسرے پر فضیلت دی اور اس



لیے کہ مردان پر اپنے مال خرچ کرتے ہیں تو نیک عورتیں اطاعت گزار ہوتی ہیں وہ خاوند کے پیچھے وفادار رہتی ہیں جس طرح اللہ نے وفاداری کا حکم دیا اور اگر انہیں عورتوں کی نافرمانی کا اندیشہ ہو تو انہیں سمجھاؤ اور ان سے الگ ہو جاؤ اور انہیں مارو (ضرب غیر شدید) پھر اگر وہ حکم میں آجائیں تو ان پر کوئی زیادتی نہ کرو۔ بے شک اللہ بڑا بلند ہے۔''

اس کے منہ سے گہری سانس خارج ہوئی۔ اخبار کے پہلے صفحے کے سب سے اوپر دی گئی اس آیت کا مفہوم وہ شاید کبھی اتنی اچھی طرح سے نہ سمجھ پاتی اگر اسی صفحے پر ہیڈ لائن سے اوپر دی گئی اس خبر سے بے خبر ہوتی جس میں زینب علی کا پردہ فاش کیا گیا تھا۔

تمام اخبارات نے ساجد علی کی پریس کانفرنس کو نمایاں کوریج دی تھی۔ گزشتہ چار پانچ ماہ سے وہ عورت جس طرح لائم لائٹ میں تھی اسی حساب سے اب اسے پھٹکار کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ حقیقت سامنے آتے ہی ''فلاح'' والوں نے تو معافی مانگ کر اپنی جان بچالی تھی۔

زینب کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ اب اس کے ساتھ مزید کیا ہونا تھا عشاء کو اس سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی دلچسپی اس عورت میں تب ہی ختم ہوگئی تھی جب اسفند رحیم کی زبانی اسے اس کے فراڈ ہونے کے بارے میں پتا چلا تھا۔

''حد ہوگئی...... میں ہارن دے دے کر تھک گیا اور یہاں تمہارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی...... ارے زوجہ اٹھو...... ہم آئس کریم کھانے جا رہے ہیں۔''

وہ نجانے کن خیالوں میں کھوئی تھی جب عادل اس کے قریب آ کر چلایا۔

اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آئی ایم سوری...... میں اخبار دیکھنے میں مگن ہوگئی۔ پتا ہی نہیں چلا۔''

وہ اس کے قدم سے قدم ملا کر باہر کی سمت آتے ہوئے بولی۔

عادل گیٹ لاک کرنے لگا تھا۔ اتنی دیر میں وہ گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ چکی تھی۔

''جو ہوا اچھا ہوا اور جو ہوگا اچھا ہی ہوگا۔ اب اخبار پڑھ پڑھ کر کڑھنے سے بہتر ہے تم ''ٹی وی دیکھنا شروع کردو...... سنا ہے بہت اچھے اچھے ڈرامے آتے ہیں آج کل۔

وہ مین گیٹ سے گاڑی نکالتے ہوئے بولا۔

''دفع دور...... میں نہیں دیکھتی ڈرامے ورامے...... اتنا برا وقت نہیں آیا ابھی مجھ پر۔'' عشاء ناک چڑھا کر بولی۔

عادل مسکرانے لگا۔ عشاء کو ایک ٹھیک ٹھاک کھڑاک سے گزرنے کے بعد احساس ہوا تھا کہ اللہ نے اسے بہت اچھا شریک سفر دیا ہے۔ عادل نے ایک بار بھی اسے اس کے گزشتہ رویے کی بدصورتی کا احساس دلانے کے لیے کچھ نہیں جتایا تھا۔ بلکہ وہ اس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگا تھا۔

آفس سے جلدی آجاتا تھا اور پھر سارا وقت اس کے ساتھ گزارتا تھا۔ عشاء نے جاب چھوڑ دی تھی مگر اس نے عادل کو اسفند کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ کس منہ سے کہتی کہ وہی اسفند رحیم جس کی وہ تعریفیں کرتے نہیں تھکتی تھی دراصل نہایت برا انسان ثابت ہوا تھا۔

"اب کن سوچوں میں گم ہو؟" اس کی طویل خاموشی سے اکتا کر عادل نے پوچھا۔ وہ بے وجہ مسکرا دی اور کوئی جواب دیے بغیر دوبارہ شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ عادل نے مسکراتے ہوئے اپنا بایاں بازو اس کے کندھوں کے گرد پھیلا لیا۔

"سب کچھ بھول جاؤ نا...... میں کبھی یہ نہیں جتاؤں گا کہ تم اس جاب کی وجہ سے مجھے اگنور کرتی رہیں یا مس بی ہیو کرتی رہیں یا بے وجہ ایک غلط شخص کی لچھے دار گفتگو سے متاثر رہیں...... سب بھول جاؤ...... جو ہوا سو ہوا...... ارے ہاں اس سے مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک چائنیز کپل کے یہاں جڑواں بچے ہوئے تو انہوں نے بچوں کے نام رکھے "جو ہوا" اور "سو ہوا" یعنی جو ہوا سو ہوا ہاہاہا...... لوگ کیسے کیسے لطیفے بنا لیتے ہیں نا۔"

وہ بہت محبت سے اپنے مخصوص انداز میں بات کر رہا تھا۔ جب کہ عشاء حیران ہو گئی اس کے زبردست قیاس پر۔ وہ اپنی بے وقوفی کے متعلق سوچ کر ہی تو پریشان تھی۔ سب سے بڑا دھچکا اسے عادل کے منہ سے اسفند رحیم کا نام سن کر لگا تھا۔ یعنی وہ جانتا تھا کہ عشاء اس وجہ سے پریشان ہے۔

"میں تو آپ کو بہت بے وقوف سمجھتی تھی عادل!" وہ بے ساختہ کہہ گئی۔

عادل نے بلاوجہ ایک اور قہقہہ لگایا پھر اس کے سر پر محبت سے ایک چپت رسید کر کے بولا۔

"اور میں تمہیں بہت عقل مند سمجھتا تھا۔" عشاء مسکرا دی۔

"ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکے اور ہم دونوں کے اندازے ایک دوسرے کے بارے میں غلط ثابت ہوئے۔"

وہ گاڑی آئس کریم پارلر کے باہر روک کر مزید گویا ہوا۔ عشاء نے گہری سانس بھری پھر بولی۔

"نہیں عادل...... آپ کا اندازہ درست تھا۔ میں بے وقوف ہوں مگر آپ سچ مچ ذہین واقع ہوئے ہیں۔ آپ کو بہت پہلے اندازہ ہو گیا تھا کہ "زینب علی" ایک فلاپ ڈرامہ ہے...... ہے نا...... ہے نا۔" وہ اس کی جانب مڑ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

آئس کریم پارلر کے گلاس ڈور سے ہی اندر موجود ہجوم کا اندازہ ہو رہا تھا۔ تب ہی وہ گاڑی میں بیٹھے رہے تھے۔

"ارے میری جان! آپ شرمندہ مت ہوں...... یہ صرف آپ کے ساتھ نہیں ہوا۔ بہت سے لوگ اس عورت کو مظلوم سمجھتے تھے۔ دراصل یہ ہماری قوم کی کمزوری ہے تم مانو یا نہ مانو مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں جب کوئی عورت رو رو کر اپنی زندگی کے المیوں پر روشنی ڈالتی ہے تو ایک زمانہ اس کی مدد کو آگے بڑھ آتا ہے۔ جب کہ ایک سو مرد مل کر بھی روئیں تو کوئی انہیں عورت کے مقابلے میں مظلوم نہیں سمجھتا۔"



وہ بہت نرم لہجے میں بات کر رہا تھا۔ تا کہ عشاء کو اپنا موقف سمجھا سکے۔

"حالانکہ ہمارا معاشرہ ایک میل ڈومینیٹڈ معاشرہ ہے۔ یقین کرو عشاء! اس دن فاطمہ بھابھی کی باتیں سن کر میرے ذہن کی بہت سی الجھنیں دور ہو گئیں۔ میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے۔ ہم اندھا دھند ایک غلط راستے پر چلے جا رہے ہیں ہم کیوں اپنے آپ کو بے کار کے مسئلوں میں الجھاتے ہیں۔ امریکہ بہادر ہمیں ایک نام نہاد صحت مند سوچ تحفتاً دان کر دیتا ہے اور ہم اس کے اوپر اپنا آپ قربان کر دینے کی حد تک سوچنے لگتے ہیں۔

ہم یہ بھی نہیں سوچتے کہ ان کا معاشرہ ہمارے معاشرے سے مختلف ہے اور ان کے مسائل کو اپنے مسائل مان کر ان پر کڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ فاطمہ بھابھی کی باتیں سن کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہمارے مسائل کا حل تو چودہ سو سال پہلے ہمیں ہماری کتاب میں بتا دیا گیا تھا پھر ہم کیوں اپنے مسائل کے لیے ادھر ادھر لڑھکتے ہیں۔

پچھلے جمعہ کو میں نے مولانا صاحب کے خطبے کو بہت دلجمعی سے سنا اور یقین کرو بہت سی باتیں پتا چلیں۔ میرے ذہن کی بہت سی رہیں کھلیں۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے جان بوجھ کر خود کو آگہی سے دور رکھا ہوا ہے۔ میں کسی امام مسجد کو دوست نہیں بنا سکتا اور میں خود میں اور کسی مذہبی اپروچ کے بندے میں بہت فرق محسوس کرتا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میں خود کو بہتر سمجھتا تھا مگر جب میں نے اپنا موازنہ ان لوگوں سے کیا تو مجھے وہ بہتر لگے۔

یہ این جی اوز جو ہمارے معاشرے میں ایسی سوچ انجیکٹ کرتے ہیں کہ عورت اور مرد کے درمیاں کھلی جنگ ہے اور فلاں فلاں یہ دراصل ہمارے دشمنوں کے آلہ کار ہیں۔ میں آج کل جس مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے جاتا ہوں وہاں کے امام بہت اچھے ہیں۔ میں ان سے اکثر مسئلے مسائل پر گفتگو کرتا رہتا ہوں انہوں نے مجھے ایک بہت گر کی بات بتائی۔

ایک دن باتیں کرتے کرتے کہنے لگے۔ "جس شخص کو عزت پیاری ہوتی ہے وہ کبھی بھی اس طرح سے دنیا کے سامنے آ کر واویلا نہیں مچاتا کیونکہ وہ خوف زدہ ہوتا ہے جب کہ جس شخص کے لیے عزت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی وہی پورے معاشرے کے سامنے اس طرح بلند و بانگ شور کرتا ہے۔"

وہ مزید کہنے لگے کہ عادل صاحب آپ خود سمجھ دار ہیں۔ اس مثال کو آپ ان "محترمہ" کے اوپر اپلائی کر کے دیکھیں۔ یہ خاتون خوف زدہ نہیں ہیں بلکہ نڈر ہو کر ایک ایسے ایشو پر بیان دیتی پھر رہی ہیں جس نے اسلامی پوائنٹ آف ویو سے وہ قطعاً ناواقف ہیں۔"

عادل بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا کیونکہ ان کی گاڑی دیکھ کر آئس کریم پارلر کا ویٹر آرڈر لینے آ گیا تھا۔

"ونیلا اور چاکلیٹ کرنچ۔" عادل نے آرڈر دیا۔

عشاء اب بھی اس کی جانب حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ اسے ہمیشہ لگتا تھا کہ عادل کی ذہنی اپروچ ابھی تک کھلنڈرے لڑکوں جیسی ہے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی باتیں عادل نے کی ہیں۔

''چلو اب ایسے مت دیکھو مجھے جیسے میں ہی آئس کریم ہوں۔'' وہ پھر ٹریک بدل کر بولا تھا۔

''آپ کو نہیں دیکھوں تو کس کو دیکھوں...... کسی اور کو دیکھوں گی تو گناہ ملے گا نا!'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

اس کے جواب نے عادل کو بہت لطف دیا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

''ارے واہ...... یہ ہوئی نا مسز عادل والی بات...... اب تو تمہیں دو کپ آئس کریم کھلانی پڑے گی۔'' وہ اسے چڑا رہا تھا۔

''ہاں پلیز...... مجھے دو ہی کھانی ہیں...... ایک ونیلا دوسری اسٹرابری...... دو ہی لا کر دیجئے اب......'' وہ بچوں کی طرح مچل کر بولی۔

''اچھا بابا...... لاتا ہوں مجازی خدا کے منہ سے کوئی عقل کی بات نہ سننا اسے مزدوری پر لگائے رکھنا۔'' وہ مصنوعی خفگی کا مظاہرہ کرتا گاڑی سے اتر کر باہر کی جانب چل دیا۔

عشاء نے مسکراتے ہوئے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

اسے خوشی تھی کہ وہ بھٹکنے سے بچ گئی۔ اس کی سوچ میں جو منفی رنگ آتا جا رہا تھا وہ اسے بھٹکانے کو کافی تھا۔ وہ خوش تھی کہ وہ اس منفی رنگ کے اثر سے باہر نکل آئی۔ اسے خوشی تھی کہ اسے اچھا سلجھا ہوا شریک سفر ملا۔ وہ خوش تھی کہ وہ ''فلاح'' سے نکلی تھی۔ مگر حقیقی ''فلاح'' کے راستے پر گامزن تھی۔

# عدم کا افسانہ ہے دنیا

**دارالامان میں ایک سنگدل عورت نے قرآن پاک شہید کر ڈالا۔**

لاہور (نامہ نگار) دارالامان میں ایک سنگدل عورت نے قرآن پاک کے ٹکڑے کر کے اسے شہید کر ڈالا۔ تفصیلات کے مطابق شہر کے نواحی علاقے میں موجود ایک دارالامان میں مساۃ ''ت'' نے نہ صرف قرآن پاک کی بے حرمتی کی بلکہ اللہ اور رسول ﷺ کی شان میں نازیبا کلمات بھی کہے۔ دارالامان کے حکام نے ''ت'' کو روکنے کی کوشش کی مگر ''ت'' نے حملہ کر کے ایک اہلکار کو زخمی کر ڈالا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ''ت'' اس قت نشے کی حالت میں تھی اور وہ پہلے بھی اللہ اور رسول کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کرتی رہی ہے۔ شہریوں نے اس واقعے پر احتجاج کرتے ہوئے ''ت'' کے خلاف سخت سزا کی اپیل کی۔ پولیس نے ملزمہ کو گرفتار کر کے واقعہ کی تحقیقات شروع کر دی ہیں۔

☆ ☆ ☆

''میں آج شام میں فارغ ہوں۔ میں چاہ رہا تھا کہ آپ بھی فارغ ہوں تو ڈنر کے لیے چلتے ہیں۔''

مناہل نے استعجاب آمیز حیرت میں گھر کر ہاتھ میں پکڑے کارڈلیس کو دیکھا۔ یہ خیال ہی بہت خوش کن تھا کہ جس کی موجودگی کو ہمہ وقت آس پاس محسوس کرتی تھی اس بے حد مصروف شخص کو ایک ڈیڑھ ماہ بعد ہی سہی مگر بہر حال اس کا خیال آ جاتا تھا۔

''اگر آج مصروف ہیں تو پرسوں کا پلان کر لیتے ہیں کیونکہ کل میں آپریشن تھیٹر میں مصروف ہوں۔''

اس کی لمحہ بھر کی خاموشی کو اس کی مصروفیت خیال کرتے ہوئے صفوان نے نئے سرے سے پروگرام ترتیب دیا۔

''نہیں۔'' اس نے قطعیت سے کہا پھر لمحہ بھر کا توقف کر کے بولی۔

''آج ہی چلتے ہیں۔ آپ سات بجے مجھے پک کر لیجئے گا۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہوا تو اس نے مسکراتے ہوئے کارڈلیس کو دور بیڈ پر پھینک دیا۔ وہ خود کاؤچ پر دونوں ٹانگیں سمیٹے لیپ ٹاپ گود میں رکھے بہت دیر سے اسی حالت میں بیٹھی تھی۔ اسے ہر حال میں ایک دارالامان کو چند مخیر حضرات کی جانب سے سلائی مشینوں کی فراہمی پر مشتمل یہ دستاویز صبح مسز شہلا قمر کی میز پر پہنچانی تھی اسی لیے وہ کافی دیر سے غیر ترتیب شدہ ڈیٹا کو مرتب کرنے میں مصروف تھی۔ ویسے تو وہ ہر کام میں اتنی ہی جانفشانی سے کرنے کی عادی تھی مگر جو کام ہیڈ آفس کی طرف سے اسے سونپا جاتا تھا وہ اس کام کو مزید محنت سے سرانجام دیتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا کوئی بھی کولیگ یا مسز شہلا قمر خود یہ سمجھیں کہ وہ اپنے اور ان کے بیچ رشتے کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہے اسی لیے وہ جب سے آفس سے واپس آئی تھی آفس ہی کے کام میں مصروف تھی لیکن پانچ منٹ کی ایک فون کال نے اس کی ساری توجہ کہیں اور مبذول کروادی تھی۔

''آج مصروف ہو تو پرسوں کا پلان کر لیتے ہیں۔''

مسکراتی آنکھوں اور متبسم ہونٹوں کے ساتھ اس نے بیڈ پر پڑے کارڈلیس کو نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے صفوان کی نقل اتاری۔ وہ کم گو تھا اور مناہل کو اس کی اس عادت سے سخت چڑ تھی۔

''مس مناہل مرتضٰی! آپ کے حصے میں ایک نہایت بور نگ شخص آیا ہے۔''

لیپ ٹاپ کو بند کر کے سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے خود کلامی کی۔ اس کا موڈ خوشگوار ہو چکا تھا' گھڑی کی سوئیاں چار کے قریب پہنچی تھیں سات بجنے میں بہت وقت باقی تھا مگر وہ سب چھوڑ چھاڑ کر وارڈروب کھول کر شام کو پہننے کے لیے ڈریس منتخب کرنے لگی بہت غور وخوض کے بعد اس نے نیوی بلیو رنگ کا لباس نکالا تھا۔ جب سے اسے پتا چلا تھا کہ صفوان کو یہ رنگ پسند ہے تب سے اس نے اس رنگ کے کافی ڈریسز خریدے تھے۔ کپڑوں کے انتخاب سے فارغ ہو کر وہ آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

ایک سال قبل جب صفوان کے نام کی انگوٹھی پہننے کا موقع آیا تھا تو اس نے گھر میں ایک ہنگامہ مچا دیا تھا وہ ابھی یا کبھی بھی شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ سوشیالوجی میں ماسٹرز کرتے ہی اس کے عزائم بہت بلند ہو چکے تھے۔ وہ خود کو عورتوں کے حقوق کی سب سے بڑی علمبردار سمجھنے لگی تھی۔ اس کے پاپا تو اس کی ہر روش سے محبت کرتے تھے مگر ممی اکلوتی بیٹی کی اس آزادانہ روش کو دیکھ دیکھ کر ہولنے لگتیں پھر ایک دن اکتا کر بہت غصے سے انہوں نے اپنے شوہر صاحب سے شکایت کر ڈالی۔

''آپ کی بیٹی عاصمہ جہانگیر بننے کے خواب دیکھ رہی ہے۔''

''ماشاءاللہ...... ماشاءاللہ...... اچھی بات ہے۔ بہت اچھی بات ہے۔''

وہ کیمسٹری کے پروفیسر تھے اور ان کی ساری دلچسپی نامیاتی غیر نامیاتی اصولوں اور فارمولوں تک محدود تھی۔ اس وقت تو انہوں نے بیٹی کو سراہ کر اپنی شریک حیات کا موڈ خراب کر دیا مگر اتفاق سے اسی رات انہوں نے ٹی وی کے کسی پروگرام میں متعلقہ خاتون کو دیکھ لیا۔

''میرا خیال ہے ہمیں مناہل کے لیے آئے ہوئے پروپوزلز کو سنجیدگی سے زیر غور لانا چاہیے۔''



صبح ناشتے کے وقت وہ اپنی بیگم سے کہنا نہیں بھولے تھے۔ اس طرح سے بہت چھان پھٹک کے بعد مناہل کی مرضی سے اس کے جملہ حقوق صفوان قمر کے نام منسوب کر دیے گئے۔ ماسٹرز کے دوران تھیسز اور پراجیکٹ کے سلسلے میں مناہل کا مسز شہلا قمر کی این جی او میں بہت آنا جانا تھا۔ انہیں نجانے اس کی کون سی ادا پسند آئی کہ اسے اپنے لائق فائق ہونہار بیٹے کے لیے پسند کر لیا۔ منگنی کے بعد وہ ان ہی کی این جی او کے ساتھ کام کرنے لگی تھی۔

منگنی سے پہلے اس کی صفوان قمر کے ساتھ صرف ایک باضابطہ ملاقات ہوئی تھی۔ وہ نیوروسرجن تھا۔ زندگی میں اس کی دلچسپیاں اور ترجیحات مناہل کی زندگی میں اس کی دلچسپیوں اور ترجیحات سے بہت مختلف تھیں مگر پھر بھی ایک چھوٹی سی انگوٹھی نے مناہل کو دنوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ اب کام کے علاوہ جو ایک نام اسے یاد رہا تھا وہ صفوان کا تھا۔ ہمیشہ اپنی مرضی کرنے والی مناہل اب چھوٹی چھوٹی باتوں میں صفوان کی رائے کو اہمیت دینے لگی تھی۔ ہمیشہ اپنے آپ کو کوئی سپر قسم کی چیز سمجھنے والی مناہل کو اب عام لڑکیوں کی طرح صفوان کی طرف سے موصول ہونے والے کارڈز گفٹس اور پھولوں کا انتظار رہنے لگا تھا۔

وہ صفوان کی طرف سے ملنے والی ہر دعوت پر نہ صرف لبیک کہتی تھی۔ بلکہ خاص طور پر تیاری بھی کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ڈیڑھ ماہ بعد ملنے والی یہ دعوت اور یہ شام اس کے لیے بہت خاص تھی۔ سات بجنے میں بیس منٹ ابھی باقی تھے جب وہ تیار ہو کر پورچ میں آ کھڑی ہوئی۔ پھپھو سے اجازت وہ پہلے ہی لے چکی تھی۔ مناہل کے ممی پاپا ایک ہفتہ قبل حج کے لیے جدہ روانہ ہوئے تھے۔ پھپھو مناہل کی تنہائی کے خیال سے ان کے یہاں رہ رہی تھیں۔ پورچ میں کھڑے کھڑے اسے اپنے موبائل فون کا خیال آیا جو چارج کے لیے لگا تھا وہ دوبارہ بیڈروم میں آ گئی۔ موبائل فون اٹھانے سے پہلے اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں ایک بار پھر برش چلایا ابھی وہ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر سراہنے میں مشغول تھی کہ موبائل کی بپ بجی۔ موبائل کی اسکرین پر مسز شہلا قمر کا نمبر آ رہا تھا۔ اس نے کچھ حیران ہوتے ہوئے موبائل کان سے لگا لیا۔ اس کا موڈ فون سننے کے بعد آف ہو گیا۔ وہ کافی دیر تک برے برے منہ بنانے کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے موبائل فون اٹھا کر کچھ نمبر پُش کیے تھے وہ صفوان کو کال کر رہی تھی۔

''ٹو ہیل ود یو مناہل...... ٹو ہیل ود یو۔''

سات بج کر دس منٹ پر دوبارہ کار پورچ میں کھڑی وہ خود کو کوس رہی تھی۔ اب اسے مسز شہلا قمر کے ڈرائیور کا انتظار تھا۔

☆ ☆ ☆

''میں کیوں ہوں...... ؟ دادو جی! مجھے کیوں پیدا کیا گیا؟'' اس نے ان کی گود میں بلکتے ہوئے سوال کیا۔ ان کے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے اس قسم کے سوالوں کے آگے خود کو بے بس محسوس کرتی تھیں ............ مسلسل پڑنے والے تھپڑوں کے باعث اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنسوؤں کی نمی کی وجہ سے بال رخساروں پر چپک گئے تھے۔ اسے تھپڑوں' ڈنڈوں' لاتوں سے مارا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا

ہاتھ دروازے میں آنے کے باعث بری طرح کچلا گیا تھا۔ اس کی دادو جی یہ حالت دیکھ کر ایک بار پھر آبدیدہ ہو گئیں۔ ایسے تو کوئی جانور بھی انسان کو نہیں رگیدتا ہوگا جیسے اس کے باپ نے اسے رگید ڈالا تھا۔

''ابو کو اگر مجھ سے اتنی نفرت تھی تو...... انہوں نے...... مجھے پیدا کیوں کیا...... وہ اگر مجھے...... دنیا میں نہ لاتے...... تو ہم دونوں سکون سے رہ سکتے تھے۔ وہ بھی...... اور میں بھی...... میرے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے دادو جی۔''

وہ ان کی گود میں سر گھسائے مسلسل سسک رہی تھی۔ اس کے لیے یہ مار پیٹ کوئی نئی بات نہیں تھی مگر اس مار پیٹ کے لیے اس کی ماں نے آج جو جواز گھڑا تھا وہ کم از کم اس کے لیے، بہت نیا تھا۔

اس کی زندگی کی کہانی وہی تھی جو سنڈریلا کی زندگی کی کہانی تھی فرق صرف اتنا تھا کہ سنڈریلا کی سوتیلی ماں کے مظالم اس لیے سہنا پڑے کیونکہ اس کی ماں مرگئی تھی جبکہ اسے اس لیے سوتیلی ماں کو برتنا پڑ رہا تھا کہ اس کی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی کیونکہ وہ اس کے باپ جیسے تنگ نظر مڈل کلاس عام آدمی کے ساتھ خوش نہیں تھی۔ ماں پاس رہی نہیں باپ پاس تھا مگر اس نے پاس آنا چھوڑ دیا۔ اسے دادو جی نے پالا تھا۔ اس کے ابو نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دینے کے دو ماہ بعد ہی دوسری شادی کرلی تھی۔ ابتدا میں اس کی سوتیلی ماں کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہوئی جب دو سال بعد عبیر ان کی گود میں آئی تو انہوں نے خود بخود اس کے خلاف ایک محاذ قائم کرلیا۔ انہیں اس کا وجود بہت بری طرح کھٹکنے لگا تھا۔

بچپن میں زیادتی کا زیادہ احساس اس لیے نہیں ہوتا کہ بچہ ہر ظلم وستم پر چیخ چلا کر احتجاج کر لیتا ہے۔ اور اس کی بھڑاس نکل جاتی ہے۔ وہ بہت بڑی بڑی باتیں بھی بہت آرام سے بھول جاتا ہے مگر شعور آنے کے بعد رو کر چلا کر اپنے غصے کا اظہار کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر اس انسان کے لیے، جس کی پروا کرنے والے اس کے ارد گرد موجود نہ ہوں۔ وہ ہر زیادتی کا بدلہ اپنے آپ سے لینے لگی۔ امی کی ڈانٹ تھپڑ کھا کر دادو جی کی گود میں آکر رو لینا اور پھر تھوڑی دیر بعد سب کچھ بھلا کر پھر سے اپنی ننھی منی دنیا میں گم ہو جانا...... یہی اس کے بچپن کی خوشگوار یادیں تھیں کیونکہ دادو جی ہر بار پٹ کر آنے کے بعد اسے اپنی بانہوں میں بھر لیتیں اس کے بالوں میں ہاتھ چلاتے ہوئے اس کے بدن کو سہلاتیں اور پھر اسے ننھے منے قصے کہانیاں سنا کر بہلا لیا کرتیں۔ وہ اس کے لیے اتنا ہی کر سکتی تھیں۔ جب ذرا بڑی ہوئی تو مکوں تھپڑوں کے ساتھ جو ایک اور چیز اسے ملنا شروع ہوئی وہ طعنے تھے۔

اسے اکثر ابو کے گھر آنے کے بعد پتا چلتا کہ آج اس نے امی کو کتنا ستایا ہے۔ اس نے عبیر کے نئے فراک کو قینچی سے کاٹ ڈالا ہے۔ کیونکہ وہ اس فراک میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس نے چھوٹے خرم کا فیڈر پی لیا ہے اس کا مقصد صرف اور صرف خرم کو بھوکا رکھنا تھا۔ امی کی ایسی باتیں سن کر وہ خوفزدہ ہو جاتی۔ اس وقت ابو حکمران ہوتے تھے اور امی ظالم فریادی۔ انصاف کا تقاضا پورا کرنے کے لیے اس کو مارنا ضروری ہوتا تھا۔

وہ مار کھانے کے لیے زندہ تھی یا زندہ رہنے کے لیے مار کھا رہی تھی۔ اسے بہت عرصہ تک سمجھ میں نہ آیا مگر وقت اس کی ناسمجھی کی وجہ سے رک نہیں سکتا تھا سو وقت گزرتا رہا اور وہ بڑی ہوتی گئی۔



اس کی اسکولنگ اس کی گھٹیا ڈریسنگ اور اس کا دوسرے درجے کا انداز پرورش یہ سب کچھ اس کی امی کے ایماء منشا کے تحت ہوا۔ ابو نے کبھی یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ ان کے دوسرے بچوں کی نسبت اتنی ڈل اور ڈنر کیوں ہے۔ اس کی رنگت جو بچپن میں اچھی بھلی صاف ہوا کرتی تھی اب اتنی زردی مائل کیوں ہوگئی ہے۔ اس کے کپڑے اتنے برے رنگوں کے کیوں ہوتے ہیں۔ اس کی مارکس شیٹس پر اتنے برے گریڈ کیوں ہوتے ہیں؟ یہ سوالات اس کے والدین کے سوچنے اور کرنے کے تھے مگر انہیں کوئی کام سوچ سمجھ کر کرنے کی عادت ہوتی تو شاید ان کے درمیان طلاق کی نوبت نہ آتی۔

عبیر ہر لحاظ سے اس سے بہتر تھی۔ ہر ایک کی توجہ لمحوں میں اپنی طرف مبذول کروا لینے والی۔ ان دونوں کی شخصیت میں بلا کا تضاد تھا۔ جس کی وجہ سے اکثر لوگ انہیں بہنیں ہی نہیں سمجھتے تھے۔ اس صورت حال میں امی کے چہرے پر عجیب سی استہزائیہ مسکراہٹ پھیل جاتی جو اسے پزل کر دینے کو کافی ہوتی تھی۔

دادو جی کے علاوہ اگر اس گھر میں کسی اور کو اس کا احساس تھا تو وہ اس کا بھائی خرم تھا۔ امی نے عبیر کی طرح خرم کے دل میں بھی سوتیلے پن کے جراثیم انجیکٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ زیادہ کامیاب نہیں ہو پائی تھیں۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس نے خرم کو گود میں کھلایا تھا۔ خرم جب پیدا ہوا تو وہ پانچ سال کی تھی۔ دادو جی کو بھی اپنے اکلوتے پوتے سے بہت محبت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ خرم عبیر کی نسبت اس سے زیادہ قریب تھا۔ وہ اپنے اسکول سے اکثر اس کے لیے چاکلیٹس وغیرہ لے آتا تو اس کی خوشی دیدنی ہوتی تھی۔ کیونکہ اس کے اپنے اسکول کی کینٹین میں اس قسم کی چیزیں نہیں ملتی تھیں۔ دراصل اس کے لیے اسکول کا وہی معیار دیکھا گیا تھا جو امی کے دل میں اس کا اور اس کی محبت کا تھا۔ ان سارے حالات میں اگر ابو پہلی اولاد ہونے کے باعث کچھ توقعات لگا رہے تھے تو یہ سراسر ان کی غلطی تھی۔

اس کی زندگی نے پندرہ سال تک یہی چلن اپنائے رکھا۔ اس عمر کو پہنچنے تک وہ ہر چیز برداشت کرنا سیکھ گئی تھی۔ ابتدا میں طعنے برداشت کرنا بہت مشکل لگتا تھا مگر جب طعنوں کے ساتھ الزام بھی لگنے لگے تو احساس ہوا طعنے برداشت کرنا تو بہت عام سی بات ہے۔

بات سچ مچ بہت عام سی تھی۔ محلے میں سے ایک بڑی عمر کی خاتون اس سے اپنے بیٹے کو خط لکھوانے آئی تھیں۔ وہ عرصہ دراز سے کراچی میں مقیم تھا اور اس نے ماں کی خیر خبر نہ لی تھی۔

''میرے پیارے اختر! مجھے تمہاری بہت یاد آتی ہے۔ تم کب مجھ سے ملنے آؤ گے۔''

پہلا فقرہ انہوں نے یہی لکھوایا تھا اور امی نے بھی شاید یہی فقرہ سنا تھا۔ اس کے بعد مزید کچھ سننے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ انہوں نے اس کے ہاتھ سے کاغذ چھین کر واویلا مچانا شروع کر دیا۔ اس کی ہر تر دید سے ان کے دل میں یہ خیال پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ وہ بگڑ چکی ہے اور اس نے اتنی سی عمر میں لڑکوں سے خط وکتابت شروع کر دی ہے۔ ان کے اس قدر برافروختہ ہو جانے سے بیٹے کو خط لکھوانے والی اماں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے واپس چلی گئی تھیں۔ دادو جی کی طرح وہ بھی ترس کھانے کے علاوہ اس کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

ابو کے گھر آنے پر امی نے اس کی یہ محبت بھری چٹھی ان کے سامنے رکھ دی۔ اس کے بعد اسے طلب

کیا گیا۔

''ابو! میں نے کچھ نہیں کیا...... میری غلطی نہیں ہے۔ ابو!''

ان کے غصے سے خائف ہو کر وہ اپنی صفائی دیتے ہوئے بولی۔

''میں جانتا ہوں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے...... غلطی میری ہے...... میرے نصیبوں کی ہے جو میرے گھر تمہارے جیسی اولاد پیدا ہوئی۔''

انہوں نے اپنے پاؤں سے بھاری سلیپر اتارتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد بھی وہ مسلسل بولتے رہے تھے۔ مگر کمرے میں سلیپر کی آواز تھی اس کے بلکنے اور سسکنے کی آواز تھی۔ ایک گھنٹے کے بعد ہر طرف سکوت چھا گیا۔ دادو جی بہت مشکل سے اسے گھسیٹ کر اس کے کمرے تک لا پائی تھیں۔ اس رات وہ بہت روئی تھی بہت واویلا کیا تھا بہت واسطے دیے تھے مگر اس کی پکار سننے والا کوئی نہیں تھا یا شاید پکار سننے والے تو بہت تھے مگر جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

''مجھے آج ہی تطہیر رحمان سے ملنا ہے۔''

اس نے اب کی بار زرا...... غصہ سے اس گھنی مونچھوں والے موٹے حوالدار سے کہا اس کی بتیسی اندر جانے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بظاہر وہ سبزی مائل رنگ کی فائل میں سر گھسائے کچھ لکھنے سڑ سڑ کر کے چائے پینے میں مصروف تھا مگر ہر سات آٹھ منٹ بعد وہ مناہل کو بغور جائزہ لے کر سر جھکا لیتا۔ مناہل نے سیاہ چادر بہت اچھی طرح سے لپیٹ رکھی تھی لیکن اس کے باوجود اسے اس ماحول میں عجیب سی الجھن ہو رہی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس جگہ کا ماحول برا ہوگا مگر اتنا برا ماحول وہ توقع نہیں کر رہی تھی۔

''بی بی! میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ سیف اللہ صاحب تفتیش کر رہے ہیں۔''

مناہل کی بات پر اس حوالدار نے بتیس دانتوں کی دوبارہ نمائش کرتے ہوئے کہا۔ اس کا جی چاہا اس بات پر اس شخص کو خوب جلی کٹی سنائے مگر اسے خاص طور سے تاکید کی گئی تھی کہ اس جگہ کسی قسم کا تماشا کھڑا نہیں ہونا چاہیے اسی لیے وہ غصہ کرنے سے احتراز برت رہی تھی۔

''کیا آپ مہربانی فرما کر مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ کے سیف اللہ صاحب اس تفشیش کا اختتام کب کریں گے۔''

اس نے طنزیہ انداز میں اس خرانٹ شکل والے حوالدار کو گھورتے ہوئے کہا۔

''او بی بی! وہ سر پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگا پھر ہنس چکا تو بولا۔

''صاحب لوگ اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں۔ جب خواتین سے تفتیش کرتے ہیں تو اس کا اختتام اپنی مرضی سے کرتے ہیں۔''

''کیا آ آ......؟'' وہ ایک دم سے اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایسی ویسی کوئی بات تو اس کے ذہن میں بھی نہیں آئی تھی۔ اس کے یہاں پہنچنے کے بعد مسز شہلا قریشی قمر کا دو بار فون آ چکا تھا لیکن تطہیر رحمان



سے اس کی ملاقات ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ حوالدار کی بات سننے کے بعد اسے اپنے غصے پر قابو نہیں رہا تھا۔ وہ لکڑی کے بنے دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہو گئی۔

میز کے دوسری طرف وردی میں ملبوس وہ شخص جو بھی تھا کافی اکتایا ہوا لگ رہا تھا۔ مناہل کو دیکھ کر وہ گڑبڑایا نہیں تھا بلکہ اس نے تحیر سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کاٹ تھی جس نے مناہل کو مزید تاؤ دلا دیا۔ اس آفیسر کے سینے پر اس کے نام کا بیج لگا تھا وہ سیف اللہ صاحب ہی تھے۔

''مجھے تطہیر رحمان سے ملنا ہے بلکہ مجھے اسے اپنے ساتھ لے جانا ہے۔ بیل پیپرز (ضمانت کے کاغذات) میں آپ کے ماتحت کو دے چکی ہوں اور امید ہے کہ آپ کو فون بھی آ چکا ہوگا۔''

وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔ اس آفیسر نے بہت تحمل سے اس کی بات سنی پھر کرسی کی سمت اشارہ کر کے بولا۔

''آپ بیٹھیے پلیز!''

''میں پچھلے آدھے گھنٹے سے بیٹھی ہوں اور میں مزید نہیں بیٹھ سکتی اگر میرے بیٹھنے کا کوئی فائدہ ہے تو......''

''بی بی! آپ ہتھیلی پہ سرسوں جمانے والی بات کیوں کر رہی ہیں۔ آخر ہمیں بھی اوپر جواب دینا ہوتا ہے۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر انتہائی سرد انداز میں بولا۔ مناہل کو حوالدار کے ''بی بی'' کہنے پر اتنا غصہ نہیں آیا تھا جتنا اس شخص کے ''بی بی'' کہنے پر آیا تھا۔

''میں ہتھیلی پہ سرسوں جمانے کی بات نہیں کر رہی مگر آپ مجھے یہ بتائیے کہ یہ سارا پولیس ڈپارٹمنٹ آخر کس مرض کی دوا ہے۔ آپ لوگ یہاں بیٹھے سارا دن کرتے کیا ہیں؟ لوگوں کے جان و مال کی حفاظت آپ سے ہو نہیں سکتی اور عزت کی حفاظت آپ کر نہیں سکتے۔ میں اتنی دیر سے باہر بیٹھی بکواس کر رہی ہوں کہ مجھے اس عورت سے ملنا ہے۔ وہ...... آپ کا اسٹوپڈ حوالدار کہتا ہے کہ صاحب تفتیش کر رہے ہیں اور یہاں صاحب فرما رہے ہیں کہ ضابطے کی کاروائی بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور...... پھر آپ کہتے ہیں آپ کو اوپر بھی جواب دینا ہوتا ہے...... کس کو......؟ اوپر کون ہے......؟ کس سے ڈرتے ہیں آپ......؟ میرا تو خیال ہے پولیس ڈپارٹمنٹ اللہ سے بھی نہیں ڈرتا......''

''شٹ اپ...... کیا سمجھتی ہیں آپ اپنے کو...... ونی منڈیلا کی کاربن کاپی۔''

وہ شخص اس کی بات کاٹ کر اتنے غصے سے بولا کہ باہر سے سپاہی بھی بھاگ کر اندر آ گیا پھر صاحب کو ''موڈ'' میں دیکھ کر فوراً واپس چلا گیا۔ سیف اللہ نے اپنے سامنے پڑی فائل اٹھا کر اس کے سامنے میز پر پٹخی۔

''یہ کاغذات آپ کی طرف پیش کیے گئے ہیں۔ ان پر آج کی تاریخ میں ساڑھے گیارہ بجے سائن کیے گئے تھے۔ اب آپ یہ دیکھیے۔''

''اس نے ٹیلی فون سیٹ کا رخ گھما کر اس کی طرف کیا پھر وہ سی ایل آئی کے نمبر پیش کرنے لگا۔

''یہ دیکھیے...... بارہ...... ساڑھے بارہ...... بارہ چالیس...... سوا ایک...... ایک انچاس...... دو......

پھر اڑھائی...... پھر ساڑھے تین...... پھر سوا چار...... پھر چار پچاس...... پھر چھ اکیس...... پھر سات...... اور سات سے لے کر اب آٹھ چالیس تک ایک درجن سے زیادہ فون آ چکے ہیں کہ اس عورت کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑنا۔''

''اور اب اس پر دیکھیے۔'' اس نے اپنی جیب سے موبائل فون نکال کر اس کے سامنے رکھا۔

''میرے ذاتی موبائل پر بھی کم وبیش اتنے ہی فون آ چکے ہیں کہ ضمانت کے کاغذات آ بھی جائیں تب بھی کم از کم آج کی رات اس عورت کو نہیں چھوڑنا۔ آپ کی پارٹی مضبوط ہے تو ان کی پارٹی بھی کسی سے کم نہیں ہے جس دارالامان میں یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ اس دارالامان کو چلانے والی محترمہ ایک ایم این اے کی منظور نظر ہے۔ وہ کسی صورت ملزمہ کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ جب آپ لوگوں نے بیل پیپرز پر دستخط لیے تو ہم لوگ بھی کورٹ کے باہر موجود تھے۔ آپ لوگوں کو پانچ منٹ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو ہم مزید ریمانڈ لینے میں کامیاب ہو جاتے لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ ایسا ہو جاتا تو یقیناً مجھے خوشی ہوتی کیونکہ یہ حدود کا مقدمہ ہے...... غلطی کرنے والے کو سزا ضرور ملنی چاہیے اور کڑی سزا ملنی چاہیے لیکن......''

اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ ذہنی اضطراب کی نجانے کون سی حد پر تھا کہ اسے سب کچھ بتائے چلا جا رہا تھا۔

''ہمیں کسی سے ذاتی دشمنی نہیں ہے ہمیں کسی کو بے وجہ اپنا مہمان بنائے رکھنے کا بھی شوق نہیں ہے۔ لیکن ہم مجبور ہیں کیونکہ یہ معاملہ جن لوگوں کے درمیان ہے ان کی اپروچ بہت آگے تک ہے۔ ان کی آپس میں دشمنیاں بھی ہیں اور انہیں ایک دوسرے کو مہمان بنائے رکھنے کا بھی شوق ہے۔ آپ کی مسز شہلا قمر اس وقت دارلپناہ کی صفیہ صفدر کے آفس میں موجود معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ان کے آفس میں اس وقت دو ایم این اے ایک مشہور سیاسی رکن جو اس وقت حکومت کا حصہ نہیں ہے مگر پھر بھی پاور میں ہے۔ اس کے علاوہ دو مشہور وکیل ہیں۔ وہ سب معاملے کو سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی ہدایت کے بغیر میں کوئی حکم کیسے جاری کر سکتا ہوں۔ جب تک ہمیں وہاں سے آرڈر نہیں مل جاتے ہم کچھ نہیں کر سکتے...... ہم آزاد ہیں...... مگر ہم آزاد نہیں ہیں۔''

وہ خاموش ہوا تو مناہل کو ایسا لگا جیسے وہ دوبارہ بہت دیر تک بول نہیں سکے گا۔ اس کے چہرے پر سچ مچ ایک عجیب سی تھکن اور پژمردگی نے ڈیرا ڈال لیا تھا۔

''اس ملک کا قانون اندھا ہی نہیں ہے بلکہ مکمل طور پر اپاہج ہو چکا ہے۔ ہمارے شکنجے میں برائی ہونی چاہیے لیکن ہم خود برائی کے شکنجے میں ہیں...... آپ کے کہنے پر میں تطہیر رحمان کو چھوڑ دیتا ہوں...... آپ مجھے میری نوکری کی ضمانت دیجیے۔''

''آئی ایم ساری آفیسر! لیکن میں......'' مناہل کی خود سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ سیف اللہ صاحب اس کو شش وپنج میں دیکھ کر استہزائیہ انداز میں ہنسے۔

''آپ کو ایکسکیوز کرنے کی ضرورت نہیں ہے...... شرمندہ ہونے کی بھی کوئی ضرورت نہیں......



دراصل آپ جیسے لوگ جو یونی ورسٹیوں کالجوں سے پانچ پانچ چھ چھ ماہ پہلے پاس آؤٹ ہو کر آتے ہیں وہ اسی طرح جذباتی ہوتے ہیں جیسے آپ ہو رہی ہیں۔ آپ لوگوں کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ کس قسم کا گورکھ دھندا ہے۔ یہاں انصاف کو کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟ کھرا کھوٹا کیسے ہو جاتا ہے اور کھوٹا کھرا کیسے کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب آپ کو اتنی جلدی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ آپ مزید تین سال اس سسٹم کا حصہ رہیں گی تو آپ کو ہر بات سمجھ میں آ جائے گی پھر آپ کسی پولیس آفیسر کے سامنے اس طرح نہیں بھڑکیں گی جس طرح آپ میرے سامنے بھڑک اٹھی تھی۔ اور پھر آپ کو کسی کے سامنے اس طرح ایکسکیوز نہیں کرنا پڑے گا جس طرح آپ میرے سامنے کر رہی ہیں۔''

وہ ابھی بہت کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر فون کی گھنٹی نے گفتگو کا تسلسل توڑ ڈالا۔ اس سے پہلے مناہل کا واسطہ کبھی اس قسم کے آفیسر سے نہیں پڑا تھا بلکہ اس کا واسطہ کسی بھی پولیس آفیسر سے نہیں پڑا تھا۔ اس لمحہ وہ اپنے آپ کو سچ مچ چغد محسوس کر رہی تھی۔ وہ فون پر بات کر ہی رہا تھا کہ مناہل کے اپنے موبال کی بپ بجی۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں سے مناہل کو اشارہ کیا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ ''دیکھا میں کہہ رہا تھا نا۔''

مسز شہلا قمر فون پر تھیں۔ وہ اسے ضروری ہدایات دے رہی تھیں۔

ان کی ساری باتیں اسے کس قدر الجھا رہی تھیں۔ اس سے پہلے آفس کی طرف سے ایسی ذمہ داریاں اسے نہیں سونپی گئی تھیں فون بند کر کے وہ سیف اللہ...... کی طرف متوجہ ہوئیں۔ وہ اس کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک جلی ہوئی مسکراہٹ کی پرچھائیں تھیں۔ اس نے دوبارہ مناہل کو نشست سنبھالنے کے لیے اشارہ کیا۔ وہ چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

''مبارک ہو...... تصفیہ ہو گیا ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ''کیا آپ جاننا چاہتی ہیں کہ تصفیہ کیسے ہوا۔''

مناہل خاموش رہی۔ اس کا خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔ سیف اللہ نے اسے خود ہی بتانا شروع کیا۔ معاملہ کتنے میں طے ہوا؟ پولیس ڈپارٹمنٹ کو کتنا ملا۔ اس کی اپنی جیب میں کتنا گیا؟ پھر اس نے سپاہی کو بلا کر مطلوبہ لڑکی کو بلانے کو کہا۔

اس کے بعد اس نے فائل نکال کر اس کا سرسری جائزہ لیا پھر ایک نظر مناہل کو دیکھا پھر وہ دوبارہ فائل پر نظر ڈالی۔ اس کے بعد اس نے دیکھتے ہی دیکھتے فائل کے ٹکڑے کر ڈالے تھے۔

''یہ ہے ایک اسلامی ملک اور یہ ہے اس اسلامی ملک کا قانون۔''

وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا لیکن مناہل نظر اٹھا کر اسے دیکھنے کے بھی قابل نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

''میرا نام مناہل ہے...... مناہل مرتضیٰ۔'' کار پورچ سے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ مسز شہلا قمر کا ڈرائیور ان دونوں کو یہاں ڈراپ کر کے گیا تھا۔ ان ہی کے کہنے پر ڈرائیور کی موجودگی میں اس نے تطہیر رحمٰن کو مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے گھر کے گیٹ سے اندر

داخل ہونے کے بعد خود کو متعارف کروایا۔ تطہیر نے اسے مخاطب کرنے یا مسکرانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وہ سر سے پیر تک بھورے رنگ کی ملگجی سی چادر میں ملفوف تھی۔

''یہ میرا گھر ہے۔ جب تک آپ کی رہائش کا کہیں اور بندوبست نہیں ہو جاتا آپ یہاں میرے ساتھ رہیں گی۔''

لاؤنج میں داخل ہو کر مناہل نے اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔ فی الحال وہ اس کے بارے میں کوئی بھی رائے قائم نہ کر سکی۔ اس کا حلیہ میلا میلا سا تھا۔ شاید اس نے بہت دن سے منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ مناہل اسے لے کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

''یہاں آپ اطمینان سے رہیے کوئی آپ کو ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ اس گھر میں میرے اور میری پھپھو کے علاوہ صرف ملازم ہیں اور ملازم آپ کی مرضی کے بغیر آپ کو مخاطب کرنے کی کوشش بھی نہیں کریں گے۔''

وہ اس سے کہتے ہوئے بیڈروم کا دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔

''آپ کو بھوک لگی ہوگی؟ آپ فریش ہو جاؤ میں کھانا لاتی ہوں۔''

اب اس کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا۔ تطہیر کے لیے کپڑے نکال کر بیڈروم پر رکھے پھر سیڑھیاں اتر کر لاؤنج میں آ گئی۔ کن اکھیوں سے پھپھو کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ کچن میں آ گئی۔ پھپھو کو وہ یہی بتا کر گئی تھی کہ صفوان کے ساتھ ڈنر کے لیے جا رہی ہے اس لیے اس درجہ احتیاط برتنا پڑ رہی تھی۔ ملازمہ سے بھی کھانے کے لیے کہہ نہیں سکتی تھی۔ وہ خود ہی ٹرے میں چیزیں رکھنے لگی۔

''باجی! آپ کھانا کھاؤ گے؟'' پروین نے اس کے پیچھے سے آ کر لمحہ بھر کو ڈرا دیا تھا۔ وہ ان کے چوکیدار کی بیوی تھی اور پھپھو کے سو جانے تک ان کے پاس ہی بیٹھی ہوتی تھی۔

''پھپھو سو گئیں؟'' اس نے پروین کی بات کا جواب دیے بغیر استفسار کیا۔

''ہاں جی!'' اس کا تحیر دور نہیں ہوا تھا۔ وہ ''باجی'' کے خاص الخاص ڈنر اور اس کی تمام تیاریوں سے بخوبی واقف تھی۔

''کھانا گرم کر کے گیلری والے کمرے میں لے آؤ۔'' پھپھو کے سو جانے کا سن کر وہ کافی مطمئن ہو گئی تھی۔ انہیں اگر پتا چل جاتا کہ ان کی بھتیجی پولیس اسٹیشن سے ہو کر آئی ہے تو وہ اس سے کچھ نہیں کہتیں مگر جدہ فون کر کے ساری رام کہانی کو دو سے دو مرتبہ ضرب دے کر اس کے والدین کو سنا دیتیں اور اسی چیز سے مناہل بچنا چاہتی تھی سو محتاط رہنا لازم تھا۔

''ہائیں باجی......! گیلری والے کمرے میں؟'' پروین کی باتیں اس کا موڈ خراب کرنے کے لیے کافی تھیں اور یوں بھی اسے وہ ڈنر یاد آ رہا تھا جو ناگزیر وجوہات کی بنا پر موخر ہو گیا تھا۔ وہ پروین کی بات کا جواب دیے بغیر دوبارہ سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے تک آ گئی۔ کپڑے اٹھا کر اس نے اس کمرے کا رخ کیا جہاں تطہیر رحمان تھی۔ وہ منہ ہاتھ دھو چکی تھی۔ اور بستر پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے فوراً ٹانگیں سمیٹ



لیں۔

''یہ کپڑے بھی تبدیل کر لو۔'' مناہل نے بے تکلفی سے کہتے ہوئے کپڑے بستر پر رکھ دیے۔ وہ کن اکھیوں سے اس کا جائزہ بھی لے رہی تھی اور اس کے لیے مناسب سا ٹائٹل بھی سوچ رہی تھی۔

''عام...... بہت عام...... عام سے بھی عام لڑکی۔''

اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا تھا۔ چند لمحوں بعد پروین کھانا لے کر آئی تو تطہیر کو دیکھ کر اس کی آنکھیں مزید پھیل گئیں مگر مناہل کے چہرے پر پھیلی سختی دیکھ کر وہ خاموشی سے باہر چلی گئی۔ مناہل نے ٹرے تطہیر کی طرف بڑھا دی پھر اسے جھجکتا دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ کھانا کھاؤ...... میں چلتی ہوں۔'' وہ دروازے کی سمت آئی پھر کچھ یاد آ جانے پر مڑی۔

''کمرے میں لحاف موجود ہے لیکن اگر اور لحاف چاہیے ہو تو اس کیبنٹ میں موجود ہے۔''

اس نے الماری کے نیچے بنے کیبنٹ کی طرف اشارہ کیا۔

روم ہیٹر پہلے ہی آن کر چکی تھی جس کی بدولت کمرے کا خنک ماحول کسی حد تک گرم ہو چکا تھا۔ اپنی طرف سے اچھے میزبان کی تمام ذمہ داری نباہ کر وہ جانے لگی جب تطہیر نے اسے پہلی مرتبہ پکارا۔ اس کی آواز بہت خوبصورت تھی...... نرم ملائم احساس لیے ہوئے۔

''مجھے جائے نماز چاہیے۔''

مناہل نے آنکھیں سکیڑ کر حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر تطہیر کا جھکا ہوا سر دیکھ کر استہزائیہ سی مسکراہٹ آ گئی۔

''خاتون کافی سے زیادہ ذہین واقع ہوئی ہیں۔ ایک نہایت مشرکانہ حرکت کے لیے کی جانے والی نہایت مسلمانہ کوشش۔''

☆ ☆ ☆

''اللہ میاں جی! پلیز...... پلیز اللہ میاں جی۔''

مصلے پہ بیٹھی وہ آنکھیں بند کیے دیر سے ایک ہی دعا کرنے میں مصروف تھی۔ منہ سے صرف وہ اللہ کو پکارتی تھی اور باقی دعا دل میں کر رہی تھی۔ آج اس کا رزلٹ اناؤنس ہونے والا تھا۔ اس کی اس رزلٹ سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ اس رزلٹ کو لے کر بہت آگے جانے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کا رزلٹ اچھا ہوتا تو وہ اپنے امی ابو پر ثابت کر سکتی تھی کہ وہ اتنی بیکار نہیں ہے جتنا وہ اسے سمجھتے ہیں۔

''میں نے آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگا اور اگر کبھی مانگا تو آپ نے مجھے دیا نہیں لیکن میں کوئی شکوہ نہیں کروں گی...... اللہ میاں جی...... میرے پیارے اللہ جی...... مجھے نمبرز دے دیجیے گا۔ مجھے اے گریڈ چاہیے...... پلیز اللہ میاں جی!''

وہ آگے پیچھے ہلتے ہوئے دعا مانگ رہی تھی۔ خرم اس کا اور عبیر کا رزلٹ معلوم کرنے کے لیے قریبی اسٹال تک گیا تھا۔ عبیر اس سے چھوٹی تھی مگر وہ دونوں ہم جماعت تھیں۔ کیونکہ میٹرک میں برا گریڈ لانے کے

باعث اس کی پڑھائی ختم کروادی گئی تھی۔ اس کے امی ابو نے اتنے برے نتیجے کی ساری ذمہ داری اس پر ڈال دی تھی۔ اس کی امی بھول گئی تھیں کہ وہ امتحانات میں روٹین سے دوگنا کام کرواتی تھی۔ اس کے ابو بھول گئے تھے کہ امتحان سے کچھ دن قبل انہوں نے اس پر بے جا شک کرتے ہوئے اس کو روئی کی طرح دھنک ڈالا تھا۔ انہیں یاد رہا تھا کہ وہ ان کے کسی گناہ کی سزا ہے اور وہ صرف اس لیے پیدا کی گئی ہے۔ کہ ان کی ٹینشن میں ہر آنے والے دن کے ساتھ اضافہ کر سکے۔ اس نے پڑھائی چھڑوائے جانے پر کوئی شکوہ نہیں کیا تھا کیونکہ وہ خود بھی اتنے برے رزلٹ سے دلبرداشتہ ہوگئی تھی۔ اسے لگا تھا کہ وہ زندگی میں کبھی بھی کچھ نہیں کر پائے گی۔

اس کے بعد اس نے دو سال گھر میں فارغ ہی گزار دیے تھے۔ دادو جی اسے دیکھ کر کڑھا کرتی تھیں کیونکہ اس کی زندگی میں کھانے پکانے کپڑے دھونے اور اسی طرح کے دوسرے کاموں کے علاوہ کوئی اور دلچسپی تھی ہی نہیں۔

اس ساری صورت حال سے تنگ آ کر دادو جی نے اپنی کسی جاننے والی کے مشورے پر اسے کچھ کتابیں لا دی تھی۔ وہ کتابیں نصاب کی کتابوں سے مختلف تھی اور اسی لیے ٹین ایج سے نکلتی ہوئی کسی بھی لڑکی کے لیے ان کتابوں میں سیکھنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ شروع میں وہ اتنی دلچسپی سے نہیں پڑھ رہی تھی مگر پھر نسیم حجازی کی داستانوں اور ڈپٹی نذیر احمد کے ناولز میں کچھ کچھ دلچسپی ہونے لگی تھی۔

اس کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے دادو جی نے محلے میں رہنے والی ایک پڑھی لکھی خاتون سے مشورہ کر کے اس کے لیے کچھ اور کتابیں خرید دی تھیں۔ یہ کتابیں اسے پہلی کتابوں کی نسبت زیادہ پسند آئی تھیں۔ خواتین مصنفین کا لکھا ہوا پڑھنے میں زیادہ مزہ آتا تھا اور ایک بات جو اس نے ان کتابوں سے سیکھی وہ یہ تھی کہ برا وقت ایک دن اختتام کو ضرور پہنچتا ہے اور برائی ختم ہو کر رہتی ہے۔ اس نے سیکھا کہ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور ہوتی ہے۔ اور یہی خصوصیت اسے انعام دلوانے کا باعث بنتی ہے۔ اس کو اسی انعام کا انتظار تھا۔ اس کی امید جو ختم ہوگئی تھی ایک بار پھر سے بیدار ہونے لگی۔ اسے احساس ہوا کہ زمانے کے ساتھ چلنے کے لیے تعلیم کا ہونا کتنا ضروری ہے۔ پڑھائی چھوڑنے کے دو سال بعد اسے اچانک پھر سے پڑھائی میں دلچسپی پیدا ہونا شروع ہوئی تھی۔

اس نے تقریباً ہر ناول میں جو ایک مشترک بات دیکھی تھی وہ Poetic Justice تھی' اس کی عمر خواب دیکھنے کی تھی اور خواب دیکھنے پر اس کے والدین پہرہ نہیں لگا سکتے تھے۔

اس Poetic Justice نے اس کے خوابوں کو نئی راہ دکھائی تھی۔ اسے اپنے خوابوں کی تعبیر اپنے ہاتھ میں دکھائی دینے لگی تھی۔

''جب سب کے ساتھ اچھا ہو سکتا ہے تو میرے ساتھ کیوں نہیں۔''

یہی سوچ کر اس نے پرائیویٹ ایف اے کرنے کا ارادہ کیا تھا تب اس سے دو سال چھوٹی عبیر بھی اسکول سے پاس آؤٹ ہو چکی تھی۔ اس کے نہایت شاندار نمبروں کی بدولت اس کا ایڈمیشن کینرڈ کالج میں ہوا



تھا۔ وہ اپنی چھوٹی بہن جیسی قابل اور ذہین نہیں تھی مگر اتنی کند ذہن بھی نہیں تھی کہ ایف اے نہ کر پاتی۔ اس نے بھی نہایت ذوق وشوق سے گھر میں ہی پڑھائی کا دوبارہ آغاز کیا تھا۔ دادو جی کی دعائیں اور استانی جی کی رہنمائی قدم بہ قدم اس کے ساتھ تھی۔

سارا دن...... گھر کے کاموں کی مشقت کے بعد وہ جب کتابیں کھولتی تھی تو مشکل نصاب اسے الجھانے لگتا تھا مگر دل میں چھپی کوئی ایک آدھ ننھی کرن اسے ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتی اسے حوصلہ دیتی محسوس ہوتی۔ کتابوں اور داخلے کے لیے روپے اسے دادو جی نے دیے تھے۔ اس نے داخلہ بھجوانے کے بعد بہت یکسوئی سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ وہ راتیں اس کے لیے بہت تھکا دینے والی تھی۔

اس نے وہ سب کیسے کیا تھا صرف وہی سمجھ سکتی تھی اور اس کے بعد وہ رزلٹ آ جانے تک بہت خشوع وخضوع سے دعا مانگتی رہی تھی لیکن ہر بار کی طرح اس کی یہ دعائیں بھی قبول نہیں ہوئی تھیں وہ فیل ہوگئی تھی اور عبیر نے اس بار بھی بہت شاندار نمبر لیے تھے۔

خرم نے جب آ کر اسے اس کا رزلٹ بتایا تو اسے لگا تھا جیسے وہ مرگئی ہے۔ امتحان میں ناکام ہو جانا اتنی بڑی بات نہیں ہوتی لیکن جس انسان کے لیے امتحان میں کامیاب ہو جانا ہی زندگی ہو اس کے لیے یہ ناکامی بہت بڑی بات تھی۔ وہ زاروقطار رونے لگی تھی۔ اس کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ روتے روتے وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی تھی۔ پھر اس نے جھک کر نیچے بچھی ہوئی جائے نماز کھینچ کر دور پھینک دی۔ اس کی اہمیت وحیثیت کیا تھی شاید یہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ یہ رات بھی اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔

کچھ سال قبل ابو نے ایک غلط فہمی کی بنا پر تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ وہ اس کی غلطی کی سزا دے رہے تھے۔ اس رات اس نے جتنی تکلیف محسوس کی تھی رزلٹ والی رات بھی وہ بالکل ویسی ہی تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ وہ درد سے گزر رہی تھی اور اس درد کا کوئی مداوا نہیں تھا۔ اس رات بھی اس نے دادو جی کی گود میں بلک بلک کر بہت شکوے کیے تھے اور اس رات بھی دادو جی اسے تسلی دینے میں ناکام رہی تھیں۔ امی اور عبیر کے قہقہے ان کا خون جلا رہے تھے۔

''میں صابن کی ٹکیہ کی طرح ہوں...... مجھے گھل گھل کر ختم ہو جانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ جیسے صابن جسم کی غلاظت صاف کرتا ہے۔ میں اس گھر کی بدقسمتی صاف کر رہی ہوں۔ میری زندگی میں آنے والا ہر دکھ...... ان کی زندگی کے سکھ میں اضافہ کرتا جارہا ہے۔'' وہ دادو جی کی گود میں سر دیے شکوہ کرتی رہی۔

☆ ☆ ☆

''تم ہمیشہ سے ایک خوش قسمت لڑکی رہی ہو مناہل!''

''اچھا کیسے......؟'' ماریہ کی بات پر مناہل مسکرا کر مصنوعی تحیر سے بولی۔ وہ دونوں کافی دیر سے سڑکوں پر آوارہ گردی کر رہی تھیں۔ ماریہ اپنی خالہ کے پاس پیرس رہ کر آئی تھی اور اب اس کے پاس مناہل کو سنانے کے لیے بہت دلچسپ قصے تھے مگر مناہل نے اس کی کہانیاں سن کر کوئی خاص رسپانس نہیں دیا تھا۔ اور اس کی یہی ادا اس کی بچپن کی سہیلی کو چڑا رہی تھی۔ تب اس نے جل کر کہا۔

''کیونکہ......میرے جیسی شاندار لڑکی تمہاری دوست ہے۔''

''میں تمہاری بات سے اس صورت انکار کرتی اگر ڈنر کا بل مجھے پے کرنا ہوتا۔ اب چونکہ بل تم پے کرنے والی ہو اس لیے مجھے تمہاری ہر بات سے اتفاق ہے۔''

''تم خاصی چالاک ہو۔'' ماریہ نے جل کر کہا۔ اور وہ دونوں ہی ہنس دی تھیں۔

''خوش قسمت ہو یار! تب ہی تو صفوان جیسا شاندار شخص ملا ہے تمہیں۔'' ماریہ نے رشک سے کہا۔

''صفوان زیادہ خوش قسمت ہے'' مناہل نے مسکرا کر کہا۔

''ٹھیک......ٹھیک۔'' وہ سر ہلا کر بولی۔

''ویسے چالاک تو تمہاری ساس ہیں۔ بیٹا فون کر کے انوائٹ کرتا ہے اور وہ ایک منٹ میں سب دی اینڈ کر دیتی ہیں۔''

ایک ہفتہ پرانی بات مناہل نے ماریہ کو فون پر بتائی تھی۔

''وہ تو ایک پرابلم ہو گیا تھا اسی وجہ سے انہیں یہ سب کرنا پڑا ورنہ تم جانتی ہو وہ کتنی نائس خاتون ہیں۔''

ماریہ اس کی بات پر خاموش رہی۔ اس کو مسز شہلا قمر کچھ خاص بھاتی نہیں تھیں۔

''انہوں نے بعد میں مجھ سے ایکسکیوز بھی کیا تھا اور وہ چاہ رہی تھیں کہ میں اور صفوان اگلے ہی دن ان کی طرف سے ڈنر کریں مگر صفوان نیکسٹ ڈے OT میں مصروف تھا پھر اگلے دن وہ ڈھاکہ چلا گیا۔''

''ڈھاکہ......خیریت؟'' ماریہ اس بارے میں لاعلم تھی۔

''WHO نے تیسری دنیا کے ممالک کے Cosmoplitan cities میں شور کی آلودگی کے باعث پیدا ہونے والی دماغی بیماریوں کی روک تھام کے لیے چند نئے تحقیقی مراکز قائم کیے ہیں۔ اس سلسلے میں کوئی کانفرنس اور سیمنار وغیرہ تھا وہی اٹینڈ کرنے گیا ہے۔''

''تم نے صفوان سے اپنے پولیس اسٹیشن والے ایڈونچر کا ذکر کیا؟'' ماریہ نے ونڈ اسکرین سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اسے مناہل کا یہ اقدام پسند نہیں آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جب اس کے والدین کو یہ بات پتا چلے گی تو انہیں اچھا نہیں لگے گا۔

''پاگل ہو گئی ہو۔ آنٹی نے خاص طور سے منع کیا تھا۔ کہ یہ بات کسی کو مت بتانا نامناسب لگتا ہے۔ میں نے پھپھو سے یہی کہا تھا کہ صفوان کے ساتھ جا رہی ہوں۔ اگر انہیں یہ بات پتا چل جاتی تو وہ مجھے اسی وقت قتل کر دیتیں۔'' وہ بولی۔

''انہوں نے تمہارے ساتھ اس لڑکی کو دیکھ کر کچھ نہیں کہا......کوئی سوال نہیں کیا؟'' ماریہ نے حیرت سے پوچھا۔

''ان کی ملاقات اس سے اگلے دن صبح کے وقت ہوئی تھی مگر میں نے انہیں مطمئن کر دیا کہ وہ میری ایک فرینڈ کی واقف کار ہے کچھ دن میرے پاس رہے گی پھر چلی جائے گی۔ ویسے بھی ان کے درمیان زیادہ



تفصیل سے گفتگو نہیں ہوتی۔ تطہیر زیادہ وقت اپنے کمرے میں رہتی ہے۔ پھپھو سے اس کا سامنا کم ہی ہوتا ہے۔''

''تطہیر نام کتنا خوبصورت ہے......خود کیسی ہے؟'' ماریہ کے انداز سے دلچسپی ہویدا تھی۔

''ویسی ہی ہے جیسی عام لڑکیاں ہوتی ہیں......عام سا رنگ......عام سا قد......عام سا حلیہ......عام سا انداز گفتگو......عام سی سوچ......عام سی ذہنی اپروچ۔''

وہ اپنے شولڈر بیگ سے چیونگم نکال کر ریپر کھولتے ہوئے بولی۔

''لڑکی تو عام سی ہے مگر جو حرکت اس نے کی ہے وہ عام سی نہیں ہے۔'' ماریہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''سارا معاشرہ ہی اس قسم کے لوگوں سے بھرا ہے۔ فرسٹریشن اس قدر بڑھ چکا ہے۔ کہ لوگ توجہ حاصل کرنے کے لیے ایسے اوچھے ہتھکنڈے آزمانے لگے ہیں۔ ہر شخص لائم لائٹ میں آنا چاہتا ہے۔ اور اس مقصد کے لیے وہ ہر حد پار کرنے کو تیار ہے۔'' چیونگم منہ میں ڈال کر وہ لاپروائی سے بولی۔

''توجہ حاصل کرنے کے لیے تمہارے خیال میں یہ لڑکی توجہ حاصل کرنے کے لیے۔'' ماریہ نے مزید تحیر میں مبتلا ہوتے ہوئے کہا۔

''میں کوئی حتمی رائے نہیں دے رہی صرف اپنا خیال ظاہر کر رہی ہوں۔'' مناہل کو اس ساری بحث سے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔

''میرا خیال ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو تمہاری ساس نے بھی تو خدا ترسی کا عظیم مظاہرہ کیا ہے اس لڑکی کو اتنا اسپیشل پروٹوکول دے کر اس کے بارے میں کیا کہتی ہو؟'' اس کی کوشش کامیاب رہی۔ مناہل چڑ گئی تھی۔

''وہ ایسی خدا ترسی کرتی رہتی ہیں......ایسی ضرورت مند لڑکیاں روز ہی دیکھتی ہیں وہ......ان کے لیے یہ نئی بات نہیں ہے۔''

''تم نے اس لڑکی سے پوچھا کیوں کیا اس نے یہ سب۔'' ماریہ کو تطہیر میں زیادہ ہی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

''پلیز ماریہ......بند کرو یہ انٹرویو......اتنے سوالات تو میرے کولیگز بھی نہیں کرتے حالانکہ ہمارا واسطہ روز ہی ایسے لوگوں سے پڑتا ہے۔''

وہ ٹھیک ٹھاک زچ ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔'' وہ مناہل کے سامنے بیٹھی کہہ رہی تھی اس تمام عرصہ میں شاید اس نے اس طرح سے پہلی بار کوئی بات کی تھی۔

''موسٹ ویلکم تطہیر!'' اس نے بے تکلفی پیدا کرنے کے لیے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ مناہل کا دودھیا مخروطی خوبصورت کیوٹکس سے سجا ہاتھ اس کے سانولے ہاتھ پہ دھرا اور بھی خوبصورت لگنے لگا۔ تطہیر نے

بہت آہستگی سے اپنا ہاتھ چادر میں چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ مناہل نے اس کی اس حرکت کو محسوس بھی نہیں کیا تھا۔

''میں آپ سے یہ نہیں پوچھتی کہ آپ مجھے یہاں اپنے گھر میں کیوں لائی ہیں مگر...... میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں اس...... مہربانی کی مستحق نہیں ہوں۔ میں ان سب چیزوں کی حقدار نہیں ہوں جو آپ مجھے دے رہی ہیں۔''

وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی پھر سر جھکا کر بولی۔

''آپ کو اگر کچھ دن بعد...... اس ساری مہربانی کے لیے...... میرا مطلب ہے...... میں...... میرے پاس کچھ نہیں ہے...... میں آپ کو ان سب کے بدلے میں کچھ بھی نہیں دے سکتی۔ میں آج کل یا پرسوں یا پھر ایک سال بعد کبھی بھی اس قابل نہیں ہو سکوں گی کہ آپ کی اس مہربانی کے بدلے شکریہ کے علاوہ کچھ اور دے سکوں۔ آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ میں اس احسان کو یاد رکھنے کی کوشش کروں گی...... مگر...... میں ایک بے کار عورت ہوں۔''

اس کی آواز دھیمی اور سر جھکا ہوا تھا مگر آواز پر کوئی جذبہ غالب نہیں تھا۔

وہ ایسے بات کر رہی تھی جیسے کسی اور کے بارے میں بات کر رہی ہو۔ مناہل کو اس قسم کے ڈائیلاگز کچھ خاص بھاتے نہیں تھے۔ وہ تقدیر کی مہربانی سے مالا مال لڑکی تھی۔ وہ تطہیر رحمان کی پرابلمز کو صرف سن سکتی تھی۔ اس کا دل حساس تھا مگر اتنا نہیں کہ وہ تطہیر رحمان کی بات سن کر تڑپ اٹھتا۔ البتہ تطہیر سے ہمدردی ضرور محسوس ہوئی تھی۔

''کس قسم کی باتیں کر رہی ہو تطہیر! کیا کیا سوچتی رہتی ہو ایسا کچھ نہیں ہے۔ جیسا تم سوچ رہی ہو۔ مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے۔ میں یہ سب اس لیے کر رہی ہوں کیونکہ مجھے یہ سب کرنا اچھا لگتا ہے اور تم بے کار نہیں ہو تم اتنی ہی کار آمد ہو جتنی میں یا کوئی اور بھی لڑکی......''

وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ وہ اس کی ہم عمر لگتی تھی لیکن تطہیر رحمان عورت تھی اور مناہل مرتضیٰ لڑکی...... تقدیر کا ہیر پھیر تھا یا لفظوں کا کسے خبر۔

''میں خود چاہ رہی تھی کہ تم اس موضوع پر بات کرو تمہیں اپنے بارے میں سوچنا چاہیے اور اگر تم کسی مقدمے وغیرہ سے ڈر رہی ہو تو اس ڈر کو دل سے نکال دو۔ تم سے یہاں اس گھر میں کوئی بھی کوئی سوال نہیں کرے گا۔ سب لوگوں کو میں مطمئن کر چکی ہوں۔'' مناہل نے بات کرتے ہوئے اسے دیکھا پھر توقف سے بولی۔

''پڑھی لکھی ہو؟''

''جی...... ایف اے کیا ہے۔'' تطہیر کے جواب پر مناہل کو حیرت ہوئی۔

''آپ مجھے کوئی کام دلوا سکتی ہیں۔'' تطہیر نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

''ہاں کیوں نہیں میں تمہیں......''

''آپ اجازت دیں تو میں آپ کے گھر کے کام کاج کر دیا کروں۔''



وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ مناہل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ وہ مسز شہلا قمر سے بات کیے بغیر تطہیر کے بارے کی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔

مسز شہلا قمر کو ایک ضروری کام کے لیے امریکہ جانا تھا۔ وہ تطہیر کے بارے میں وہاں سے آنے کے بعد کوئی فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ انہوں نے مناہل سے درخواست کی تھی کہ وہ تطہیر کو مزید دس پندرہ دن کے لیے اپنے گھر میں ٹھہرا لے۔ مناہل اپنے والدین کے واپس آ جانے تک بہت آرام سے اس کو اپنے گھر میں ٹھہرا سکتی تھی۔

''میں مسلمان ہوں...... بخدا میں مسلمان ہوں۔''

تطہیر نے اس کی ہچکچاہٹ کو کوئی اور معنی پہنا دیے۔ مناہل سمجھ گئی تھی کہ وہ اپنی حرکت کی وجہ سے شرمندہ ہو کر اس طرح کہہ رہی ہے۔ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''میں جانتی ہوں تم مسلمان ہو اور تم اس گھر میں سب کام اطمینان سے کر سکتی ہو تم اپنی اس حرکت کے لیے شرمندہ ہو یہی کافی ہے...... غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔'' تطہیر نے جھٹکے سے سر اٹھایا تھا۔

''میں نے کوئی غلطی نہیں کی اور میں کسی چیز کے لیے شرمندہ بھی نہیں ہوں۔'' وہ تڑخ سے بولی تھی۔

مناہل حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اتنی ہٹ دھرمی کی توقع نہیں تھی۔ تطہیر اس سے اجازت لینے آئی تھی۔ لے کر چلی گئی جبکہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی کافی دیر تک اس صورت حال کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ مسز شہلا قمر جیسی خاتون تطہیر رحمٰن کو پہچاننے میں غلطی کیسے کر سکتی ہیں۔ وہ اسے جتنی اہمیت دے رہی تھی وہ قطعاً اس کی مستحق نہیں تھی۔

اگلے چند روز میں اس نے تطہیر کو گھر کے کاموں میں دلچسپی لیتے دیکھا۔ وہ حقیقتاً سگھڑ واقع ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ذائقہ تھا۔ پھپھو کو اس کے ہاتھ کا پکا کھانا پسند آیا تھا۔ پروین کو ایک مددگار مل گئی تھی اس لیے وہ بھی کافی خوش تھی۔ اسے صرف اس بات کا اعتراض تھا کہ تطہیر اس سے زیادہ بات چیت کیوں نہیں کرتی۔ اس سے اپنے دکھ سکھ کیوں نہیں کہتی جبکہ پھپھو کو اس کی ٹینٹ نما چادر سے الجھن ہوتی تھی۔ وہ ہمہ وقت چادر لیے رکھتی تھی اور وہ ان سے بچنے اور احتراز برتنے کی کوشش بھی کرتی تھی۔ کبھی کبھی اس کا رویہ ایسا ہو جاتا جیسے وہ اس گھر میں رہنے والی اکیلی عورت ہے اور بہت سے مردوں کے بیچ میں پھنس گئی ہے۔ وہ کچھ زیادہ ہی احتیاط پسند تھی حالانکہ اس گھر میں ملازم مرد گنتی میں صرف دو تھے اور وہ بھی گھر میں اندر زیادہ نہیں آتے تھے اسی لیے تطہیر کی اس درجہ احتیاط عجیب لگتی تھی۔

مناہل کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ بس مسز قمر کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہیں امریکہ گئے بہت دن ہو گئے تھے نہ جانے کیا وجہ تھی کہ ان کا قیام وہاں طویل ہو رہا تھا مناہل کو ان سے تطہیر کے متعلق بہت سی باتیں معلوم کرنا تھیں کیونکہ وہ اپنے منہ سے ابھی بھی کچھ بتانے کو تیار نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ کہتا ہے یہ گھر اس کا ہے...... وہ اس گھر کا سربراہ ہے۔ وہ کہتا ہے وہ میرے ساتھ جس طرح کا

سلوک کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے اسے میری بے عزتی کا اتنا ہی حق ہے۔ جتنا ابو کو تھا...... وہ کہتا ہے وہ...... وہ میرا بھائی نہیں ہے...... وہ کہتا ہے...... میں اس کے لیے ہمیشہ سوتیلی ہی رہوں گی۔''

وہ یہ سب کہتے ہوئے رو نہیں رہی تھی لیکن اس کے گرد تا دیدہ ان بہے آنسوؤں کا ہالہ صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ آج بھی اس کو سننے کے لیے کمرے کی تنہائی کے علاوہ دادو جی موجود تھیں۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس کے سوالوں کے جواب نہیں دے پاتی تھیں۔ آج سے پہلے وہ اپنے امی ابو کی زیادتی کی وجہ سے روتی رہی تھی، مگر آج وہ اپنے سوتیلے بھائی کی زیادتی کی وجہ سے رو رہی تھی۔ ابو کے انتقال کو بمشکل چالیس دن گزرے تھے اور ان چالیس دنوں میں وہ چالیس ہزار مرتبہ خرم کے رویے پر حیران ہوئی تھی۔

ابو کے انتقال کے اتنے قلیل عرصہ بعد ہی خرم کو اپنی اس سوتیلی بہن کا وجود اس بری طرح کھٹکنے لگا تھا کہ وہ اسے جلد سے جلد اس گھر سے رخصت کر دینا چاہتا تھا اور اس نے اپنی سوتیلی بہن کے لیے اپنے اکتالیس سالہ ماموں کو پسند کیا تھا۔ وہ پہلے سے شادی شدہ تھا۔ اس کے پانچ بچے بھی تھے اور اس کی بیوی ناگزیر وجوہات کی بنا پر اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

''آپی! تم ان بچوں کے درد کو بھی سمجھ سکتی ہو انہیں ماں کی ضرورت ہے تم انہیں حقیقتاً ماں کا پیار دے سکتی ہو یہ بہت ثواب کا کام ہے آپی! بن ماں کے بچے ہیں آپ کو بہت دعائیں دیں گے۔''

خرم نے بات کا آغاز ہی یہ کہہ کر کیا تھا۔ وہ اس کی شکل دیکھتی رہ گئی تھی اگر وہ جانتا تھا کہ بن ماں کے بچے پالنا ثواب کا کام ہے تو اس نے یہ بات آج تک اپنی ماں کو کیوں نہیں بتائی تھی۔ وہ یہ بات صرف اسے کیوں بتا رہا تھا۔

''آپی! گھر کے حالات تمہارے سامنے ہیں۔ ابو کے بعد میں اپنے آپ کو بہت سی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل نہیں سمجھتا۔ عبیر کے متعلق تم جانتی ہو کہ وہ ابھی پڑھ رہی ہے اس کا ابھی شادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے اور پھر اس کے لیے تو بہت سے پرپوزل ہیں۔''

وہ سچ مچ اسے حیران کر دینے کے موڈ میں تھا۔ وہ جانتی تھی ابو کے انتقال کے بعد ان کے آفس سے ایک خطیر رقم ملی ہے۔ انہوں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ کوئی پارٹ ٹائم بزنس بھی شروع کر رکھا تھا۔ وہ بھی کافی منافع بخش بزنس تھا۔ اس گھر میں بھی بیٹی کی حیثیت سے اس کا حصہ نکلتا تھا مگر پھر بھی اس کے لیے اب اس گھر میں سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے لیے ایک ایسے شخص کو جیون ساتھی کے طور پر منتخب کیا گیا تھا جو اس سے عمر میں دگنا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اتنی رحمدل نہیں سمجھتی تھی کہ اپنی زندگی بن ماں کے بچوں کے لیے دان کر دے۔ زندگی میں اس کے لیے اگر کچھ اچھا تھا تو وہ اسے ملنا ہی چاہیے۔ یہی سوچ کر اس نے خرم کو انکار کر دیا تھا۔

''آپی! اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہیں اس سے بہتر شخص مل سکتا ہے تو تم غلطی پر ہو۔ ماموں سے بہتر آدمی تمہیں کم از کم اس شکل کے ساتھ نہیں مل سکتا۔'' اس کی بات سن کر خرم نے نہایت خشک لہجے میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں کیا نہیں تھا۔ تضحیک تحقیر طنز نفرت اسے لگا وہ دیوار سے چپکی ایک چھپکلی ہے اور اس کا بھائی اس پر تھوک دے گا جبکہ وہ کہہ رہا تھا۔



''اگر تم نے کبھی غور سے آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہوتی تو تم کبھی اس طرح انکار نہیں کرتیں۔ اس شخصیت کے ساتھ تم کس شہزادے سے شادی کر سکتی ہو۔ تمہارا رنگ و روپ شکل و صورت تمہاری تعلیم ہر چیز سے تم واقف ہو۔ آج سے دو سال بعد شاید تمہیں یہ سب بھی نہیں مل سکے گا۔ اس کے بعد تم کیا کرو گی۔ کہاں جاؤ گی تم؟ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں ساری زندگی تمہیں سنبھالوں گا اور کیا تم سمجھتی ہو کہ تم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مجھے تمہارے مرنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ تم غلطی پر ہو آپی! میں ایسا کچھ نہیں کروں گا...... اس کے علاوہ میں کچھ سننا بھی نہیں چاہتا۔ اپنے اچھے برے کی تم خود ذمہ دار ہو تم اپنی مرضی سے فیصلہ کر سکتی ہو۔''

یہ سب کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ یہ سب کہتے ہوئے اس کی آواز میں ذرا جھجک نہیں تھی۔ وہ بہت اطمینان سے اس کے سامنے بیٹھ کر اس کی شخصیت کو چیونٹی کی طرح پاؤں کے نیچے رکھ کر مسل گیا تھا اور وہ کچھ بھی کر نہیں پائی تھی۔ وہ سانس لیے بغیر سنتی رہی تھی۔ وہ اپنے بھائی کو فرشتہ کہا کرتی تھی اور اس کا بھائی حقیقتاً اس کے لیے فرشتہ ثابت ہوا تھا موت کا فرشتہ۔

☆ ☆ ☆

''لڑکیاں عام طور پر اتنی پنکچوئل نہیں ہوتیں جتنی کہ آپ ہیں۔'' وہ چاولوں کی ڈش میں سے چاول اپنی پلیٹ میں منتقل کرتے ہوئے مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ مناہل کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایک ماہ بعد ہونے والی اس غیر متوقع ملاقات نے اس کے موڈ کو بہت خوشگوار کر دیا تھا۔ صفوان نے اسے آفس فون کر کے لنچ کی آفر دی تھی اور بعد میں وہ خود لینے کے لیے کلینک سے اس کے آفس آیا تھا لیکن اس کو آنے میں بیس منٹ کی تاخیر ہو گئی تھی اور اسی لیے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر وہ اس کی اس خوبی کو سراہ رہا تھا۔

''لڑکیاں عام طور سے اتنی ذہین بھی نہیں ہوتیں جتنی کہ میں ہوں۔'' اس نے بھی کھانے کا آغاز کرتے ہوئے مسکرا کر اعتماد سے کہا۔ وہ کھل کر ہنسا تھا۔

''اس خوش فہمی میں کس نے مبتلا کر دیا آپ کو؟''

اس کی مسکراتی آنکھیں مناہل کے موڈ کو خوشگوار کر گئی تھیں۔ براؤن شرٹ کی آستین چڑھائے بکھرے بالوں کے ساتھ اس لاابالی حلیے میں بھی وہ مناہل کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''اسی نے جس نے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کیا کہ میں پنکچوئل ہوں۔'' وہ اسی کے انداز میں بولی تو وہ اپنا قہقہہ ضبط نہ کر سکا۔ مناہل بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''Just kidding'' اس نے کہا۔ وہ نہ بھی کہتا تب بھی مناہل جانتی تھی کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔

''مام بھی آپ کی ذہانت کی تعریف کرتی ہیں۔'' مام کا حوالہ دے کر جیسے اس نے اسے بہلانا چاہا تھا۔ مناہل کا دل چاہ رہا تھا وہ اس کی ظاہری خصوصیات کی بھی تعریف کرے۔ وہ بتائے کہ وہ اچھی لگ رہی ہے مگر صفوان اس طرف آ ہی نہیں رہا تھا۔

''وہ صرف ذہانت کی تعریف نہیں کرتیں۔'' اس نے جتانے والے انداز میں کہا اور یہ حقیقت بھی تھی کہ مسز شہلا قمر اس کی خوبصورتی کو بہت سراہتی تھیں۔

"آپ کا سینس آف ہیومر بہت شاندار ہے مناہل!" مناہل کا منہ حلق تک کڑوا ہوا۔ سارا زمانہ ہی اس کے انداز گفتگو اس کی ذہانت اس کی حاضر دماغی کی تعریف کرتا تھا مگر اسے صفوان کے منہ سے ایسی تعریف سننا اچھا نہیں لگتا تھا۔

"آنٹی کب واپس آئیں گی امریکہ سے؟" اس نے خود ہی موضوع تبدیل کر دیا۔

"آج ہی ان سے فون پر بات ہوئی ہے۔ ابھی کچھ اور دن لگ جائیں گے۔ انہوں نے ہی مجھے تاکید کی کہ ان کی طرف سے آپ کو لنچ کے لیے لے جاؤں کیونکہ اس دن والا ڈنر ابھی ڈیو ہے۔ حالانکہ میں سوچ رہا تھا کہ اب کی بار آپ مجھے انوائٹ کریں گی مگر مام نے کہا کہ اس روز ان کی وجہ سے وہ ڈنر ملتوی ہوا تھا۔"

وہ ایک ماہ پرانی تفصیل اسے سنا رہا تھا۔ مناہل کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ یہ خیال ہی دل جلا رہا تھا کہ وہ صرف اپنی مام کے کہنے پر اسے لنچ کروا رہا تھا۔

"دراصل......" اس نے بات کی ابتدا کی پھر گہری سانس بھر کر بولی۔

"کچھ ضروری کام آن پڑا تھا اس روز...... میں نے بعد میں فون کیا تھا ایکسکیوز کرنے کے لیے مگر آپ کا موبائل آف تھا۔"

"اٹس او کے مناہل! میں شکوہ تو نہیں کر رہا۔" وہ بات اس سے کر رہا تھا مگر دھیان کھانے کی پلیٹ کی طرف تھا۔

"کاش تم نے کیا ہوتا۔" وہ دل ہی دل میں خود سے مخاطب ہوئی تھی۔

"اسی طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں...... کیسا چل رہا ہے آپ کا سوشل ورک۔"

اس نے اس کی جاب کے متعلق پوچھا۔ نجانے کیوں مناہل کو لگتا تھا کہ صفوان کو اس کی جاب کی نوعیت پسند نہیں ہے۔ اسے ہمدردی اور خدا ترسی جیسے لفظوں سے چڑ تھی اور یہ بات وہ کم ہی کرتا تھا۔

"اوہ ہاں...... یاد آیا...... میں ڈھاکہ سے آپ کے لیے کچھ گفٹس لایا تھا۔ آپ کو دینا یاد ہی نہیں رہا...... وہ ابھی تک میرے پاس پڑے ہیں۔ میں آپ کو ڈرائیور کے ہاتھ گھر بھجوا دوں گا۔"

وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا مگر مناہل کو سخت توہین کا احساس ہوا۔ وہ کتنے دن پہلے بنگلہ دیش سے واپس آیا تھا اور گفٹس دینے کا خیال اب آیا تھا اور وہ بھی ڈرائیور کے ذریعے...... اس کا موڈ مزید خراب ہو گیا تھا۔

محبت توقعات کے چکنے فرش پر رقص کرتی ہوئی جوان ہوتی ہے۔ اور اس سلسلے میں اسے بہت مرتبہ پھسلنا پڑتا ہے۔ وہ جتنی مرتبہ پھسلتی ہے اتنی ہی مرتبہ سنبھلتی ہے۔ لیکن اس پھسلنے اور سنبھلنے کے کھیل میں ایک چبھن ایک تکلیف ہوتی ہے۔ محبت یہ ساری چبھن اور تکلیف اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور پھر اسے اس شخص کو دان کر دیتی ہے۔ جسے عرف عام میں مریض محبت کہتے ہیں۔

اس کی خاموشی سے اکتا کر صفوان اس کانفرنس کے متعلق بتانے لگا۔ جو وہ اسلام آباد میں اٹینڈ کر کے آیا تھا۔ اس نے وہاں کچھ منفرد نیورو کیسز دیکھے تھے۔ وہ بہت دلچسپی سے دماغی بیماریوں کے متعلق بات کر رہا تھا۔



"کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔" اس نیورو سرجن کو شاید یہی بیماری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

ان دونوں کے درمیان ایک گہرا تعلق تھا کیونکہ یہ تعلق ان کے بڑوں نے اپنی رضامندی سے قائم کیا تھا لیکن اس کے باوجود مناہل کا کمزور محبت کا مارا دل انجانے خدشوں اور وسوسوں میں گھرا رہتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ صفوان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور اگر ہے تو وہ اسے کبھی ظاہر نہیں کرتا تھا۔ اس کی اپنی ساس سے کافی بے تکلفی تھی۔ اور انہوں نے بطور خاص اسے بتایا تھا کہ صفوان نے زندگی میں کتابوں کے علاوہ کسی چیز سے عشق نہیں کیا اور وہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہے مگر مناہل کو یقین تھا کہ جو شخص زندگی میں صرف کتابوں سے عشق کر رہا ہوتا ہے وہ زندگی میں پہلے بھی انسانوں سے عشق میں ناکام ہو چکا ہوتا ہے۔

وہ اس کے سامنے بیٹھا بہت اطمینان سے وہ باتیں کر رہا تھا جس میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر پھر بھی وہ خاموشی سے اس کی باتوں میں دلچسپی لینے کی کوشش کر رہی تھی کیونکہ اس کو صفوان کی باتیں سننا اچھا لگتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"مجھے بھوک نہیں مجھے کھانا نہیں کھانا اور اگر اب مجھے کوئی تنگ کرے گا تو نتائج کا ذمہ دار ہوگا۔"

اس نے تکیے سے سر اٹھائے بغیر کہا۔ وہ جب سے واپس آئی تھی اسی طرح اپنے کمرے میں بند تھی۔ پھپھو آج صبح سے اپنے گھر گئی ہوئی تھیں اور گھر میں صرف ملازم تھے جو بی بی کی عادت سے بخوبی واقف تھے۔ پہلے پروین کی بڑی بیٹی کھانے کا پوچھنے آئی پھر چھوٹی بیٹی اور پھر پروین کچھ دیر پہلے ہی پوچھ کر گئی تھی۔ اس بار بھی اسے یہی مغالطہ ہوا کہ شاید ان لوگوں میں سے کوئی ہے مگر اب کی بار تطہیر تھی۔ وہ مناہل کی ڈانٹ کی پروا کیے بغیر کمرے کے اندر چلی آئی۔ مناہل اوندھے منہ بستر پر لیٹی تھی۔

"میں آپ کو کھانے کے لیے بلانے نہیں آئی مگر میری ایک بات سن لیجیے۔"

"جی فرمائیے۔" اس نے سر اٹھائے بغیر تطہیر کے انداز میں کہا۔ لہجہ انتہائی جلا ہوا تھا۔ جب اس کا موڈ آف ہوتا تھا تو وہ سب کے ساتھ اسی سلوک کا مظاہرہ کرتی تھی۔

"یہ لیجیے۔" تطہیر اسے کچھ دے رہی تھی۔ وہ اس کی ملازم نہیں تھی اسی لیے ڈانٹ کر اسے کمرے سے نکال نہیں سکتی تھی۔ طوعاً و کرہاً اس نے تکیے سے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پانی سے لبالب بھرا گلاس تھا۔ مناہل کی خفگی مزید بڑھ گئی۔

"مجھے پانی نہیں چاہیے تطہیر! اور اگر چاہیے ہوگا تو میں خود لے لوں گی۔" وہ بہت مشکل سے ضبط کر کے بولی۔

"یہ عام پانی نہیں ہے...... دراصل......" وہ جھجک کر خاموش ہوئی پھر وہ دوبارہ سے بولی۔

"میں نے صبح کے وقت قرآن پاک کی تلاوت کر کے اس پر دم کیا ہے...... آپ کو پیاس نہیں ہے تب بھی تھوڑا سا پی لیجیے۔"

مناہل نے اس کی بات سن کر ایک بار پھر سر تکیے پر گرا لیا۔ تطہیر کی بات اسے نہایت عجیب لگی تھی۔ چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ تطہیر نے دوبارہ سے اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی مگر وہ اس کے بستر کے

قریب کھڑی رہی تھی۔ مناہل نے گہری سانس بھر کر ایک بار پھر اسے دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے خود بھی اس طرح نخرے کرنا پسند نہیں تھا مگر صفوان کا لیا دیا انداز کبھی کبھی بہت چڑچڑا کر دیتا تھا۔ تطہیر نے پانی کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر کھڑکی کا بھاری پردہ ذرہ سا سرکا دیا تھا۔ دھوپ کی تھکی ہاری کرنیں اپنا دم خم کھو دینے کے بعد مناہل کی طرح الجھی الجھی لگ رہی تھی۔ کمرے میں ذرا سی روشنی ہوئی تو ہر چیز پہلے کی نسبت کچھ واضح ہو گئی۔ تطہیر نے دوبارہ بیڈ کے قریب آ کر گلاس پکڑ لیا۔

''میں بیمار نہیں ہوں تطہیر! اس کے خیال میں بیمار لوگ ہی اس قسم کا پانی پیتے تھے۔ تطہیر خاموش رہی۔

''تھک گئی ہوں اس وجہ سے موڈ کچھ آف ہے۔'' وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی تطہیر اب بھی خاموش رہی۔ وہ مناہل کو تک رہ تھی۔ تاہم اس نے گلاس سے ایک گھونٹ لے لیا۔ وہی عام سا پانی تھا جو وہ روز پیتی تھی۔ اسے کم از کم اس پانی میں کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی مگر وہ خاموشی سے پانی پیتی رہی۔ تاوقتیکہ گلاس میں سے تین تہائی پانی اس کے اندر منتقل ہو گیا۔

''بیٹھ جاؤ تطہیر!'' اس نے مسکراتے ہوئے تطہیر سے کہا اور اس بار مسکرانے کے لیے اسے کوشش نہیں کرنی پڑی تھی۔ مسکراہٹ خود بخود اس کے لبوں سے پھسل کر اس کے چہرے کا حصّہ بن گئی تھی۔ اسے مسکراتا دیکھ کر تطہیر بھی مسکرائی اور اس کے بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔

''یہ غصہ بھگانے کا سب سے کامیاب طریقہ ہے۔ دادو جی جب تک زندہ تھیں اسی طرح پانی پہ دم کر کے میرا غصہ اتارنے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔ میرا غصہ بھی فوراً ختم ہو جایا کرتا تھا۔''

''تمہیں غصہ آتا ہے...... تمہیں غصہ آ سکتا ہے۔ یقین نہیں آ رہا۔'' مناہل مسکرا کر بولی۔ تطہیر خاموش رہی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے بولنا پسند کرتی تھی۔

مناہل کو افسوس ہوا وہ پہلی مرتبہ اپنی زندگی کا کوئی رخ اس کے سامنے کھول رہی تھی۔ مناہل نے باقی پانی ایک گھونٹ میں ختم کر دیا پھر گلاس سائڈ پر رکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں غصّے میں نہیں تھی۔'' پانی کا ایک گلاس کسی کے مزاج کو کس طرح شگفتہ کر سکتا ہے۔ یہ مناہل کی سمجھ میں فی الحال نہیں آ سکتا تھا۔ مگر اس کے سرہانے بیٹھی تطہیر اس کے چہرے سے پانی کے اس گلاس کا کرشمہ بخوبی دیکھ سکتی تھی۔

''میں بھی دادو جی سے اسی طرح کہا کرتی تھی۔'' تطہیر کی بات پر مناہل ایک بار پھر مسکرا دی۔

''دراصل پانی کو کیمیائی زبان میں $H_2O$ کہتے ہیں اور جب یہ $H_2$ O آکسیجن یعنی ہوا یعنی $O_2$ سے ملتا ہے تو تعامل کے بعد جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ $H_2O$ ہی ہوتا ہے۔ یعنی پانی ہی پیدا ہوتا ہے۔ اور پانی کی خصوصیات ہمیشہ ٹھنڈی ہوتی ہیں پھر جب ہوا دم کی ہوئی ہو تو ان ٹھنڈی خصوصیات میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ پانی غصّے کی تلخی کو اپنے اندر حل کر لیتا ہے۔ اور اگر آپ یہ پانی پینے سے پہلے ''بسم اللہ'' پڑھ لیتیں تو پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی یہ کرشمہ ہو جاتا۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں وضاحت دے رہی تھی۔ مناہل کچھ دیر تک بول نہ پائی۔



اس کے پاپا کیمسٹری کے پروفیسر تھے مگر اتنے عام سے فارمولے کی اتنی خاص وضاحت انہوں نے بھی کبھی نہیں دی تھی۔

''تمہیں کس طرح پتا چلا کہ میں نے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سے ابتدا نہیں کی؟'' وہ ذرا کی ذرا شرمندگی سے بولی۔

''آپ کو مسکرانے کے لیے تین تہائی پانی پینا پڑا۔ اگر آپ نے اللہ کے مبارک نام سے ابتدا کی ہوتی ہے۔ پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی مسکراہٹ آپ کے چہرے پر آ جاتی۔'' وہ طنز نہیں کر رہی تھی۔ اس کا انداز ویسا ہی تھا۔ معصومانہ اپنے آپ سے بے نیاز۔ وہ وہی لڑکی تھی جسے مناہل کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھی مگر وہ یکدم اہم ہو گئی تھی۔

''اب کھانا لگاؤں آپ کے لیے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں کھانا کھا چکی ہوں۔ صفوان کے ساتھ لنچ کیا تھا میں نے۔'' تطہیر کی منگنی کے بارے میں جانتی تھی۔

''اس کے باوجود آپ کا مزاج اتنا برہم دکھائی دے رہا ہے۔ حالانکہ آپ کو تو بہت خوش دکھائی دینا چاہیے۔''

وہ پہلی بار اس طرح چھیڑنے والے انداز میں بات کر رہی تھی۔

''تطہیر! تم نے کبھی محبت کی ہے؟'' صفوان کا ذکر آیا تو وہ اسے کریدتے ہوئے پوچھنے لگی۔ تطہیر کے چہرے پر ایسے تاثرات آ گئے جیسے مناہل نے کوئی مذاق کیا ہو۔

''محبت کی جاتی ہے کیا؟'' اس نے الٹا سوال کیا۔

''او کے...... فائن...... کیا تمہیں کبھی کسی سے محبت ہوئی؟'' اس نے سوال کی تصحیح کی۔

''نہیں۔'' تطہیر نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔

مناہل نے صرف ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا۔ اسے اسی جواب کی توقع تھی۔ حیران وہ تب ہوتی جب تطہیر مثبت جواب دیتی۔ وہ جانتی تھی محبت کرنے کے لیے جو معیار اور شرائط ضروری ہوتی ہیں تطہیر ان سب میں صفر تھی۔ وہ بھول ہی گئی کہ محبت اور مذہب دو ایسی چیزیں ہیں جن کے لیے کسی معیار اور کسی شرط کی ضرورت نہیں ہوتی۔

''بہت اچھی بات ہے...... خوش قسمت ہو تم۔''

اس کی بات پر تطہیر کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی اور کاتب تقدیر کے چہرے پر بھی کہ بہر حال یہ ساری کارستانی اسی کی تھی۔ بدقسمت وہ نہیں ہوتا جس کی قسمت اچھی نہ ہو بلکہ بدقسمت وہ ہوتا ہے جو اپنی قسمت کو پہچان نہ پائے۔ نجانے ان دونوں میں سے بدقسمت کون تھا۔

''ہاں...... شاید۔'' تطہیر نے اس کی رائے سے اختلاف نہیں کیا تھا۔

مناہل کو احساس ہوا کہ شاید اس نے زیادہ ہی تکلیف دہ بات کر دی ہے۔ وہ لڑکی جو اس قدر

مصائب میں تھی۔ وہ کس طرح خوش قسمت ہو سکتی ہے۔ محبت خوش قسمتی کو ناپنے کا مستند پیمانہ نہیں ہوتا۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ انسان جو کسی سے محبت نہ کرے وہ خوش قسمت ہو ازل سے دنیا جانتی ہے کہ چاہنے سے زیادہ چاہے جانا اہم ہوتا ہے۔

''آؤ چائے پیتے ہیں۔'' مناہل نے بات پلٹ کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ وہ دونوں کچن کی طرف جاتے ہوئے بھی مسکرا رہی تھیں۔ نجانے کس چیز کا اثر تھا۔ پانی سورۃ یاسین یا شاید کچھ اور......؟

☆ ☆ ☆

''میں نماز نہیں پڑھوں گی......'' وہ چلاتے ہوئے بولی تھی۔ اسے اس طرح بولنے چلانے اور شکوے کرنے کی عادت تھی وہ بچپن سے اس عادت میں مبتلا تھی۔ دادو جی کو لگتا تھا وہ شاید کچھ مختلف قسم کی مٹی سے بنائی گئی ہے ورنہ اسے آج سے دس پندرہ سال پہلے ہی مر جانا چاہیے تھا۔ انہوں نے اس لڑکی کی زندگی میں خوشیاں لانے کی ایک کوشش کی تھی انہوں نے اس کے ابو کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد اسے اس کی سگی ماں کے گھر بھجوا دیا۔ مگر وہ وہاں بھی رہ نہیں پائی تھی نجانے کیا بات تھی۔ جو اس کا گزارا اس کی اپنی ماں کے گھر میں بھی نہیں ہو سکا تھا۔ حالانکہ مالی حیثیت میں اس کی ماں اس کے ابو کے مقابلے میں بہت آگے تھیں۔ وہ صرف تین ماہ بعد ان کے گھر سے واپس آ گئی تھی۔

واپسی میں اس کے پاس کچھ نہیں تھا حتیٰ کہ وہ خود بھی اپنے آپ کے پاس نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے خوشی اور خوشی کے احساس تک کا گلا گھونٹ ڈالا تھا۔ وہ کچھ دیر قبل خرم کو اپنی منشا سے آگاہ کر آئی تھی۔ اس کا مثبت جواب سن کر خرم نے مسرت کا اظہار کیا تھا مگر ساتھ ہی اس نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ کہیں اب ماموں کا ارادہ بدل نہ گیا ہو۔ تین ماہ قبل وہ جس رشتے کے لیے بہت پر جوش تھا۔ اب تین ماہ بعد وہ عجب ملے جلے ردعمل کا اظہار کر رہا تھا۔ وہ اس کا احسان مند ہونے کے بجائے اس پر احسان کرتا لگ رہا تھا۔ اس کی سوتیلی بہن اس کے علاوہ کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ اپنی ماں کے گھر سے واپس آ جانے کے بارے میں اس نے خود ماموں کو بتایا تھا کہ اس کی اپنی ماں بھی اسے بوجھ سمجھ کر واپس چھوڑ گئی ہے۔ وہ اپنے کانوں سے خرم کو یہ سب کہتے اور استہزائیہ انداز میں ہنستے دیکھ رہی تھی۔ واپس کمرے میں آ کر وہ بستر پر بیٹھ گئی تھی اس نے بازوؤں کو گھٹنوں کے گرد باندھ لیا تھا۔ اور سر کو تقریباً گھٹنوں میں دے لیا تھا۔ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے اپنی ماں کے گھر میں گزارے تین ماہ یاد آ گئے تھے۔

اسے ان کا وہ رویہ یاد آ گیا تھا جو وہ اپنے بیٹے اور اپنے دوسرے شوہر کے سامنے اس کے ساتھ روا رکھتی تھی۔

اسے وہ ناگواری یاد آئی جو اس کا حلیہ دیکھ کر ان کی آنکھوں میں ناچنے لگتی تھی۔
اسے وہ جھنجھلاہٹ یاد آئی جو اپنے ملازموں کے سامنے اسے چلتا پھرتا دیکھ کر وہ محسوس کرتی تھیں۔
اسے وہ الجھن یاد آئی جو اس کی موجودگی میں انہیں ہونے لگتی تھی۔
اور اسے وہ گھڑی یاد آئی جب وہ اس کے سامنے اپنی مجبوریوں کو گنوا رہی تھیں۔ انہیں اس کے اپنے



گھر میں رہنے پر اعتراض نہیں تھا مگر ان کے شوہر اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنے سے قاصر تھیں۔ وہ اس کی ہر قسم کی مالی مدد کرنے کے لیے تیار تھیں۔ مالی مدد کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

انہوں نے اپنے منہ سے اسے دفعہ ہو جانے کے لیے نہیں کہا تھا مگر ان کا ایک ایک انداز اس سے یہی کہہ رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے ان کی بات سن لی تھی اور اس نے ان کی بات مان بھی لی تھی۔ وہ بدقسمت اولاد تھی اس کا اپنے ماں باپ کی کسی چیز پر کوئی حق نہیں تھا۔ وہ حق جتانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنی ماں سے زندگی میں پہلی بار ملی تھی اور پہلی بار میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ عورت سب کچھ ہو سکتی ہے مگر ماں نہیں......

اسے بہت اچھی طرح سے پتا تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر میں کیوں نہیں رکھ سکتی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے سوتیلے باپ اور ان کے بیٹے کو اس سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ اس کی ماں تھیں جو اس کے یہاں رہنے کو مسئلہ سمجھتی تھیں۔ کیونکہ وہ ان کے معیار سے بہت نیچے تھی وہ کسی بھی طرح ان کی بیٹی نہیں لگتی تھی۔ وہ اسے اپنی بیٹی کہہ کر اپنے حلقہ احباب سے متعارف نہیں کروا سکتی تھیں انہیں اس کو اپنے ساتھ رکھنے میں شرم آتی تھی۔ گزشتہ تین ماہ سے وہ اسے اپنے جیسا بنانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر انہیں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ بہت تھک ہار کر انہوں نے ایک خطیر رقم اس کے حوالے کر کے اسے صاف لفظوں میں وہاں سے جانے کے لیے کہہ دیا تھا۔ اس گھر میں اور اس گھر میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ وہ جیسی وہاں تھی ویسی ہی یہاں تھی مگر پھر بھی وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی نہ جانے کیوں جاتے جاتے سے کوئی بندھن اسے وہاں رک جانے کے لیے مجبور کرتا رہا تھا مگر وہ ہر بندھن سے آزاد ہو کر واپس اپنے مرحوم باپ کے گھر چلی آئی تھی۔ اب اس کے دل میں کوئی خواہش نہیں تھی۔ خرم کی بات مان کر گویا اس نے اپنا آپ بھی قربان کر دیا تھا اور یہ سب کر دینے کے بعد جب وہ دادو جی کے سامنے بیٹھی تھی تو انہوں نے اسے نماز پڑھ کر اپنے لیے سکون کی دعا مانگنے کی تلقین کی تھی مگر وہ بھڑک اٹھی تھی۔

''نماز وہ پڑھے جس کی دعا قبول ہوتی ہو۔ میں کیوں نماز پڑھوں؟ کس لیے نماز پڑھوں؟ کس چیز کی دعا کروں؟ کس چیز کا شکر ادا کروں؟ اس شکل کا؟ اس ذہن کا؟ اس شخصیت کا؟ یا پھر اس حیثیت کا؟''

وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی نہ جانے کیوں ہر بار مشکل میں اللہ کو پکارنے پر بھی اس کی پکار رد کر دی جاتی تھی۔ وہ ناشکری کر رہی تھی اور علی الاعلان کر رہی تھی۔ دادو جی آج بھی خاموش تھیں حالانکہ انہیں بولنا چاہیے تھا۔

☆ ☆ ☆

''خیریت ہے نا؟'' اس نے آنکھیں ملتے ہوئے تحیر سے دروازے پہ کھڑی پروین کی طرف دیکھا رات کے اس پہر بیڈروم کے دروازے پر ہونے والی اس دستک نے کچھ دیر کو اس کے حواس معطل کر دیے تھے اس کی آنکھ اتنی جلدی کھلتی نہیں تھی یقیناً پروین نے اسے بیدار کرنے کے لیے بہت زور زور سے دروازہ بجایا تھا۔ اس کے استفسار پر سب سے پہلے پروین نے عادت کے مطابق لمبی سانس لی پھر حلق میں گلوگیر ترنم پیدا کر کے بولی۔

''اوہ باجی!...... بہت مصیبت ہو گئی ہے۔''

"کیا مطلب؟ کیا ہوا؟ پھپھو کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" وہ دل کی مریضہ تھیں مناہل کا پہلا دھیان انہی کی طرف گیا۔

"نہیں باجی......! میرا مطلب ہاں باجی...... آپ پریشان مت ہوں۔" وہ اصل بات بتانے کے بجائے اسے اطمینان دلانے لگی مناہل کو ٹھیک ٹھاک غصہ آیا۔

"باجی...... تطہیر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پھپھو جی ان کے کمرے میں ہیں۔"

رات کے کھانے پر تو وہ اچھی بھلی تھی مناہل اس کے کمرے کی طرف آ گئی۔ پھپھو ایک کرسی پر بیٹھی تھیں ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے انہوں نے مناہل کو دیکھ کر ایک سلگتی ہوئی نظر اس پر ڈالی۔ تطہیر بستر پر بیٹھی تھی اس کے بال کھلے ہوئے تھے جنہوں نے اس کے سارے چہرے کو چھپا کر رکھا تھا وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے پچھلے حصے کو دبانے میں مصروف تھی۔ مناہل کو دیکھتے ہی اس نے سر پر مکے مارنے شروع کر دیے تھے پھر وہ بالوں کو نوچنے لگی اس کے منہ سے کراہنے کی آوازیں نکل رہی تھی۔ پروین نے دروازے میں ہی کھڑے رہنے میں عافیت جانی وہ اس کے قریب بھی نہیں آئی تھی۔ بلکہ دور کھڑی منہ میں کچھ پڑھنے کے ساتھ کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھی بلاشبہ تطہیر سے خوف آ رہا تھا مناہل کچھ جھجکتے ہوئے اس کے قریب چلی آئی۔

"تطہیر، تطہیر کیا ہوا ہے تمہیں۔" وہ اس کے بستر پر بیٹھ کر بولی تطہیر نے سر نہیں اٹھایا وہ اپنے بالوں کو نوچنے میں مصروف تھی چند لمحوں بعد اس نے سر دونوں گھٹنوں میں دے لیا تھا وہ گھٹنوں کو بھینچ کر سر کو دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"پروین! بی پی آپریٹس لے کر آؤ۔" مناہل نے تطہیر کے سر پر ہاتھ رکھا پروین دوڑ کر باہر نکل گئی تھی۔ مناہل نے تطہیر کے جھکے سر کو اوپر کیا پھر اس کے چہرے سے بال ہٹا کر اس کے رخسار تھپتھپانے لگی۔ تطہیر نے اس کے ہاتھ کو ہٹانے یا جھٹکنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے تطہیر! کیا محسوس ہو رہا ہے۔"

وہ اس کے سر کو دبانے لگی، تطہیر جس طرح سر کو دبانے میں مصروف تھی اس سے وہ یہی اندازہ لگا سکتی کہ شاید اس کے سر میں درد ہے۔ تطہیر نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر اس کی گود میں سر رکھ دیا۔ اس کا جسم گرم ہو رہا تھا۔ مناہل نے حد درجہ گھبرا کر پھپھو کی جانب دیکھا وہ نہ جانے کیوں دور بیٹھی بس سرد نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھیں حالانکہ وہ اپنے گھریلو ٹوٹکوں کے لیے خاندان بھر میں مشہور تھیں مگر انہوں نے آگے بڑھ کر تطہیر کی مدد کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پروین اس دوران آپریٹس لے کر آ گئی تھی اس نے بہت ڈرتے ہوئے بیڈ کے قریب آ کر وہ اپریٹس مناہل کو تھمایا۔

"پلیز! اسے میرے اوپر سے تو اٹھاؤ۔" وہ پروین اور پھپھو کے رویے سے جھلا کر بولی۔ پروین نے آنکھیں تقریباً بند کرتے ہوئے تطہیر کے کندھوں کو پشت سے تھامنا چاہا تطہیر نے ایک دم سر اٹھایا تھا۔ پروین چیخ مار کر ایک بار پھر دروازے کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

"باجی...... ہٹ جائیں پیچھے ہٹ جائیں اس کو سایہ ہے آپ کو بھی ہو جائے گا باجی! وہ کپکپاتے



ہوئے کہہ رہی تھی۔

"چپ کرو۔" پھپھو نے اپنی نشست سے اٹھ کر اسے ڈانٹتے ہوئے کہا وہ بہت الجھی ہوئی لگ رہی تھیں۔ انہوں نے تطہیر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے مناہل کی گود سے اٹھایا اور پھر ان دونوں نے اسے بستر پر لٹا دیا۔ رات کے اس پہر وہ کسی ڈاکٹر کو بھی نہیں بلا سکتی تھی۔ پھپھو اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دھیرے دھیرے دبا رہی تھیں۔

"اس کا بی پی چیک کرو۔" انہوں نے مناہل کی طرف دیکھ کر درشتی سے کہا وہ اس سے اس قدر خفا کیوں لگ رہی تھیں اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ حالانکہ کھانے کے وقت ان کا موڈ کافی خوشگوار تھا۔ وہ مناہل کے جلدی گھر آ جانے کی روٹین سے مطمئن تھی۔ مدینہ سے آنے والی اس کے پاپا کی کال میں بھی انہوں نے اس اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ مناہل پریشان ہو کر بی پی چیک کرنے لگی۔ سردی کے باوجود اس کے جسم میں کوئی کپکپاہٹ نہیں تھی۔ مناہل نے بی پی چیک کر کے اپریٹس ایک طرف رکھ دیا۔ بی پی نارمل نہیں تھا۔

"پروین فریج سے سیون اپ کی بوتل لے کر آؤ۔"

اس کی ممی کو بی پی نارمل کرنے کا یہ طریقہ ان کی کسی دوست نے بتایا تھا۔ پھپھو اس کے ہاتھ رگڑنے لگی تھیں۔ جبکہ پروین کو انہوں نے اس کے پاؤں کے تلوے رگڑنے پر لگا دیا۔ تطہیر کی آنکھیں ابھی بھی بند تھیں اور نقاہت اس کے سارے وجود پر چھا رہی تھی وہ اپنے ہاتھوں سے پھپھو کو رک جانے کا اشارہ کر رہی تھی۔

کافی دیر تک تیمارداری کے بعد تطہیر کی حالت بہتر ہونے لگی تھی۔ اگلے پندرہ منٹوں میں وہ سو چکی تھی۔ پھپھو نے ان سب سے اٹھ جانے کے لیے کہا۔ وہ تینوں خاموشی سے باہر نکل آئیں۔ مناہل کا خیال تھا پھپھو کمرے سے باہر آ کر اس سے تطہیر کی حالت کے بارے میں بات کریں گی مگر وہ پروین کا ہاتھ تھامے خاموشی سے سیڑھیاں اتر گئیں۔

☆ ☆ ☆

"باجی...... پھپھو جی بلا رہی ہیں۔" پروین کی بیٹی آخر کار بلاوا لے آئی ان کے کمرے تک آنے سے پہلے اس نے وہ تمام متوقع سوالات خود سے کر لیے تھے جو وہ اس سے تطہیر کے متعلق پوچھ سکتی تھیں۔ اس نے وہ خود ساختہ گھڑی ہوئی کہانی بھی ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کی جو اس نے تطہیر کے متعلق پھپھو کو سنائی تھی۔

وہ ان کے کمرے میں آ کر خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ اس سے بہت خائف دکھائی دے رہی تھیں۔

"اس کا شوہر کہاں ہے۔؟" انہوں نے مناہل کے چہرے کو غصیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے پہلا سوال میزائل کی طرح داغا۔

ایک لمحہ کو وہ سمجھ نہیں پائی کہ وہ کس کے شوہر کے متعلق دریافت کر رہی ہیں پھر اس کا ذہن پروین کی طرف گیا۔ اس نے بہت اطمینان سے انہیں بتا دیا کہ اس کا شوہر گیراج میں گاڑی دھو رہا ہے مگر ان کے چہرے پر غصے کے آثار دیکھ کر وہ سمجھ نہ سکی کہ وہ کس کے متعلق پوچھ رہی ہیں۔

''میں تطہیر کے شوہر کی بات کر رہی ہوں۔'' اس کی استفہامیہ نگاہوں سے چڑ کر وہ خفگی سے بولیں۔ مناہل نے ان کی بات پر بہت مشکل سے خود کو حالت سکون میں رکھا اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ اس نے تطہیر کو ان کے سامنے شادی شدہ ظاہر کیا تھا یا غیر شادی شدہ۔

''پھپھو! اس کی شادی نہیں ہوئی ابھی تک۔'' اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا پھپھو کو اس کی بات سن کر جھٹکا لگا انہوں نے گھور کر اسے دیکھا پھر جو بات انہوں نے اسے بتائی وہ مناہل کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچنے کو کافی تھی۔

''آپ...... آپ کا مطلب وہ پریگنینٹ ہے۔'' اس نے حلق میں کانٹے اگتے ہوئے محسوس کیے۔ پھپھو اسے گھورنے میں مصروف تھیں۔

''اور تم کہہ رہی ہو اس کی شادی نہیں ہوئی...... اس بات کا مطلب؟؟''

انہوں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ مناہل اندر ہی اندر شرمندہ ہو رہی تھی۔ اس کی ممی سامنے ہوتیں تو وہ انہیں نہایت تفصیل سے بتا سکتی تھی۔ لیکن پھپھو جس زمانے کی خاتون تھیں وہ انہیں کبھی بھی قائل نہیں کر سکتی تھی۔

''میرا مطلب تھا کہ...... دوسری شادی نہیں ہوئی...... میں سمجھی کہ آپ اس کی دوسری شادی کے متعلق پوچھ رہی ہیں دراصل تطہیر کا پہلا شوہر ایک حادثے میں وفات پا گیا تھا۔ اس بات کو دو تین ماہ ہی گزرے ہیں اسی لیے۔''

اس نے اعتماد کی فضا قائم کرنے کے لیے جھوٹ روانی سے بولا۔

''تین ماہ؟''

پھپھو نے آنکھیں سکیڑ کر پوچھا۔ ان کا دل ذرا سا پگھلا تو تھا وہ خود بیوہ تھیں اور انہیں زمانے میں سب سے بڑا دکھ بیوگی ہی لگتا تھا۔

''عدت پوری کرنے کا تو وقت ہی نہیں ملا...... ساس نے ظلم کرنے شروع کر دیے تھے۔ اسی لیے اپنے گھر سے نکلنا پڑا'' وہ جان بوجھ کر ایسی باتیں کر رہی تھی کیونکہ پھپھو خود بھی اس قسم کے حالات سے گزر چکی تھیں اور وہ ایسی باتوں سے ہی پگھل سکتی تھیں۔

''یہ میری اچھی سہیلی کی دور پار کی رشتہ دار ہے دراصل وہ جانتی تھی کہ میرے گھر میں صرف پاپا ہی ہوتے ہیں اور وہ بھی آج کل یہاں نہیں ہوتے۔ اسی لیے میری سہیلی نے مجھے اس کو یہاں ٹھہرانے کے لیے کہا۔ آپ جانتی ہیں عدت میں اب وہ آدمیوں کا سامنا تو نہیں کر سکتی تھی۔''

پہلا جھوٹ بولنا مشکل لگا تھا مگر اب وہ بغیر دقت کے بات کر رہی تھی۔ پھپھو کے چہرے پر رنج و الم کے رنگ گہرے ہونے لگے۔

''مجھ سے...... بہتر کون جان سکتا ہے۔ بیٹا کہ بیوگی کا دکھ کیا ہوتا ہے؟ میں نے بھی بہت کٹھن حالات دیکھے ہیں۔''



وہ رقت آمیز لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ مناہل نے دل ہی دل میں خود کو داد دی اور ساتھ ہی تطہیر کا گلا دبا دینے کو بھی جی چاہا وہ اس کے لیے ہر گزرتے دن کے ساتھ مشکلات پیدا کر رہی تھی۔

''آپ کو...... اس نے خود بتایا اس بارے میں۔'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

پھپھو کے سامنے لفظوں کا چناؤ بہت دیکھ بھال کے کرنا پڑتا تھا۔ وہ بن بیاہی بچیوں سے ہر بات ڈسکس کرنے کی قائل نہیں تھیں۔

''کس بارے میں؟'' وہ الجھ کر اس کا چہرہ دیکھنے لگیں کیونکہ وہ تو اسے اپنی ساس کے ظلم کی داستان سنانے لگی تھیں جبکہ وہ شاید سن ہی نہیں رہی تھی۔

''میرا مطلب...... پریگنینسی...... کے بارے میں......'' دل ہی دل میں تطہیر کو گالیاں دیتے ہوئے اس نے پوچھا۔ پھپھو کے چہرے پر پھر خفگی کے تاثرات آ گئے۔

''مجھے اس نے بتایا ہوتا تو میں تم سے پوچھتی۔'' وہ پھر سے اسے گھورنے لگی تھیں۔

''آپ کو کیسے پتا چلا پھر......؟'' اس نے ایک اور احمقانہ سوال کیا۔ اب کی بار پھپھو کے چہرے پر ایسے رنگ آئے جیسے اسے چپت رسید کرنے والی ہوں۔

''احمق......'' اتنا ہی بولی تھیں اور مناہل پھر بھی نہیں سمجھی۔

''میں بچی نہیں ہوں دودھ پیتی...... دنیا دیکھی ہے میں نے، مجھے پہلے اس بارے میں اس لیے پتا نہیں چل سکا کہ وہ اپنے آپ کو بہت چھپا کر رکھتی ہے۔ بیڈشیٹ جتنی تو چادر اوڑھتی ہے وہ...... اسی لیے مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا۔'' وہ سانس لینے کو رکیں پھر بولیں۔

''بیوگی کا دکھ بہت برا ہوتا ہے بیٹی! عورت کو اندر ہی اندر ختم کر دیتا ہے ورنہ اس حالت میں تو بکری کا جسم بھی پھیل جاتا ہے۔''

اب مناہل کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔ تطہیر سچ مچ اپنے سراپے سے حاملہ نہیں لگ رہی تھی۔ اتنے دن سے وہ ان کے گھر میں تھی مگر کسی کو پتا نہیں چل سکا تھا۔

''مجھے اس لڑکی سے ہمدردی ہے مگر کل کلاں کو کچھ مسئلہ ہو گیا تو میں تمہارے پاپا کو کیا جواب دوں گی میں جانتی ہوں تمہارے پاپا نے تمہیں بیٹوں کی طرح پالا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ہر پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑا کر اپنے لیے مسائل کا انبار اکٹھا کر لو اور پھر کل رات جو کچھ ہوا...... میں تو ہم پرست نہیں ہوں مگر...... جنات کا وجود تو بہرحال قرآن سے بھی ثابت ہے۔''

وہ تطہیر سے اس سے زیادہ ہمدردی نہیں کر سکتی تھیں مناہل ان کی بات مکمل ہونے پر خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گئی۔ پھپھو سے بحث کرنے یا ان کی بات سے انکار کرنے کا مطلب ان کی مزید خفگی مول لینا تھا جو وہ چاہتی نہیں تھی ویسے بھی وہ اس سارے مسئلے سے اکتانے لگی تھی۔

تطہیر کے بارے میں ہر روز ایک نئی بات سامنے آ رہی تھی ہر روز ایک نئے راز سے پردہ اٹھ رہا تھا۔ مسز شہلا قمر نے یہ بھاری ذمہ داری اس کے سر پر ڈال کر دوبارہ خبر نہیں لی تھی اور خود امریکہ جا بیٹھی تھیں وہ اسے

ہر دو روز بعد فون کر کے صورت حال کے بارے میں پوچھتی ضرور تھیں۔

انہوں نے اس سے خاص طور پر درخواست کی تھی کہ وہ فی الحال تطہیر رحمٰن کی موجودگی کو راز ہی رکھے حتیٰ کہ انہوں نے صفوان اور باقی کولیگز سے بھی یہ بات مخفی رکھنے کے لیے کہا تھا۔ ایک ماریہ تھی جس سے وہ یہ سب اطمینان سے کہہ سکتی تھی مگر اس جیسی الا ابالی لڑکی اس مسئلے کو سلجھا ہی نہیں سکتی تھی۔

تطہیر کی شخصیت پیاز کی طرح پرت در پرت کھل رہی تھی مگر پھر بھی وہ ایک سربستہ راز کی مانند معلوم ہوتی تھی۔ مناہل کو اس کی ہر لحہ اوڑھی ہوئی چادر کا مقصد سمجھ میں آنے لگا تھا۔ اس کا جرم اتنا پھیلا ہوا نہیں تھا کہ مناہل جیسی لڑکی اس کی پریگنینسی کے متعلق جان سکتی تھی مگر پھپھو جیسی جہاندیدہ عورت سے اپنا آپ چھپانے کے لیے یہ سب ضروری تھا مگر وہ یہ سب باتیں چھپا کیوں رہی تھی چھپایا تو گناہ جاتا ہے تو کیا تطہیر رحمٰن گنہگار تھی۔ اس کے گناہوں کی لسٹ میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ گناہ بھی عام گناہ نہیں کبیرہ گناہ۔ اس نے اپنے حسن سلوک سے جو ایک امیج بنایا تھا وہ پھر ٹوٹنے لگا تھا۔ اس کی شخصیت کا گراف پھر نیچے آرہا تھا۔ اس کے بارے میں لاتعداد سوالات اٹھ رہے تھے۔ مناہل مزید خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔

''تم کون ہو؟'' اس نے کمرے میں داخل ہو کر پہلا سوال یہ ہی کیا۔

☆ ☆ ☆

''میں کہاں جاؤں؟..... بولو میں کہاں جاؤں؟''

وہ اپنے شوہر کے گھر کی دہلیز پر بیٹھی آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بار پھر اپنے مالک سے سوال کررہی تھی اسے اسی طرح لاتعداد سوال کرنے کی عادت تھی لیکن اس بار وہ رو نہیں رہی تھی کیونکہ اس کے اندر بہنے والا آنسوؤں کا جھرنا خشک ہو چکا تھا۔ اس کے جسم کے صحرا میں اندر باہر اب کہیں برسات نہیں ہوتی تھی۔ اس کے باپ اور بھائی کے بعد اس کی مرضی کے بغیر اس کی زندگی میں آنے والا تیسرا مرد اکبر علی تھا لیکن وہ ان دونوں سے قدرے مختلف تھا اگرچہ وہ زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا لیکن کچھ شکی اور توہم پرست بھی تھا مگر وہ اس کے ساتھ رہتے ہوئے مطمئن تھی۔ اس گھر میں آجانے کے بعد اس کی دونوں سہیلیاں یکے بعد دیگرے وفات پاگئی تھیں ایک دادو جی اور دوسرے اس کی تنہائی۔ اس کے ابو کے گھر میں اب اس کا کچھ باقی نہیں بچا تھا اس نے اکبر علی کے گھر کو اپنا گھر سمجھنا شروع کردیا۔

اکبر علی کے پاس کچھ نہیں تھا مگر دولت بہت تھی اور اس دولت کو خرچ کرنے کے معاملے میں وہ بہت شاہ خرچ واقع ہوا تھا۔ اکبر علی کا پیسہ خرچ کرتے ہوئے اسے کسی شرم یا تذلیل کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ خود ہی ہر مہینے کی ابتدا میں اچھی خاصی رقم اس کے حوالے کردیتا تھا۔ وہ اکثر اوقات اس کے لیے تعریفی الفاظ بھی استعمال کردیتا تھا۔ شاید اپنی بیوی کی وفات کے بعد وہ اپنی تین جوان ہوتی ہوئی بیٹیوں کو لے کر کچھ زیادہ ہی حساس ہوگیا تھا اسی لیے وہ اس کے ساتھ اپنا رویہ بہترین رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کی تین بیٹیاں اور دو بیٹے بھی اپنی سوتیلی ماں سے مطمئن تھے۔

شادی کے تقریباً آٹھ ماہ بعد اس کو وہ احساس ہوا جو ہر عورت کی تکمیل کہلاتا ہے۔ وہ زندگی تخلیق



کرنے جارہی تھی وہ یقیناً اس قابل تھی کہ زندگی عدم سے وجود میں لے آئے۔ خوشی کیا ہوتی ہے اسے پتا چل گیا تھا خوشی کی حد کیا ہوتی ہے اسے یہ بھی پتا چل گیا تھا۔ ان دنوں اس کی اپنی زندگی اس کی کھلکھلاہٹیں سن کر حیران ہوجاتی تھی۔

ہماری خوشیوں کو ہماری اپنی ہی نظر لگ جایا کرتی ہے۔ اس کی خوشی کو بھی شاید اس کی نظر لگ گئی تھی۔

پریگنینسی کے پہلے ہی مہینے اس نے اپنے بچے کا نام سوچ لیا تھا۔ اس نے اپنی گری گری طبیعت کا ذکر اکبر علی سے بہت خوش ہو کر کیا۔ اکبر علی نے اسے کچھ الجھ کر دیکھا پھر اپنی جیب سے نوٹ نکال کر اس کے سامنے رکھے تھے۔ روپے خوشی خریدنے کے لیے ہوتے ہیں لیکن وہ اسے یہ روپے اس کی زندگی کی اکلوتی خوشی کو ختم کرنے کے لیے دے رہا تھا۔ وہ اکبر علی کی بات کیسے مان سکتی تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی گناہ نہیں کیا تھا اور پھر بھی اس نے گنہگاروں جیسی زندگی گزاری تھی اور اگر وہ یہ گناہ کرلیتی تو اس کی زندگی گنہگاروں سے بھی بدتر ہوسکتی تھی۔

اکبر علی اس سے اس کی زندگی کی یہ اکلوتی خوشی بھی چھین لینا چاہتا تھا۔ اس نے واضح لفظوں میں مزید اولاد کے لیے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کردیا تھا وہ اس عمر میں میٹرنٹی ہوم کے چکر لگا کر اپنا تماشا نہیں بنوانا چاہتا تھا۔ وہ اسے ایک استعمالی چیز سمجھ کر گھر لایا تھا جسے اس کی اولاد بیک وقت وائپر جھاڑو بیلن اور چمٹے کی طرح استعمال کرسکتی تھی وہ اس استعمال کی چیز کے ہاتھوں خود استعمال نہیں ہونا چاہتا تھا۔

اس نے اکبر علی کی بات ماننے سے انکار کردیا تھا۔ جواب میں اکبر علی نے بہت خاموشی سے طلاق کے کاغذات اس کے سامنے رکھ دیے۔ اسے کسی مولوی سے فتوے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اسے اپنے گھر سے نکالنے کا فیصلہ کرچکا تھا وہ اکبر علی کا چہرہ دیکھتی رہ گئی یہ بات اسے ہمیشہ حیران کرتی تھی کہ آخر اتنی مشکل سے بننے اور نبھانے والا یہ رشتہ اتنی آسانی سے کیسے ختم ہو جاتا ہے اور اب اپنے شوہر سے یہ کاغذات لیتے ہوئے سب سمجھ میں آگیا تھا۔ وہ اسے اپنے گھر میں رکھنے کو تیار تھا مگر اپنی شرائط پر جو اسے منظور نہیں تھیں اکبر علی نے طلاق کی وجہ اس کی وہ بیماری ظاہر کی تھی جو بہت عجیب وغریب تھی اور وہ شادی سے پہلے اس کی اس بیماری کے متعلق نہیں جانتا تھا۔ وہ خود بھی اپنی اس بیماری کو جانتی تھی لیکن جو نام اسے اکبر علی نے دیا تھا وہ کچھ انوکھا تھا کم از کم خود اس کے لیے۔

اسے جنات کا سایہ تھا۔ وہ جنات کے زیر اثر بہت نقصان دہ حرکتیں کرتی تھی۔ وہ اپنے شوہر اور اپنے بچوں کے لیے نقصان دہ تھی۔ ایسی عورت کو گھر میں کیسے رکھا جاسکتا تھا۔

لوگوں کی ہمدردیاں بٹورنے کے لیے اکبر علی کے پاس اس سے بہتر کوئی اور جواز ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک بار پھر کھلے آسمان کے نیچے آگئی تھی۔ اس کے شوہر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر نکال دیا تھا۔ اس کی قسمت ہی یہی تھی شاید کہ ہر جگہ سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر نکال دیا جاتا۔

یہ ابو کے جوتے امی کے تھپڑ بہن بھائیوں کے طعنے نہیں تھے کہ وہ چلا چلا کر آسمان سر پہ اٹھالیتی، ایک ایسی بات تھی جس کے لیے وہ کسی کو موردالزام نہیں ٹھہرا سکتی تھی۔ اور یہ ایک ایسی بات تھی جس کا سارا کریڈٹ وہ خود لینا چاہتی تھی۔ اس کے لیے اپنے واسطے طلب کرنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا مگر وہ اپنے بچے کی کو

خواہش سے دستبردار نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بچہ اپنا نجات دہندہ محسوس ہونے لگا تھا حالانکہ اس کے آنے تک اسے ٹھکانہ چاہیے تھا۔ وہ ایک بار پھر اللہ سے پوچھ رہی تھی۔ وہ ماں باپ بھائی شوہر کے گھر سے دھتکار دی گئی تھی۔ اسے گھر چاہیے تھا وہ اللہ سے ٹھکانا طلب کر رہی تھی۔

وہ کہتا ہے کہ وہ ہر پکار کا جواب دیتا ہے۔ اور اگر وہ ہر پکار کا جواب دیتا ہے تو وہ جواب سنائی کیوں نہیں دیتا یا پھر شاید اس کے جواب کو سن کر ان سنی کر دیا جاتا ہے اکثر اوقات اس کے جوابات کو ٹھیک طرح سے سمجھا ہی نہیں جاتا اور پھر شکوہ بھی اسی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا شاید ورنہ اللہ اپنے بندے سے اتنا لاپروا نہیں کہ اس کی پکار کا جواب نہ دے۔

☆ ☆ ☆

''میں کون ہوں؟ سوال یہ نہیں ہے۔ میں کیوں ہوں؟ سوال یہ ہے۔''

اس نے ہر حقیقت سے پردہ اٹھا دینے کے بعد کہا۔ نقاہت کے باعث اس کے چہرے پر زردی کے رنگ نمایاں تھے۔ رات کے وقت ہونے والے اس سر درد نے اسے بہت نڈھال کر دیا تھا وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر بات کر رہی تھی مگر اس نے مناہل سے کچھ چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

مناہل کے صرف ایک سوال پر وہ اس کے سامنے کھلتی چلی گئی تھی۔ والدین کی علیحدگی اس کی امی کے ظلم و ستم عبیر کے طعنے خرم کی سنگدلی اس کی سگی ماں کی خود غرضی...... ایک ایک بات مناہل کو بتا دی تھی اس نے، شاید وہ خود بھی اتنا غبار اٹھائے جانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اسے کسی سامع کی ضرورت تھی اور مناہل ایک اچھی سامع ثابت ہوئی تھی۔

اس کی تعلیم زیادہ نہیں تھی مگر وہ کمال کا فلسفہ بولتی تھی کیونکہ فلاسفی بولنے کے لیے تعلیم سے زیادہ علم کی ضرورت ہوتی ہے اور علم تجربے سے بھی آ جاتا ہے۔ تطہیر کے پاس بہت تجربہ تھا۔ اس نے زندگی کی درماندگی کو بہت ہمت سے سہا تھا۔

''مجھے اب کسی سے کچھ نہیں چاہیے میری ساری امیدوں کا مرکز میرا بچہ ہے۔ وہ جب اس دنیا میں آ جائے گا تو مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ میں اس کے سہارے زندگی کے تمام مصائب کو ہنسی خوشی سہہ لوں گی۔'' اس نے کہتے کہتے لحہ بھر کا توقف کیا پھر بولی۔

''جب اکبر علی نے مجھے گھر سے نکالا تو میرے پاس کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ میں خرم کے پاس نہیں جا سکتی تھی۔ میں اپنی ماں کے گھر واپس نہیں جا سکتی تھی تب میں نے بہت دل سے اللہ کو پکارا تھا۔ مجھے رہنے کو ٹھکانہ مل گیا تھا۔ میں دارالپناہ میں آ گئی تھی۔ میں نے وہاں تین ماہ گزارے...... اور وہ تین ماہ میری تیئس سالہ زندگی پر حاوی ہیں۔ میں نے ان دنوں زندگی کی جس تلخی کو محسوس کیا جن رنگوں کو دیکھا وہ اس قدر تکلیف دہ تھے کہ میں ابھی تک ان کو بھلا نہیں پائی مگر میں انہیں یاد بھی نہیں کرنا چاہتی۔ گھر سے نکلی دارالامان پہنچی وہاں سے پولیس اسٹیشن اور پھر یہاں آپ کے پاس...... میں جانتی ہوں مجھے یہاں سے بھی جانا ہے میں آپ کو زیادہ دیر تک تنگ نہیں کروں گی...... بس دو تین ماہ صرف دو...... تین ماہ مجھے اپنے پاس رکھ لیں یقین کریں اس کے بعد میں آپ کو



کبھی شکل بھی نہیں دکھاؤں گی...... مگر براہ مہربانی۔''

اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ مناہل سمجھ گئی تھی وہ ڈلیوری تک اس کے گھر میں رہنا چاہتی تھی لیکن یہ مناہل کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اپنے والدین سے پوچھے بغیر اب کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ تطہیر کا دل بھی نہیں توڑ سکتی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر بات پلٹی۔

''اور وہ سب کچھ جو کل رات ہوا...... وہ کیا ہوا تھا۔ کیا سچ مچ تمہیں......''

یہ شاید پھپھو کی بات کا اثر تھا کہ وہ بھی جنات کے وجود کے بارے میں پر یقین ہو چلی تھی اور پھر تطہیر کی طلاق کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی اسی لیے اس نے پوچھ لیا۔ تطہیر کے چہرے پر بہت مردہ سی مسکراہٹ نے جھلک دکھائی۔

''بچپن سے ہی ایسا ہے...... اچانک درد اٹھتا ہے۔ اور میں بے حال ہو جاتی ہوں حتیٰ کہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہتی...... دل چاہتا ہے سر کو اپنے ہاتھوں الگ کر دوں۔''

''تم نے کبھی ڈاکٹر کو نہیں دکھایا؟...... کبھی چیک اپ بھی نہیں کروایا؟'' مناہل نے پوچھا۔

''جب میں اپنی ماں کے گھر گئی تھی تب وہاں چیک اپ کروایا تھا۔ ڈاکٹر نے ٹیسٹ وغیرہ کیے تھے۔ وہ کہتا ہے میں پیدائشی ہائپر ٹینسو ہوں۔ اس نے اور بھی بہت سی باتیں بتائی تھیں دوائیں بھی دی تھیں۔ مگر۔''

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ مناہل نے گہری سانس بھری...... اسے تطہیر سے ہمدردی ہوئی تھی اور اس جیسی لڑکی جو زندگی کے ہر میدان میں کامیابی کے نشے سے سرشار تھی وہ تطہیر کے لیے صرف ہمدردی ہی محسوس کر سکتی تھی۔

''تمہیں اپنی ممی کا گھر نہیں چھوڑنا چاہیے تھا...... بہر حال وہ تمہاری ماں ہیں وہ تمہیں بہتر طریقے سے سنبھال سکتی تھیں۔'' مناہل نے رائے دی۔

''وہ بھی یہی کہتا تھا...... اس کا خیال تھا کہ بہت پچھتاؤں گی...... اور۔'' اس نے رک کر گہرا سانس لیا اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی مناہل نے یہ مسکراہٹ پہلے کبھی اس چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔

''اور اس کا خیال ٹھیک ثابت ہوا میں حقیقتاً پچھتائی بھی۔'' اس نے اسی طرح مسکراتے ہوئے بات مکمل کی۔

''وہ؟ وہ کون؟'' مناہل نے کھوجنے والے انداز میں پوچھا تطہیر کے چہرے پر جھینپی ہوئی مسکراہٹ میں اضافہ ہوا۔

وہ...... وہ تھا...... وہ کہتا تھا اسے مجھ سے محبت ہے...... وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔''

شرمگیں مسکراہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ مناہل کو خفیف سا جھٹکا لگا۔ بھلا تطہیر جیسی عام شکل والی لڑکی سے کون محبت کر سکتا تھا۔

''وہ میری ماں کے دوسرے شوہر کا بیٹا تھا ہر لحاظ سے مجھ سے مختلف ہر لحاظ سے مجھ سے بہتر......''

وہ ایک بار پھر بات کرتے کرتے رکی۔ شرمگیں مسکراہٹ استہزائیہ مسکراہٹ میں ڈھل گئی تھی۔

''اسے میرے حالات سن کر ہمدردی کا بخار چڑھ گیا تھا وہ کہتا تھا اسے مجھ سے محبت ہوگئی ہے اور وہ میرے لیے ساری دنیا سے ٹکر لے سکتا تھا۔'' وہ بتا رہی تھی جبکہ مناہل کو حیرت ہو رہی تھی۔ تطہیر نے بتایا تھا وہ لڑکا اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ لڑکا اتنے بڑے بزنس مین کا بیٹا تھا یقیناً وہ بہت ہائی فائی چوائس رکھتا تھا تو پھر اس نے بیوی کے لیے تطہیر کا انتخاب کیوں کیا؟ اس کے ذہن میں یہی سوال گردش کرنے لگے تھے۔

''بدھو ہوگا۔'' اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔

''تمہیں بھی اس سے محبت تھی؟'' مناہل نے سرسری سے انداز میں سوال پوچھا۔

''پتا نہیں میں نے کبھی سوچا نہیں...... مگر مجھے اس کی ہمدردی سے سخت نفرت تھی۔ میری ماں نے اس کی پرورش کی تھی وہ ان کا احسان اتارنے کے لیے مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا مجھے اس کے جھوٹ سے نفرت تھی وہ احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے مجھے استعمال کر رہا تھا اور وہ کہتا تھا وہ مجھ سے محبت کرتا ہے محبت یہ تو نہیں ہوتی محبت اس طرح کی تو نہیں ہوتی۔''

وہ سر جھکائے کہہ رہی تھی۔ مناہل سمجھ نہیں پائی کہ پھر وہ کس قسم کی محبت کی طلب گار تھی۔ وہ بات کرتے کرتے آنکھیں بند کر چکی تھی۔ اسے اس بات پر کافی حیرت ہو رہی تھی۔ کہ تطہیر سے کوئی لڑکا محبت کیسے کر سکتا ہے۔ یقیناً اس کی والدہ کا سوتیلا بیٹا نیکی کے موڈ میں تھا اور تطہیر نے اسے یہ نیکی کرنے نہیں دی تھی۔

☆ ☆ ☆

''آٹھ نمبر......'' استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی نے نمبر پکار کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ مناہل نے مسکراتے ہوئے اس خوب صورت سی ریسپشنسٹ کو دیکھا۔

''آپ آٹھ نمبر کے ساتھ ہیں؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''جی۔'' وہ اپنی نشست سے اٹھ کر استقبالیہ پر آ گئی۔

''میم! آپ اندر چلی جائیے۔'' وہ گائنا کولوجسٹ کے روم کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہی تھی۔ مناہل خاموشی سے اندر چلی گئی۔ ویٹنگ روم میں بیٹھی خواتین نے حیرت سے اسے دیکھا تھا پھر ان میں سے دو ایک کھسر پھسر کر کے ہنسنے لگی تھیں اسی لیے وہاں سے اٹھتے ہوئے اس نے ذرا سکون کا سانس لیا تھا۔ ویسے بھی کسی بھی میٹرنٹی ہوم میں آنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ تطہیر پہلے سے گائنا کولوجسٹ کے روم میں تھی۔ اس کا چیک اپ ہو چکا تھا اور وہ اب کرسی پر خاموشی سے بیٹھی ہدایات سن رہی تھی۔

''آپ ہیں ان کے ساتھ؟'' بے حس سے چہرے والی اس گائنا کولوجسٹ نے پوچھا پھر اس کے اثبات پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''کیس بہت مشکل ہے...... سیزیرین کے بغیر تو ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم بے بی کو بچا سکیں۔ بہت کمزور ہیں یہ...... ہائپرٹینسو بھی ہیں...... بائی داوے آپ میرڈ ہیں۔''

اس نے ایک دم سے سوال کیا۔

''نہیں!'' اسے اچانک ہی اپنے غیر شادی شدہ ہونے پر شرمندگی ہونے لگی۔ گائنا کولوجسٹ کے



چہرے کے تاثرات ہی ایسے تھے۔

''آپ کو کسی میرڈ خاتون کو اپنے ساتھ لانا چاہیے تھا۔ اب میں ان کو مزید تفصیلات سے کیا آگاہ کروں؟ آپ کا یہ پہلا بے بی ہے...... بہت احتیاط کی ضرورت ہے...... کچھ کمپلیکیشنز ہو سکتی ہیں......''

وہ ٹھہر ٹھہر کر ان دونوں کے چہرے اور اپنے سامنے پڑی تطہیر کی رپورٹس دیکھ کر کہہ رہی تھی۔ ایک دن پہلے اس نے اسی میٹرنٹی ہوم سے کچھ ٹیسٹ کروائے تھے۔

''Foetus کی موومنٹ بہت سلو ہے...... آپ اپنی خوراک کی طرف دھیان دیں...... ٹینشنز...... اسٹریس...... ٹاٹ ایٹ آل۔''

اپنا چشمہ اتار کر اس نے میز پر رکھتے ہوئے کہا پھر مناہل کے حلیے پر نظر ڈال کر بولی۔

''ادائیگی یکمشت کرنی ہوں گی...... آپ کاؤنٹر پہ اپنا نام رجسٹر کروا کر نیکسٹ وزٹ کی ٹائمنگ طے کر لیجیے۔''

وہ اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولی۔ مناہل کو اس نے بلایا ہی اس لیے تھا کہ تطہیر کو اپنے حلیے سے اس قابل نہیں لگ رہی تھی کہ اخراجات برداشت کر سکے جبکہ مناہل کو دیکھ کر اسے اطمینان ہو گیا تھا۔

وہ دونوں شکریہ ادا کر کے اٹھ گئی تھیں تطہیر کو گائنا لوجسٹ کی باتوں نے پریشان کیا تھا یا نہیں اس کے چہرے سے پتا لگانا مشکل تھا یہاں آنے سے پہلے اس نے مسکراتے ہوئے مناہل سے کہا تھا۔

''میں جانتی ہوں اس بار اللہ میرے ساتھ ہے وہ مجھ پر کرم ضرور کرے گا۔''

وہ مرکزی استقبالیہ پر آ کر ضروری معلومات فراہم کر کے تطہیر کا نام درج کروانے لگی تطہیر ایک طرف پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔

''ایکسکیوزمی۔'' مناہل نے مڑ کر دیکھے بغیر اس آواز کو پہچان لیا تھا اس آواز کو وہ ہزاروں کے مجمع میں بھی پہچان سکتی تھی وہ صفوان ہی کی آواز تھی۔ مناہل کچھ جھجکتے ہوئے مڑی۔ میٹرنٹی ہوم میں وہ کم از کم اس شخص کا سامنا نہیں کر سکتی تھی اسے یہ صورتحال ایک دم سے بہت عجیب لگی۔ صفوان کی آنکھوں میں تحیر تھا۔

''وہ...... میں اپنی ایک فرینڈ کے ساتھ آئی تھی۔'' اس کے استفسار پر وہ خجالت بھری مسکراہٹ سے بولی۔

''میرے ایک کولیگ کی وائف ہیں یہاں...... جڑواں بیٹے ہوئے ہیں ان کے گھر۔'' اسی کے انداز میں صفوان نے بھی وضاحت کی۔ اس کا اس جگہ پر ہونا اتنا بھی حیران کن نہیں تھا کیونکہ وہ خود ایک ڈاکٹر تھا مگر پھر بھی اس کی وضاحت مناہل کو اچھی لگی۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے تطہیر کو اپنی سمت بلایا۔ صفوان نے بھی اس کی طرف دیکھا پھر وہ مناہل کو دیکھنے لگا تھا۔

''یہ...... تطہیر......''

''تطہیر رحمٰن۔'' صفوان نے اس کی بات اچک کر نام مکمل کیا تو مناہل نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''یہ آپ کے ہاتھ میں نسخہ ہے نا اور یہ رپورٹس۔'' فائل کی سمت اشارہ کیا جس پر تطہیر کا نام لکھا تھا اور

مناہل کے ہاتھ سے فائل لے کر دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے مگر اس نے ان پر قابو پا لیا تھا۔ گائنی کی رپورٹس کو مکمل طور پر سمجھنا اس کے لیے اتنا بھی آسان نہیں تھا۔ فائل اس نے چیک کرنے کے بعد واپس مناہل کو تھما دی۔

''مبارک ہو آپ کو بہت۔'' اس نے تطہیر کی طرف دیکھتے ہوئے استہزائیہ انداز میں مبارک باد دی۔ وہ تطہیر کا مکمل جائزہ لے چکا تھا شاید اسے اس کے حلیے سے الجھن ہو رہی تھی کم از کم اس کے چہرے سے الجھن ہی ٹپک رہی تھی۔ سجی سنوری میک اپ سے آراستہ مناہل کے مقابلے میں تطہیر کی سادگی اس کے روپ کو مزید گہنا رہی تھی۔ تطہیر نے ایک نظر ہی صفوان کو دیکھا تھا اسے مناہل کی قسمت پر رشک آیا تھا۔ صفوان کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

مناہل نے صفوان کی آنکھوں میں تطہیر کے لیے الجھن دیکھی تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ جانتی تھی صفوان کو ہمدردی خداترسی سوشل ورک سب باتوں سے چڑ ہے۔ اس کے دل میں ایک انوکھا خیال آیا تھا۔

وہ اس لمحہ صفوان کو دکھا سکتی تھی کہ وہ کتنی ہمدرد اور حساس طبیعت رکھتی ہے اس کا دل لاچاروں کی تکلیف پر کتنا دکھ محسوس کرتا ہے اور وہ صفوان کی نظروں میں اپنا بلند کردار مزید بلند کرنے کے لیے تطہیر رحمٰن کو استعمال کر سکتی تھی۔ وہ اپنی ہمدرد طبیعت کا مظاہرہ کر کے اپنے نمبر بڑھا سکتی تھی۔ اپنی عظمت کو ثابت کرنے کا شاید ہی اس سے بہتر موقع کوئی اور ہوتا۔ اس کا دل مدر ٹریسا بننے کو چاہا تھا۔

وہ صفوان کو اپنی اس مظلوم دوست کے عجیب و غریب سر درد کے متعلق بتانے لگی۔ وہ نیورو سرجن تھا۔ اور مسئلے کی اصل تہہ تک پہنچ سکتا تھا۔ لیکن وہ نہایت لاتعلقی سے مناہل کی بات سن رہا تھا اور وقتاً فوقتاً تطہیر کے سراپے پر نظر ڈال لیتا جو سر جھکائے اپنے جوتوں کو گھورنے میں مشغول تھی۔

☆　☆　☆

''جو انسان دارالامان جیسی جگہوں پر برائی ڈھونڈ سکتا ہے۔ جو وہاں کی مظلوم عورتوں کو فراڈ قرار دیتا ہے۔ اور جو ایسی جگہوں کو ختم کرنے کی بات کر سکتا ہے میں تو اسے مسلمان ہی نہیں مانتی۔''

سبیکا نے میز کے گرد بیٹھے ساتوں افراد کے چہرے پر باری باری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''تمہارے نہ ماننے سے میں کافر نہیں ہو جاؤں گا...... الحمد اللہ مسلمان ہی رہوں گا۔''

فیصل نے بہت اطمینان سے جواب دیا جبکہ سبیکا کا خیال تھا وہ اس بات پر ضرور بھڑک اٹھے گا مگر وہ ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھا جنہیں غصہ ذرا کم ہی آتا تھا۔ سبیکا نے جان بوجھ کر اس کی بات کا جواب نہیں دیا ورنہ ایک لمبی بحث چھڑ سکتی تھی جس سے وہ فی الحال احتراز برتنا چاہتی تھی۔

''یہ دارالامان جس طرح ضرورت مند عورتوں کو چھت آسرا اور پناہ فراہم کرتے ہیں وہ قابل تحسین ہے۔''

یہ ٹکڑا بھی فیصل نے ہی لگایا تھا۔ وہ ایک کرائم رپورٹر تھا اس کے پاس اس طرح کی باتوں کے متعلق



ساری معلومات ہی نہایت اپ ٹو ڈیٹ ہوتی تھیں۔ لیکن سبیکا کو اس کی کسی بات سے اتفاق نہیں ہوتا تھا۔ اس کے خیال میں فیصل کو انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے ہر اچھی چیز کو برا کہنے کا شوق تھا۔ ان کی این جی او کے سالانہ فنڈنگ سے حاصل ہونے والی رقم سے اس بار ایک دارالامان بنانے کا منصوبہ زیر غور تھا۔ سبیکا کو بورڈ ممبرز کے ساتھ ساتھ جونیئر سینئر اسٹاف کی رائے بذریعہ ووٹنگ لینے کے لیے کہا گیا تھا۔ وہ اسی سلسلے میں ان سب کو اس منصوبے کے فوائد اور دور رس اثرات سے آگاہ کر رہی تھی جب فیصل بھی وہاں چلا آیا اور آتے ہی اس نے اس منصوبے کے فوائد کو بوگس بکواس قرار دیا تھا سبیکا دراصل اسی بات سے بھڑکی تھی۔ فیصل ان کا کولیگ نہیں تھا اس کا اس آفس سے صرف اتنا تعلق تھا کہ وہ ریحان قمر کا بھانجا تھا اور جب اپنے کام سے تھک جاتا تھا تو فریش ہونے کے لیے ان کے پاس آ کر بیٹھ جایا کرتا تھا' کیونکہ وہ ایک فری لانسر رپورٹر تھا اس لیے اپنی مرضی کا مالک تھا۔ وہ اس آفس میں ہونے والی ہر بحث میں کود پڑنے کا عادی تھا اور خاص طور سے سبیکا جس بحث کو چھیڑتی اس میں ٹانگ اڑانا تو اس کی عادت تھی۔ اب بھی یہی ہوا تھا اس نے سبیکا کی بات سے اختلاف کر کے گویا اس کے غصے کو ہوا دی تھی۔

اس [illegible]مینان بھی قابل داد تھا۔ وہ سبیکا کو چڑانے کے لیے جان بوجھ کر اس طرح سے بات کر رہا تھا۔ ا[illegible] بار اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکی اسی لیے تڑخ کر بولی۔

''تم تو مجھ سے بات ہی نہیں کرو فیصل...... تم ایک مردہ دل کے مالک انسان ہو میرا دل چاہتا ہے کہ تمہاری پیشانی پہ یہ بڑا بڑا کر کے لکھوا دوں کہ یہ شخص پاگل ہے اس کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اسے کاٹنے کی عادت ہے۔''

وہ در پردہ اسے گالی دے رہی تھی۔ فیصل نے بہت جلی ہوئی مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

''ویل مس سبیکا! آپ میرے بارے میں اور میری عادتوں کے بارے میں کچھ زیادہ ہی باخبر نہیں رہنے لگیں۔ اور کس کس چیز کی عادت ہے مجھے یہ بھی بتا دیجیے۔'' مناہل' فہد' ربیعہ' اظہر اور شعیب سب ہی ایک دم کچھ محتاط ہوئے۔ فیصل کا یہ انداز ان کے لیے کچھ نیا تھا۔ سبیکا کو بھی شاید اپنی غلطی کا احساس ہوا اسی لیے وہ بھی ذرا دیر کو خاموش ہو گئی فیصل اس کے اترے چہرے کو دیکھ کر ایک دم سے ہنس دیا اور بات پلٹ کر بولا۔

''لیو اٹ یار! یہ سب تو چلتا ہی رہتا ہے...... کس بات کے لیے ووٹنگ کر رہے تھے تم لوگ چلو پھر سے شروع کرتے ہیں۔''

اس کے ہلکے پھلکے انداز میں کہنے پر سب ہی کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''تم بھی تو اپنی رائے دو مناہل!'' اسے خیالوں میں کھویا دیکھ کر اظہر نے متوجہ کیا۔ وہ اپنی دنیا میں کھوئی ان کی بات ہی نہیں سن پائی تھی۔ سبیکا اور فیصل کے درمیان تصفیہ ہو بھی چکا تھا یقیناً سبیکا نے معذرت نہیں کی تھی لیکن فیصل کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ سب ٹھیک ہو چکا ہے۔ اسے کبھی کبھی اس شخص کی قوت برداشت پر رشک آتا تھا وہ کیسے ہر بات اتنے تحمل سے ہضم کر لیتا تھا۔

''میں ذاتی طور پر کسی ادارے یا تنظیم کے خلاف نہیں ہوں۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ دارالپناہ جیسی

جگہیں نہیں ہونی چاہیں میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ مظلوم عورتوں کی بقا کو قائم رکھنے کے لیے کچھ نہ کیا جائے۔''

وہ اپنے مخصوص انداز میں سب سے بات کر رہا تھا لیکن وہ سنانا صرف سبیکا کو چاہتا تھا۔

''میرے کہنے کا صرف یہ مقصد تھا کہ تمہیں اور باقی سب لوگوں کو یہ بتا سکوں کہ جن جگہوں یا اداروں کے بارے میں ہم بہت حساس ہوتے ہیں اور ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وہاں برائی یا برائی جیسی کوئی چیز ہو سکتی ہے دراصل وہاں سب سے زیادہ بدی اور برائی کے پائے جانے کا امکان ہوتا ہے کیونکہ وہاں کسی کی نظر نہیں پڑتی اور برائی بیکٹیریا کی طرح نمو پاتی چلی جاتی ہے۔''

وہ لمحہ بھر کو رکا پھر اس نے اپنی چیئر کے پاس زمین پر پڑا بیگ اٹھالیا۔ اس نے دو تین پرانے اخبار اس میں سے لے لیے اور سب کے سامنے میز پر پھیلا کر رکھ دیے۔

''یہ شہر کے چند بڑے دارالامان ہیں۔'' اس نے کاغذ کے اوپر لسٹ کی صورت میں لکھے ہوئے ناموں پر انگلی چلاتے ہوئے کہا پھر اس نے دوسرا کاغذ اوپر کیا۔

''اور یہ چند کم معروف دارالامان ہیں۔'' وہ دوسری لسٹ کے متعلق بولا پھر تیسرے کاغذ کی باری آئی۔

''اور یہ نہایت غیر معروف...... ان دارالامان کے ساتھ کسی بڑی این جی او کسی ٹرسٹ یا کسی بڑے سیاستدان کا نام نہیں ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے تینوں کاغذ سمیٹ کر ایک طرف کر دیے۔

''برائی کا تناسب بھی اسی طرح ہے۔ سب سے زیادہ معروف دارالامان میں سب سے زیادہ...... کم معروف میں کم برائی کا تناسب اور پھر غیر معروف میں اس سے بھی کم۔'' وہ اسی طرح رک رک کر بات کرتا تھا۔

''سب سے زیادہ پکڑ میں کون سے دارالامان آتے ہیں؟'' وہ ان سب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ کر بولا۔

''وہ...... جہاں برائی سب سے کم ہوتی ہے مگر نظر سب سے زیادہ آتی ہے۔'' اس نے تیسری لسٹ ایک بار پھر سب کے سامنے رکھی اور اس لسٹ میں سے ایک پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''یہ...... سانده کے قریب واقع ایک بہت چھوٹا سا دارالامان ہے۔ یہاں کل عورتوں کی تعداد تیس ہے اور یہ دارالامان ایک شخص نے اس لیے تعمیر کیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے رفاہ عامہ کا کوئی کام کرنا چاہتا تھا۔ اس کی بیٹی جل کر مر گئی تھی۔ وہ صدقہ جاریہ ٹائپ کوئی کام کرنا چاہتا تھا' سو اس نے اور اس کی بیوی نے اس ایک چھوٹے سے ادارے کی داغ بیل ڈالی۔ شروع میں یہ ایک ہاسٹل کی طرح تھا آپ اب بھی اسے ایک ہاسٹل سمجھ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہاں پر رہنے والی تیس کی تیس عورتیں اپنا پیٹ بھرنے کے لیے خود محنت کرتی ہیں۔ اس دنیا میں کوئی ایسا نہیں جسے یہ عورتیں اپنا کہہ سکیں وہ ایک دوسرے کو اپنا کہتی اور اپنا سمجھتی ہیں...... بلکہ سمجھتی تھیں...... کیونکہ ایک ماہ قبل اس دارالامان کو بند کر دیا گیا۔''

وہ ایک بار پھر خاموش ہوا۔ سب ہی وجہ جاننے کے لیے بے تاب تھے۔



''یہاں پر رہنے والی ایک عورت نے شادی کر لی تھی۔ وہ کس سے کہتی کہ اسے شادی کرنی ہے۔؟ اس کے بزرگ نہیں تھے وہ کسی کے حکم کی پابند نہیں تھی مگر پھر بھی اس دارالامان کو چلانے والے میرے معزز دوست کی مکمل مرضی اس شادی میں شامل تھی لیکن پھر بھی اس بات کو ایشو بنایا گیا کہ اس جگہ عورتیں بدکاری میں ملوث ہیں وہ اپنے گاہکوں کو گھیر کر اس جگہ پر لاتی ہیں...... اور شاید تم سب لوگوں کے لیے یہ بات دلچسپی کی حامل ہو کہ وہاں ایک عورت کے سوا سب کی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان ہے۔ وہ لفافے بنا کر چپس بنا کر کھجور کی ٹوکریاں بنا کر اور دوسری دستکاری وغیرہ کی مدد سے روزی کماتی تھیں۔ دارالامان بند کر دیا گیا اور ان عورتوں کو ایک معروف دارالامان میں شفٹ کر دیا گیا...... شاید اس الزام کو سچ ثابت کرنے کے لیے۔''

''وہ خاموش ہو کر ایک اور لسٹ اوپر رکھ رہا تھا۔''

''یہ ایک معروف دارالامان ہے۔'' اس نے سب سے پہلی لسٹ میں سب کے آخر میں لکھے ہوئے نام پر انگلی رکھی۔

''اب ملاحظہ کیجیے یہاں کیا ہوتا ہے؟ زبردستی' زنا' بیہودہ فلموں کی ریہرسل اینڈ شوٹنگ...... کیا یہاں یہ رہنے والی عورتیں یہ سب کام کرنے پر تیار ہو جاتی ہیں؟...... ویل...... اگر وہ تیار نہ ہوں تو دارالامان کی انتظامیہ کے پاس بہت سے حربے ہیں جن کی مدد سے وہ ان عوتوں کو یہ سب کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ عورتوں پر تشدد کیا جاتا ہے انہیں اتنی بری طرح ٹارچر کیا جاتا ہے کہ وہ یہ سب کام کرنے پر راضی ہو جاتی ہیں۔ واش روم میں کیمرے لگا دیے جاتے ہیں۔ بہت سی عورتوں کی مووی بنالی جاتی ہے اور پھر انہیں بلیک میل کر کے اپنی مرضی ومنشا کے تحت مجبور کر کے اپنا من پسند کام کروایا جاتا ہے۔ یہاں سب خوب صورت عورتوں کو بڑے بڑے لوگوں کے گھر مہمان بنا کر بھیجا جاتا ہے واپسی میں ڈونیشن کے نام پر بڑی بڑی رقمیں لاتی ہیں اور پھر......''

اس نے خاموش ہو کر ایک بار پھر سب کی شکل دیکھی اور سب سے زیادہ غور سے سبیکا کو دیکھا۔

''بہت خوبصورت عورتوں کو...... کچھ اور عورتیں بھی پسند کر لیتی ہیں اور اپنے گھر میں مہمان بنا کر رکھتی ہیں۔ ان کے درمیان غیر فطری تعلقات بھی ہوتے ہیں اور اس سے زیادہ الابلا میں نہیں بتاؤں گا کیونکہ اگر اس سے زیادہ میں نے کچھ کہا تو لوگوں کو اعتراض ہوگا کہ میں عورتوں کو مردوں سے کمتر تصور کرتا ہوں اور فلمیں دیکھ کر عورتوں پہ اس قسم کی الزام تراشیاں کرتا ہوں۔'' وہ خاموش ہوا تو وہاں بیٹھی تینوں خواتین ایک لمحہ کو تو بالکل ہی ساکت رہ گئی تھیں ان میں سے کسی کو بھی امید نہیں تھی کہ بات کا رخ اس طرف نکل جائے گا۔

''یہاں رہنے والے لوگوں نے' شہریوں نے بہت بار اس دارالامان میں ہونے والی سرگرمیوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے احتجاج کیا ہے۔ وہاں کے رہائشی چاہتے ہیں کہ اس دارلامان کو ختم کر دیا جائے کہ یہاں ضرورت مند عورتوں کو طوائف بن کر رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے مگر لوگوں کی بات پر کوئی نوٹس نہیں لیا گیا کیونکہ اس دارالامان کو چلانے والی خاتون ایک بہت معزز سیاستدان کی بھابھی ہیں بھابھی...... یہ مذاق بھی خوب ہے کہ ایسے لوگ جس عورت کو بیوی نہ بنا سکیں اسے بھابھی بنا لیتے ہیں۔ اس دارالامان کو ریکارڈ میں درجہ A میں رکھا گیا ہے۔'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا جبکہ باقی لوگ مسکرا بھی نہ سکے۔ ''یہ سب کسی ایک شہر میں نہیں

ہو رہا بلکہ سب شہروں علاقوں کی بات ہے۔ سبیکا جس دارلامان کے ساتھ مل کر کام کرنے کی بات کر رہی ہے اس کا بہت بڑا نام ہے مگر میں اخبار کا آدمی ہوں میں اندر کی بات جانتا ہوں اور اسی لیے میں اس پراجیکٹ کے خلاف ہوں میں صفیہ صفدر کے بیک گراؤنڈ سے بہت اچھی طرح واقف ہوں...... ابھی حال ہی میں ایک ماہ پہلے اس دارلامان میں جو کچھ ہوا کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔"

وہ رک کر ایک اخبار ان کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

"اسی کو دیکھ لو" اس نے ایک دو کالمی خبر پر انگلی رکھی وہ سب باری باری اس خبر کو دیکھنے لگے۔

"اس گنہگار عورت کو صفیہ صفدر نے پکڑوایا پھر اس نے چھڑوایا...... کیسے؟ کیوں یقیناً رقم خرچ ہوئی ہے کسی طرح سے کس طرف سے کیوں؟ یہ میں نہیں جانتا مگر جلد ہی جان جاؤں گا۔"

وہ سبیکا کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا اس کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی اور اخبار اب مناہل کے ہاتھ میں تھا۔ خبر میں ایک عورت کا ذکر تھا جو قرآن کی بے حرمتی کی مرتکب ہوئی تھی۔ مناہل کا ذہن کہیں اور گم تھا اس نے بہت آرام سے پوری خبر پڑھی تھی اس کے ذہن میں بھول کر بھی کسی کا خیال نہیں آیا تھا۔ ایک نام جو اس کے ذہن میں مسلسل گردش کر رہا تھا وہ صفیہ صفدر کا تھا۔ اس نے یہ نام پہلے بھی سن رکھا تھا۔

اخبار دیکھنے کے بعد اس نے اپنے ساتھ بیٹھی ربیعہ کو دے دیا۔ وہ فیصل کی بات سے متفق تھی۔

"میں چاہتا ہوں برائی کا مکمل طور سے استحصال کیا جائے تاکہ اس کا مکمل طور سے خاتمہ کیا جا سکے اس شخص کی مدد کی جائے جو مدد کا مستحق ہے اس کے لیے ہمیں اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھنی ہوں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم برائی کو پھیلنے میں مدد دینے کے بجائے اس کا قلع قمع کرنے کی کوشش کریں۔ چور کو ختم کرنے سے پہلے چوری کو ختم کریں اور اس چیز کی ابتدا ہمیں گراس روٹ لیول سے کرنی ہوگی۔"

فیصل نے گہری سانس بھر کر کہا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ایک بہترین حل پیش کر دینے کے بعد اس کے پاس اب بولنے کے لیے کچھ باقی نہیں بچا۔

"یہ بات گراس روٹ لیول تک پہنچے گی کیسے...... اور پہنچائے گا کون؟"

سبیکا نے ذرا کی ذرا شرمندگی سے فیصل سے ہی پوچھا...... وہ اس کی پوری بات سے متفق تھی فیصل مسکرا دیا پھر بولا۔

"ایسے ہی پہنچے گی جیسے فیئر اینڈ لولی پہنچی ہے اور پہنچائے گا لیور برادرز" وہ سب ہنس دیے تھے جبکہ سبیکا صرف مسکرائی تھی اس کی رنگت ذرا سانولی تھی جسے نکھارنے کے لیے وہ بہت ٹوٹکے آزماتی تھی۔

"فیصل صاحب! آپ کو صفوان صاحب بلا رہے ہیں۔ وہ مین سیکشن میں آئے بیٹھے ہیں۔"

مناہل نے جھٹکے سے سر اٹھا کر پیون کی طرف دیکھا۔ صفوان آفس آیا تھا اور اس طرف آ کر مناہل سے ملنے کے بجائے مین سیکشن میں بیٹھا تھا۔ اس کے اندر تک آگ لگ گئی۔ فیصل اور وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے وہ فوراً اٹھ کر چلا گیا مگر وہ وہیں بیٹھی رہی۔ ربیعہ، سبیکا اسے چھیڑنے والے انداز میں دیکھ رہی تھیں مگر وہ مسکرا بھی نہ سکی۔ اسے اس لمحہ بہت سبکی کا احساس ہوا تھا۔ صفوان کم گو اور سرد مہر ہی سہی مگر اس کے کولیگز کے سامنے تو وہ



اپنائیت کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔ وہ اس خیال سے پیچھا چھڑا ہی نہیں پا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آپ کو مجھ سے کبھی دلچسپی تھی ہی نہیں...... میں خود کو سمجھ نہیں پائی کہ آپ نے مجھ سے رشتہ کیوں جوڑا...... جب آپ کو مجھ سے کوئی انٹرسٹ ہی نہیں تو آپ نے مجھے یہ انگوٹھی کیوں پہنائی۔"

وہ چلا کر بولی۔ صفوان نے ریسیور کو کان سے تھوڑا پرے کیا کیونکہ مناہل کی آواز ہی اتنی اونچی تھی۔

اسے ایک دم سے اتنا غصہ کیوں آ گیا وہ حیران ہوتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اس نے فون کر کے اسے یاد دلایا تھا کہ اس کو اپنی فرینڈ کو میڈیکل چیک اپ کے لیے لانا تھا۔ یہ بات یاد دلا کر جب اس نے اس کا حال پوچھا تو وہ یکدم ہی غصے میں آ گئی تھی۔

"میں سمجھا نہیں مناہل! آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟" وہ عجب کشمکش و پیچ میں گھر کر بولا۔

"یہی تو آپ کی پرابلم ہے صفوان! آپ کبھی مجھے سمجھ ہی نہیں پائے...... مجھے نہ میری فیلنگز کو اور نہ میری محبت کو...... میرا ہر جذبہ آپ کے لیے بیکار ہے۔ آپ مجھے اور میری محبت کو Forgranted لیتے ہیں۔"

"کیا؟...... کیا کیا؟...... Forgranted؟" اس کی بات سن کر شاک لگا تھا نجانے کس کی یاد دل کے کس کونے سے نکل کر آہستگی سے سارے وجود میں سرایت کر گئی۔

"ہاں...... Forgranted مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آ سکا کہ آپ نے مجھے اپنی زندگی میں کیوں شامل کیا۔ جب آپ کو میری ضرورت نہیں تھی تو آپ نے مجھے اپنانے کا سوچا ہی کیوں...... آپ کی زندگی میں کہیں پر میں ہوں ہی نہیں اور پھر بھی...... پھر بھی آپ کے نام کی انگوٹھی میری انگلی میں کیوں موجود ہے؟"

وہ شاید رو بھی رہی تھی۔ صفوان کے سارے وجود پر ایک بے چینی چھا گئی اس کے پاس الفاظ نہیں تھے وہ مناہل کو کیسے سمجھاتا جبکہ مناہل نے اس کی خاموشی کو کچھ اور سمجھا۔ اس نے صفوان کے احتراز برتنے کو اس کا لاتعلقی سمجھا تھا۔ وہ بہت دن سے یہی سب محسوس کر رہی تھی مگر آج آفس میں جس طرح اس نے نظرانداز کیا تھا اس سے وہ بہت ہرٹ ہوئی تھی اور وہ مزید اپنے جذبات کو چھپا کر رکھنا نہیں چاہتی تھی جب اسے یہ پتا چلا تھا کہ تطہیر رحمٰن جیسی عام سی لڑکی بھی ان خوش قسمت لوگوں میں شامل ہے جنہیں چاہا جا سکتا ہے تو صفوان کی سرد مہری اسے زیادہ چبھنے لگی تھی۔ اس جیسی خوب صورت لڑکی کا تو یہ حق تھا کہ اسے چاہا جاتا۔

"کبھی کبھی مجھے یہ لگتا ہے جیسے یہ تعلق آپ کے لیے مجبوری کے سوا کچھ نہیں۔ آپ اسے صرف نبھا رہے ہیں...... یہ تعلق آپ کے لیے گلے میں پڑے طوق کی مانند ہے جو آپ سے پہنا نہیں جا رہا اور اتارا بھی نہیں جا رہا آپ کو میری پروا ہے نہ میری ضرورت...... آپ صرف اپنے پیرنٹس کی وجہ سے ابھی تک اس رشتے کو قائم رکھے ہوئے ہیں ورنہ آپ کو مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

وہ اس کی کم گوئی کو اس کی سرد مہری سمجھ رہی تھی۔ اس نے اس لڑکی کے ساتھ منگنی اپنی مکمل رضامندی کے ساتھ کی تھی وہ اسے Forgranted کیسے لے سکتا تھا۔

''آپ غلط سوچ رہی ہیں مناہل...... ایسا کچھ نہیں ہے...... یہ سب غلط ہے۔ نجانے آپ نے اپنے ذہن میں کیسے کیسے مفروضے قائم کر لیے اور پھر انہیں ہی سو فیصد درست سمجھنا شروع کر دیا۔'' وہ بہت تھکے تھکے انداز میں بات کر رہا تھا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھے آپ کی ضرورت نہ ہو یا مجھے آپ سے دلچسپی نہ ہو میں نے زندگی میں کبھی ایسا کام نہیں کیا جس میں میری سو فیصد مرضی شامل نہ ہو...... اور پھر یہ تو زندگی بھر کا فیصلہ ہے...... آپ غلط سوچ رہی ہیں مناہل!'' وہ لحہ بھر کو رکا۔

''آئی ڈو کیئر فار یو...... ریئلی آئی ڈو......'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

''آپ جھوٹ بولتے ہیں...... آپ صرف میرا دل رکھ رہے ہیں اور......''

''او کے فائن...... میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ پھر؟'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ پہلے اس کی آواز میں لاچاری لگ رہی تھی مگر اب صرف غصہ غالب تھا۔ مناہل نے تحیر سے ریسیور کی طرف دیکھا اس کو صفوان کے اس طرح بھڑک اٹھنے کی امید نہیں تھی۔ وہ اسے بہت ٹھنڈے مزاج کا آدمی سمجھتی تھی۔

''اور کچھ کہنا ہے آپ کو! کوئی اور الزام کوئی اور طعنہ......'' وہ پہلے والے انداز میں کہہ رہا تھا مناہل کچھ بول ہی نہ پائی۔

''او کے دین...... اللہ حافظ۔''

اس کی خاموشی سے اکتا کر صفوان نے فون بند کر دیا۔ مناہل کی آنکھ سے یکدم آنسوؤں کی لڑی موتیوں کی طرح گالوں پر پھسلی۔ وہ صفوان کے رویے پر افسردہ ہوئی تھی مگر رونا اسے پہلی مرتبہ پڑا تھا۔ وہ فون بند کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کے آنسوؤں سے اس کا تکیہ بھیگنے لگا تھا چند لمحے اسی طرح رونے کے بعد اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں موجود وہ انگوٹھی اتار کر زمین پر پھینک دی تھی۔ اسے صفوان سے کوئی تعلق نہیں رکھنا تھا۔ یہی سب سوچتے ہوئے وہ روتے روتے سو گئی تھی۔ زمین پر پڑی وہ انگوٹھی رات بھر وہیں پڑی رہی مگر صبح ہوتے ہی مناہل نے اسے اٹھا کر دوبارہ بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہن لیا تھا وہ اس انگوٹھی سے دور رہ ہی نہیں سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

''آئی ایم سوری...... مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھے۔'' وہ ندامت سے سر جھکائے کہہ رہی تھی۔
صفوان نے ایک نظر اس کے جھکے ہوئے سر کر دیکھا پھر لا پروائی سے بولا۔

''اٹس او کے!'' مناہل کا دل اس کے انداز پر کٹ کر رہ گیا۔ وہ اس کے بالکل سامنے بیٹھا تھا مگر بہت دور محسوس ہوا تھا۔ مناہل نے صبح اٹھتے ہی فون کر کے معذرت کی تھی اور اس کو لنچ کی آفر دی تھی۔ صفوان کا انداز بہت لیا دیا تھا۔ اس نے فون پر معذرت کا جواب اٹس او کے کہہ کر دیا تھا۔ اور اب ریسٹورنٹ میں اس کے بالکل سامنے بیٹھ کر بھی وہ ایسے ہی کہہ رہا تھا۔ ریسٹورنٹ میں رش بالکل نہیں تھا ان کے علاوہ ایک اور لڑکا لڑکی تھے وہ بھی ان سے کافی دور بیٹھے تھے اسی لیے وہ آرام سے بات کر سکتی تھی۔



''میرا یہ مطلب......'' وہ بات بھی مکمل نہیں کر پائی تھی کہ آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ صفوان نے ایک نظر اسے دیکھا پھر جھلا کر بولا۔

''پلیز مناہل! مجھے اور پریشان مت کیجیے۔'' گویا وہ پہلے ہی بہت تھا۔

''آپ مجھ پر غصہ کر لیجیے مگر اس طرح...... لاتعلقی نہ برتیے میں آپ کی لاتعلقی برداشت نہیں کر سکتی۔''

وہ دھیمی آواز میں بولی آنسو بھی رواں دواں تھے۔ صفوان نے گہری سانس بھری۔

''کس کس کا غصہ کروں؟ آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے اس بات کا؟ یا آپ مجھے جھوٹا سمجھتی ہیں اس بات کا؟ میں آپ کی فیلنگز کو فار گرانٹڈ لیتا ہوں اس بات کا؟ آپ مجھے لیٹ ڈاؤن کرتی ہیں اس بات کا؟''

وہ بہت تحمل سے بات کر رہا تھا۔ مناہل نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اس شخص کو کبھی لیٹ ڈاؤن کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

''دراصل...... بات یہ نہیں ہے صفوان! آپ مجھے نظر انداز کرتے ہیں۔''

وہ اپنی بات کی وضاحت کر نہیں پائی تھی۔ صفوان نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

''کب کیا میں نے ایسا؟...... کیا کبھی ایسا ہوا کہ میں نے جان بوجھ کر اس طرح کیا ہو؟'' وہ تیز لہجے میں بولا۔

''آپ...... کل آفس آئے تھے اور...... آپ مجھ سے ملے بھی نہیں۔'' نجانے کیسے یہ بچکانہ شکوہ اس کے منہ سے پھسلا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس طرح سے شکوہ کرے گی۔

''تو اتنی سی بات سے آپ نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ میں آپ سے محبت نہیں کرتا اور اتنی سی بات سے آپ نے مجھے جھوٹا سمجھ لیا اتنی سی بات سے میں آپ کے لیے بے اعتبار ہو گیا...... ویری انٹرسٹنگ...... یعنی کہ اگر ایک شخص کسی مجبوری کے تحت آپ سے کسی روز مل نہیں پائے گا تو آپ اسے جھوٹا سمجھ لیں گی۔ آپ جانتی ہیں میں کل آپ کے آفس کیوں آیا تھا؟'' اس نے بات کرتے کرتے سوال کیا پھر جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔

''میں آپ کے آفس کے اکاؤنٹ سیکشن میں آیا تھا۔ مام کو امریکہ میں کچھ رقم کی ضرورت تھی انہوں نے فون کر کے پیسے منگوائے تھے۔ کل میں عجلت میں تھا آپ کے آفس سے مجھے بینک جانا تھا اور چار بجے ایک ضروری آپریشن تھا۔ آپ سے ملنے کے لیے رک جاتا تو دیر ہو جاتی۔''

''آئی ایم سوری صفوان...... لیکن میرا یہ مطلب......'' وہ وضاحت دے ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ اس قسم کی بات بھی ہو سکتی ہے یہ اس کے ذہن میں ہی نہیں آیا تھا۔

''آپ کا جو بھی مطلب ہو مناہل...... لیکن مجھے اس کا ایک ہی مطلب سمجھ میں آیا...... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی کیا بات ہے جو سارا زمانہ مجھے جھوٹا سمجھتا ہے کیا میرے چہرے پہ لکھا ہے کہ میں جھوٹا ہوں گیا کسی کی نظر میں میری اتنی بھی اہمیت نہیں کہ میرا اعتبار کر سکے...... میں اتنا برا ہوں کہ سارا جہان مجھے ناقابل اعتبار کہتا ہے۔''

''پلیز صفوان! میں نے آپ کو جھوٹا نہیں کہا'' وہ اس کے لہجے سے خائف ہو کر بولی۔

''کیا یہ لازم ہے کہ اندھے کو اس کے اندھے پن کا احساس اندھا کہہ کر دلایا جائے کیا اور طریقے نہیں ہو سکتے اس کو اس کی کمزوری کا احساس دلانے کے...... اگر اس کی بیساکھی چھین لی جائے تو اسے پتا نہیں چل جائے گا کہ اسے معذور کہا جا رہا ہے۔ مناہل آپ نے مجھ سے میرا مان چھین لیا۔ کیا میں اپنے ماتھے پہ لکھوالوں کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں یا ہر بار سانس لینے سے پہلے اس بات کو دہراؤں کہ مجھے آپ سے محبت ہے۔''

وہ بہت سخت لہجے میں بات کر رہا تھا۔ مناہل کو شرمندگی ہونے لگی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ وہ سارا زمانہ اور سارا جہان کسے کہہ رہا ہے اور اس کے علاوہ اسے اور کون جھوٹا سمجھتا ہے مگر اس کی غلط فہمی دور ہونے لگی تھی کہ صفوان کو اس کی پروا نہیں ہے اگر اس کو پروا نہ ہوتی تو وہ غصہ کیوں کرتا...... غصہ صرف اپنوں کے ساتھ کیا جاتا ہے اس کے اندر کسی قدر سکون اتر آیا تھا۔

''اگر آپ کے ہاتھ میں موجود انگوٹھی آپ کو میری محبت کا یقین دلانے میں ناکام ہو گئی ہے تو شاید کوئی چیز آپ کو میری محبت کا یقین نہ دلا سکے۔ میں شرمندہ ہوں مناہل! کہ میں شاید کبھی بھی آپ کی توقع پر پورا نہ اتر سکوں کیونکہ میں بار بار تو یہ گردان نہیں کروں گا کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہے تو اٹس او کے......''

''پلیز صفوان...... بس کریں پلیز۔''

وہ تڑپ کر اس کی بات کاٹ کر بولی نجانے وہ کیا کہنے والا تھا۔ اسے بھی اپنے لہجے کی سختی کا احساس ہوا۔ وہ دونوں ہی خاموش ہو گئے تھے چند لمحے اسی طرح گزر گئے۔ صفوان نے گلاس اپنے قریب کر کے اس میں پانی ڈال لیا وہ کچھ دیر پانی کے اس گلاس کو گھورتا رہا پھر اس نے گہری سانس بھر کر گلاس ہاتھ میں پکڑ لیا۔ مناہل اسی کی طرف دیکھ رہی تھی اس نے گلاس سے پانی کا ایک بڑا گھونٹ بھرا تھا۔ پانی کو اندر منتقل کر کے اس نے ایک بار پھر لمحے کا توقف کیا اور مناہل کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پہ مسکراہٹ چمکی تھی۔ پھر وہ مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے دھیرے دھیرے پانی پی پینے لگا۔ مناہل کے چہرے پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی اسے تطہیر رحمٰن اور اس کا غصہ بھگانے کا انوکھا طریقہ یاد آیا۔ اسی لمحے صفوان کو بھی کسی کی یاد آئی تھی۔ اس نے خالی گلاس ایک طرف رکھ دیا پھر مناہل کو دیکھ کر بولا۔

''آئی ایم سوری...... میں کچھ زیادہ ہی تلخ ہو گیا تھا شاید۔''

وہ حقیقتاً شرمندہ لگ بھی رہا تھا اس سے پہلے کہ مناہل کچھ بولتی اس نے پھر کہا۔

''مگر...... مناہل...... ایک ریکویسٹ ہے مجھے کبھی جھوٹا نہیں سمجھیے گا۔ کبھی بھی نہیں۔ مجھے حقیقتاً برا لگتا ہے جب کوئی مجھ پر اعتبار نہیں کرتا۔''

اس کے لہجے میں عجیب سی بے چارگی تھی۔ مناہل کو مزید شرمندگی نے آن گھیرا۔ اس نے میز پر رکھے صفوان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔



''آئی ایم سوری اینڈ آئی پرامس اب کبھی ایسا نہیں کہوں گی۔'' اس کے اس طرح سے کہنے پر صفوان کے چہرے پر موجود مسکراہٹ میں اضافہ ہوا تھا۔

☆　☆　☆

اس سے اگلے ہی دن وہ تطہیر کو لے کر صفوان کے کلینک گئی تھی۔ اس کا مکمل میڈیکل چیک اپ ضروری تھا۔ مناہل کی توقعات کے برعکس صفوان اس سوشل ورک میں اس کے ہم قدم تھا۔ اس نے اپنے ضروری اپائنٹمنٹس کینسل کر کے تطہیر رحمٰن کو ٹائم دیا تھا۔ مناہل کو آفس جانا تھا اور وہ تطہیر کو اس کے کلینک میں ڈراپ کر کے خود آفس چلی گئی تھی حالانکہ تطہیر اس کے بغیر وہاں رکنا نہیں چاہتی تھی اس نے منت بھری درخواست کی تھی مگر وہ تسلی دے کر اسے صفوان کے پاس اس کے کلینک میں چھوڑ گئی تھی۔ کیونکہ صفوان نے کہا تھا کہ مکمل چیک اپ میں دیر ہو جائے گی اس لیے وہ بے فکر ہو کر اپنے کام کے لیے جا سکتی ہے چونکہ صفوان نے ایسا کہا تھا اس لیے مناہل کے لیے یہ سب ماننا بہت ضروری تھا۔ وہ اسے یقین دلانا چاہتی تھی کہ وہ اس پہ اعتبار کرتی ہے۔

صفوان نے چیک اپ کے بعد کچھ ضروری ٹیسٹ کروانے کے لیے کہا۔ پھر اس نے خود ہی مختلف لیبارٹریز سے یہ ٹیسٹ کروائے تھے۔ تطہیر جس چیز کو صرف بلڈ پریشر کی زیادتی کی وجہ سے اٹھنے والا سر درد سمجھ رہی تھی وہ صرف بلڈ پریشر کی وجہ سے اٹھنے والا سر درد نہیں تھا۔ اس کے مکمل ٹیسٹ ہونے میں ایک ہفتہ لگ گیا تھا اور ایک ہفتہ بعد آنے والی ساری رپورٹس حیران کن تھیں صفوان کے علاوہ دو نیورو سرجن نے بھی اس سر درد کو برین ٹیومر کا نام دیا تھا۔ ایک ایسی بیماری جو اپنی آخری سٹیج پر تھی۔ صفوان نے یہ خبر مناہل کو فون پر دی تھی اور اسے یہ خبر تطہیر کو سنانی ہی تھی۔ جو بے صبری سے اپنی رپورٹس کا انتظار کر رہی تھی۔

☆　☆　☆

''آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ میرے پاس اتنا بھی وقت نہیں کہ میں اپنے بچے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔ اس کے آنے میں بہت تھوڑا سا وقت ہے اور اللہ نے مجھے اتنے وقت کی بھی مہلت نہیں دی تھی۔ اس نے مجھے زندگی میں ایک ہی خوشی دی تھی اور وہ مجھ سے یہ خوشی بھی چھین لینا چاہتا ہے۔''

مناہل کے منہ سے اپنی بیماری کا نام اور اس کی نوعیت جان کر اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے کہا۔

مناہل نے اس سے پہلے بھی بہت بے یار و مددگار تکلیف میں مبتلا عورتیں دیکھی تھیں مگر اس کا دل کسی کی بھی تکلیف پر اتنا بے چین نہیں ہوا تھا جتنا اس لمحہ تطہیر کی حالت زار دیکھ کر ہوا تھا۔

وہ مناہل کے منہ سے یہ سب سننے کے بعد یکدم رونے لگی تھی۔ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر وہ پہلی مرتبہ اس کے سامنے روئی تھی مگر چونکہ مناہل اس کے ماضی کے متعلق سب جانتی تھی اس لیے وہ سمجھ سکتی تھی کہ یہ پہلا موقع نہیں جو وہ اس طرح رو رہی ہے وہ اسی طرح روتی آئی تھی۔ اس کا اپنا دل بہت رنجیدہ ہو رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تطہیر نے اپنے پاس پڑی سب چیزیں اٹھا کر زمین پر پھینک دی تھیں۔ مناہل کے لیے اس کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

وہ مجھے دیکھتا ہی نہیں...... اتنے سال ہو گئے روتے ہوئے چلاتے ہوئے مگر وہ میری مدد کو تیار ہی

نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں شکوہ کناں تھی مگر مناہل نے یہ منظر پہلے دیکھا تھا نہ ایسے شکوے سنے تھے اس نے صرف تطہیر رحمٰن کے منہ سے اس کے حالات کے متعلق سنا تھا۔ وہ اسے پرسکون کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر کر نہیں پا رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہیں اپنا کچھ نقصان نہ کر بیٹھے دوسرا پھپھو بھی گھر نہیں تھیں ورنہ وہ ہی تطہیر کو سنبھال لیتیں۔

''میں اتنے سالوں سے اسے پکار رہی ہوں مگر کیوں نہیں سنتا۔ وہ جو ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے اسے میں نظر کیوں نہیں آئی۔ چاول بھری پرات میں سے کنکر بھی چن لیے جاتے ہیں کیا میں اس کے لیے کنکر کے برابر بھی نہیں۔''

وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ بہت دن ہو گئے اس کو اللہ سے اس طرح شکوہ کیے ہوئے وہ جب سے حاملہ ہوئی تھی تب اس کا ہر شکوہ ختم ہو گیا تھا اسے لگتا تھا زندگی کی صعوبتیں ختم ہو گئی ہیں مگر اب انکشاف ہی جان لیوا تھا کہ وہ خود مرنے والی ہے۔ اس نے بہت بار مرنے کی دعا کی تھی مگر وہ زندہ رہی تھی۔ اب جب وہ زندہ رہنے کی خواہش کرنے لگی تھی۔ اسے پتا چلا کہ وہ مرنے والی ہے۔

''میرے جسم کا ایک ایک خلیہ اس کی رحمت کی بارش کے لیے نماز استقسا ادا کر رہا ہے مگر بارش نہیں ہوتی...... رحمت نہیں ہوتی۔

اس نے میرے حصّے میں سارے غم رکھ دیے ہیں۔ باقی سب لوگوں کے حصّے میں سکھ ہی سکھ خوشیاں' اطمینان' میرا باپ اتنی جلدی مر گیا اور میری سوتیلی ماں اپنی سوتیلی اولاد کے ساتھ بالکل اطمینان سے زندگی گزار رہی تھی۔ خرم نے مجھے گھر سے نکال دیا مگر وہ زندگی میں ایک کامیاب انسان ہے۔ عبیر کے پاس کیا نہیں ہے زندگی کی ہر نعمت سے مالا مال ہے وہ اور پھر...... میری ماں......'' وہ ہچکی لینے کو رکی پھر بولی۔

''میری ماں ایک کامیاب عورت ہے۔ ایک دکھ بھی اسے چھو کر نہیں گزرا۔ وہ اطمینان سے شہلا رحمٰن سے شہلا قمر بن گئی۔ میرے لیے نہ کبھی اس کا دل پگھلا نہ اس کو میری یاد آئی اور جب میں خود اس کے گھر آ گئی تو اسے میرے ساتھ رہنا ایک مصیبت لگنے لگا۔''

''واٹ...... کیا کہا تم نے...... شہلا رحمٰن...... شہلا قمر...... وہ وہ تمہاری سگی ممی ہیں؟''

ہزار والٹ جتنا کرنٹ لگا تھا مناہل کو، وہ پھٹی ہوئی آنکھیں لیے اسے دیکھ رہی تھی ہاں...... وہی میری سگی ممی ہیں...... آپ کو بھی تو پتا چلے کہ جس عورت کو آپ فرشتہ سمجھتی ہیں اس کی حقیقت کیا ہے'' تطہیر نے سابقہ انداز میں جواب دیا۔

''تطہیر...... !صفوان...... وہ تم سے محبت کرتا ہے؟''

اس نے سسکی لینے والے انداز میں پوچھا۔ تطہیر اپنے حواسوں میں کب تھی جو بات کو سمجھ پاتی ورنہ جس دن سے اس نے صفوان کو دیکھا تھا اس دن سے وہ ڈر رہی تھی کہ جب مناہل کو اس حقیقت کا پتا چلے گا تو وہ کس طرح اپنے ردِّعمل کا اظہار کرے گی وہ جلد از جلد اپنے بچے کا انتظار کر رہی تھی تا کہ وہ اس گھر سے جا سکے مگر تقدیر نے ایک بار پھر اسے اپنا زیر نگیں کر لیا تھا۔ مناہل دھیرے سے اس کے پاس سے اٹھی تھی۔ اس کی اگلی منزل



قمر لاج تھی۔ وہ تطہیر کی غلط فہمی فوراً کرنا چاہتی تھی یقیناً اسے غلط فہمی ہوئی تھی کہ صفوان جیسا شاندار انسان اس سے محبت کرتا ہے۔ اس میں ایسا تھا ہی کیا کہ اسے چاہا جاتا۔

☆ ☆ ☆

''صفوان! اس نے بہت آہستگی سے پکارا۔ کمرے میں عجب سی گھٹن تھی اور عجیب سی بو بھی آ رہی تھی۔ صفوان کرسی پر کندھے جھکا کر کھوئے ہوئے انداز میں بیٹھا تھا۔ اپنے نام کی پکار پر بھی اس نے سر نہیں اٹھایا تھا۔ مناہل کچھ جھجکتے ہوئے کمرے کے درمیان آ گئی۔ ریحان قمر بھی گھر پر نہیں تھے جبکہ شہلا قمر تو پہلے ہی امریکہ میں تھیں۔ ملازم نے اسے بتایا تھا کہ صاحب کمرے میں ہیں اسی لیے وہ کمرے میں ہی آ گئی تھی۔

''صفوان۔'' اس نے ایک بار پھر پکارا۔ اب کی بار صفوان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اس کی آنکھیں بے تحاشا سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھا تو اس کے ہاتھ سے گلاس نیچے گر پڑا تھا۔ مناہل کے لیے آج جھٹکوں کا دن تھا۔

''تم...... اب کیا کرنے آئی ہو؟ اب کیا رہ گیا ہے...... اب تو سب ختم ہو چکا اور تم اب آئی ہو۔''

وہ عجیب سے انداز میں ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ مناہل کو اس سے کچھ خوف محسوس ہوا۔

''صفوان! میں...... مناہل ہوں...... آنکھیں کھولیں صفوان!''

وہ دور کھڑی ذرا جھجکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ صفوان نے اسے دیکھا پھر ہنستے ہوئے بولا۔

''تم...... مناہل...... تمہیں بھی آج ہی آنا تھا۔ تم بھی آ جاؤ سب مل کر میرا تماشا دیکھو' تمہیں بھی تو مجھ پر یقین نہیں ہے نا تمہیں بھی میں جھوٹا لگتا ہوں وہ بھی یہی کہتی تھی اسے لگتا تھا میں اس پر ترس کھاتا ہوں مگر مناہل میں کیوں ترس کھاتا میں تو اس سے محبت کرتا تھا۔'' مناہل ڈھے جانے والے انداز میں زمین پر بیٹھ گئی۔ اب کس بات کا شک تھا کون سی غلط فہمی دور کرنی تھی۔ وہ شخص آپے میں نہیں تھا وہ نشے میں تھا مگر وہ جانتی تھی کہ اس کے منہ سے نکلا ایک ایک لفظ سچ پر مبنی ہے۔ اس کا دل چاہا ہر چیز کو آگ لگا دے ہر چیز کو تہس نہس کر دے۔

''مناہل وہ مجھے اتنی اچھی لگتی تھی کہ دل کرتا تھا کہ اس کے سارے غم خود لے کر اپنے سارے سکھ اسے دے دوں۔ اس کی آنکھ میں آنسو نہ آنے دوں...... اس کی بدنصیبی کو خوش قسمتی میں بدل دوں...... مگر مناہل وہ بہت بری تھی۔ وہ مجھے جھوٹا کہتی تھی اسے لگتا تھا کہ میں اس پر ترس کھاتا ہوں اسے میرا یقین ہی نہیں تھا اسے میرا یقین کیوں نہیں تھا مناہل؟''

وہ اس سے سوال کر رہا تھا جبکہ وہ خود جواب دینے کی پوزیشن میں کہاں تھی اس کا سارا غرور مٹی میں مل گیا تھا۔ وہ لڑکی جسے اس نے کبھی کچھ نہیں سمجھا تھا جس کو وہ صرف اپنے گھر میں اسے لیے رکھ رہی تھی کہ اس کی ساس نے ایسا کرنے کے لیے کہا تھا ورنہ شاید وہ اسے مخاطب کرنا بھی پسند نہ کرتی۔ اسے یہ بھی سمجھ میں آ گیا تھا کہ صفوان کو جھوٹا کہلائے جانے سے کیوں نفرت ہے۔ وہ بے آواز رونے لگی تھی۔

''وہ کہتی تھی اس کے پاس ایسا کیا ہے کہ میں اس سے محبت کے لیے سب سے...... وہ سمجھتی تھی کہ محبت کے لیے سب سے...... ضروری چیز شکل ہے اور مناہل وہ بہت خوبصورت تھی۔''

وہ کہہ رہا تھا اور مناہل جانتی تھی کہ وہ کتنی خوبصورت ہے اگر محبت کا عمل دخل نہ ہوتا تو صفوان کو وہ لڑکی کسی زاویے سے خوب صورت نہ دکھائی دیتی مگر محبت کے کھیل نرالے تھے۔ وہ مناہل کے مقابلے میں اسے خوب صورت قرار دے رہا تھا۔

''محبت...... شکل سے کب ہوتی ہے؟ ہے نا مناہل...... شکل سے محبت ہوا کرتی تو مجھے تم سے نہ ہو جاتی۔ پلیز مناہل روٹھنا نہیں ورنہ میں کیا کروں گا وہ بھی تو مرنے والی ہے مناہل وہ مر جائے گی۔ مناہل بولو مناہل میں کہاں جاؤں گا اس کے بغیر میں بھی مر جاؤں گا میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا مناہل۔''

اس نے بہت زیادہ پی رکھی تھی۔۔ مناہل خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل آئی۔ اس نے بہت بار چاہا تھا کہ وہ شخص اسے تم کہہ کر مخاطب کرتا اور جب آج وہ اسے تم کہہ کر مخاطب کر رہا تھا تو اسے برا لگا تھا۔ وہ بہت آہستگی سے لاؤنج میں پھر پورچ تک آئی تھی۔ قسمت نے اس کے ساتھ عجیب کھیل کھیلا تھا۔ اور اس کھیل میں اسے شکست پھر اس انسان کے ہاتھوں ہوئی تھی جو کسی طور اس کا ہم پلہ نہیں تھا ایسی شکست زیادہ رلایا کرتی ہے شاید۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ بے آواز رو رہی تھی اور اس کے ذہن میں ایک فقرے کی تکرار تھی۔

''آئی ول کل یو تطہیر۔''

☆ ☆ ☆

''یہ کون ہیں؟''

تطہیر رحمٰن کو پہلی مرتبہ اپنے گھر میں دیکھ کر جو بے ساختہ سوال اس کی منہ سے نکلا تھا وہ یہی تھا۔ اس نے اس لڑکی کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اسی لیے وہ دل ہی دل میں کچھ حیران ہوا تھا۔ اس نے اپنی مام کو ہمیشہ ہائی جینٹری کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے دیکھا تھا وہ ہر چیز میں بہت اعلا معیار رکھتی تھی۔ ان کا حلقہ احباب بھی ان ہی جیسا ہائی فائی تھا ایسے میں پھیکے سے رنگوں میں ملبوس' سادہ چہرے والی وہ لڑکی ان کے ساتھ نظر آنے کی وجہ سے صفوان کے لیے حیرانی کا باعث بن رہی تھی۔ اس کے استفسار پر ملازمہ نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ وہ اپنی مالکن کی اس بدلی ہوئی روش پر صفوان سے زیادہ حیران دکھائی دے رہی تھی۔ صفوان کے اپنی دوسری ماں سے تعلقات بالکل نارمل تھے۔ وہ اچھے موڈ میں ہوتی تو کافی مہربان دکھائی دیتی تھیں اور برے موڈ میں وہ عام طور پر صفوان کا سامنا کرتی ہی نہیں تھیں۔

صفوان کے ڈیڈی سے شادی کے بعد انہوں نے کبھی بھی اپنی اولاد کے بارے میں نہیں سوچا تھا بلکہ دھڑلے سے کہتی تھیں کہ میرے لیے صفوان جیسا ایک ہی بیٹا کافی ہے۔ ان کے اچھے رویے کی وجہ سے ان کے حلقہ احباب میں تقریباً سب ہی لوگ اس بات سے بے خبر تھے کہ وہ اس کی سوتیلی ماں ہیں۔ اس لڑکی کے متعلق ملازمہ سے استفسار کے بعد اس نے دوبارہ یہ سوال کیا تھا کیونکہ تجسس اس کی عادت نہیں تھی اور اس کا دوبارہ اس لڑکی کے متعلق کچھ جاننے کا موڈ بھی نہیں تھا اگر اس کا سامنا اسی روز ڈائننگ ٹیبل پر اس سے نہ ہوتا۔

وہ کلینک سے واپس آیا تو بھوک سے برا حال تھا۔ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے وہ ڈائننگ ہال میں آ گیا۔ مام ڈیڈ کے ساتھ وہ لڑکی بھی موجود تھی۔ وہ خاموشی سے سب کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔



اس نے سرسری سی نظر اس پر ڈالی تھی۔

''یہ تطہیر ہیں...... شہلا کی بیٹی!'' صفوان کو اس کی طرف دیکھتا پا کر ڈیڈ نے تعارف کروایا۔ ابھی وہ اس سے ہیلو ہائے کرنے ہی والا تھا کہ مام عجلت میں بولیں۔

''تطہیر! ابھی بھوک نہیں ہے تو بعد میں کھا لینا۔ نیند آ رہی ہے تو اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔''

صفوان کو مام کے رویے پر حیرت ہوئی تھی اور اسے ان کی بیٹی پر بھی حیرت ہوئی تھی۔ وہ تو اس لڑکی کو ان کے سوشل ورک کی کوئی نئی مثال سمجھ رہا تھا مگر اس کا اندازہ غلط نکلا تھا وہ ان کی اپنی بیٹی تھی۔

اس نے مام کی نظر میں اپنی ہی بیٹی کے لیے پیدا ہو جانے والی شرمندگی کو حیرت سے دیکھا۔ وہ ایک نامی گرامی سوشل ورکر تھیں جو ضرورت مندوں کی مدد کے لیے ہر دم تیار رہتی تھیں۔ اور اس لمحہ وہ اپنی ہی بیٹی سے عجیب سلوک کرتی نظر آ رہی تھیں۔ صفوان نے سر جھٹک کر اپنا سارا دھیان کھانے کی طرف لگا دیا تھا۔ یہ ماما کا ذاتی معاملہ تھا اور وہ اتنا ال مینرڈ نہیں تھا کہ ان کے ذاتی معاملے میں بے جا مداخلت کرتا مگر نجانے کیسے ان کا پرسنل میٹر دھیرے دھیرے اس کے لیے بھی پرسنل ہونے لگا تھا۔ غیر ارادی طور پر وہ اس لڑکی کے ساتھ مام کے رویے کا جائزہ لینے لگا۔ ان کا رویہ اکثر بہت نامناسب اور اہانت آمیز ہوتا تھا۔ اسے حیرت ہوتی تھی کہ کیا سچ مچ وہ ان کی سگی بیٹی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ان کی سگی بیٹی لگتی نہیں تھی ان کی رنگت، نقوش اور سراپا ہر چیز اپنی بیٹی سے مختلف تھا حالانکہ صفوان نے تطہیر رحمٰن کے انداز میں بہت تبدیلیاں محسوس کی تھیں۔

اس گھر میں آنے کے بعد اس کے ظاہری حلیے میں بہت سی تبدیلیاں آئی تھیں یقیناً مام اس کی ڈریسنگ وغیرہ کے معاملے میں بہت محتاط تھیں۔ انہوں نے اس کو اپنی طرح بنانے کی کوشش نہیں کی تھی مگر پہلے دن کے مقابلے میں وہ اب کچھ مختلف دکھائی دے رہی تھی۔ ایک چیز جو ابھی تک ویسی تھی وہ تھا اس کا سپاٹ چہرہ۔ صفوان کو لگتا تھا یہ لڑکی شاید ہی زندگی میں کبھی ہنسی ہو گی۔ وہ اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ اور پہلے دن کے بعد اس نے ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی نہیں کھایا تھا اسی طرح اس کو ان کے ساتھ رہتے ہوئے ایک مہینہ بیت گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

''بھوک لگی ہے؟'' اس نے دوستانہ مسکراہٹ چہرے پہ سجا کر پوچھا۔

وہ اس کی آواز سن کر کچھ محتاط ہو گئی تھی ورنہ اس سے پہلے وہ لان میں بنے سیمنٹ کے چبوترے پر دونوں ٹانگیں چڑھائے بیٹھی تھی۔ صفوان کے سوال پر اسے حیرت ہوئی۔ اسے کیسے پتا چلا تھا کہ اسے بھوک لگ رہی ہے دراصل جب وہ کچن میں کھڑی کھانے کو کچھ ڈھونڈ رہی تھی تو صفوان لاؤنج میں اپنا والٹ اٹھانے آیا تھا جو اس نے غلطی سے وہاں رکھ دیا تھا۔

تطہیر کچن میں کچھ کھانے کو ڈھونڈنے میں ناکام ہو کر لان میں آ گئی تھی۔ پتا ہی نہیں چلا تھا کہ صفوان مسلسل اس کی حرکات کو نوٹس کر رہا ہے۔ مام اور ڈیڈ ایک پارٹی میں گئے تھے وہ خود اپنے فرینڈز کے ساتھ ڈنر کر کے گھر آیا تھا۔ تطہیر کو شاید اس قابل سمجھا ہی نہیں گیا تھا کہ اس کے لیے پکا کر رکھا جاتا۔ وہ اس گھر کی مالکن کی بیٹی

تھی مگر اس کی حیثیت ملازم سے بڑھ کر نہیں تھی اسے یقیناً بھوک لگ رہی تھی مگر وہ صفوان کے سامنے خاموش رہی۔

صفوان نے اپنے ٹراؤزر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ باہر نکالا تھا۔ وہ اس چیز کو کچھ دیر ہاتھ میں پکڑ کر دیکھتا رہا پھر اس نے وہ چیز تطہیر کی طرف بڑھا دی۔ وہ چند لمحے تذبذب میں گھری اس کے ہاتھ کی طرف دیکھتی رہی۔ لان میں پھیلی بلب کی زرد روشنی میں وہ بمشکل اس چیز کو پہچان پائی تھی۔ وہ سارے دن کی بھوک مٹانے کے لیے اسے چاکلیٹ دے رہا تھا۔ اس نے کچھ جھجکتے ہوئے اس چاکلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن صفوان نے وہ چاکلیٹ اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے اس کے سامنے پھینک دی۔ تطہیر کو حد درجہ توہین کا احساس ہوا۔ وہ شاکڈ رہ گئی تھی اس طرح کا سلوک کیا گیا تھا۔ ہزاروں مرتبہ اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا گیا تھا۔ ہزاروں مرتبہ اس کو اسی طرح کھانے کے لیے دیا گیا تھا مگر اتنی بے قدری اسے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

''اٹھاؤ۔'' صفوان نے کہا۔

''مجھے نہیں چاہیے۔'' اس نے بہت دھیمی آواز میں جواب دیا۔ صفوان زور سے ہنسا تھا۔

''کیوں......؟'' وہ ایک دم سے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور پوچھا۔ اس کے وجود سے تطہیر کے پاس آنے والی زرد روشنی بالکل چھپ گئی تھی۔

''میری مرضی......اور میں آپ کی غلام نہیں ہوں جو آپ اس طرح سے مجھے یہ چاکلیٹ دے رہے ہیں۔ اٹھا لیجئے اسے۔ مجھے نہیں چاہیے۔'' وہ تڑخ کو بولی صفوان ایک بار پھر ہنس دیا۔

''بہت خوب......تو آپ کو بولنا آتا ہے......؟ سن کر خوشی ہوئی۔ ساری دنیا سے اس طرح چیزیں لینے والی تطہیر رحمٰن مجھ سے اس طرح چاکلیٹ نہی لے سکتی۔''

اس کے ڈیڈ سے تطہیر کے متعلق یہ سب پتا چلا تھا۔

''ہاں میں اس طرح سے آپ سے یہ چاکلیٹ نہیں لے سکتی......میں جانور نہیں ہوں کہ آپ یہ سلوک کریں۔''

وہ کاٹ کھانے والے انداز میں بولی۔ صفوان اب کی بار ہنسا نہیں تھا مگر اس کے چہرے پر محظوظ سی مسکراہٹ تھی۔ وہ تطہیر کے سرخ چہرے کی طرف بغور دیکھتا رہا پھر اس کے ساتھ بنچ پر بیٹھ گیا تھا۔

''یہ تو میں تمہیں بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تم جانور نہیں ہو اور جب تم جانور نہیں ہو تو لوگوں کو دنیا کو اس بات کا موقع کیوں دیتی ہو کہ وہ تمہیں اس طرح ٹریٹ کریں جیسے تم کوئی جانور ہو۔''

وہ بہت اپنائیت سے ناصحانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ اب کی بار تطہیر خاموش رہی۔

''یہ سب جو تمہیں مل رہا ہے یہ بھیک نہیں ہے کہ تم اسے لیتے ہوئے شرمندہ ہو۔ یہ سب تمہارا حق ہے۔ اسے حق کی طرح وصول کرو۔ یہ...... جہاں تم ابھی بیٹھی ہو۔ اس گھر کی قیمت لگ بھگ ایک کروڑ ہے اور یہ گھر تمہاری مدر کا ہے۔ اور ان کے گھر کی واحد حقدار تم ہو۔ مام اگر اپنے سارے اثاثے ڈکلئیر کریں تو ان کی



مالیت ڈیڈ کی جائیداد سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔ وہ ایک بزنس ٹائیکون ہیں۔ ان کے نام سے کتنے ٹرسٹ چل رہے ہیں۔ اور تم...... تطہیر رحمٰن......ان کی اکلوتی وارث ہو۔ اس کے باوجود یہاں ایسے رہتی ہو جیسے کوئی کسی غیر کے یہاں رہتا ہے۔ تم مام کی ہر جائز ناجائز بات اتنے آرام سے برداشت کر لیتی ہو۔ ان کا رویہ تمہارے ساتھ اہانت آمیز ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی تم سہتی رہتی ہو۔ تم سب کیسے کر لیتی ہو۔ کم از کم میں تو ایسا نہیں کر سکتا۔ مجھے کوئی جانور کی طرح ٹریٹ کر کے دیکھے تو میں اسے قتل کر دوں......'' وہ خاموش ہو گیا تھا مگر اس کی بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس نے تطہیر کی آنکھ سے آنسو رم جھم کی طرح برستے دیکھا۔

''آپ یہ سب کر سکتے ہیں...... آپ یہ سب کر سکتے ہیں......مگر میں یہ سب برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں کیونکہ اللہ نے مجھے یہی سب برداشت کرنے کے لیے سہنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ لوگ مجھے اسی لیے جانور طرح ٹریٹ کرتے ہیں کیونکہ انہیں اللہ نے یہ حق دیا ہے کہ وہ میرے ساتھ اس طرح کا سلوک کریں اللہ نے مجھے بنایا تو انسان ہے مگر میری قسمت......''

''پلیز اب یہ مت کہنا کہ تمہاری قسمت کسی جانور کی قسمت کی طرح ہے۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

''کوئی انسان اپنے منہ سے اپنی اس قدر تذلیل نہیں کر سکتا اور کوئی بھی انسان اس قدر تذلیل کے قابل نہیں ہوتا کہ خود کو ایک جانور سے ملائے۔''

صفوان کی آواز کچھ اونچی ہو گئی تھی۔ مگر جب تطہیر بولی تو اس کی آواز اس سے بھی زیادہ اونچی تھی۔

''میں کر سکتی ہوں اپنے منہ سے اپنی تذلیل اور میں کسی جانور سے برابری بھی کر سکتی ہوں چھپکلی، سانپ اور ہر ایسے جانور سے جس سے کراہیت آتی ہے اور نفرت محسوس ہوتی ہے کیونکہ......اللہ نے مجھے پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ میری تذلیل کی جائے۔ جب اللہ ہی مجھے اس طرح ذلیل ہوتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے تو میں کس طرح اس کی مرضی کے خلاف جا سکتی ہوں۔ میں سارے جہان سے لڑ سکتی ہوں مگر...... میں اللہ سے تو نہیں لڑ سکتی۔''

وہ ہسٹریا کا شکار ہو رہی تھی۔ صفوان کو اس سب کی امید نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا وہ اس کے سامنے اپنی ماں کے لیے نفرت کا اظہار کرے گی اپنے باپ کے خلاف بولے گی وہ دنیا کی زیادتی کی بات کرے گی۔ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

''اللہ کے بارے میں ایسے بات مت کرو۔''

صفوان کو سال میں دو مرتبہ ہی مذہب سے دلچسپی پیدا ہوتی تھی جب اسے عیدین کی نماز پڑھنے مسجد جانا ہوتا تھا مگر اس سے اس لڑکی کے منہ سے ایسی باتیں سن کر وہ اسے ٹوکے بنا نہ رہ سکا جب کہ وہ مزید بھڑک اٹھی۔

''پیدا ہونے سے لے کر اب تک اس نے مجھے ہر چیز کے لیے ترسایا ہے۔ ہر چیز کے لیے مجھے ستر ستر بار اس کو پکارنا پڑا ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ میری طلب کی ہوئی کوئی چیز مجھے نہیں ملی۔ میری ہر خواہش

آزمائش بن گئی میری ہر چاہ آہ بن کر پلٹ آئی۔ والدین...... ذہانت...... شخصیت' نعمت' ہر چیز میں مجھے بدقسمت رکھا۔ ہر چیز میں۔ اتنی نفرت تو کوئی بھی کسی سے نہیں کرتا۔''

وہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ اور اسی لیے اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔ صفوان کو احساس ہوا کہ یہ موضوع چھیڑنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اسے کیا پڑی تھی کہ کسی غیر لڑکی کے آنسو پونچھ کر اس کی تکلیف کم کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر نجانے کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایک دفعہ اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔ اس کے دل سے ساری غلط فہمی دور کر ڈالے مگر وہ اتنی فلاسفی نہیں بول سکتا تھا۔ وہ لفظوں کے معاملے میں تھوڑا کنجوس اور تھوڑا اناڑی تھا۔ اس نے کبھی اللہ تعالیٰ کہ بارے میں ایسے نہیں سوچا تھا۔ کیونکہ اسے کبھی ایسے سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اس نے دنیا کی ہر نعمت کو پیدا ہونے کے ساتھ ہی اپنے قریب پایا تھا۔ اس کی ماں بھی اس کے بچپن میں انتقال کر گئی تھی مگر اسے سوتیلی ماں جیسی کسی چیز سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ ریحان قمر نے جب شہلا رحمٰن سے شادی کی تو وہ چھ برس کا تھا۔ اس نے بچپن کا ایک عرصہ دادا دادی کے ساتھ انگلینڈ میں گزارا تھا جب واپس آیا تو اس کی اسکولنگ ختم ہو چکی تھی وہ دبنے والی عمر میں تھا نہ مسز شہلا قمر دبانے والی پوزیشن میں، اسی لیے ان کے تعلقات ہمیشہ آپس میں خوشگوار رہے تھے۔ اس کے علاوہ وجاہت' ذہانت' دولت میں وہ آؤٹ اسٹینڈنگ تھا۔ قسمت کا ہیر پھیر کیا ہے وہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اور حقیقت تو یہ ہے اس نے کبھی سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ کیونکہ ایسا کرنے کی اسے کبھی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

اس نے ہچکیاں بھرتی تطہیر کی طرف دیکھا وہ کیا تھی وہ کیوں تھی؟ وہ زندگی تھی۔ وہ سب کچھ وہ جو اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتی تھی رات کے پہر اس لمحہ وہ کسی کے لیے اس کا سب کچھ ہو گئی تھی۔ جو قدرت کو مہربان ہوتے دیر کتنی لگتی ہے۔

وہ اس لڑکی کو خاموش کروانے لگا جسے یہ نہیں پتا تھا کہ اللہ کی مہربانی ہوتی کیا ہے۔ وہ اس کی مہربانی کو سمجھنے کے بجائے اس کی نامہربانی کا شکوہ کر رہی تھی۔ اس رات صفوان بہت مشکل سے اسے پرسکون کر پایا تھا۔ مگر ان دونوں کی دوستی میں اس رات نے بہت کردار ادا کیا۔ غیر محسوس طریقے سے صفوان اس کا خیال رکھنے لگا تھا۔

''تم پاگل ہو گئی ہو؟'' اس نے چڑ کر کہا مگر تطہیر پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی طرح سر جھکائے ہوئے اپنے ناخنوں کو تکنے میں مشغول تھی۔ صفوان کو اس کے رویے نے سخت بدمزہ کیا تھا اور پچھلے ایک ماہ میں ان کے درمیان اتنی بے تکلفی ضرور پیدا ہو چکی تھی کہ وہ اسے ٹوک کر اس کے غلط رویے اور فیصلے پر تنقید کر سکتا تھا۔

''تمہیں واپس جا کر کیا ملے گا؟ کیا وہ گھر اس گھر سے زیادہ بہتر ہے یا اس گھر کے لوگ تمہیں اس گھر کے لوگوں سے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔''

وہ بالکل اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ واپس اپنے ابو کے گھر کیوں جا رہی ہے حالانکہ اپنے گھر کے متعلق ساری باتیں بتاتے ہوئے اس نے ایک بار کہا تھا کہ وہ زندگی میں کبھی بھی دوبارہ اس گھر میں ان سوتیلے رشتوں کے بیچ نہیں جانا چاہتی۔ اسے اس گھر میں رہتے ہوئے دو ماہ ہو چکے



تھے۔ اور مام سے اس کے تعلقات کی نوعیت ویسی ہی تھی جیسی پہلے دن تھی۔ مگر صفوان کے ساتھ وہ بہت گھل مل گئی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے متعلق تقریباً بہت ساری باتیں اسے بتائی تھیں۔ اسے اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے ایک مہربان دوست کی ضرورت تھی۔ اور صفوان میں اسے وہ مہربان دوست مل گیا تھا۔

اس کی خاموشی اسے تاؤ دلا رہی تھی۔ جب کہ وہ اپنا فیصلہ سنا دینے کے بعد اب گونگے کا گڑ کھائے بیٹھی تھی۔

''کیا میں یہ سمجھوں کہ تم مجھے وجہ بتانا نہیں چاہتیں؟'' وہ ایک دم سے اس کے سامنے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ تطہیر کے وجود میں خفیف سی لرزش ہوئی تو تھی۔

''او کے فائن...... میں چلتا ہوں اب کبھی کچھ نہیں پوچھوں گا۔''

وہ اٹھ کر باہر کی سمت چل دیا تھا۔ اس کو مکمل یقین تھا کہ وہ آواز دے کر روک لے گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا وہ لاؤنج سے باہر لان میں آ گیا تھا اور کتنی دیر تک لان سے پورچ' کار پورچ سے لان میں چکر لگاتے ہوئے تطہیر کی بے حسی کے متعلق سوچ کر سلگتا رہا تھا۔ اس نے اس لڑکی کے لیے کیا کیا نہیں کیا تھا۔ اپنا قیمتی وقت اس پر ضائع کر کے اس میں جینے کی لگن پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اس کو اپنی شخصیت کا اتنا زعم تھا کہ وہ کبھی کسی لڑکی کو لفٹ بھی نہیں دیتا مگر اس تطہیر رحمٰن کو لے کر وہ گھنٹوں باہر گھومتا تھا۔ اس نے ابھی حال ہی میں اپنا کلینک شروع کیا تھا وہ کلینک سے تھکا ہارا گھر واپس آتا تھا۔ مگر اس کو دیکھ کر نجانے کیوں کچھ دیر کو تھکن کو بھول سا جاتا وہ منہ لٹکائے پریشان حال اداس بیٹھی ہوتی اور ایسے میں صفوان کا دل چاہتا اس لڑکی سے اس کی ساری اداسی' ساری پریشانی لے کر اس کے چہرے پر ایک ازلی مسکراہٹ سجا دے۔

وہ اس کے اس گھر میں آنے سے پہلے اکثر ڈنر باہر سے کر کے آتا تھا مگر اس کے آنے کے بعد وہ خاص طور سے جلدی گھر آ جاتا تھا کہ ڈنر اس کے ساتھ کر سکے۔ دوپہر کو لنچ کے وقت وہ اسے فون کر کے کھانے کے متعلق استفسار کرتا حالانکہ اس کے ہاسپٹل کے کولیگز اس بات پر اس کا مذاق اڑانے لگے تھے کہ شاید وہ ہر روز اپنی کسی گرل فرینڈ کو فون کرتا ہے۔ مگر اسے پروا نہیں تھی اور یہ لاپروا لڑکی کتنے آرام سے اسے بتا رہی تھی کہ وہ واپس اپنے ابو کے گھر جا رہی ہے اور اسے اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ اس کا دوست اس سے ناراض ہے۔ بہت دیر تک اس کے رویے پر کڑھتا رہنے کے بعد وہ گاڑی لے کر باہر نکل گیا...... جان بوجھ کر ڈنر بھی باہر کر کے جب وہ گیارہ بجے کے قریب گھر واپس آیا تو تطہیر لان میں بیٹھی تھی۔

وہ اسے یکسر نظر انداز کر کے اندر کی سمت بڑھ گیا۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کھڑکی سے لان میں دیکھا تو وہ وہیں بیٹھی نظر آئی۔ دونوں گھٹنوں میں سر دیے اپنے آپ سے بے نیاز صفوان کندھے اچکا کر اپنے بستر پر بیٹھ کر کچھ مریضوں کی کیس ہسٹری دیکھنے لگا تھا مگر زیادہ دیر تک وہ اپنے آپ کو اس کام میں مصروف نہیں رکھ پایا۔ اس کا دل اس لڑکی کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

دل کو کوستے ہوئے وہ سلیپر پہن کر خود بھی لان میں آ گیا۔ بہت خاموشی سے وہ اس کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ ہوا میں بہت ہلکی سی خنکی تھی۔ جو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ تطہیر نے سر اٹھا کر اسے نہیں دیکھا تھا مگر وہ

ہچکیاں لینے لگی تھی۔ صفوان کے دل کو جیسے کسی نے مسل ڈالا تھا۔ اس کے وہم وگمان میں نہیں تھا کہ یہ وہ کبھی اس کی وجہ سے روئے گی۔

"تطہیر پلیز......اوکے بابا......سوری......میری غلطی ہے۔"

اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ کبھی اس سے بات نہیں کرے گا مگر اس کے آنسو دیکھ کر وہ اپنے آپ سے کیے گئے سارے وعدے بھول گیا......وہ مسلسل ہچکیاں لے کر رونے میں مشغول تھی۔

"پلیز یار......! کیوں شرمندہ کرتی ہو؟ اب بس بھی کرو۔" وہ عجیب بے بسی سے بولا تھا۔

"پلیز مجھ سے کبھی ناراض مت ہونا۔ کبھی بھی نہیں۔" اس نے ایک دم سے سر اٹھا کر کہا......اس کے گال آنسوؤں سے تر تھے اور اس کی نم آنکھوں میں التجا ہی التجا تھی۔ صفوان بہت دیر تک اس کے چہرے سے نظر ہٹا نہیں پایا تھا۔

"میں تم سے ناراض ہو ہی نہیں سکتا......کبھی بھی نہیں......تم میری بہترین دوست ہو۔"

آخری بات شاید اس نے اپنے آپ سے کہی تھا۔ وہ ایک عام سی لڑکی کے لیے اپنے آپ کو اتنا بے بس کیوں محسوس کر رہا تھا۔ وہ خود سمجھ نہیں پایا۔

"میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی مجھے یہاں سے جانا ہے۔ یہ میرا گھر نہیں ہے۔ یہ تو میری ماں کا گھر ہے اور میری ماں کو مجھ سے محبت نہیں ہے بلکہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہیں......انہیں میرے اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے حتیٰ کہ میرے کھانا کھانے کے طریقہ پر بھی اعتراض ہے۔ وہ اس بات پر غصہ کرتی ہیں کہ میں چھری کانٹے سے نہیں کھا سکتی......انہیں یہ بات بھی بری لگتی ہے۔ کہ میں ان کے ملازموں کے سامنے انہیں مخاطب کیوں کرتی ہوں اور میرے بولنے کا طریقہ ایسا ہے جیسے پچاس ساٹھ سال کی کوئی عورت بات کر رہی ہو۔"

اس بار صفوان کے پوچھے بنا ہی وہ سب کچھ بتانے لگی تھی صفوان کو اندازہ تھا کہ مام کا رویہ ہی اس کے لیے ہتک کا باعث ہے اور اسی لیے وہ یہاں سے جانا چاہتی ہے۔

"دراصل......انہیں میرے سانس لینے پر اعتراض ہے انہیں اس بات پر اعتراض ہے کہ میں کیوں ہوں؟ میں زندہ کس لیے ہوں میں اب تک مر کیوں نہیں گئی میں ان کے لیے وبال جان ہوں۔" وہ اس سے سوال کر رہا تھا پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔

"تم پاگل ہو تطہیر! بالکل پاگل ہو......یہ تمہاری ماں ہیں اگر کچھ کہہ بھی دیتی ہیں تو تم برداشت کرو تمہیں برداشت کرنا چاہیے......مگر وہ لوگ تو سب تمہارے لیے سوتیلے ہیں......تمہارے اپنے نہیں ہیں وہ بھی تو تمہارے ساتھ اسی طرح کا رویہ روا رکھیں گے پھر......؟ پھر کیسے برداشت کرو گی کہاں جاؤ گی؟ ماں کے گھر سے نکلو گی تو واپس باپ کے گھر......اور جب دوبارہ وہاں سے نکالا گیا تب......بولو کہاں ٹھکانا ڈھونڈو گی۔"

تطہیر نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔ اور اپنے گالوں کو ہاتھ سے صاف کرنے کی کوشش کی۔

"بتاؤ نا......؟ کیا کرو گی؟" اس نے پھر پوچھا۔

"آپ یہ سب اتنے آرام سے اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ کو زندگی میں کبھی بھی اپنوں کی نفرت کا



شکار نہیں ہونا پڑا۔ آپ نے کبھی اپنوں کی آنکھوں میں اپنے آپ کے لیے جھنجلاہٹ یا الجھن نہیں دیکھی۔ آپ نے کبھی اپنوں کی آنکھوں میں تضحیک کی جھلک محسوس نہیں کی۔ میں نے کی ہے۔ اپنے باپ کی آنکھوں میں جھنجلاہٹ الجھن اپنی ماں کی آنکھوں میں اہانت اور حقارت......" وہ لمحہ بھر کو رکی پھر سلسلہ کلام وہیں سے جوڑ کر بولی۔

"انسان ساری دنیا کی نفرت برداشت کر سکتا ہے مگر اپنوں کی نہیں......میں بھی انسان ہوں مجھ سے بھی اپنی ماں کی آنکھوں میں نفرت نہیں دیکھی جاتی......میں نہیں برداشت کر سکتی......وہ مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہیں کہ اس گھر میں میرا وجود بھی برداشت نہیں کر سکتیں......میں اپنے سوتیلے رشتوں کے ساتھ رہ لوں گی۔ کیونکہ ان کی زیادتیوں پر میں ان سے لڑ سکتی ہوں۔ چیخ چلا سکتی ہوں مگر اپنوں سے نہیں لڑ سکتی میں اپنی ماں سے نہیں لڑ سکتی اور آپ نے پوچھا ہے کہ میں اپنے مرحوم باپ کے گھر سے ایک بار پھر دھتکاری دی گئی تو کہاں جاؤں گی؟ میں وہاں جاؤں گی، جہاں سب جاتے ہیں۔ قبرستان......میں مر جاؤں گی۔" وہ بے رحمی سے بولی۔

تو صفوان اس کی آخری بات پر تڑپ اٹھا تھا۔

"مر جاؤ گی۔؟ اور میں......؟ میرے بارے میں سوچا ہے کہ میرا کیا ہو گا؟"

الفاظ اس کے منہ سے خود بخود پھسلے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ جذبہ کون سا ہے۔ مگر وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ یہ لڑکی اس کے لیے اہم ہے اتنی ہی اہم جتنا کہ وہ خود تھا اپنے آپ کے لیے۔

"میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا تطہیر! میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا وہ بھی صرف اتنی سی بات کے لیے کہ مام تمہیں ناپسند کرتی ہیں۔" وہ ایک نئے عزم سے بولا تھا۔

"کیوں ناپسند کرتی ہیں وہ تمہیں؟ تم ان کے اسٹینڈرڈ پر پورا نہیں اترتیں میں تمہیں ان کے معیار کا بناؤں گا......میں تمہیں تبدیل کر دوں گا......اتنا تبدیل کہ تم بھی خود کو پہچان نہیں پاؤ گی۔ کیا سیکھنا ہے تمہیں؟ چھری کانٹے سے کھانا کھانا' سوسائٹی میں موو کرنا......انگلش بولنا میں سب سکھا دوں گا تطہیر! لیکن......"

وہ جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ کر بولا۔

"تم اپنے آپ کو اندر سے تبدیل کرو......تبدیلی کی ضرورت تمہارے اندر ہے سب سے پہلے تم خود اپنے آپ کو اہمیت دینا شروع کرو تا کہ باقی لوگ تمہیں اہمیت دیں۔ تم اتنی گئی گزری نہیں ہو کہ جس کا دل چاہے تمہیں لیٹ ڈاؤن کرے۔ جس کا دل چاہے تمہیں فور گرانٹڈ لے۔ لیکن یہ ساری باتیں سب سے پہلے اپنے آپ کو سمجھاؤ......"

"میں کیسے تبدیل ہو سکتی ہوں......طریقہ بدل سکتی ہوں انداز نہیں۔ عقل بدل سکتی ہوں شکل نہیں۔ یہ چہرہ تو یہی رہے گا نا......بدصورت کراہیت آمیز......"

"فار گاڈ سیک تطہیر! اس طرح سوچنا چھوڑ دو۔" وہ اس کی بات سے زچ ہو کر بولا۔ نجانے کیوں اس لڑکی کو ہمہ وقت اپنی تحقیر کا شوق تھا۔

"کسی بات پر تو خدا کا شکر کرنا سیکھو......کبھی تو تمہارے منہ سے کلمہ شکر سنوں میں......اتنا مکمل بنایا

ہے اللہ نے تمہیں کس چیز کی کمی ہے؟ آنکھیں نہیں ہیں کیا؟ ٹانگیں نہیں ہیں؟ ہاتھ ٹوٹے ہوئے ہیں۔؟''

وہ اس کی طرف دیکھ کر سختی سے بول رہا تھا۔

''یاد رکھو تطہیر! شکر اور شرک کے درمیان ذرا سا فرق ہوتا ہے۔ شکر ادا نہ ہو تو شرک بن جاتا ہے اور اللہ کو شرک پسند نہیں۔ شرک کرنا چھوڑ دو اور شکر کرنا سیکھو۔ پھر دیکھو اللہ کیسے مہربان ہوتا ہے۔ اس کی نعمت کو پہچاننا سیکھو۔ کسی معاملے میں اگر اس نے کوئی کمی رکھی ہے تو کہیں نہ کہیں اس کی مہربانی کی زیادتی بھی ہوگی۔ شکوے کرنا چھوڑ دو اور اللہ کے کرم کو پہچاننے کی کوشش کرو۔ وہ تمہیں مایوس نہیں کرے گا۔ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ اس کا کرم کب کیسے کس پر اور کس طرح ہو جائے۔ اس سے اس کا کرم طلب کرو وہ یقیناً مہربان ہوگا۔''

وہ اتنا کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ اس کو اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے فلسفۂ تشکر کس طرح تطہیر کو سمجھایا۔ وہ خوش تھا کہ اس نے کچھ اچھی باتیں تطہیر کو سمجھانے کی کوشش کی۔

☆ ☆ ☆

''میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔'' اس نے قطعی لہجے میں بغیر گنجائش رکھے انکار کر دیا۔ اس کو مذاق کرنے کی عادت نہیں تھی کہ صفوان اتنے دوٹوک انکار کو اس کا مذاق سمجھتا۔ اسے تو پتا ہی نہیں چلا تھا کہ کب وہ اس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ وہ تو اسے مام کی پسند کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کوشش میں وہ اس کی اپنی پسند میں ڈھلتی چلی گئی۔

''زندگی میں چھری کانٹے سے کھانا ضروری نہیں ہوتا۔ کھانا ضروری ہوتا ہے اور کھایا ہاتھوں سے بھی جا سکتا ہے۔'

اتنی پریکٹس کے بعد بھی چھری کانٹے سے الجھتا دیکھ کر اس نے سمجھایا تھا۔ اس دن کے بعد وہ ہاتھ سے اطمینان سے کھانا کھانے لگی تھی۔ شاید کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس کی یہ حرکت صفوان کو کبھی بھی پسند نہ آتی۔ مگر تطہیر رحمٰن کے لیے اس کا دل ہر رعایت برتنے کو تیار تھا اور تطہیر رحمٰن اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''اس شادی کی بنیاد کیا ہو گی...... ہمدردی...... خدا ترسی...... رحم دلی...... اور یہ شادی کتنا عرصہ چلے گی؟ دو ماہ چھ ماہ ایک سال۔''

صفوان نے انکار کی وجہ دریافت نہیں کی تھی مگر وہ خود ہی کہنے لگی۔

''اور اس ہمدردی خدا ترسی اور رحم دلی کے صلہ میں جو اولاد پیدا ہوگی وہ اگلے پچیس سالوں تک دنیا کی ٹھوکروں کی زد پر ان ہی تین چیزوں کی حقدار ہوگی۔'' وہ بہت سنگدلی سے کہہ رہی تھی۔ صفوان زچ سا ہو گیا۔

اس لڑکی کا واحد مسئلہ خود ترسی تھا اور وہ پچھلے تین ماہ سے اسی خود ترسی والی عادت سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم اس پاگل پن سے کب باہر آؤ گی تطہیر؟'' وہ بے بسی سے کہتے ہوئے اس کے سامنے پڑے کاؤچ پر بیٹھ گیا۔

''یہی تو میں آپ سے کہنا چاہ رہی تھی کہ آپ اس پاگل پن کا شکار کیوں ہو رہے ہیں؟ جب میری



ماں کو مجھ پر کبھی ترس نہیں آیا تو آپ کیوں مجھ پر ترس کھا رہے ہیں۔؟''

''واٹ ربش تطہیر! چپ کرو...... گزشتہ تین ماہ سے یہی سب سن رہا ہوں۔ کیوں ہر وقت خود کو ڈی گریڈ کرتی رہتی ہو...... مت کیا کرو ایسے بہت اہم ہو تم میرے لئے۔''

''امپورٹنٹ اور میں...... ہاہ......'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی تھی۔ ''میں کسی کے لیے اہم کیسے ہو سکتی ہوں؟ میرے پاس ایسا ہے ہی کیا کہ جو مجھے دوسروں کے لیے اہم کر دے۔ آپ نے کبھی مجھے غور سے دیکھا ہے میرے چہرے سے کراہیت آتی ہے میری ماں کو۔ میرا باپ مجھے کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ عبیر نے ہمیشہ میرے رنگ اور نقوش کا مذاق اڑایا۔ ماں نے کبھی اس قابل نہیں سمجھا کہ مجھ سے دو گھڑی بات کر لے۔ کیونکہ میں ایسی باتیں نہیں کر سکتی۔ جیسی میری ماں کو پسند ہیں۔ میری ماں ایمسٹرڈیم اور برمنگھم کے شاپنگ مالز کی باتیں کرتی ہیں اور میں لاہور کے کسی شاپنگ مال کے بارے میں نہیں جانتی۔''

وہ ہمیشہ اپنے بارے میں ایسے ہی بات کرتی تھی مگر آج صفوان کو اس کی باتوں میں ایک نیا پن محسوس ہو رہا تھا کیونکہ آج اس نے اسے بھی سب کے ساتھ ایک قطار میں کھڑا کر دیا تھا۔

''میرا وجود اتنا بے کار اتنا بے وقعت ہے کہ میرے قریب سے گزرنے والا کوئی انسان رک کر میری طرف نظر ڈالنا بھی پسند نہیں کرتا آپ کے گھر کی ملازمہ بھی مجھ سے زیادہ بہتر ہے اور...... آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ میرا مزید تماشا بن سکے۔ جب میں آپ کے ساتھ چلوں تو لوگ میرا مذاق اڑائیں اور آپ کی عظمت کی داد دیں کہ آپ نے خدا ترسی کا عظیم مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے سے کمتر لڑکی سے شادی کی۔ میں نے بہت سے لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹی ہیں مگر آپ جیسا ہمدرد کبھی نہیں ملا۔ وہ لڑکی جس کے ساتھ اس کے اپنے چند منٹ نہیں گزار سکتے وہاں ایک غیر اس کے ساتھ ساری زندگی گزارنے کی بات کر رہا ہے۔''

وہ خشک لہجے میں بات کر رہی تھی اور پہلی بار ایسی باتیں کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی کا نشان تک نہیں تھا۔ اس کی باتوں سے صفوان کو بہت دکھ ہوا تھا اور آخری بات پر تو جیسے جھٹکا لگا تھا۔

''غیر......؟ غیر کون......؟ تم مجھے غیر کہہ رہی ہو۔ تطہیر......؟ یہ سب تمہارے اپنے ہیں اور...... میں...... میں غیر ہو گیا......''

وہ اپنے سینے پہ انگلی رکھ کر پوچھ رہا تھا۔ تطہیر خاموش رہی تھی۔

''کیا تمہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ غیر تم سے محبت کرتا ہے اور تمہارے ساتھ ساری زندگی ہنسی خوشی گزارنے کو تیار ہے۔''

''بہت دیالو، بہت فیاض ہیں آپ...... ہمدردی کو محبت کہتے ہیں ہمدردی کو محبت سمجھتے ہیں۔''

وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ صفوان کو بھی غصہ آیا تھا۔

''شٹ اپ...... شٹ اپ تطہیر!'' تطہیر نے اتنے غصے میں اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''تم میری انسلٹ کر رہی ہو اور میری محبت کی بھی۔'' وہ اپنے آپ پر قابو پا کر بول رہا تھا۔ تطہیر نے استہزائیہ سا قہقہہ لگایا۔

''آپ مجھے بچی سمجھتے ہیں یا بے وقوف...... کیا میں اس قابل ہوں کہ مجھ سے محبت کی جائے...... اور اگر ایسی بات ہوتی تو میرا خالق مجھ سے اس قدر نفرت نہ کر رہا ہوتا۔''

''دراصل...... تمہیں خود اپنے آپ سے نفرت ہے اور اسی نفرت کی وجہ سے تم خود اپنے بارے میں کچھ بھی اچھا سوچنے کے قابل نہیں ہو۔ تم نے زندگی کے ہر میدان میں ناکامی کا منہ دیکھا تو اس کا سبب تم خود ہو...... کبھی اچھا سوچا ہے تم نے۔ کبھی کوئی مثبت بات آئی ہے تمہارے ذہن میں۔ ہر وقت اپنے آپ میں کیڑے ڈھونڈتی رہتی ہو۔ غلطیاں نکالتی رہتی ہو...... تمہارے چہرے پہ یہ جو بارہ بجے رہتے ہیں نا یہ اسی قنوطیت کا نتیجہ ہے۔ سوچ تازہ ہو تو چہرے پہ تازگی نظر آئے۔

یہ تو ہوگی تمہاری ظاہری شخصیت کی بات اور یہ جو تم ہر وقت ذہانت کی کمی کا رونا روتی رہتی ہو نا تو یہ بھی تمہاری اپنی غلطی ہے جب تم اور باتیں اتنی ذہانت والی کر سکتی ہو تو پڑھائی میں یہ ذہانت کیسے نہ کام آتی مگر تم نے خود ہی یہ سوچ لیا کہ ہر کام بس ایک بار کیا جائے گا اور اس کام میں ناکام ہونے کی صورت میں دوبارہ کبھی اسے کرنے کی کوشش ہی نہیں کرو گی۔ بہت بڑے بڑے کامیاب لوگ بھی دوسری کوشش پہ یقین رکھتے ہیں مگر تمہاری ڈکشنری میں شاید یہ لفظ ہی نہیں ہے۔ تم نے ایف اے میں ناکام ہونے کے بعد دوبارہ پڑھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ حالانکہ تم نے خود مجھے بتایا تھا کہ تمہاری دادو جی نے تمہاری بہت منت کی تھی کہ تم دوبارہ سے پیپرز دے لو مگر تم نے ان کی بات بھی نہیں مانی۔

میں جانتا ہوں زندگی نے تمہارے ساتھ بہت بار زیادتی کی ہے۔ تمہاری توقعات ہرٹ ہوئی ہیں مگر یقیناً کہیں تو زندگی مہربان ہوگی۔ تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم نے زیادتی کو تو یاد رکھا مگر مہربانی کو بھول گئیں۔ بہت سے لوگوں کے پاس ماں اور باپ دونوں نہیں ہوتے مگر تمہارے پاس باپ کا سایہ تو تھا...... باپ کی محبت میں کمی تھی مگر دادو جی کی محبت تھی اور پھر تطہیر...... چھت کا آسرا تو تمہارے پاس ہمیشہ رہا ہے۔ اپنی ماں کے گھر میں ہو یا باپ کے گھر میں...... عزت تو تمہاری ہر جگہ محفوظ رہی ہے۔ کبھی کسی کی میلی نظر کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا تمہیں لیکن تم شاید اس چیز کو اللہ کی نعمت ہی نہیں سمجھتی۔ تمہارے نزدیک یہ مہربانی ہی نہیں ہے سرے سے۔

اس کے علاوہ کوئی ایسی رات جب تمہیں بھوکے سونا پڑا ہو تمہیں فاقہ سہنا پڑا ہو۔ کیا تم نے اس بات کو اللہ کی نعمت سمجھا نہیں نا۔ تم اتنی قنوطیت پسند ہو کہ رحمت کو زحمت سمجھتی رہیں۔ تمہارے پاس وہ نظر ہی نہیں جو تمہیں رحمت اور زحمت میں فرق دکھا سکے ورنہ تمہیں میری محبت ہی سمجھ آ جاتی......''

وہ بولتے بولتے تھک گیا تھا مگر بات ابھی بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا تطہیر کو وہ یہ بات کبھی نہیں سمجھا سکے گا جس بات کو اسے وہ گزشتہ تین ماہ سے مسلسل مختلف طریقوں سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا وہ تین گھنٹوں میں اسے کیسے سمجھ آ سکتی تھی۔

''تم اللہ کا شکر ادا کر سکتی ہیں کہ ایک شخص تمہاری محبت میں پاگل ہوا جا رہا ہے۔ تم صحیح کہتی ہو تو وہ اس پر بھی تیار ہو جاتا ہے اور تم...... تطہیر! تم یہ کہتی ہو کہ میں تم سے ہمدردی کر رہا ہوں ترس کھا رہا ہوں تم پر۔ کیا تم نے اس سے پہلے کوئی ایسا ہمدرد شخص دیکھا ہے جو خود کو بھول کر کسی دوسرے کو اپنا بنانے کی کوشش کر رہا ہو۔ تم میری محبت کو رحم دلی کہتی ہو۔'' وہ نہایت بے چارگی سے کہہ رہا تھا۔ تطہیر کا جھکا سر دیکھ کر اسے اور غصہ آیا تھا۔



''آپ بھی تو اپنی رحم دلی کو محبت کہہ رہے ہیں اور اس جھوٹی محبت کا پرچار کر رہے ہیں۔'' وہ دھیمی آواز میں بولی تھی مگر اس کی آواز کے دھیمے پن نے بھی صفوان کے اندر تک آگ لگا دی۔ اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

''جھوٹی محبت؟'' اس نے تحیر سے اس کے الفاظوں کو دہرایا۔

''اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ تطہیر! میں نے ہمیشہ تمہاری اور تمہارے احساسات کی عزت کی ہے اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنی مرضی اور اپنے ہر فیصلے میں آزاد ہو۔ اب میں تمہاری راہ میں نہیں آؤں گا لیکن میں تمہاری پکار کا انتظار ضرور کروں گا کیونکہ......''

وہ کچھ لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ محبت کے اظہار کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ وہ لڑکی اس کے ہر جذبے کو اپنی مرضی کے معنی پہناتی چلی جا رہی تھی۔

صفوان نے کچھ دیر اسے دیکھا پھر باہر نکل گیا۔ اس سے اگلی صبح وہ اس سے بات کیے بغیر کلینک چلا گیا تھا اور جب شام ڈھلے وہ واپس آیا تو اسے لگا یہ شام اب کبھی صبح میں تبدیل نہیں ہوگی۔ اس شام کا اثر زندگی پر مستقل ہو چکا تھا وہ واپس جا چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

''تطہیر رحمان! تم ہو کون چیز کیا ہو؟''

وہ اس کے تقریباً سر پر کھڑی سوال کر رہی تھی۔ تطہیر کی آنکھیں ابھی بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ شاید وہ اس کی غیر موجودگی میں بھی روتی رہی تھی۔ مناہل کو اب کی بار اس پر ترس نہیں آیا...... رقیب مر بھی جائے تب بھی رقیب ہوتا ہے۔

''تمہاری اوقات کیا ہے! یہ جو کپڑے تم نے پہن رکھے ہیں نا یہ میری اترن ہیں۔ میری وجہ سے آج تم یہاں حالت سکون میں بیٹھی ہو ورنہ شاید وہیں تھانے میں مر گئی ہوتیں اور تم...... تم صفوان سے محبت کرتی ہو شکل دیکھی ہے اپنی۔''

وہ بہت غصے میں تھی۔ تطہیر کو اس کے غیض پر حیرت نہیں ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ مناہل اسی طرح کرے گی اسی لیے وہ صفوان کے کلینک جانے اور حتیٰ کہ اس کا سامنا کرنے سے بھی ڈرتی تھی۔

''میں محبت نہیں کرتی۔ وہ کہتا تھا کہ وہ محبت کرتا ہے...... وہ......''

''تم اپنی بکواس بند کرو اگر تم نے کبھی خود کو غور سے دیکھا ہوتا تو تم یہ بات بھی نہیں کہتیں تم یہ بات اپنے ذہن میں بھی نہ لاتیں مگر تم اس سے محبت کرتی تھیں اسی لیے تم نے ابتدا میں ہی اپنی سگی ممی کے بارے میں مجھ سے چھپایا۔ میں نے تمہارے لیے کیا نہیں کیا تطہیر! اور تم نے...... تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ میں نے تمہارا کتنا خیال رکھا اپنے گھر میں تمہیں جگہ دی اور تم......''

وہ یکدم ہی رونے لگی تھی۔ تطہیر کی آنکھ میں آنسو نہیں تھے مگر وہ یک ٹک مناہل کی شکل دیکھ رہی

تھی۔ اسے اس طرح کے ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ اس نے پہلی بار جب مناہل کے منہ سے صفوان کا ذکر سنا تو وہ کچھ چونکی تھی مگر پھر بھی اس نے یہ سوچ کر اس بات کو ذہن سے نکال دیا کہ ایک جیسے ناموں والے بہت سے لوگ ہو سکتے ہیں مگر پھر ایک روز پروین نے بہت فخر سے مناہل کی ہونے والی ساس کا ذکر کرتے ہوئے اسے ان کی اخبار میں چھپی تصویر دکھائی تھی۔ اور تب اسے احساس ہوا کہ اس کے ساتھ کھیل کھیلا گیا ہے۔

مناہل اس کی ماں کے کہنے پر اسے اپنے گھر لائی تھی اور اسی لیے غیر ہوتے ہوئے بھی وہ اس کے ساتھ اتنی مہربانی سے پیش آتی تھی اور اس کی ماں اپنی سماجی ساکھ قائم رکھنے کے لیے اسے اپنی بیٹی نہیں مان سکتی تھی۔ ورنہ وہ الیکشن میں اپنے ووٹرز گنوا دیتی اسی لیے راتوں رات اسے تھانے سے گھر منتقل کر دیا گیا تھا۔ یہی سب سوچتے ہوئے اس نے مناہل کا گھر چھوڑ دینے کا ارادہ کیا تھا مگر اسی رات اس کو وہی سر درد ہوا جو اکثر ہوتا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر مناہل سے اپنی شناخت نہیں چھپائی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ اس مہربان لڑکی کو کس طرح بتائے کہ اس کی شادی جس لڑکے سے ہونے جا رہی ہے وہ اس سے بھی زیادہ مہربان ہے۔ وہ تو اسے اپنے گھر لائی تھی جبکہ وہ لڑکا اسے اپنی زندگی میں لانا چاہتا تھا مگر وہ اسے کچھ بتا نہیں پائی تھی۔

وہ صفوان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر اب یہ قسمت کی خرابی تھی کہ وہ میٹرنٹی ہوم میں مل گیا۔ مناہل کو اپنی ہی دھن میں سمجھ میں نہ آسکا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر کس بری طرح سے چونک گئے ہیں۔ صفوان نے اسے طنزیہ انداز میں مبارک باد دی تھی مگر جب مناہل اس کو کلینک میں ڈراپ کر گئی تھی تو صفوان نے اس سے بہت باتیں کی تھیں۔ وہ اس سے اس کے متعلق اگلوانے کی کوشش کرتا رہا تھا اور اس کے شوہر کے متعلق پوچھتا رہا تھا مگر تطہیر اپنے متعلق کوئی بھی بات بتانے کے بجائے اسے مناہل کے بارے میں بتاتی رہی تھی اور اب مناہل کہہ رہی تھی کہ اس نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔

"تم میرے گھر سے چلی جاؤ...... ابھی اسی وقت...... چاہے وہیں واپس دارلامان چلی جاؤ...... جہاں سے تم گناہ کر کے تھانے پہنچی تھیں...... یا اپنی مدر کے پاس چلی جاؤ...... مگر میری زندگی سے نکل جاؤ...... میرا صفوان مجھے واپس کر دو۔"

وہ بہت بے رحمی سے کہہ رہی تھی۔ تطہیر کو شاید اسی کی توقع تھی۔ اس نے جگہ چھوڑ دی تھی۔ اس کا گھر یہ بھی نہیں تھا اس کی منزل کہیں اور تھی اسے یہ جگہ چھوڑنی ہی تھی۔ اس نے ایک بار مناہل کو دیکھا وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ جو وہ سوچ رہی ہے وہ غلط ہے مگر وہ جانتی تھی مناہل اس کی بات کا یقین نہیں کرے گی۔

اس نے جوتے پہننے شروع کیے تھے۔ پہلا جوتا پہن کر اس نے اس کے تسمے بند کیے تھے اور جب وہ دوسرا جوتا پہننے لگی تھی تب اچانک ہی اس کے پیٹ میں ہلکا سا درد اٹھا۔ ایسی درد کی لہریں پچھلے کئی دنوں سے وہ محسوس کر رہی تھی۔

جوتے پہن کر اس نے چادر درست کی...... وہ خالی ہاتھ آئی تھی خالی ہاتھ جا رہی تھی۔ دروازے پر پہنچ کر درد کی شدت میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ اس نے مناہل کی طرف دیکھا اس کا دل چاہا ایک رات کے لیے یہاں رک جائے۔ وہ مناہل سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ صبح چلی جائے گی مگر مناہل سے کچھ کہنے کی ہمت اس کے



پاس نہیں تھی۔ وہ اس کی محسنہ تھی اور وہ اسے مزید تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔

اپنی تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

درد برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا مگر وہ چلتی رہی تھی اس سے چلا نہیں جا رہا تھا مگر وہ چل رہی تھی پھر ایک مقام پر تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ کون سی جگہ ہے مگر وہ ٹھہر گئی۔ اس نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی۔ بے حال کرتے ہوئے درد نے ہر طرف سے آنکھیں بند کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں ہر چیز چھپ گئی تھی۔ زندگی موت سے پہلے والی موت کا نام ہے۔

میں وہ اقلیم کہ محروم چلی آتی تھی
سالہا دشت نوردوں سے، جہاں سے گردوں سے
اپنا ہی عکس روا تھی گویا
ایک محرومی دیرینہ سے شاداب تھے
آلام کے اشجار وہاں
برگ و باراں کی وہ پامال امیدیں جن سے
پری افشاں کی طرح خواہشیں آویزاں تھیں
کبھی ارمانوں کے آوارہ سراسیمہ طیور
کسی نادیدہ شکاری کی صدا سے ڈر کر
ان کی شاخوں میں اماں پاتے تھے ستاتے تھے
اور کبھی شوق کے ویرانوں کو اڑ جاتے تھے
شوق بے آب و گیاہ
ولولے جس میں بگولوں کی طرح ہانپتے تھے
اونگھتے ذروں کے تپتے ہوئے لب چومتے تھے
"ہم" کہ اب "میں" سے بہت دور نکل آئے ہیں
دور اس وادی سے جو کہ اک منزل بے نام بھی تھی
کروٹیں لیتے ہیں جس منزل میں
عشق گم گشتہ کے افسانوں کے خواب
ولولوں کے وہ ہیولے جہاں
جن کی حسرت میں تھے نقاش ملول
جن میں افکار کے کہاروں کی روحیں سرور بستہ ہیں
اولین نقش ہیں ارمانوں کے آوارہ پرندوں کے جہاں

خواہشوں اور امیدوں کے جیتن
اپنی ہی ذات کے ہمسائے ہیں
آج ہم خود سے بہت دور نکل آئے ہیں

وہ سچ مچ بہت دور نکل گئی تھی۔ ڈھلتی شام نے اس کے مرنے کی خبر قبرستان میں بہت زور و شور سے سنائی تھی۔ ایک اور انسان خود سے بہت دور ہو کر خالق کے بہت قریب ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

''مناہل پلیز اب بس بھی کرو...... بھول جاؤ تطہیر رحمان کو۔''

ماریہ نے بے بسی سے تقریباً گلوگیر لہجے میں کہا۔ اس سے مناہل کی حالت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ بلاشبہ اسے بھی تطہیر رحمان کی موت کا دکھ تھا مگر اتنا دکھ جتنا کسی بھی غیر انسان کی موت کا ہو سکتا ہے۔ وہ ایک بار تطہیر رحمان سے ملی تھی اور اسے اس لڑکی میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی تھی جسے اس کی خصوصیت یا خوبی قرار دیا جاتا۔ وہ حقیقتاً عام لڑکی تھی اور ماریہ کے ذاتی خیال میں مناہل اس عام لڑکی کے لیے اتنے دن سے سوگ منا کر اسے بہت خاص بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسے مسز شہلا قمر پہ بھی غصہ آ رہا تھا کیونکہ اس کو اس الجھن میں پھنسانے والی بھی وہی تھیں۔ وہ خود امریکہ سے واپس ہی نہیں آ رہی تھیں جبکہ مناہل کے والدین اگلے ہفتے واپس آ رہے تھے۔ پھپھو خود مناہل کے لیے پریشان تھیں۔ انہوں نے فون کر کے ماریہ کو بلایا تھا تا کہ وہ مناہل کو سمجھا سکے۔ وہ خود اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکی تھیں۔ ان کا بھی یہی خیال تھا کہ ایسی اموات تو معاشرے میں روز ہوتی تھی وہاں ایسی اموات بہت عام تھیں۔ گویا کسی کی موت کا دکھ منانے کے لیے اس کا خاص ہونا ضروری ہے۔ مناہل کسی کو نہیں سمجھا سکتی تھی کہ آرگنائزیشن میں کسی کا آنا اور بات ہے اور زندگی میں آنا بالکل ایک اور بات ہے۔ اس کی تطہیر رحمان سے کیا رشتہ داری تھی۔ ان کے بیچ کتنا گہرا تعلق تھا وہ کسی کو نہیں بتا سکتی تھی۔

اس کے مرنے کے بعد گویا وہ صفوان کی زندگی سے بھی نکل گئی تھی۔ اس نے اس کا صفوان اسے واپس کر دیا تھا مگر پھر بھی وہ خوش نہیں تھی۔ تطہیر کا دو ماہ کا ساتھ اسے دو سو سال کے برابر لگ رہا تھا۔ وہ آئی بھی اور چلی بھی گئی تھی مگر وہ تھی اور اسے سدا وہیں رہنا تھا۔

''ہم کسی کو گھر سے تو نکال سکتے ہیں مگر دل سے نہیں۔'' یہ بات مناہل کی سمجھ میں تب آئی تھی جب تطہیر نے وجود سے عدم کی راہ پہ سفر شروع کر دیا تھا۔ وہ اس کے گھر سے نکل کر کہاں گئی کسی کو نہیں پتا تھا مگر دو دن بعد ایک گمنام فون کے ذریعے اسے بتایا گیا تھا کہ یہ عورت دو دن پہلے مر گئی تھی۔ اسے لاوارث سمجھ کر دفنا دیا گیا تھا اور فون کرنے والا انسان کون تھا؟

''سیف اللہ خان وہی پولیس انسپکٹر جس نے تطہیر رحمان کو مناہل مرتضیٰ کے حوالے کیا تھا۔ وہ اس لڑکی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا مگر وہ مناہل کو بہت اچھی طرح سے جان گیا تھا کیونکہ وہ ایک بڑی عورت کی ہونے والی بہو تھی اسی لیے اس نے فون کر کے تطہیر کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا تھا۔



لاوارث تدفین اتنی بھی آسان نہیں ہوتی مگر اس عورت تطہیر رحمان کی حالت اتنی بری تھی کہ اسے عجلت میں دفنانا پڑا تھا۔ وہ زندہ تھی معاشرے کے لیے تب بھی ناقابل برداشت تھی اور مرنے کے بعد اسے برداشت کرنا مشکل ترین ہو گیا تھا۔

''ہم انسان پہ رحم نہیں کریں گے تو ہم پر رحم کیسے ہوگا۔''

سیف اللہ خان نے مناہل سے ملنے کے بعد کہا تھا۔ وہ اس کی خدا ترسی کو سراہ رہا تھا۔ مناہل کے بہتے آنسو اس کے درجے کو مزید بلند کر رہے تھے۔

اس انسپکٹر نے ایک لاوارث عورت کے لیے ایک مشہور عورت کو اتنا بے تحاشا روتے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اسے تطہیر رحمان کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ ہر وہ بات جو مناہل سے مخفی تھی مگر سیف اللہ کو دوران تفتیش پتا چلی تھی اور اس ساری تفصیل نے مناہل کے احساس جرم کو بہت بڑھا دیا تھا۔

''مناہل! اب ختم کرو یہ رونا دھونا تم کب تک اس طرح روتی رہو گی۔''

ماریہ نے اس کے بستر پر بیٹھ کر اس کے ٹھنڈے یخ ہاتھ تھام لیے تھے۔ ''ماریہ......! میں اس کا خیال رکھتی تو وہ کبھی نہ مرتی۔ وہ میری وجہ سے مر گئی۔''

اس نے ماریہ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر کہا تھا۔ یہی وہ بات تھی جو پھپھو کو بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی اور یہی وہ بات تھی جو مناہل کی زبان پر ہمہ وقت رہنے لگی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ ناکام رہی تھی تو اور خیال رکھنا کسے کہتے ہیں۔

''وہ تمہاری وجہ سے نہیں مری ہر شخص اپنی مدت پوری ہونے پر مر جاتا ہے اسے بھی مرنا تھا کیونکہ اس کی مدت پوری ہو چکی تھی۔''

وہ زچ ہو کر بولی۔

''میں چاہتی تو اس کی مدت کبھی نہ پوری ہوتی میں چاہتی تو وہ کبھی نہ مرتی۔'' اس نے ایک اور بے تکی بات کہی۔ ماریہ کو اس بار شدید غصہ آیا۔

''کیوں، تم کون ہو؟ اور بھلا انسانی جان انسان کے ہاتھ میں کب سے ہونے لگی۔ تمہارے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے اور کیا ہو سکتا تھا تمہارے چاہنے سے۔''

وہ سخت لہجے میں بولی تھی مناہل سے جھکا سر اٹھایا نہیں جا رہا تھا۔ وہ اسے کچھ بتا سکتی تھی۔ وہ اس کی بچپن کی سہیلی تھی مگر پھر بھی اسی نے تطہیر کے ساتھ جو کیا تھا اور تطہیر نے اس کے ساتھ جو کیا تھا وہ اسے نہیں بتا سکتی تھی۔ وہ اسے اپنے گھر میں لائی تھی اور پھر اسی نے اسے اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔ اگر وہ یہ بات ماریہ کو بتا دیتی تو پھر سوال جو ماریہ کے ذہن میں آتا 'وہ' ''کیوں؟'' ہوتا اور وہ ماریہ کے کسی ''کیوں؟'' کا جواب نہیں دے سکتی تھی۔ اس صورت میں ہر راز سے پردہ اٹھ جاتا اور یہی وہ نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس شخص کی سیکنڈ چوائس تھی جسے اس نے اپنی زندگی میں ہمیشہ پہلا درجہ دیا تھا۔ یہ بات سب جانتے تھے کہ ماریہ اس کے ماں باپ اس کے سب دوست اور حتیٰ کہ صفوان بھی۔

اس نے سیف اللہ کا فون آنے کے بعد صفوان کو فون کر دیا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ قبرستان گئے تھے۔ شہر سے قدرے دور واقع اس قبرستان میں تطہیر کو جگہ صرف اس وجہ سے مل سکی کہ اس کی تدفین میں حصہ لینے والوں میں ایک انسپکٹر موجود تھا وگرنہ شاید اسے اس قبرستان میں جگہ بھی نہ مل پاتی۔

''میں نے اسے سمجھایا تھا کہ یہ تمہارا آخری ٹھکانہ ہے۔ یہاں سے کہیں اور مت جانا۔ اس گھر کو اتنی آسانی سے مت چھوڑنا۔'

قبرستان کی طرف ڈرائیو کرتے ہوئے صفوان کی زبان پہ ایک یہی فقرہ تھا۔ اس نے مناہل کو کوئی وضاحت دینے کی کوشش نہیں کی تھی اور اس چیز نے اسے اندر سے مزید توڑ ڈالا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے صفوان کو تطہیر رحمان کی کچی قبر پر زاروقطار روتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ شاید اس موت پہ اتنا سوگ نہ مناتی اگر وہ اس شخص کو اس طرح روتے نہ دیکھتی۔ اس کے اندر احساس جرم بڑھنے لگا تھا۔ اگر وہ تطہیر کو اپنے گھر سے نکل جانے کے لیے نہ کہتی تو شاید حالات آج مختلف ہوتے۔ وہ اس لیے تکلیف میں تھی کیونکہ صفوان تکلیف میں تھا اور وہ ماریہ کو نہیں بتا سکتی تھی کہ صفوان تکلیف میں کیوں ہے۔ اسے لگنے لگا تھا وہ شاید سر اٹھا کر اب کبھی دنیا کا سامنا نہیں کر پائے گی۔

سومنات کے مندر پہ کئی حملے ہوئے تھے۔ مگر جان لیوا حملہ آخری ہی تھا۔ بالکل اسی طرح تطہیر کے ساتھ زیادتی کرنے والے لوگ بہت زیادہ تھے مگر آخری زیادتی مناہل مرتضیٰ نے کی تھی۔ اسے تطہیر کو اپنے گھر سے رات کے اس پہر نہیں نکالنا چاہیے تھا۔ اس نے اپنے قریب بیٹھی ماریہ کو دیکھا۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''ماریہ! میں نے تطہیر کو مار ڈالا۔ میں اسے یہاں سے چلے جانے کے لیے نہ کہتی تو وہ کبھی نہ مرتی۔''

وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ ماریہ کو اس کی بات پر خاص حیرانی نہیں ہوئی تھی۔

''تم نے اسے یہاں سے جانے کے لیے کہہ دیا تھا؟'' وہ استفسار کر رہی تھی۔ مناہل اس بات کا جواب کیا دیتی۔

''کیوں؟'' توقع کے عین مطابق ماریہ نے دوسرا سوال یہی کیا تھا اور اس سوال کا جواب مناہل مر کر بھی نہیں دے سکتی تھی۔ وہ کسی کو کیسے بتا دیتی کہ وہ ''ان چاہی'' ہے۔''

''ویل...... اگر ایسی کوئی بات ہے بھی تو تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم نے اس کے لیے کیا نہیں کیا وہ ایک گنہگار عورت تھی اور تم نے اس کی کتنی مدد کی۔ تم نے اسے اپنے گھر میں پناہ دی۔ وہ حرکت جو اس نے کی تھی اس کی سزا موت سے کم تو نہیں ہوگی اور پھر بھی تم اس عورت کے لیے اتنا زیادہ رو رہی ہو۔''

وہ ناصحانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔ مناہل کی آنکھ سے آنسو ٹپکے۔

''کون سی غلط حرکت؟'' اس نے ایک بار پھر سر جھکاتے ہوئے پوچھا۔

''ارے...... اتنی جلدی بھولنے والی بات تو نہیں۔ قرآن پاک شہید کر ڈالا تھا اس نے۔''

وہ تحیر سے بولی۔

''Blasphemy (اللہ کی بے ادبی) کتنا بڑا گناہ ہے۔'' وہ مناہل کے چہرے پر چھائی زرد خزاں کو



گھورتے ہوئے بولی۔

''Blasphemy of life (زندگی کی بے ادبی) بھی بہت بڑا گناہ ہے۔ اور......'' اس نے خلا میں ایک نادیدہ نقطے کو گھورتے ہوئے کہا۔ ماریہ کو لگا جیسے وہ اپنے حواس کھو چکی ہے۔ اور بے تکی باتیں کرنے میں مصروف ہے۔

''ماریہ! اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ بہت اچھی مسلمان تھی۔ وہ شراب پی کر قرآن پاک کی بے حرمتی کیسے کر سکتی تھی۔ اسے اللہ تعالیٰ سے بہت سے شکوے تھے۔ ایسے شکوے جیسے ہم سب کرتے رہتے ہیں۔ اپنائیت بھرے محبت بھرے۔ اس کا تو اللہ کے سوا کوئی بھی نہیں تھا اسی لیے وہ اللہ سے شکوے ضرور کرتی تھی مگر وہ مشرک نہیں تھی وہ گنہگار نہیں تھی۔''

اس نے سچ اگلا تھا اور یہ سچ اسے سیف اللہ نے بتایا تھا۔ ''وہاں دارالامان میں عورتوں سے ایسے کام کروائے جاتے ہیں جو انسانیت کے خلاف ہوتے ہیں۔ تطہیر نے یہ سب کرنے سے انکار کر دیا تھا اسی لیے وہاں کے حکام اسے ٹارچر کرتے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ یہ ساری باتیں اور ثبوت پولیس کو فراہم کر دے گی اسی لیے...... اسی لیے ماریہ! صفیہ صفدر نے اسے آفس بلا کر ہراساں کیا تھا کیونکہ دارالامان میں ایک فنکشن ہونے والا تھا جس میں کچھ بڑے سیاستدان اور مخیر حضرات آنے والے تھے۔ وہ ڈونیشن کے لیے اس فنکشن کو خراب نہیں کرنا چاہتی تھی مگر تطہیر نے سب گڑبڑ کر دی۔''

مناہل سانس لینے کو رکی پھر بولی۔

''اس فنکشن والے روز سب کے بیچ کھڑے ہو کر سب باتیں کہہ ڈالیں۔ اسے خاموش کروا دیا گیا تھا مگر بعد میں صفیہ صفدر نے بدلہ لینے کے لیے جان بوجھ کر صحیفہ کی بے ادبی کروائی۔ اس کو بے ہوشی کی دوا ملا کر کھانا کھلا دیا۔ عورتوں کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ زمین پر پڑی ہے اور اس کے گرد مقدس کتاب کے صفحات زمین پر پڑے ہیں۔ سب ہی عورتیں جانتی تھیں کہ اسے اللہ میاں سے چیخ چیخ کر شکوے کرنے کی عادت ہے اور بہت سی عورتیں اس کی حرکت سے عاجز تھیں۔ انہوں نے اسے مشرک قرار دیا تھا اور وہاں سے وہ حوالات آ گئی تھی۔''

وہ خاموش ہو گئی اور ماریہ تو جیسے شاکڈ تھی۔ جب سیف اللہ نے یہ ساری باتیں مناہل کو بتائی تھیں تب مناہل کی بھی یہی حالت تھی کہ تطہیر رحمان بری تھی اور اس نے اگر اس کے ساتھ برا کیا تھا تو وہ اسی مستحق تھی۔

''پولیس اسٹیشن سے تم اسے اپنے گھر لے آئی تھیں مسز شہلا کے کہنے پر ان کو اس سے کیا غرض تھی؟''

ماریہ کے سوال شروع ہو چکے تھے اور ان ہی سوالات کے جواب مناہل اسے نہیں دے سکتی تھی۔ وہ اس سے زیادہ کچھ بتا بھی نہیں سکتی تھی۔ ماریہ نے بھی یوں ہی سوال کیا تھا اسے شاید جواب چاہیے بھی نہیں تھا۔

''سب کچھ سن کر عجیب سا لگتا ہے جیسے ایک کہانی سن رہے ہوں۔'' ماریہ نے رائے دی۔ مناہل نے گہری سانس بھری...... پھر وہ بولی۔

''کہانی بننے سے کہانی سننا بہتر ہے۔''

ماریہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اس کی آنکھوں میں پھر سوال تھا مگر مناہل کے پاس جواب دینے کے

لیے الفاظ نہیں تھے۔ وہ اسے نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ کس طرح تطہیر رحمان کی کہانی کا حصہ بن گئی تھی۔

''دعا کرو ماریہ! میرے لیے دعا کرو مجھے سکون مل جائے۔''

اس نے گھٹنوں پہ سر رکھتے ہوئے التجائیہ انداز میں کہا تھا۔ ماریہ دعا کے علاوہ کچھ اور کر بھی نہیں سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

''تمہیں...... سب پتا چل گیا تھا نا؟''

وہ سر جھکائے پوچھ رہا تھا۔ مناہل کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے شرمندہ تھے اور وہ دونوں اس سے بھی شرمندہ تھے جس کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے آئے تھے۔ مناہل کو امید نہیں تھی کہ صفوان یہ ذکر اس طرح سے چھیڑ دے گا۔ وہ خاموش ہی رہی۔ وہ جانتا تھا کہ نشے کی حالت میں وہ بہت کچھ مناہل کو بتا چکا ہے۔

''میں نے کبھی کچھ چھپانا نہیں چاہا مناہل! کبھی بھی نہیں۔ میں آپ کو سب بتانا چاہتا تھا...... مگر...... مجھے...... یقین کریں مناہل! سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں یہ بات کس طرح کروں۔؟''

وہ ''تم'' سے ایک بار پھر ''آپ'' پر آ گیا تھا۔ یہ اس کی ذہنی حالت کے انتشار کو ظاہر کر رہا تھا۔

''آپ کو مجھ سے آل ریڈی کچھ شکایتیں تھیں۔ مجھے احساس تھا کہ میں بھی کبھی...... آپ کو...... میرا مطلب...... آپ اکثر خود کو نظر انداز کیا جانا محسوس کرتی تھیں۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بات کر رہا تھا۔

''آپ کو تطہیر سے محبت تھی؟'' کچھ سوالات کے جوابات ہمیں پتا ہوتے ہیں مگر پھر بھی ہم کلاس روم میں انہیں بار بار پوچھتے ہیں۔ مناہل نے ایک ایسا سوال ہی کیا تھا۔ صفوان کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے دھیرے سے اقرار کیا۔

''ہاں...... بہت...... میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔''

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا اور اب بولنے کو رہ کیا گیا تھا۔

''میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے اسے پروپوز کیا تھا مگر...... اس لڑکی کو میرا یقین نہیں تھا۔ وہ سمجھتی تھی، میں اس سے ہمدردی کے لیے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اسے لگتا تھا میں اس کی ماں کے احسانات کا بدلہ چکانا چاہتا ہوں۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ مجھے کسی نے مجبور نہیں کیا تھا۔ میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ مام کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا' حالانکہ وہ ان کی سگی بیٹی تھی مگر انہیں اس کے وجود سے شرم آتی تھی۔ وہ اپنے حلقہ احباب میں اسے متعارف کروانے سے شرماتی تھیں اور یہ بات تطہیر کو بہت اچھی طرح سے پتا تھی۔ وہ اس خیال سے پیچھا چھڑا ہی نہیں پائی تھی۔''

مناہل خاموشی سے سب سن رہی تھی۔ اسے دھیرے دھیرے اپنی بدقسمتی کا یقین آتا جا رہا تھا۔ حالانکہ وہ لڑکی جو زندگی بھر اپنی قسمت کو روتی رہی تھی' اس کے سامنے قبر میں ابدی نیند ہو رہی تھی۔



''اس کی ایک بُری عادت تھی ناشکری کی عادت۔ اسے کسی چیز کے لیے شکر ادا ہی نہیں کرنا آتا تھا۔ میں اسے بہت سمجھایا کرتا تھا مگر وہ شاید سمجھنے کی حد سے آگے نکل چکی تھی۔ وہ اپنی ہر کمی کو اپنے سر پر سوار کر کے اسے اپنے اوپر حاوی کر لیتی تھی۔ یوں تو مناہل! جو انسان شکر نہ کر سکے پھر وہ کچھ کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ تطہیر کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ اسے لگتا تھا وہ بہت بدقسمت ہے۔ حالانکہ وہ خوش قسمت تھی۔ وہ چلی گئی ہے مگر اپنے پیچھے کتنے بہت سے لوگوں کو روتا چھوڑ گئی ہے۔ ایسے لوگوں کو جن سے اس کا کوئی رشتہ ہی نہیں تھا۔''

وہ گہری سانس بھر کر بولا...... اس کا اشارہ مناہل کی طرف تھا۔

''مام کو ڈاکٹر نے بریسٹ کینسر بتایا ہے۔'' اس نے ایک اور اطلاع دی۔ مناہل شاکڈ رہ گئی۔

''وہ اسی لیے امریکہ گئی تھیں۔ یہ بات مجھے خود کچھ دن پہلے پتا چلی ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنے چیک اپ کے لیے امریکہ جا رہی ہیں۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ وہ لڑکی جو ان کی سگی بیٹی تھی' وہ مر چکی ہے۔ مام رو رہی تھیں۔ میں جانتا ہوں وہ اپنے لیے رو رہی تھیں۔ انسان خود مرنے والا ہو تو اسے مرے ہوؤں پر رونا آ ہی جاتا ہے۔''

وہ بہت لاتعلق ہو کر بات کر رہا تھا۔ شاید اس کی سوتیلی ماں کا یہی حق تھا۔

''میں نے انہیں آپ کے بارے میں بتا دیا تھا' وہ آپ سے شرمندہ ہیں مناہل! اور میں بھی۔''

اس کی بات پر مناہل نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''میں صرف آپ ہی سے شرمندہ ہوں کیونکہ میں نے صرف آپ کے ساتھ زیادتی کی' تطہیر کے ساتھ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ وہ کہتی تھی کہ اللہ اس کی مدد نہیں کرتا۔ آپ بتاؤ مناہل! اور مدد کیسی ہوتی ہے۔ کیا اللہ خود زمین پر آتا ہے مدد کے لیے؟ وہ انسانوں کو ہی وسیلہ بناتا ہے۔ میں نے تطہیر سے کہا تھا کہ میں اس کے لیے وسیلہ بنوں گا۔ میں اس کی زندگی سے ہر خار چن کر اسے گلاب بنانے کو تیار تھا۔ اگر وہ مجھ پر یقین کرتی...... مگر......''

اس نے پھر ٹھہر کر گہری سانس بھری۔

''اس نے اپنی سگی ماں کی زیادتی کی سزا ان کے سوتیلے بیٹے کو دی۔ اگر وہ مجھ پر اعتبار کرتی تو شاید آج حالات مختلف ہوتے۔ وہ جب ہمارے گھر پہ تھی تب اتنی بیمار نہیں تھی۔ میں نے خود اس کے ٹیسٹ کروائے تھے۔ وہ نامکمل ٹیسٹ کروا پائی تھی مگر تب ڈاکٹر نے اس کی بیماری کی کچھ اور وجہ بتائی تھی۔ وہ میرے پاس رکتی تو اس کا علاج ہو سکتا تھا مگر......''

وہ پھر خاموش ہو گیا۔ اس کی زندگی میں بہت سے اگر مگر آ چکے تھے۔ مناہل کیا کہتی' وہ خاموش ہی رہی۔

''میں یہ نہیں کہتا کہ میں اسے جلد بھول جاؤں گا مگر میں کوشش ضرور کروں گا۔ آپ اپنی مرضی سے جو فیصلہ کریں گی' میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ اگر آپ خود یہ انگوٹھی نہیں اتار سکتیں اور آپ کو کچھ اندیشے ہیں تو آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ میں خود انکار کر دیتا ہوں۔''

مناہل کا دل کٹ کر رہ گیا...... وہ ایک کو کھو چکا تھا اور دوسری کو کھونے کی تیاری کر رہا تھا۔ کتنے بہت سے لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ مناہل نے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا...... اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ قسمت کس طرح ہم سب کو اپنے چکر میں جھولا جھلانے کی کوشش کرتی ہے۔

غلطی کی سزا غلط کو دی جاتی ہے' مجبُور کو نہیں اور وہ صفوان کو مجبُور سمجھتی تھی' غلط نہیں۔ جو ہو چکا تھا وہ بھلانا آسان تھا مگر کوشش کر کے اسے آسان بنایا جا سکتا تھا۔ اس نے صفوان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''میں اس رنگ کو اپنی انگلی سے کبھی نہیں اتاروں گی۔''

اس سے زیادہ واضح اقرار وہ نہیں کر سکتی تھی۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا...... مگر وہ مسکرائے نہیں تھے، لیکن شاید قبر میں لیٹی تطہیر ضرور مسکرائی تھی۔ صفوان اور مناہل نے اس کی قبر کے ساتھ بنی اینٹوں کی ٹوٹی روش پر قدم رکھ کر باہر کی سمت چلنا شروع کر دیا۔ نماز عصر کا وقت ہو چلا تھا۔ اور قبرستان میں سناٹے کا راج دھیرے دھیرے قائم ہونے لگا تھا۔ سناٹا جو ہر جگہ خاموش ہوتا ہے مگر قبرستان میں جو ہمہ وقت بولتا ہے' وہ سناٹا ہی ہے۔ شام کے سائے منڈلائے تھے اور سناٹے کو بولنے کے لیے ایک ساتھی مل گیا تھا۔ آج قبرستان میں ایک ہی موضوع کی بازگشت تھی۔

''تطہیر رحمان کیا تھی' خوش قسمت یا بدقسمت؟''

سناٹا اور شام بھی اسی کی باتیں کر رہے تھے اور صفوان اور مناہل بھی۔ اول الذکر قبرستان سے باہر جا چکے تھے۔ یہ آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے لیکن تطہیر رحمان کو اب کہیں نہیں جانا تھا۔ اسے طویل عرصے کے لیے مستقل ٹھکانہ مل چکا تھا۔ تطہیر رحمان جس نے ہمیشہ خود کو ایک Pipsqueak (بے قدر) سمجھا تھا۔ حالانکہ دنیا میں اللہ کی بنائی کوئی چیز Pipsqueak نہیں ہو سکتی۔ سناٹا بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا اور شام بھی۔ انہوں نے تطہیر کی قبر کی طرف دیکھتے ہوئے تاسف سے سر ہلایا تھا۔ وہیں کہیں خزاں زدہ درخت کے زرد پتے نے یہ بات سنی۔ اس نے گرتے ہوئے ان دونوں کی گفتگو میں مداخلت کی تھی۔

''جبر کو صبر سے برداشت کرنے والوں کے لیے صرف قبر ہی رہ جاتی ہے۔''

# یہی میرا حوالہ ہے

''برصغیر کی تقسیم ہی غلط تھی۔''

قانتا راج نے اپنے چہرے پر بکھرے بھورے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر کلپ میں جکڑتے ہوئے بہت نزاکت سے کہا۔ آمنہ کے چہرے پر ناگواری اور پیشانی پر شکنوں کا اضافہ ہوا۔ رگوں میں بہتے خون کی روانی میں تیزی آئی اور کنپٹیوں پہ ہلکا ہلکا دباؤ محسوس ہونے لگا۔ قانتا راج پال جو سلیولیس شرٹ اور ٹائٹ جینز میں ملبوس تھی' نے اپنے دودھیا برہنہ بازو سامنے میز پر پھیلائے اور پھر اپنی دھن میں مگن بولی۔

''ہمارے بزرگ اس بات کی مخالفت کرتے رہے۔ ہماری تاریخ کی کتابوں میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے اور ہم سب بھی اس کا ذکر کرتے ہے اور ہم سب بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ برصغیر کی تقسیم فقط جغرافیائی تقسیم نہیں تھی بلکہ اس تقسیم نے دلوں کو تقسیم کر ڈالا۔''

''واٹ داہیل! شی از ٹاکنگ اباؤٹ......''

(یہ کیا بکواس کر رہی ہے)

آمنہ کی جذباتی اور حساس طبیعت اس سے زیادہ نہیں سن سکتی تھی۔ وہ نہایت ناگواری سے بول اٹھی جبکہ اس کی بات ابھی ادھوری تھی کہ ''شش...... شش......'' کی آوازں اور شور نے اسے خاموش ہو جانے پر مجبُور کیا۔

''شش...... وہ ہمارے مہمان ہیں...... کول ڈاؤن اینڈ کمپوز یور سیلف۔'' (خود پر قابو رکھو)

اس کے بالکل ساتھ بیٹھی مدیحہ اقتدار نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سرگوشی میں اسے سمجھایا تھا۔

''ڈی جی صاحب نے خصوصاً تاکید کی تھی کہ بحث طلب معاملات کو ڈسکس نہیں کرنا۔''

اس کے بائیں جانب بیٹھے مصطفیٰ کمال تارڑ نے بھی مدیحہ کے سے انداز میں اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے یاد دلانے کی کوشش کی' جبکہ مصطفیٰ کے ساتھ بیٹھی سمیرہ سہگل ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ آمنہ نے حیرت سے اپنے ہم وطنوں' ہم عمروں اور ہم جماعتوں کی جانب دیکھا۔ اس نے بحث طلب معاملات شروع نہیں کیے تھے۔ یہ اس کے سامنے بیٹھی معزز مہمان کی کارستانی تھی۔ قانتا راج پال اگر اس طرح کی بات نہ کرتی تو وہ کبھی اس طرح غصے میں نہ آتی مگر اس کی رو میں بیٹھے اس کے ہم وطن اس بات کی مخالفت کر رہے اور چاہ رہے تھے کہ وہ خاموش رہے۔

آمنہ خاموش ہوگئی تھی مگر اس کے جذبات میں ایک اتھل پتھل شروع ہو چکی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک عمر رسیدہ ٹھہری مدبر سی آواز گونجی تھی۔ اسے یاد آنے لگا تھا کہ اس کی ایک ''بے ضرر'' سی بات پر کسی کو کتنا غصہ آ گیا تھا۔

''جب کوئی یہ کہے کہ آپ کو پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا اور آپ کا وجود ایک غلطی ہے تو کیا آپ کو غصہ نہیں آئے گا۔ مجھے بھی غصہ آتا ہے' جب کوئی پاکستان کے قیام کو غلطی قرار دیتا ہے کیونکہ میرا وجود اور میری نسل کی بقا پاکستان کے وجود سے قائم ہے۔''

اسے یاد آیا تھا کہ ایک بار کچھ ''معصوم'' سی باتیں کرنے پر کسی کی خفگی بھری آواز میں یہ سب سننا پڑا تھا۔ وہ تب سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے خاموش ہوئی تھی مگر آج وہ سر جھٹک سکی تھی نہ مسکرا سکی تھی۔ آج اسے مجبوراً خاموش ہونا پڑ رہا تھا۔ قانتا راج پال اپنی لمبی گردن کو رعونت سے ادھر ادھر گھماتے ہوئے مسلسل بول رہی تھی۔

''مجھے یہ بتائیے کہ اس تقسیم کا' اس دراڑ کا فائدہ کیا ہوا۔ دو بھائی آپس میں دشمن ہوگئے' دلوں کا بٹوارہ ہوگیا۔ آپ ہمارے لیے' ہم آپ کے لیے اجنبی بن گئے۔ دو بھائیوں کی لڑائی میں چھوٹے بھائی کا نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ آپ لوگ جانتے ہی ہیں کہ آپ کا زیادہ نقصان ہوا۔

تجارتی راستے بند ہوگئے' معاشی ترقی میں رکاوٹ آگئی' نہایت سستی اشیاء نہایت مہنگے داموں ملنے لگیں۔''

وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش ہوئی پھر اپنی دائیں اور بائیں جانب پڑے پانی کے گلاس کو بائیں ہاتھ سے پکڑ کر پانی کا گھونٹ بھر کر بولی۔

''ان باتوں کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ آج ہمیں اس صدی میں ان لڑائی جھگڑوں کو ختم کر کے آگے بڑھنا ہوگا تاکہ آئندہ نسلیں محبت کی چھاؤں میں پروان چڑھیں۔''

آمنہ نے ایک بار پھر اپنے دائیں بائیں جانب بیٹھے لوگوں کو دیکھا۔ پاکستان بھر سے یہ پچاس ذہین ترین اسٹوڈنٹس اکٹھے ہوئے تھے مگر کیا کسی میں اتنی جرات کلام بھی نہیں تھی کہ کوئی قانتا راج پال کی بات کا جواب دے دیتا۔ وہ سب لوگ قانتا راج پال کی اس بات پر میز کی سطح پر ہاتھ مار مار کر



اسے داد دینے لگے۔

''کاش یہ ہاتھ قانتا راج پال کے سر پر پڑ رہے ہوتے۔'' آمنہ نے دل ہی دل میں سوچا۔

''دماغ کے فیصلے دل کی مشاورت سے طے ہونے چاہئیں۔ جو قومیں دماغ و دل کی اس باہمی مشاورت کو ترک کر دیتی ہیں' وہ کمزور ہو جاتی ہیں' ان کے دماغ کام کرنا بند کر دیتے ہیں اور ان کے دلوں پر قفل لگ جاتے ہیں۔ انہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ ہاتھ کا استعمال کس جگہ کرنا ہے اور زبان کا کس جگہ۔''

اس کے ذہن میں ایک بار پھر کچھ الفاظ گونجے تھے۔ اس نے ایک بار پھر گہری سانس بھری تھی۔ وہ بولنا چاہتی تھی' وہ قانتا راج پال کو کھری کھری سنانا چاہتی تھی مگر اس کے کندھے پر ابھی بھی مدیحہ اقتدار کا ہاتھ تھا۔ اسے مصطفیٰ کمال تارڑ کی آنکھوں میں ابھی بھی تنبیہہ نظر آ رہی تھی اور سمیرہ سہگل کے ہونٹوں پر رکھی انگلی اسے ابھی بھی ''شٹ اپ'' کہتی محسوس ہو رہی تھی۔

''ہمارے ساتھ دشمنی رکھنے کا فائدہ کیا ہے۔ ہمیں دوست بنا کر آپ ہمیشہ کے لیے جنگ کے خطرات سے آزاد کیوں نہیں ہو جاتے۔ اس چخ چخ' پخ پخ سے چھٹکارا ملے گا تو ساری قوم پرسکون ہو جائے گی۔ وہ رقم جو آپ کی حکومت دفاع پر خرچ کرتی ہے' وہ آپ کی بھلائی پر خرچ ہونے لگے گا۔ آپ کی اکانومی تیزی سے ترقی کرنے لگے گی۔ آپ پانچ کے بجائے پچیس روپے کی بچت کرنے لگیں گے۔ آپ کو آلو بیس نہیں' دو روپے کلو ملے گا۔ آپ ادویات پر ایک ہزار کے بجائے پانچ سو روپے خرچ کرنے لگیں گے۔ آپ پچاس ہزار میں برانڈ نیو کمپیوٹر نہیں خریدیں گے کیونکہ وہ آپ کو پچیس ہزار میں ملنے لگے گا۔ آپ کو ایک لاکھ کی سوزوکی ستر ہزار میں ملے گی۔''

رادھیکا پٹیل نے نہایت اعتماد سے وہ تفصیلات بیان کیں جو وہ گھر سے چلتے وقت رٹ کر آئی تھی۔ ہال میں ایک بار پھر میز کی سطح پر رکھے ہاتھ تھرکنے لگے۔ قانتا راج پال' رادھیکا پٹیل' سونی سوریش' آنند اگروال' ساحر کمار اور ان کے بقیہ پنتالیس ہم وطنوں' ہم جماعتوں' ہم عمروں کے چہروں پر ایک ایسی مسکراہٹ بھری تھی جس نے آمنہ کا دل جلا کر رکھ دیا تھا مگر اس کے ساتھی تالیاں پیٹ رہے تھے۔ وہ سب کے سب اپنی اپنی فیلڈ کے ماہر تھے۔ انہیں ملک بھر کی یونیورسٹیز' کالجز اور دوسرے اداروں سے یہاں جمع کیا گیا تھا تاکہ وہ ہمسایہ ملک سے آئے ہوئے اپنی ہی طرح کے ان پچاس اسٹوڈنٹس کے ساتھ ''گپ شپ'' لگا کر خیر سگالی جذبات اور امن و محبت کی فضا کو مزید سازگار کرنے میں مدد دے سکیں جو ان ہی کی طرح اپنی اپنی فیلڈ میں ایک الگ مقام رکھتے تھے۔

آمنہ کو قائداعظم یونیورسٹی آئی آر ڈپارٹمنٹ سے بلوایا گیا تھا۔ وہ تھرڈ ایئر' پوزیشن ہولڈر اور ایک بہترین مقرر تھی۔ اس نے سارک ممالک کی طرف سے آرگنائز کیے گئے ساؤتھ ایشیا کوئز مقابلوں میں اپنی ٹیم کو گولڈ میڈل دلوانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس نے آئی آر میں پہلے دو سمسٹر

میں ٹاپ کر کے ایک پرانا ریکارڈ برابر کیا تھا۔ اسے گفتگو میں کمال حاصل تھا۔ وہ جب اپنے مخصوص انداز میں بولتی تھی تو ایک زمانہ سننے کے لیے تیار ہو جاتا تھا مگر آج یہاں اس کانفرنس روم میں وہ خاموش بیٹھی تھی۔ اسے بولنا چاہیے تھا مگر وہ نہیں بول رہی تھی اور اسی پر کیا موقوف' وہاں بیٹھے سب لوگ اس کی طرح نہایت شاندار اکیڈمک ریکارڈ رکھتے تھے۔ وہ سب آمنہ کی طرح گھنٹوں بلا تکان بول سکتے تھے مگر وہ سب بھی خاموش تھے۔

آمنہ کے برعکس وہ مسرور دکھائی دے رہے تھے' ان کے چہروں پر سکون و اطمینان تھا۔ وہ اپنے سامنے بیٹھے پچاس لوگوں سے انتہائی مرعوب دکھائی دے رہے تھے۔ آمنہ کو ایک عجیب سی بے چینی نے گھیر لیا۔ اس کے دل و دماغ پر کچھ یادیں دستک دینے لگی تھیں۔

''ہر قوم کی نئی جوان نسل اس قوم کا غرور ہوا کرتی ہے۔ کیا تم اس قوم کا غرور ہو؟''

☆ ☆ ☆

''ہر قوم کی نئی جوان نسل اس قوم کا غرور ہوا کرتی ہے۔ کیا تم اس قوم کا غرور ہو؟''

دادو کی گرجدار آواز نے اسے اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑے ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ریموٹ اس کے ہاتھ سے پھسل کر زمین پر گر پڑا۔ دادو کمرے کے عین وسط میں کھڑے انتہائی غیض و غضب کے عالم میں اسے گھور رہے تھے۔ آمنہ نے اپنی تیرہ سالہ زندگی میں پہلے کبھی انہیں اتنے غصے کی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے زمین پر گرا ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی بند کر دیا۔ اسے ان کی آمد کا بالکل بھی پتا نہیں چلا تھا۔ وہ دس پندرہ منٹ قبل اپنے کسی دوست سے ملاقات کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ وہ جب کسی دوست سے ملنے جاتے تھے تو پھر دو ڈھائی گھنٹے بعد ہی واپسی ہوتی تھی۔ ان کی غیر موجودگی کا یقین کرتے ہوئے ہی آمنہ نے ٹی وی پر ہندی قومی چینل دور درشن ٹیون کیا تھا۔ کسی فلم کے گیت دکھائے جا رہے تھے۔ اس نے اپنی ایک فرینڈ کے گھر بھی پہلے کبھی یہ گیت اسٹیریو پر سن رکھے تھے' وہ ٹی وی کا والیوم فل کر کے اطمینان سے کاؤچ پر ٹک گئی۔

جب کوئی بات بگڑ جائے' جب کوئی مشکل پڑ جائے
تم دینا ساتھ میرا او ہمنوا

یہ گانا اسے بہت پسند آیا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں ساتھ ساتھ گنگنانے لگی تھی اور یہی برا وقت تھا جب دادو نے چھاپہ مار کر اسے رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا تھا۔'' انہوں نے آمنہ کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''دادو! دراصل یہ بہت اچھا گانا ہے۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ میں بس...... وہ......''

آمنہ منمناتے ہوئے بولی تھی۔

''یہ بہت اچھا گانا' جو تمہیں کہا تھا کہ تم انڈین فلمیں دیکھو گی نہ انڈین فلموں کے گانے



سنو گی مگر تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آتی۔ تمہاری نظر میں میری کوئی عزت نہیں ہے۔ تم سمجھتی ہو یہ بڈھا آدمی پاگل ہے جو بلاوجہ بکتا رہتا ہے۔ تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے آمنہ!''

وہ غضب ناک لہجے میں بولے۔ ان کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ تیرہ سالہ آمنہ کے لیے ان کا یہ روپ بہت حیران کن تھا۔ اس قدر مشفق اور اس قدر مہربان ہستی کا اتنے جلال میں آ جانا اور وہ بھی صرف اتنی سی بات پر۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی' اسے کبھی کسی نے اس طرح نہیں ڈانٹا تھا۔ اس کے ابو کے انتقال کے بعد تو وہ دادو کی بھی بہت چہیتی ہو گئی تھی۔ اس کی بہتر تعلیم و تربیت کے لیے ہی وہ جہانیاں جیسا چھوٹا سا شہر چھوڑ کر مستقل لاہور آ گئے تھے۔ انہیں اپنی اس اکلوتی پوتی سے بہت محبت تھی' وہ اس کی آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں کر سکتے تھے مگر اس لمحہ نجانے انہیں اتنا برا کیوں لگا تھا کہ وہ اپنے رویے کی تلافی کرنے اور اسے منانے کے بجائے جھکے ہوئے کندھوں کے ساتھ خاموشی سے اپنی خوابگاہ کی سمت چل دیے۔ آمنہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

''میں دادو سے کبھی بات نہیں کروں گی۔''

اس نے روتے روتے کئی مرتبہ یہ عزم دل میں دہرایا تھا۔ اسے بھی دادو سے بہت محبت تھی وہ اپنی امی سے زیادہ ان سے بے تکلف تھی۔ ان کی وجہ سے اسے ابو کے بعد بھی ابو کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ جب جہانیاں سے چند ماہ قبل لاہور شفٹ ہوئے تھے تو دادو نے اسے بہت سی نصیحتیں کی تھیں۔ انہیں اس بات کی بہت فکر رہتی تھی کہ آمنہ کی تربیت بہت اچھی ہونی چاہیے۔ وہ اسے پوری قوم کے لیے قابل فخر بنانا چاہتے تھے' اسی لیے بہت چھوٹی عمر سے انہوں نے اس کے دل میں ملک و قوم کی محبت پروان چڑھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے اصول اسے ازبر کروانے شروع کر دیے تھے۔ وہ اسے قیام پاکستان اور ہجرت کے وقت کے ظلم و بربریت سے بھرے واقعات سنا کر اس کے دل میں اپنے وطن کی محبت و افادیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کیا کرتے جو ان کے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئے تھے مگر آمنہ کے لیے یہ سب پرانے دور کی کہانیاں تھیں۔

''تم کیا جانو' زمین کے اس خطے کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں کیا کیا کھونا پڑا تھا۔''

دادو اکثر اوقات کوئی پرانا قصہ سنانے کے لیے اپنی اس نئے زمانے کی پوتی کے سامنے یہی فقرہ دہراتے تھے۔ آمنہ ان کی بات اس وقت تو دھیان سے سنتی مگر چند دن بعد بھول جاتی۔

اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ قیام پاکستان کے لیے کتنی مشکلات اٹھانی پڑی تھیں۔

اسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ قیام پاکستان کے وقت فوجی ساز و سامان کی تقسیم میں کیا دھاندلی ہوئی؟

مسلمان فوجیوں کو کس طرح برصغیر کے دور دراز علاقوں میں غیر ضروری مشن پر بھیج دیا گیا؟
مہاراجہ گلاب سنگھ نے کشمیر کے لیے انگریزوں سے کیا ساز باز کی؟
کس مسلمان اکثریت والی ریاست کو کس طرح ہندوستان سے ملحق کر دیا گیا؟
مسلمان مہاجرین کی منتقلی کے لیے ناکارہ پرزوں والی ٹرینیں کیوں فراہم کی گئیں؟ بٹالہ میں کیا ہوا؟ امرتسر میں راستے بلاک کیوں کر دیے گئے؟
سکھوں کی کرپانیں سرعام برہنہ کیوں ہونے لگیں؟
مسلمان لڑکیاں اور عورتیں اپنے باپ بھائیوں اور شوہروں کے ہاتھوں کیوں ذبح کر دی گئیں؟

نالیوں اور گٹروں میں گندے پانی کے بجائے لاشیں کس طرح بہنے لگیں؟ مسلمان بوڑھوں کو گلیوں میں پڑے تعفن میں زندہ کیوں دفن کیا جانے لگا؟ مسلمان بچے ایک دوسرے کی غلاظت کھانے پر کیوں مجبور ہوئے؟

وہ بچپن سے لے کر لڑکپن تک اس قسم کے واقعات سنا کرتی تھی۔ اسے دادو کی باتوں سے الجھن نہیں ہوتی تھی کیونکہ اسے انہیں سننا اچھا لگتا تھا مگر کبھی کبھی اکتاہٹ ہونے لگتی۔ وہ کب تک یہی فرسودہ کہانیاں سن سکتی تھی۔ وہ لڑکپن سے نکل کر جوانی کی سرحد تک پہنچ رہی تھی۔ اسے بھی ان ہی چیزوں سے دلچسپی تھی جو اس کی عمر کی باقی لڑکیوں کی پسندیدہ تھیں۔

وہ ٹی وی پر آنے والے نت نئے پروگرام دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ ڈش کلچر سے مستفید ہونا چاہتی تھی اور دادو کو یہ باتیں پسند نہیں تھیں جبکہ آمنہ کو جہانیاں چھوڑ کر لاہور آنے میں صرف اس لیے کشش محسوس ہوتی تھی کہ وہاں پر ٹی وی کے نئے نئے پروگرام انجوائے کرنے کا موقع ملتا جبکہ جہانیاں میں تو وہ قومی چینل ہی دیکھ پاتی تھی۔ اس کے پاس اسٹیریو تھا مگر اسے کیسٹس دادو ہی لا کر دیتے تھے جو اسے پسند تو آتی تھیں مگر وہ اپنی فرینڈز کے گھر پر سنے گئے گانوں کو بھی سننا چاہتی تھی جو اس کے کلیکشن میں نہیں ہوتے تھے جبکہ دادو کو یہ بات سخت ناپسند تھی۔

دادو نے سختی سے کہا تھا کہ اگر ڈش انٹینا لینے کی ضد کرے گی تو دادو اسے لاہور سے دوبارہ جہانیاں لے جائیں گے اور یہی بات تھی جو آمنہ کو کسی بھی قسم کی ضد کرنے سے باز رکھتی تھی۔ وہ کسی صورت جہانیاں واپس نہیں جانا چاہتی تھی' اس لیے وہ دادو کی غیر موجودگی میں دوردرشن دیکھ کر دل بہلا لیتی جو لوکل ٹی وی پر بغیر ڈش انٹینا کے دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی فرینڈز بھی تھیں جن کے گھروں میں یہ سب ''سہولیات'' تھیں۔

وہ ان کے گھر جا کر اس قسم کی سہولیات سے مستفید ہو سکتی تھی اور وہ ہوتی بھی تھی جبکہ دادو کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی۔ آج جب دادو نے اسے ایک بے ضرر سا گانا سنتے دیکھ لیا تھا تو وہ اس



بڑی طرح ناراض ہو گئے تھے۔ آمنہ بھی ان سے ناراض تھی مگر وہ ان سے زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتی تھی' اسے انہیں منانے کا گُر آتا تھا۔ چائے کی ایک پیالی اور شرمندہ سی مسکراہٹ ان کی خفگی دور کر سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

'' پاکستان کے وسائل بھارت کی نسبت بے حد محدود ہیں' ان وسائل کے ساتھ ترقی کی منازل طے کرنا بہت مشکل ہے جبکہ آپ کو قومی خزانے کا بڑا حصہ جنگی آلات اور اس قسم کے دوسرے سامان کی درآمد پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اس قسم کی صورتحال میں ترقی یافتہ قوموں کی صف میں کھڑا ہونا کس طرح ممکن ہو گا؟''

ریتوورما کے شیریں لہجے میں کہے گئے تلخ الفاظ اسے ماضی سے حال میں گھسیٹ لائے۔ دادو کی خوابگاہ سے اس کانفرنس روم تک پہنچنے میں اسے آٹھ سال لگے تھے جبکہ دیوار پر لگے سنہرے وال کلاک نے صرف پندرہ منٹ گزرنے کی نشاندہی کی تھی۔ وہ ریتوورما کے الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھ نہیں پائی تھی اس لئے اس نے مدیحہ کی جانب دیکھا۔

ریتوورما کا فگر بہت زبردست ہے۔ یہ ایک پرفیکٹ ماڈل ہے۔ یقیناً یوگا کرتی ہو گی' میں اس سے یوگا کے کچھ ٹپس ضرور لوں گی۔''

آمنہ کو اپنی جانب متوجہ دیکھ کر وہ سرگوشی میں بولی تھی۔ مدیحہ اقتدار خود بھی کچھ عرصہ قبل بہت سے مشہور میگزینز کے لیے ماڈلنگ کر چکی تھی اور کیٹ واک میں اسے خاص مہارت حاصل تھی۔

اس نے گہری سانس بھر کر سامنے دیکھنا شروع کر دیا۔ کسی سے کچھ دریافت کرنے کا فائدہ ہی نہیں تھا۔ اس کے اردگرد مدیحہ اقتدار جیسے ''لبرل'' اور ''براڈ مائنڈڈ لوگ بیٹھے تھے۔ وہ لوگ جو ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر پاکستانی معیشت کی زبوں حالی کا رونا روتے تھے۔ وہ لوگ جو پیپسی کا خالی ٹن ہوا میں اچھال کر فلسطین پر اسرائیل کے مظالم کا ذکر کرنا پسند کرتے تھے اور وہ لوگ جو اپنی مرسیڈیز اور لینڈ کروزرز میں سڑکوں پر سگنل توڑ کر گزرتے تھے اور پھر منہ بھر بھر کر ٹریفک سسٹم کو گالیاں دیتے تھے۔

وہ لوگ پاکستان کی چودہ کروڑ آبادی کا وہ ایک کڑوا حصہ تھے جو دنیا بھر میں پاکستان کی نمائندگی ضرور کرتے تھے مگر جو خود '' پاکستانی '' نہیں تھے۔ وہ آمنہ کے لیے اور آمنہ ان کے قطعاً اجنبی تھے۔

'' ہم لوگ اکٹھے رہنا چاہتے ہیں۔ میں نے یہاں بہت سے بچوں سے ملاقات کی ہے جو ہمارے فلمی ہیروز کے دیوانے ہیں۔ ہم میں انہیں اپنا آپ نظر آتا ہے وہ ہمارے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ ہمارا میڈیا آپ کی رگوں میں اتر آیا ہے۔ بچہ بچہ '' جئے ہند'' کا مطلب جانتا ہے اور یقین کیجیے

یہ سب دیکھ کر دل بہت خوش ہوتا ہے۔ احساس ہوتا ہے کہ ہم سب ایک ہیں۔ ہمیں جغرافیائی حدود الگ نہیں رکھ سکتیں۔

ریتوورما اپنی سریلی آواز میں کہہ رہی تھی اور آمنہ کا دل چاہ رہا تھا اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دے۔ اسے دادو کے الفاظ یاد آئے۔

''ہم سب ایک نہیں ہیں۔ اس ملک کی اساس دو قومی نظریہ ہے اور یہ نظریہ واضح طور سے کہتا کہ ہم دو ہیں۔''

اس کا دل چاہا ریتوورما اور اس کے ساتھیوں سمیت اپنے ساتھیوں کو بھی اس نظریے کی یاد دلائے مگر اس کی آواز نقار خانے میں طوطی کے جیسی تھی اس کا دل چاہا وہ یہاں سے چلی جائے۔ مگر وہ پھر بھی نجانے کس طاقت کے زیرِ اثر وہاں ہی بیٹھی تھی۔

''چند روز قبل ہمارے ایک اخبار نے پاکستانی ٹین ایجرز سے ایک سروے کیا جس میں یہ سوال کیا گیا کہ وہ بھارت سے دوستی کے خواہاں ہیں تو سب کا جواب تھا کہ وہ لونگ ٹرم ریلیشن شپ چاہتے ہیں۔ سروے کا ایک سوال تھا کہ برصغیر کی تقسیم کو کتنے لوگ جسٹی فائی کرتے ہیں آپ کو جان کر خوشی ہوگی کہ پچھتر فیصد لوگوں نے کہا کہ وہ اس تقسیم کو قطعاً جسٹی فائی نہیں کرتے اور اگر انہیں موقع دیا جاتا تو وہ اکٹھے رہنا پسند کرتے۔''

ریتوورما کے ساتھ بیٹھی اس کی بہن تارا ورما نے بھی گفتگو میں حصّہ لیا۔

''الگ رہنے میں نقصان بھی تو بہت ہے اور تکلیف بھی۔ آپ لوگوں کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ کے یہاں جمہوریت کا جو حال ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ آپ لوگوں کو اقتدار ہینڈل کرنا نہیں آیا۔ آپ کی حکومت قرض کے بوجھ تلے دبی ہے اور ان قرضوں کی ادائیگی کئی سالوں تک ممکن نہیں۔ آپ کو مہاجرین کی آبادکاری میں جو مشکلات پیش آئیں اس کی وجہ سے آپ ابھی تک سنبھل نہیں پائے۔ آپ بھارت سے الگ ہوئے تو پھر کتنے حصوں میں بٹ گئے۔ اب آپ لوگ صرف پاکستانی نہیں ہیں۔ آپ سندھی' پنجابی' بلوچی' پختون ہیں جبکہ ہمارے یہاں ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہم سب کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں۔ ہندو' مسلم' سکھ' عیسائی' بدھسٹ سب ایک ساتھ رہتے ہیں اور بہت محبت سے رہتے ہیں۔''

سنگیتا مہتا نے ناک چڑھا کر کہا۔ وہ اس وفد کی سب سے مغرور لڑکی کے روپ میں سامنے آئی تھی۔

''کوئی تو ہو جو ان کو چپ کروا دے۔ کوئی تو سچا پاکستانی ہو جو بولے۔'' آمنہ نے بے چارگی سے سوچا۔ مدیحہ کا ہاتھ ابھی بھی اس کے کندھے پر تھا۔ اس نے دل ہی دل میں خود پر سو بار لعنت بھیجی۔ وہ بہترین مقررہ تھی اور گفتگو کے سب اصول اسے ازبر تھے اور وہ چاہتی تھی کہ اس کے



بجائے کوئی اور آئے اور سامنے بیٹھے لوگوں کا منہ بند کروادے۔ وہ شاید کسی محمد بن قاسم کے انتظار میں تھی حالانکہ ضرورت محمد بن قاسم کی نہیں محمد بن قاسم جیسے حوصلے کی ہوتی ہے جو کوئی انسان بھی اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے اور وہاں کوئی محمد بن قاسم جیسے حوصلے والا نہ تھا۔

''مشرقی پاکستان کے سانحے نے آپ کو یہ سبق ضرور سکھایا ہوگا کہ الگ رہنے میں بہت نقصان ہے' تب آپ بھی اسی تکلیف سے گزرے ہوں گے جس سے 47ء میں ہم گزرے تھے۔ اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے مگر جب یہ باتیں یاد آتی ہیں تو بے حد تکلیف ہوتی ہے ہم اس تکلیف سے بچنا چاہتے ہیں اس لیے ہم آپ کی طرف بار بار دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں کیونکہ ہم چاہتے ہیں دونوں ممالک کے روابط بے حد شاندار خطوط پر استوار ہوں۔ ہماری آئندہ آنے والی نسلوں کو اپنی تاریخ کی کتابوں میں یہ سب باتیں پڑھتے ہوئے کسی پچھتاوے اور دکھ کا احساس نہ ہو کیونکہ تاریخ بدل جائے گی۔ ہم دوستی کا یہ پیغام لے کر آئے ہیں ہم آپ کو بدلنے آئے ہیں۔''

راج شرودھا کرنے نپے تلے انداز میں کہا۔

''آپ تاریخ بدلنے نہیں آئے آپ ہمیں بدلنے آئے ہیں اور کیل کانٹوں سے لیس ہو کر آئے ہیں۔ اس بار آپ کے ہتھیار ماضی کے ہتھیار سے مختلف ہیں۔ اس بار آپ ہمیں بغیر جنگ کے فتح کرنا چاہتے ہیں۔''

آمنہ نے جل کر سوچا۔ اسے پھر سے دادو کی یاد آئی۔

''میکالے کہتا ہے کہ اگر تم کسی قوم کو جنگ کے بغیر فتح کرنا چاہتے ہو تو اسے احساس کمتری کا شکار بنا دو' وہ تمہاری ہمیشہ غلام رہے گی۔''

دادو نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے تھکی تھکی سی آواز میں کہا۔ آمنہ جو کمپیوٹر اسکرین میں پوری طرح منہمک تھی ان کی آواز پر چونکی۔ اس کے کانوں میں مائیکروفون لگا تھا جس کی وجہ سے وہ دادو کی بات مکمل طور پر سمجھ نہیں پائی تھی۔ اس نے مائیکروفون اتار کر مسکراتے ہوئے ان کی جانب دیکھا پھر بولی۔

''دادو! میں پانچ منٹ میں فارغ ہو جاؤں گی۔''

وہ اپنی کسی انڈین نیٹ فرینڈ سے گپیں...... کر رہی تھی۔ اس نے انٹرمیڈیٹ پارٹ ٹو کے پیپرز دے رکھے تھے اور آج کل کتھک ڈانس کی کلاسز لے رہی تھی۔ جب دادو کمرے میں آئے تب وہ اپنی انڈین فرینڈ سے اس کے متعلق بات کر رہی تھی اور انڈین کتھک ڈانسرز کو سراہ رہی تھی۔

''تم لوگ ہر فیلڈ میں شاندار ہو یار! ہم تو بس ایویں ہیں۔''

اس نے اپنی فرینڈ سے کہا تھا تب ہی دادو کمرے میں داخل ہوئے تھے اور انہوں نے آمنہ کا یہی فقرہ سن کر اسے میکالے کا مشہور زمانہ قول سنایا تھا۔ انہیں اس قسم کے اقوال ہمیشہ ازبر رہتے تھے

اور وہ اکثر و بیشتر آمنہ کو یہ اقوال سنا سنا کر شرمندہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے حالانکہ وہ جانتے تھے آمنہ اب سمجھنے والے مراحل سے بہت آگے نکل چکی تھی۔

وہ کنیئرڈ کالج کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اور پڑھائی میں بہت اچھی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں وہ بہت شاندار ریکارڈ رکھتی تھی۔ وہ یقیناً ہر میدان میں آؤٹ اسٹینڈنگ تھی یہی وجہ تھی کہ اس کے فرینڈز میں بیوروکریٹس' آرمی افسران اور بزنس مین کے بچے شامل تھے جبکہ خود اس کا تعلق ایک عام سے گھرانے سے تھا۔

جہانیاں سے لاہور آنے کے بعد دادو نے ساری جمع پونجی سے شہر کے اچھے کاروباری علاقے میں دکانیں خرید لی تھیں جو کرائے پر چڑھا دی گئی تھیں۔ ہر ماہ ایک معقول رقم کرایہ کی مد میں موصول ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی امی ایک انگلش میڈیم میں جونیئر ونگ میں اردو کی ٹیچر تھیں اور شام کو وہ گھر میں کوکنگ اسکول چلا رہی تھیں۔

آمنہ کو کبھی روپے کی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی پھر اس کا حلقہ احباب بھی بہت ہائی فائی قسم کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ گزشتہ پانچ سالوں میں اس کے نظریات میں بے حد پختگی آئی تھی۔ اس نے انٹر میں میوزک اور سوشل ورک پڑھا تھا اور اس کی دلچسپیاں ان دو فیلڈز میں بھی تھیں۔ وہ کالج کی ڈرامیٹک سوسائٹی کی ممبر تھی۔ اس کے علاوہ بیڈمنٹن میں بہت سے انعامات جیت چکی تھی غرضیکہ وہ ایک ہر فن مولا ٹائپ لڑکی تھی اور وہ اپنی خوبیوں سے آگاہ بھی تھی۔ زندگی میں ہر مقام پر ملنے والی بے پناہ ستائش نے اسے کسی قدر مغرور بنا دیا تھا اور وہ زیادہ تر معاملات کو اپنی مرضی سے حل کرنا چاہتی تھی۔

دادو جانتے تھے کہ ان کی پوتی آج کی لڑکی ہے جس کے اپنے نظریات ہیں۔ وہ اس کی اس روش سے اکثر الجھن میں ضرور مبتلا ہو جاتے تھے۔ وہ کہیں سے بھی نور الحسن کی پوتی نہیں لگتی تھی۔ وہ آدھی امریکن برٹش آدھی انڈین اور آدھی پاکستانی مسلمان لڑکی تھی وہ انہیں نوسٹیلجک اور بنیاد پرست ہونے کا طعنہ دیتی تھی۔ وہ ان سے بحث کرتی تھی کہ انہیں ماضی سے باہر آنا پڑے گا تاکہ وہ زمانے کے ساتھ چل سکیں اسی وجہ سے ان کا خوب جھگڑا ہوتا تھا اور دادو ہمیشہ ہار جاتے تھے۔ وہ عجیب عجیب سے دلائل دیتی تھی۔

'' دادو! ہم ہمسایہ ملک سے ہر لحاظ سے پیچھے ہیں۔ وہ کامیاب لوگ ہیں دادو! ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہمارے یہاں تو چھوٹے چھوٹے ایشوز پر ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ معیشت' تعلیم' سیاست' ہر چیز...... ہم تو وہیں کھڑے ہیں جہاں 47ء میں کھڑے تھے جبکہ وہ لوگ کہاں سے کہاں نکل گئے۔''

وہ اکثر کہتی تھی اور دادو حیرت سے اس کی شکل دیکھتے رہ جاتے وہ ان کے بیٹے ابوبکر کی بیٹی کہیں سے بھی نہیں لگتی تھی جو کشمیر کے جہاد میں شہید ہوا تھا۔



وہ ان کے ساتھ اس بات پر بحث کرتی تھی کہ پاکستانی رہنماؤں کے مغربی طرز زندگی پر بحث کیوں نہیں ہو سکتی جبکہ بھارت میں تو نہرو کی رومانوی زندگی پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تک لکھا جا چکا ہے۔ وہ یہودیوں کو ماڈرن سائنسز میں بے پناہ ترقی کے باعث انسانیت کا محسن کہتی تھی۔ دادو جب کبھی جھنجھلا کر اسے نصیحت کرنے کی کوشش کرتے تو وہ جواب دیتی۔

'' ہمیں اس '' کنویں کے مینڈک '' والی روش کو ختم کرنا ہوگا۔ ہمیں اسلام کے بجائے انسانیت کے خلاف جنگ لڑنی چاہیے۔ ہمیں باطنی وسعت اور قلبی کشادگی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔''

اس کی ان ہی باتوں کی وجہ سے دادو اب اسے ٹوکنے سے گریز کرتے تھے۔ اب وہ چھوٹی سی آمنہ نہیں تھی جو پاکستانی پرچم زمین پر گرا دینے کے باعث ان کا تھپڑ آرام سے کھا لیتی اب وہ اٹھارہ سالہ آمنہ تھی جو خود کو انٹرنیٹ ایج کی لڑکی مانتی تھی اور حب الوطنی جس کے نزدیک خود کو محدود کر لینے والی بات تھی۔

'' زمین کا ایک ٹکڑا آپ کا آئی ڈی کارڈ نہیں ہونا چاہیے دادو! ساری دنیا ہماری ہے بحیثیت انسان ہم ساری دنیا کی نمائندگی کرتے ہیں۔''

وہ دھڑلے سے کہتی تھی اور دادو اس کی ذہنی حالت میں سدھار کے لیے دعا کرتے اس کے پاس سے اٹھ جاتے۔ اب بھی اسے انٹرنیٹ کی دنیا میں مگن دیکھ کر وہ اس کے پاس سے اٹھنے لگے تھے کہ اس نے ملتجی نگاہوں سے ان کی جانب دیکھ کر مزید پانچ منٹ مانگے۔ دادو خاموشی سے دوبارہ کاؤچ پر بیٹھ گئے تھے۔ آمنہ کے کمپیوٹر پہ مادھوری ڈکشٹ کی تصویر والا ڈیسک ٹاپ تھا۔ دادو نہیں جانتے تھے وہ خاتون کون ہیں مگر اس کے ایک طرف لگا تین رنگوں والے ترنگے کا بیج وہ بخوبی پہچانتے تھے۔ آمنہ نے کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کیا اور پھر ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

'' آئی ایم سوری دادو! دراصل تسنیم کی بات لمبی ہوتی جا رہی تھی۔''

'' میرے بچے' یہ تم کن چکروں میں پڑی رہتی ہو اس کا کیا فائدہ ہے؟ میرے پاس بہت اچھی کتابیں آئی ہیں...... مرزا صاحب نے بھجوائی ہیں تم وہ کتابیں پڑھو تمہارے نالج میں اضافہ ہوگا۔''

وہ بہت محبت سے بولے۔ آمنہ کی اس آزادانہ روش کے باوجود انہیں اپنی پوتی سے بہت محبت تھی۔

'' دادو! آپ کے پاس ساری کتابیں نہایت بورنگ ہوتی ہیں۔ میں بالکل انجوائے نہیں کرتی۔ برِصغیر کی تقسیم' دو قومی نظریہ' علیحدہ تشخص' مجھے یہ سب ہضم نہیں ہوتا دادو!''

اس نے گویا صاف انکار کر دیا۔ دادو کا دل چاہا وہ اسے بتائیں کہ یہ سب جو اسے '' بورنگ '' لگتا ہے وہ اس کی سانسوں کا ضامن ہے۔ وہ جسے صرف زمین کا ٹکڑا سمجھتی ہے۔ وہ ٹکڑا اس کے اعتماد سے کھڑا ہونے کے لیے کس قدر ضروری ہے اور زمین کے اس ٹکڑے کو حاصل کرنے کے لیے انہیں کیا

کیا نہیں دیکھنا پڑا تھا۔

وہ ضلع گورداسپور کے چھوٹے سے قصبے بٹالہ کے رہنے والے تھے۔ امرتسر سے کچھ فاصلے پر واقع یہ ضلع انڈین حدود میں شامل کر دیا گیا تھا۔ تیس ستمبر 1947ء کو ہونے والے بلوائیوں کے حملے میں اس کی آنکھوں کے سامنے ان کے ماں باپ کو ذبح کیا گیا تھا۔ وہ کس طرح بلوائیوں کے حملے سے بچ کر امرتسر اور پھر لاہور پہنچے یہ ان کا دل ہی جانتا تھا۔ بارہ سال کی عمر میں انہوں نے بہتر سالہ زندگی کے مظالم دیکھ لیے تھے۔ اپنے چھوٹے بھائی کو وہ اپنی قمیض کے نیچے پیٹ پر باندھ کر لائے تھے۔ ان کا دو سالہ بھائی جب بھوک سے بلکتا تو وہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتے کہ کہیں سکھ جتھوں کو یہ آواز نہ پہنچ جائے۔ وہ کس طرح پاکستان پہنچے' یہ وہ کبھی بھلا نہیں کر سکتے تھے۔ راستے میں انہوں نے ظلم کو کس طرح ظالم کے ہاتھوں بے بس پایا یہ کوئی ان سے پوچھتا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ظلم خود ظالم سے شرمندہ ہے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے وہ رنگ ابھی بھی گہرے تھے اور ان کی پوتی کہتی تھی انہیں یہ سب بھول کر ہمسایہ ممالک سے محبت بڑھانے کے متعلق سوچنا چاہیے وہ آمنہ کو کیسے سمجھاتے کہ ان کا عمر رسیدہ دل یہ سب بھول نہیں سکتا وہ بھول جاتے اگر ان کی زندگی میں اس حوالے سے کوئی روشن دن آیا ہوتا۔

ان کا بھائی نور الحسنین' جس کی پرورش انہوں نے اولاد کی طرح کی تھی وہ 1970ء میں مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی کے ہاتھوں شہید ہوا تھا۔ اس کے وہ خطوط اب بھی ان کی الماری میں پڑے تھے جو اس نے مشرقی پاکستان سے لکھے تھے۔ وہ ایک اخباری رپورٹر تھا اس نے مکتی باہنی کی بربریت کے جو مناظر دیکھے تھے انہیں کاغذ پر منتقل کر کے انہیں بھجوایا تھا۔ اس کی ہینڈ رائٹنگ میں وہ خطوط آج بھی ان کے پاس محفوظ تھے۔

وہ کیسے ان بوسیدہ خطوط سے ٹپکتے آنسوؤں اور خون کی بوندوں کو فراموش کر دیتے۔ وہ ان کا المیہ تھا اور ایسے اتنے آرام سے کب فراموش کیے جاتے ہیں۔ بھائی کے بعد ان کا بیٹا کشمیر میں شہید ہوا تھا اور انہیں اس کی شہادت پر فخر تھا مگر آج اپنے بیٹے کی بیٹی کو دیکھ کر انہیں احساس ہوتا کہ یہ فخر کہیں نہ کہیں تفکر میں ڈھل چکا تھا۔ ان کی ذہن وفطین پوتی آزادی اور آزادی کی اہمیت جیسی کسی چیز کو مانتی ہی نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

''ہم ہمیشہ سے آپ کے خیر خواہ رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم نے اب تک آپ کی طرف سے ہونے والی ماضی کی ہر کوتاہی کو معاف کر دیا ہے۔ تاہم اعلاظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آپ کی غلطیوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے آپ کے پاس آئے ہیں اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ جواباً ہمیں کیا دیتے ہیں۔''

''آنند اگر وال نے اپنی ہیزل گرے آنکھوں کو گھماتے ہوئے کہا۔ اس کی بات پر ایک بار



پھر کانفرنس روم تالیوں کی آواز سے گونجنے لگا۔ یہی تالیاں تھیں جو آمنہ کو ماضی سے حال میں کھینچ لاتی تھیں۔ اس نے ایک بار بھی میز نہیں بجائی تھی۔

اس کا دایاں ہاتھ اس کے بائیں ہاتھ پر سختی سے دھرا تھا اسے محسوس ہو رہا تھا کہ شاید کئی صدیوں سے وہ یونہی ہاتھ پر دھرے فارغ بیٹھی لایعنی اور بے معرف سوچوں سے الجھ رہی تھی۔

''ہم بہت پر امید ہیں کہ اب کی بار یہ لڑائی جھگڑے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے ہم نے یہاں بہت سے لوگوں سے ملاقات کی ہے۔ ان کو دیکھ کر قطعاً یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ ہم سے مختلف ہیں۔ ہماری آئیڈیولوجی' ہمارا کلچر' ہمارے رہن سہن کا طریقہ ایک ہی ہے جب ہم ایک ہیں تو پھر محض ان جغرافیائی خطوط کی بنا پر اس قدر تعصب کیوں ہے؟''

رادھیکا پٹیل نے تحیر میں گھر کر استفسار کیا تھا۔

''مجھے تو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ انہی بنیادوں پر آپ کے آباؤ اجداد نے ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا تھا۔ میرے ذہن میں اکثر یہ سوال آتا تھا کہ اگر وہ سب اس بات سے واقف ہوتے کہ پچاس ساٹھ سال بعد دونوں ممالک کے رہنے والوں کے نظریات پھر سے مماثلت اختیار کر جائیں گے تو کیا وہ پھر بھی ایک الگ وطن کا مطالبہ کرتے؟''

ساحر کمار نے کہا تھا۔ آمنہ کو محسوس ہوا جیسے سوال اسی سے پوچھا گیا ہے۔ وہ بول سکتی تھی مگر اصولی طور پر ابھی اس کے بولنے کی باری نہیں آئی تھی۔

''آپ لوگوں کے یہاں جو لباس پہنا جاتا ہے کم وبیش ہمارے یہاں بھی وہی لباس زیب تن کیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں کا قومی لباس ساڑھی ہے اور وہ آپ کے یہاں کی خواتین بہت کثرت سے استعمال کرتی ہیں۔ میں نے بہت سی خواتین سے پوچھا کہ وہ ساڑھی اتنے شوق سے کیوں پہنتی ہیں تو انہوں نے کہا کہ اس لباس کو پہننا انہیں اچھا لگتا ہے اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔''

آنند اگر وال نے دوبارہ سے بولنا شروع کیا تھا۔ وہ فیشن ڈیزائننگ میں انڈین اسکول آف آرٹس سے اپنی ڈگری مکمل کر رہا تھا۔ یہ بات بہت دلچسپی کی حامل تھی کہ انڈیا سے جو وفد آیا تھا اس میں زیادہ تر فیشن ڈیزائنرز' ماڈلز' تھیٹر آرٹسٹس' سنگرز' وغیرہ شامل تھے۔ ان کی گفتگو کا مرکز بھی گھوم پھر کر انہی دو چار چیزوں پر آ جاتا تھا۔

''آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے یہاں کا ڈرامہ آپ کے یہاں کس قدر پسند کیا جاتا ہے۔ لوگ ان کے انتظار میں اپنے ضروری اپائمنٹس کینسل کر دیتے ہیں۔ ان ڈراموں کے کردار آپس کی گفتگو میں بار بار زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ ڈراموں کے کرداروں کی طرح کے لباس سلوائے جاتے ہیں۔ آپ کے یہاں ہونے والی شادیوں میں ہمارے یہاں کا میوزک بجایا جاتا ہے۔ آپ کسی بچے سے پوچھ کر دیکھیں کہ اس کا فیورٹ ہیرو کون ہے وہ لمحہ بھر کی ہچکچاہٹ کے بغیر شاہ رخ خان کا نام

لے گا۔ یہ ان کے دلوں میں موجود ہماری محبّت کا نتیجہ ہے کہ وہ ہمارے یہاں کے ایک فلمی ایکٹر کو اپنا ہیرو مانتے ہیں۔ اس کے علاوہ حالیہ کرکٹ میچز میں آپ نے دیکھا کہ دونوں ٹیموں کے درمیان ہار جیت کے جذبے سے زیادہ ملنساری اور محبّت کا جذبہ نظر آیا۔ آپ نے ہماری کرکٹ ٹیم کو جو عزت دی' جو پروٹوکول دیا ہم مدتوں اسے یاد رکھیں گے۔"

رادھیکا پٹیل نے کہا۔ اس کی بات پر آمنہ کی سائیڈ پر بیٹھے کتنے لوگوں کے چہرے اتر سے گئے۔ حالیہ کرکٹ میچز میں جو کچھ ہوا اس نے بہت سے لوگوں کو حیران بھی کیا تھا اور ان کے دل بھی دکھائے تھے مگر جو منظر عام پر آیا تھا وہ بہت شرمناک تھا۔ آمنہ کی نظر میں وہ سب تصویریں گھوم گئیں جو اس نے اخباروں اور مختلف میگزینز میں دیکھی تھیں۔ پاکستانیوں کے پریشان حال چہرے' شکست پر آنسو بہتی آنکھیں' اور فتح کی دعا کرتے لب کسی اخبار یا میگزین میں نہیں تھے مگر جینز اور ہاف شرٹس میں ملبوس لڑکیاں جو انڈین کرکٹرز کے ساتھ تصویریں بنوانے کے لیے بے تاب تھیں ہر میگزین کی زینت بنی تھیں۔ اسے پھر سے دادو کی بات یاد آئی۔

"ہمارا ایک فیصد انتہائی امیر طبقہ باقی ننانوے فیصد غریب طبقے کی خالص اور پاکیزہ سوچ کو منظر عام پر آنے دے تو کسی کو پتا چلے کہ پاکستانی کس قسم کے لوگ ہیں۔"

وہ اکثر آمنہ کی آزادانہ سوچ پر کڑھ کر کہا کرتے تھے اور آمنہ ہمیشہ ان کی بات کو اہمیت دیئے بغیر اپنے آپ میں مگن رہتی تھی۔ اسے اپنے ماضی پر انتہا کا افسوس ہوا۔ اس نے بھی کبھی اس انتہائی ماڈرن اور انتہائی لبرل سوچ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے رادھیکا پٹیل نے اپنے سامنے بیٹھے پچاس لوگوں میں سے صرف اسے ہی طعنہ دیا ہے۔ اس کا انداز بے حد جتانے والا تھا بلکہ اسی پر کیا موقوف ہمسایہ ملک سے آئے ہوئے اس وفد کا ہر رکن نہایت رعب سے بات کر رہا تھا جبکہ ان لوگوں کو خصوصاً تاکید کی گئی تھی کہ رویے میں دوستانہ پن اور عاجزی کا مظاہرہ کرنا ہے۔

"میں یہاں لاہور میں شاپنگ کے لیے بھی گئی۔ بہت سے شاپنگ مالز پر جانے کا اتفاق ہوا۔ شاپ کیپرز کو جب پتا چلا کہ میں انڈیا سے آئی ہوں تو انہوں نے مجھے ہر چیز میں بہت ڈسکاؤنٹ دیا بلکہ کچھ لوگوں نے تو مجھے گفٹس بھی دیئے مجھے ان کے اس جذبے نے بہت متاثر کیا۔ میرا دل نہایت خوش ہوا یہ سب دیکھ کر اور یہ احساس بھی ہوا کہ برف پگھلنا شروع ہو چکی ہے ظاہر ہے جب جذبات میں اس قدر گرمجوشی ہوگی تو سرد مہری کی یہ برف پگھل کر رہے گی۔"

قاتنا راج پال نے مقامی دکانداروں کے حسن سلوک کو سراہا تھا مگر پھر بھی اس کے انداز میں ستائش کی جگہ طنز ہی نظر آیا۔ ان سب کے منہ میں سیاسی زبان تھی اور وہ جذبہ خیر سگالی کی بات کر رہے تھے۔ انہوں نے آتے ہی یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ خارجہ پالیسی کے تحت نہیں آئے بلکہ وہ محبت



کے پیامبر بن کر آئے ہیں۔ ان کی یہ محبّت بھری خارجہ پالیسی آمنہ کے ذہن میں سوئی بن کر چبھ رہی تھی۔ اسے افسوس سا ہوا کہ وہ اسلام آباد سے صرف اس وفد کی خاطر لاہور آئی تھی مگر یہاں اسے سب کچھ ویسا ہی محسوس ہوا تھا جیسا دادو نے اسے بتایا تھا۔

وہ اپنی سفاک خواہشات کو نرم لباس پہنا کر ان کے سامنے پیش کر رہے تھے ان میں سے کسی نے ایک بار بھی نہیں کہا تھا کہ وہ "کشمیر ایشو" کا منصفانہ حل چاہتے ہیں جبکہ وہ بار بار یہ مطالعہ کر رہے تھے کہ سرحد پار دراندازی کو ختم کیا جائے۔ ان کے نزدیک ہر چیز دورخی اور دوہرے معیار کی حامل تھی۔ آمنہ کو یک دم اس سارے ماحول سے بے پناہ اکتاہٹ محسوس ہونے لگی۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

کانفرنس روم میں اب کولڈ ڈرنکس تقسیم ہونے لگی تھیں۔ وہ اپنا پرس اٹھا کر ہال سے باہر نکل آئی۔ دورازے سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے مڑ کر اپنے انچاس ساتھیوں کو دیکھا تھا اور پھر دل ہی دل میں انہیں مخاطب کر کے وہی بات کہی تھی جو دادو نے اسے کبھی بہت رنج سے کہی تھی۔

"جنہیں تم دوست کہتے ہو نا وہ تمہارے دوست نہیں ہیں انہوں نے ہمیشہ ہمیں دکھ دیے ہیں اور دکھ بھی عام دکھ نہیں بلکہ ذات کے دکھ اور ذات کے دکھ ساری حیات پر بھاری ہوتے ہیں"

☆ ☆ ☆

"جنہیں تم دوست کہتے ہو نا وہ تمہارے دوست نہیں ہیں انہوں نے ہمیشہ ہمیں دکھ دیے ہیں اور دکھ بھی عام دکھ نہیں بلکہ ذات کے دکھ اور ذات کے دکھ ساری حیات پر بھاری ہوتے ہیں۔"

دادو نے انتہائی رنج بھرے لہجے میں کہا تھا مگر آمنہ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ فیصلہ کر چکی تھی اور اس نے اپنے فیصلہ سے انہیں آگاہ کر دیا تھا۔

"میں قاسم خان سے ہی شادی کروں گی۔"

اس نے قطعیت سے کہا تھا۔ اس کی امی اس کے ساتھ تھیں مگر دادو کسی صورت نہیں مان رہے تھے۔ انہیں قاسم خان پسند تھا۔ انہیں اس کی فیملی پر بھی اعتراض نہیں تھا مگر انہیں اس جگہ پر اعتراض تھا جہاں وہ رہتا تھا۔ وہ انڈیا کے شہر احمد آباد کا رہنے والا تھا۔ دادو' آمنہ کی شادی اتنی دور نہیں کرنا چاہتے تھے اور پھر انڈیا تو وہ اسے کبھی بھی نہ بیاہتے مگر آمنہ پہلی ملاقات میں ہی قاسم خان کو اوکے کر چکی تھی۔ قاسم خان ملازمت کی غرض سے ٹیکساس میں مقیم تھا مگر اس کی فیملی احمد آباد میں ہی رہتی تھی وہ دادو کے چچا زاد بھائی کا نواسہ تھا جو قیام پاکستان کے وقت انڈیا میں ہی رہ گئے تھے۔ کئی سالوں بعد جب دونوں ممالک کے روابط میں ذرا نرمی آئی ہوئی تھی تو وہ سمجھوتہ ایکسپریس سے [illegible] ملنے اور پاکستان کے ناردرن ایریاز کے سیر کی غرض سے آئے تھے۔

قاسم خان کمپیوٹر سوفٹ ویئر میں ایک ایکسپرٹ انجینئر کے طور پر جانا جاتا تھا۔ قاسم خان

سمیت جب اس کے نو افراد پر مشتمل گھر والے پاکستان کی سرزمین پر اترے تو آمنہ ان کا استقبال کرنے والوں میں سب سے آگے تھی۔ ان دنوں وہ گریجویشن کر چکی تھی اور یونیورسٹی میں تھی۔ اس نے انڈیا سے آئے اپنے خاص الخاص مہمانوں کو لاہور کے علاوہ ناردرن ایریاز بھی گھمایا تھا اور یہیں کہیں کیوپڈ کے تیر نے اسے گھائل کردیا۔ ایسا ہی کچھ وار قاسم خان پر بھی ہوا۔ اس نے واپس جانے سے ایک دن قبل اپنا پرپوزل دادو کے سامنے پیش کردیا تھا۔ انہوں نے اسے مناسب الفاظ میں انکار کردیا تھا۔

''میں عرصے پہلے اس زمین کو چھوڑ کر یہاں آبسا تھا اب میں دوبارہ ایسا کوئی تعلق نہیں جوڑنا چاہتا جس کی بنا پر مجھے بار بار وہاں جانا پڑے۔''

انہوں نے بہت عاجزی سے اپنے چچازاد بھائی طاہر نقوی کو کہا تھا جو قاسم خان کے نانا تھے۔ طاہر نقوی اس آئیڈیولوجی پر یقین نہیں کرتے تھے مگر انہوں نے دادو کو منانے کی کوشش نہیں کی مگر آمنہ رات کو ان کی خوابگاہ میں آئی تھی اور اس نے انہیں اپنی مرضی سے آگاہ کیا تھا۔

''فارگاڈ سیک دادو! آپ کب ان برسوں پرانی یادوں سے چھٹکارا حاصل کریں گے۔ وہ ہمارے دشمن ہیں۔ وہ ہمارے دوست نہیں ہوسکتے۔ کیوں دادو! جب ہماری نیت میں فتور نہیں تو وہ ہمیں دھوکہ کیوں دیں گے؟ میں ایسی باتوں پر یقین نہیں کرتی۔ مجھے احمد آباد میں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں وہ بھی ایسا ہی ایک شہر ہوگا جیسا یہ لاہور' کراچی' فیصل آباد' گوجرانوالہ یا پشاور وغیرہ ہے۔ وہاں پر بھی ایسے ہی لوگ ہوں گے جیسے یہاں ہیں۔ وہ اسی طرح کھاتے ہوں گے اسی طرح پیتے ہوں گے جیسے ہم کھاتے پیتے ہیں۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا' رسم و رواج' رہن سہن' ہم سب ایک ہی تو ہیں دادو! پھر ہم الگ رہیں یا ایک ساتھ کیا فرق پڑتا ہے۔ اب زمانہ تبدیل ہوچکا ہے۔ اب دونوں طرف پہلے جیسی صورتحال نہیں رہی اب حالات بہت مختلف ہیں۔ میں وہاں بہت خوش رہوں گی۔'' اس نے ضدی لہجے میں کہا اور وہ اپنی ذہین و فطین مقررہ پوتی کے منہ سے یہ سب باتیں سن کر وہ جیسے ہکا بکا رہ گئے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ پانی سر سے اتنا اونچا ہوچکا ہے۔ انہوں نے اسے سمجھانا چاہا۔

''تم وہاں خوش نہیں رہ سکتیں میری بچی۔ وہاں سب کچھ بہت مختلف ہوگا۔ وہاں تم ادھار کی زندگی جیوگی۔ وہاں تمہیں سب کچھ ''حق کے طور پر نہیں بلکہ ''بھیک'' کے طور پر ملے گا۔ تمہاری بقا تمہارا نام ونشان اس سرزمین سے ہے۔''

''دادو! پلیز' آپ مجبور نہیں کرسکتے میں فیصلہ کرچکی ہوں اور آپ جانتے ہیں میں بہت ضدی ہوں اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں ان صدیوں پرانی فلاسفی پر یقین نہیں رکھتی۔ زمین کے ایک ٹکڑے کی اہمیت نہیں ہے۔ انسان کی اہمیت ہے اور میں قاسم کے ساتھ کہیں بھی رہ لوں گی۔ میں قاسم خان سے ہی شادی کروں گی۔''



اس نے اتنا کہنے کے بعد ان کی جانب دیکھے بغیر کمرے سے باہر قدم بڑھا دیئے۔ وہ جانتی تھی دادو مان جائیں گے اور وہ مان بھی گئے تھے۔ پہلی بار انہیں احساس ہوا تھا کہ انہوں نے اپنی لاڈلی پوتی کی تربیت میں کوتاہی کی تھی۔ قاسم خان ٹیکساس رہتا تھا اس کا ارادہ مستقل وہیں رہائش پذیر ہونے کا تھا کم وبیش اس کے باقی اہل خانہ بھی یہی چاہتے تھے اس طرح پاکستان چھوڑنے سے قبل قاسم اور آمنہ کی نسبت طے کری گئی تھی۔ آمنہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ عام حالات میں وہ انڈیا یا پاکستان میں کسی جگہ رہنے کو ترجیح نہ دیتی مگر قاسم خان نے اسے انڈیا میں رہنے کے لیے قائل کرلیا تھا۔ وہ چاہتا تھا شادی کے بعد آمنہ کچھ عرصہ احمد آباد میں رہے پھر وہ اسے اپنے ساتھ ٹیکساس لے جاتا۔ شادی دو سال بعد ہونا طے پائی تھی۔ قاسم واپس ٹیکساس چلا گیا جبکہ آمنہ نے پی جی ڈی کمپیوٹر سائنسز میں ایڈمیشن لے لیا کیونکہ منگنی کے معاملات میں الجھ کر اس نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن کی ڈیٹ گزار دی تھی۔ اس کی وہی دلچسپیاں تھیں وہی شوق تھے مگر اب اس کی زندگی کا محور قاسم خان ہوگیا تھا۔ وہ روز نیٹ پر ایک دوسرے سے بات کرتے' ہفتہ میں دوبار وہ اسے فون بھی کرلیتا اور ہر ماہ بعد اسے خلوص و محبت سے سجا ایک کارڈ اور گفٹ بھی موصول ہوجاتا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کی محبت گہری ہوتی چلی گئی اس طرح ایک سال پلک جھپکتے گزر گیا۔

''میں ایک ماہ کی چھٹیوں کے لیے واپس احمد آباد جارہا ہوں۔ میں پلان کررہا تھا کہ نکاح کی تقریب پہلے کرلیتے ہیں ورنہ پھر بعد میں پیپرز وغیرہ بنوانے میں مسئلہ ہوتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ شادی کے بعد میں ٹیکساس میں اکیلا رہوں اور تم وہاں احمد آباد میں میرے لیے اداس گانے گاتی رہو۔''

قاسم نے ٹیکساس سے اسے فون پر کہا تھا۔

''تم کسی خوش فہمی میں مبتلا مت ہو قاسم! میں تمہارے لیے کبھی اُداس گانے نہیں گاؤں گی بلکہ مجھے امید ہے کہ میں وہاں احمد آباد میں تمہاری امی کے ساتھ بہت اچھا وقت گزاروں گی۔ تم میری فکر مت کرو میں دادو کی طرح اس قسم کے وسوسوں کا شکار نہیں ہوتی۔''

اس نے جواباً قاسم کو تسلی دی تھی۔ قاسم' احمد آباد چلا گیا تھا اور ان کے نکاح کی تیاریاں دونوں طرف شروع ہوچکی تھیں۔ آمنہ نے ساری شاپنگ اپنی مرضی سے کی تھی۔ نکاح کی تقریب کے لیے اس نے مدراسی ساڑھی کا انتخاب کیا تھا کیونکہ قاسم نے اس سے کہا تھا کہ اس کی سروقد شخصیت پر ساڑھی ہی سوٹ کرے گی۔ جب ساری تیاریاں مکمل ہوگئیں۔ کارڈز بھی بٹ چکے تھے حتیٰ کہ بیوٹیشن اور فوٹوگرافر سے اپائنٹمنٹس بھی لے لی گئی تھیں کہ قاسم کی طرف سے نکاح کچھ دنوں کے لیے ملتوی کردیا گیا کیونکہ احمد آباد' گجرات اور بھارت کے کچھ دوسرے علاقوں میں ہندو مسلم فسادات شروع ہوگئے۔ دنیا کی ایک بڑی سیکولر ریاست میں وہاں کی اکثریتی آبادی نے اقلیتی آبادی کو چن چن کر مارنا شروع کردیا۔ وہی مظالم جو آمنہ دادو کی زبانی سنا کرتی تھی۔ 47ء کے وہی قصے جنہیں آمنہ فرسودہ پرانی

کہانیاں کہا کرتی تھی یکدم ری پلے کی صورت دوبارہ سے چلنے لگے۔ اخبارات میں لوگوں کی ڈری ڈری صورتیں' اپنے پیاروں کے مرنے پر رنج والم کی تصویر بنے لوگ اور پھر موت کے ظالم شکنجے سے بھاگتے پھرتے' بچتے بچاتے لوگ ہر روز ایسی ہی تصاویر اخبارات کی زینت بنی ہوتیں۔ بی بی سی اور سی این این پر جو خوفناک رپورٹس پیش کی جاتیں وہ آمنہ کو وہلا کر رکھ دیتیں۔

''یہ سب دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔'' وہ ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھ کر عجیب سے لہجے میں دادو سے کہتی جو دائیں ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے گراتے جاتے اور مسلم اُمۃ کی بھلائی' بہتری و حفاظت کی دعا کیے جاتے۔ آمنہ فون کی جانب دیکھتی رہتی' انٹرنیٹ کینکٹ کرکے قاسم کے آن لائن ہونے کا انتظار کرتی رہتی مگر وہ فون کرتا نہ نیٹ پر آتا نکاح کی طے شدہ تاریخ گزر جانے کے پانچ دن بعد قاسم نے ای۔میل کی تھی۔

''آمنہ! دعا کرو حالات بہتر ہوجائیں ایسا لگتا ہے جیسے ہم جہنم میں رہ رہے ہیں۔'' ''وہ'' ہمارے خون کے پیاسے ہوگئے ہیں ایسا لگتا ہے جیسے ہم گوشت کے لوتھڑے ہیں اور وہ کتے جو ہمیں بھنبھوڑ...... کر کھانا جانا چاہتے ہیں۔ یہاں سچ مچ خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے آمنہ!''

آمنہ اس کی میل چیک کرتے ہوئے تڑپ تڑپ کر رو دی۔ وہ دن میں کئی بار اس میل کو دیکھتی اور آنسو اس کی آنکھوں میں نجانے کہاں سے اتر آتے۔ اسے زندگی میں پہلی بار احساس ہوا تھا کہ دادو کی الماری میں موجود کچھ بوسیدہ خطوط' کچھ خون آلودہ کپڑے گندھے بالوں کی ایک کٹی ہوئی چٹیا' جس کے بارے میں دادو کا کہنا تھا کہ وہ ان کی ماں کی تھی' ان کی آنکھوں میں یہ سب چیزیں دیکھتے ہوئے آنسو کہاں سے آجاتے تھے۔ وہ جو انہیں اس نوسٹلجیا سے نکلنے کے لیے کہا کرتی تھی خود ایک عجیب سے نوسٹلجیا کا شکار ہونے لگی۔ ان ہی دنوں قاسم کی ایک ای۔میل آئی۔ اس کے خالہ زاد بھائی کو سر بازار چیر پھاڑ ڈالا گیا تھا۔

''آمنہ! انہوں نے اس کا قیمہ کردیا تھا۔ اس کی انگلیاں کاٹ کر اس کے کان میں گھسادیں۔ اس کے دانت اس کے ناک میں گاڑے ہوئے تھے۔ اس کی ٹانگیں توڑ کر انہوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالی تھیں۔ وہ کم و بیش سب مسلمانوں کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم گائے کو سجدہ کریں تو وہ ہمیں بخشنے کو تیار ہیں۔ ہمارے لیے دعا کرو آمنہ!''

اس کی میل ایسی ہی باتوں سے بھری ہوئی تھی۔ آمنہ نے اسے لکھا تھا کہ۔

''تم ٹیکساس واپس چلے جاؤ اور اپنے اہل خانہ سے کہو یہاں پاکستان آجائیں۔ یہاں سب انہیں قبول کرلیں گے۔ وہ جگہ چھوڑ دو قاسم! وہ تمہارے رہنے کے قابل نہیں ہے۔''

دادو اس کی حالت دیکھ رہے تھے اور دعا کر رہے تھیں اخبارات میں چھپنے والی تصاویر اور خبریں انہوں نے بھی پڑھی تھیں۔



وہ قاسم کے فون کا انتظار کرتے رہتے کیونکہ اس نے منع کیا تھا کہ آپ خود فون نہ کریں ورنہ کال ٹریس ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ اس دن اچانک اس کا فون آگیا۔ وہ بمبئی سے فون کررہا تھا اسے کرائم برانچ والوں نے طلب کیا تھا۔

''دادو! وہ سمجھتے ہیں کہ میں پاکستانی جاسوس ہوں کیونکہ انہیں میرے پاکستانی تعلقات کے متعلق سب علم ہے۔ وہ جانتے ہیں میری جس لڑکی سے شادی ہونے والی ہے وہ پاکستانی لڑکی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میں' میرا باپ' میرا دادا' سب شریف آدمی ہیں۔ ہم ہمیشہ اس دھرتی کے ساتھ وفادار رہے ہیں مگر وہ ہمیں مسلمان ہونے کی سزا دے رہے ہیں دادو!''

قاسم نے تقریباً روتے ہوئے انہیں فون پر بتایا تھا۔ اس کے بعد قاسم کا کوئی فون نہیں آیا بلکہ اس کے نانو (جو آمنہ کے دادو کے چچازاد بھائی تھے) کا فون آیا۔

''قاسم کو انویسٹی گیشن سیل نے اذیتیں دے دے کر مار دیا ہے نورالحسن! مجھے آج سمجھ میں آیا کہ جب تم دو قومی نظریئے کی اساس پر ہندوستان چھوڑ کر گئے تھے تو تم نے بہت اچھا کیا تھا اور میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی اور اس غلطی کا خمیازہ میری نسل کو بھگتنا پڑا۔ کاش میں تب ہی تمہاری بات مان لیتا۔''

وہ روتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ قاسم کی المناک موت نے آمنہ کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسے دہشت گرد اور پاکستانی جاسوس کہہ کر قتل کیا گیا تھا۔ اس کے قتل کے بعد ہندو بلوائیوں نے چن چن کر اس کے اہل خانہ کو بھی قتل کردیا تھا۔

آمنہ ان دونوں اتنا رو چکی تھی کہ مزید رونے کا حوصلہ ہی نہیں رہا تھا۔ انقلاب اس لیے برپا ہوتے ہیں تاکہ تبدیلیاں لائی جاسکیں۔ قاسم کی موت کے انقلاب نے آمنہ کو مکمل طور پر تبدیل کردیا تھا اسے لگا وہ آمنہ ابوبکر نہیں رہی بلکہ' نورالحسن بن ہوگئی ہے۔

''جب اذیت خود آپ کی شاہ رگ پر کھڑی ہوکر آپ کو اذیت دینے پر آتی ہے تو آپ کو احساس ہوتا ہے کہ آنکھ سے خون اور زخم سے آنسو بہنے لگے تو کیا ہوتا ہے۔''

اس کی ان باتوں پر سب پہلے حیران ہوئے اور پھر انجان ہوتے چلے گئے۔ وہ فرینڈز جو ہمیشہ اس کا دم بھرتے نظر ہوتے تھے اس سے دور ہوتے چلے گئے کیونکہ اب وہ ان کے معیار کی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے دادو کی طرح کی پرانے دور کی کہانیاں سناتی تھی جسے پاٹیز و فکشنز سے الرجی ہونے لگی تھی۔

اب وہ کتھک اور یوگا میں دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ ہر دو دن بعد مارکیٹ میں کسی نئی انڈین موی کی DVD دستیاب ہوتی تھی مگر وہ ان کی طرف تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ وہی آمنہ ابوبکر جو انڈین موویز اور ڈراماز کو حقیقت کی سب سے بڑی تصاویر مانا کرتی تھی یکدم ہی ان سب چیزوں سے

بیزار ہوگئی۔ اس کے کتابوں کے شوکیس میں کتابیں اس کی وارڈ روب میں ڈریسز اس کے کیبنٹس میں وڈیو' آڈیو کیسٹس اور اس کے درازوں میں سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز بدل گئی تھیں۔ وہ جو اس قسم کی سوچوں کو ''تنگ نظری'' کہا کرتی تھی وہ جو کلچر کو ''یونیورسل'' کہا کرتی تھی وہ لڑکی کسی اور روپ میں ڈھل گئی تھی۔ ایک قاسم خان کے مرنے سے کیا سب کچھ ختم ہوگیا تھا؟

''دنیا میں لاکھوں انسان مر جاتے ہیں مگر ایک ایسا انسان بھی ہوتا ہے جو آپ کے لیے سب سے اہم ہوتا ہے جب وہ شخص مرجاتا ہے تو پھر آپ بھی مرجاتے ہیں۔''

اس نے اپنی ایک فرینڈ سے کہا تھا جو اس کی اس تبدیلی پر حیران تھی اسے خود بخود ان تمام کتابوں سے دلچسپی ہوگئی جنہیں پڑھنے کے لیے دادو اسے ہر قسم کا لالچ دیتے رہے تھے مگر وہ ان کی طرف دیکھتی بھی نہ تھی اور اب وہ ان ہی کتابوں میں دلچسپی لیتی تھی۔ حقائق پرت در پرت اس کے سامنے آرہے تھے۔ وہ جان گئی تھی کہ جس باتوں کو ہم صرف کتابی باتیں کہہ کر اگنور کردیتے ہیں وہ صرف کتابی باتیں نہیں ہوتیں ان کے پیچھے ہزار ہا داستانیں کارفرما ہوتی ہیں۔

اس نے ایک دن خود سے یہ اعتراف کرلیا تھا اور پھر اسے احساس ہوا تھا کہ دادو کن دکھوں پہ پریشان رہتے تھے۔ وہ کون سی باتیں ہیں جو انہیں بار بار 47ء سے پہلے کے قصوں میں الجھائے رکھتی ہیں۔ اس کی رائٹنگ ٹیبل کے درازوں میں قاسم کے خطوط' اس کے گفلنس کے ساتھ اخبارات کی وہ کٹنگ بھی رہنے لگیں جو ہندو مظالم کی داستانیں چیخ چیخ کر سناتے تھے۔ اس کی اور دادو کی الماری اب ایک سی لگتی تھی۔

آپ رات کو جھوٹ کے نرم پالنے میں سو جائیں اور جب صبح اٹھیں تو حقیقت کا گرم فرش آپ کی پشت جلا رہا ہو تو پھر آپ خود بخود آنکھوں' کانوں اور اپنے ذہن کا استعمال شروع کردیتے ہیں پھر آپ کو کسی مبلغ کسی ناصح کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ آپ خود مبلغ اور ناصح بن جاتے ہیں' آمنہ بھی ایک ایسی ہی شخصیت میں ڈھل چکی تھی۔ اس نے دادو کے کہنے پر قائداعظم یونیورسٹی میں آئی آر میں ایڈمیشن لے لیا جہاں وہ ہاسٹل میں رہتی تھی۔ وہ باقی لڑکیوں کو ان ہی دلچسپیوں میں مگن دیکھتی تھی جو پہلے کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھیں اور پھر ان کی زندگی میں کسی انقلاب کے آئے بغیر ان کے بدل جانے کی دعا کیا کرتی۔

وہ کیسے اس کو وفد کے اراکین کی باتیں خاموشی سے سن لیتی جو صرف جھوٹ پر مبنی تھیں اسی لیے وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔

اس کی ذات کے دکھ اس کی ساری حیات پر بھاری ہو چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

''تم واپس جارہی ہو؟'' کاریڈور سے گزرتے ہوئے اس نے کسی کی آواز سنی۔ وہ عمر ایزد



تھا۔ وہ بھی اس کے پچاس ساتھیوں میں سے ایک تھا۔ عمر ایزد کے بارے میں اس کی رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ وہ اسے ہمیشہ سے مغرور لگا تھا۔ دونوں کی پہلی ملاقات سارک ممالک کی طرف سے منعقد کی گئی یوتھ کانفرنس میں ہوئی تھی۔ وہ آمنہ کے ساتھ اس ٹیم میں شامل تھا جس نے کوئز پروگرام میں گولڈ میڈل جیتا تھا۔ وہ اس ٹیم کا سب سے سینئر طالب علم تھا۔ وہ ان سب کا لجیبٹ کے بیچ میں واحد یونیورسٹی اسٹوڈنٹ تھا اس لیے اس کا نخرہ ان سب سے زیادہ تھا۔ آمنہ کی اور اس کی ملاقات ہمیشہ ناخوش گوار انداز میں ہوئی تھی۔ اب بھی واپسی کا سفر طے کرتے ہوئے آمنہ اس کا سامنا بالکل نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''ہاں میں واپس جارہی ہوں۔'' وہ چلتے ہوئے بولی عمر ایزد اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

''کیوں؟ انڈین بیوٹیز کی باتیں تمہیں دلچسپ نہیں لگ رہیں؟'' اس نے ایک اور سوال کیا۔ آمنہ نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

''کہاں ہوتی ہو آج کل؟ کیا کررہی ہو؟'' اپنی عادت کے برعکس وہ مسلسل سوال کررہا تھا۔

''انٹرنیشنل ریلیشنز میں ماسٹرز کررہی ہوں قائداعظم یونیورسٹی سے اور تم؟'' آمنہ نے اکتا کر پوچھا تھا۔

''ویل...... میں بھی ماسٹرز ہی کررہا ہوں کشمیریات میں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

آمنہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ جب پہلی بار اس سے ملا تھا' تب وہ شاید ہسٹری میں ماسٹرز کررہا تھا۔

''اتنا حیران کیوں ہورہی ہو' کیا میں شکل سے اسٹوڈنٹ نہیں لگتا؟ دراصل اس کا کریڈٹ ہماری پنجاب یونیورسٹی کو جاتا ہے۔ یونیورسٹی نے جو ایوننگ پروگرام شروع کیے ہیں' اس کی بدولت آپ خود کو ہمیشہ اسٹوڈنٹ کہلواسکتے ہیں کیونکہ ایوننگ پروگرامز میں داخلے کے لیے عمر کی کوئی حد نہیں رکھی گئی۔''

وہ اس کی حیرت دور کرتے ہوئے بولا۔ وہ دونوں کاریڈور سے نکل کر اپنے اپنے بیجز باہر کھڑے گارڈز کو دکھا رہے تھے۔ اس کام سے فارغ ہوکر وہ مین گیٹ کی جانب بڑھ گئے۔

''تم پہلے سے بہت بدل گئی ہو۔'' اس نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ آمنہ اب بھی خاموش رہی۔

''تم نے اب بھی اخبار پڑھنا شروع کیا یا نہیں؟ کیا ابھی تک اپنے دادو سے رٹی رٹائی باتیں سن کر تقریریں کرتی رہتی ہو۔'' اس نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں کہا۔ وہ پہلے بھی آمنہ کو تنگ کرنے کے لیے کہتا تھا کہ وہ نالائق لڑکی ہے جو اپنے دادو سے تقریر لکھواتی ہے۔

''اگر اب تم نے اخبار پڑھنا شروع کردیا ہے تو یقیناً میرا نام تمہاری نظر سے گزرتا ہوگا۔

میرے کالمز تو تم پڑھتی ہی ہو گی؟''

وہ پرزعم انداز سے کہہ رہا تھا۔ آمنہ نے ذرا کی ذرا اس کی جانب دیکھا۔

''میں عمر اکبر کے نام سے کالم لکھتا ہوں۔'' ایک اور اطلاع دی گئی۔ آمنہ نے اس کے کچھ کالمز پڑھ رکھے تھے۔

''تمہیں میرے کالمز پسند تو آئے ہوں گے۔اب تم تعریف کرو گی' مجھے سراہو گی پھر مجھ سے پوچھو گی کہ میں اتنا اچھا کیسے لکھ لیتا ہوں۔'' وہ اتراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''نہیں' میں ایسا کچھ نہیں کہوں گی اور ایسا کوئی احمقانہ سوال بھی نہیں پوچھوں گی کیونکہ میں تمہارے کالمز نہیں پڑھتی۔ میں نے تمہارا ایک آدھ کالم پڑھا تھا اور وہ مجھے بالکل پسند نہیں آیا تھا۔''

آمنہ نے صاف گوئی کی حد کردی۔

''مائنڈ مت کرنا مگر یہ حقیقت ہے کہ تم بہت بکواس لکھتے ہو۔'' اس کے چہرے پر کھسیانی سی مسکراہٹ آگئی جسے اس نے فوراً چھپالیا پھر ڈھٹائی سے بولا۔

''تم جیسے لوگ جو خود طریقے سے کچھ لکھ بھی نہیں پاتے' وہ اسی طرح دوسروں کے لکھے ہوئے پر تنقید کرتے ہیں۔''

''میں تنقید نہیں کررہی' صرف حقیقت بیان کررہی ہوں۔ مثلاً وہ کالم جو تم نے پچھلے سال ''پندرہ اگست'' کے ٹائٹل سے لکھا تھا' وہ نہایت بکواس تھا۔''

آمنہ نے اسی کے انداز میں کہا۔ اسے وہ کالم بہت اچھی طرح سے یاد تھا کیونکہ اس نے اور دادو نے اس کالم پر کافی دل کھول کر تبصرہ کیا تھا۔

''اب مجھے نہیں یاد تم کس کالم کی بات کررہی ہو' میں تو ہر ہفتے تین کالم لکھتا ہوں۔ بائی دا وے تمہیں اتنا پرانا کالم کیسے یاد آیا؟'' وہ حیرت سے بولا۔ آمنہ کے چہرے پر استہزائیہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تم نے اس کالم میں اس بات پر زور دیا تھا کہ دراصل پاکستان 14 نہیں 15 اگست کو آزاد ہوا تھا اور پاکستان کا یوم آزادی 15 اگست کو منایا جانا چاہیے۔

آمنہ نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

''ہاں تو اس میں ''بکواس'' کیا ہے۔ یہ تو سراسر حقیقت پر مبنی بات ہے۔ میں ثابت کرسکتا ہوں کیونکہ میرے پاس بہت سے ہسٹری کے پروفیسرز کے انٹرویو ہیں جو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ دراصل پاکستان چودہ اگست کو نہیں بلکہ......

''ایک منٹ۔'' آمنہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔

''مجھے تمہاری باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں کسی پروفیسر کی بات نہیں مانتی۔ میں



صرف یہ جانتی ہوں کہ پاکستان اسی تاریخ کو وجود میں آیا جس تاریخ کا ذکر کرتے ہی اس سرزمین کے بوڑھوں' بچوں اور جوانوں کے دل ولولے اور جوش سے گنگنانے لگتے ہیں۔ تم ان کے دلوں میں جھانک کر دیکھو۔ وہ پندرہ نہیں' چودہ اگست کو جشن آزادی پاکستان منایا کرتے ہیں۔ تاریخ اہم نہیں ہوتی' دن اہم ہوتے ہیں عمر!''

وہ رسانیت سے بات کررہی تھی۔ حالانکہ اس دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ عمر ایزد سے کوئی بحث کرے۔

''واؤ...... یہ تم ہی ہونا آمنہ ابوبکر! یہ معجزہ کیسے ہوگیا۔ اب تم ایسی باتیں کیا کرتی ہو۔ میں نے تمہارے بارے میں سنا تھا کہ تم بہت بدل گئی ہو مگر مجھے یقین نہیں آیا تھا...... بھئی...... یہ کایا پلٹ کیسے؟''

وہ مصنوعی انداز میں تحیر کا اظہار کرتا آمنہ کو سخت برا لگ رہا تھا۔

آمنہ اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے آگے بڑھ کر مین گیٹ کے گارڈز کو شناختی بیج دکھنے لگی۔ اس کے بعد وسیع کار پارکنگ ایریا تھا جسے کراس کرکے آمنہ کو اپنی گاڑی تک پہنچنا تھا۔ عمر ابھی بھی اسی کے ساتھ چل رہا تھا۔

''اچھا مت بتاؤ' بس ایک آخری بات پوچھ لوں۔ اگر تم اجازت دو۔''

وہ ڈھیٹ بنا کہہ رہا تھا۔ اس کے انداز واطوار آمنہ کو کسی قدر حیران کررہے تھے۔

''تمہارا منگیتر کیسا ہے؟ وہی ٹیکساس کا شہزادہ...... جس کا حوالہ تم بار بار اپنی گفتگو میں دیا کرتی تھیں۔ وہ جو شاید انڈیا میں رہتا تھا اور اب جب یہ کانفرنس روم میں تمہارے سسرالی آئے بیٹھے ہیں تو تم منہ موڑ کر جارہی ہو۔''

وہ کھلنڈرے پن سے بولا تھا۔ آمنہ نے گہری سانس بھری پھر جان چھڑانے کے لیے جلدی سے بولی۔

''وہ مرچکا ہے۔'' اس کے انداز میں اس قدر سکون تھا کہ عمر ایزد نے گھور کر اس کی طرف دیکھا کہ کہیں وہ مذاق تو نہیں کررہی مگر اس کے چہرے پر سنجیدگی ہی سنجیدگی تھی۔

''اوہ...... اس کا مطلب ویکنسی خالی ہے۔'' وہ یکدم ہی سابقہ انداز میں بولنے لگا۔ آمنہ نے اب کی بار اسے گھور کر دیکھا مگر منہ سے کچھ کہنے کے بجائے وہ آگے کی طرف بڑھ گئی۔ عمر ایزد کا یہ روپ اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

''اچھا یار! '' آئی ایم سوری' ختم کرو اب۔ یہ بتاؤ' اس کانفرنس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے' اچھی بات ہے نا۔ یہ برسوں کی جمی برف ضرور پگھلنی چاہیے۔''

آمنہ کے انداز نے اسے شاید ذرا سا خائف کیا تھا۔

’’سوال یہ نہیں ہے کہ برف پگھلنی چاہیے۔سوال کہ ہے کہ کیا یہ پگھل سکتی ہے؟‘‘ اس نے گہری سانس بھر کر کہا۔عمر ایزد کو اس جواب کی توقع نہیں تھی۔

’’اور کم آن آمنہ! ایسی باتیں مت کرو جیسے میانوالی یا چیچہ وطنی کے کسی گاؤں کے چوپال میں بیٹھے اسی اسی سال کے بوڑھے کرتے ہیں۔ بی پریکٹیکل یار! اٹس اے نیڈ آف آور۔‘‘ (عملی بنو‘ یہ وقت کی ضرورت ہے۔)

وہ چڑ کر بولا۔ آمنہ نے گہری سانس بھری‘ وہ اس کے سامنے جذباتی نہیں ہونا چاہتی تھی۔

’’وہ دوستی کا پیغام لے کر آئے ہیں‘ ہمیں کم از کم اس پیغام کو سمجھنا چاہیے۔‘‘

وہ اسی زبان میں بات کررہا تھا جس میں کانفرنس روم میں بیٹھے ہوئے آمنہ کے باقی ساتھی متفق تھے۔

’’یار!‘‘ مجھے ایک بات بتاؤ‘ تمہیں کون بیسٹ ڈیبیٹر کہتا ہے جبکہ تمہیں تو بولنا نہیں آتا۔‘‘ وہ اس کی خاموشی سے اکتا کر بولا۔

’’تم ٹھیک کہہ رہے ہو‘ مجھے بولنا نہیں آتا۔‘‘ اس نے سرد آہ بھرنے سے انداز میں کہا تھا۔ اس کے لہجے میں عجیب سی یاسیت اتر آئی۔

وہ اسلام آباد سے لاہور آئی تو دادو اسے دیکھ کر بے پناہ خوش ہوئے۔ جب انہیں کانفرنس کے متعلق پتا چلا تو وہ بہت پرجوش ہوگئے تھے۔ انہوں نے کئی ایک نکات پر آمنہ سے بحث کی تھی تاکہ وہ کانفرنس میں ان ہی خطوط پر بات کرسکے۔ انہیں پتا ہوتا کہ آمنہ اس طرح گنگ ہو کر سب سن کر آجائے گی تو شاید وہ اس پر بہت ناراض ہوتے۔

’’فرض کر لیتے ہیں کہ تمہیں بولنا نہیں آتا اور چند لمحے کے لیے یہ بھی فرض کر لیتے ہیں کہ مجھے سننا نہیں آتا۔ ہم دونوں گونگے بہرے ہیں۔ اب ہم دل ہی دل میں فرض کرتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے اشاروں کی زبان میں باتیں کر رہے ہیں اور پھر......‘‘

’’شٹ اپ پلیز مسٹر عمر ایزد!‘‘ وہ اس کی بک بک سے تنگ آ کر بولی۔ اس کا دل پہلے ہی بوجھل ہورہا تھا اور عمر کی بے معنی گفتگو اسے زچ کرنے کو کافی تھی۔

’’میں شٹ اپ ہوجاتا ہوں مگر تم مجھے یہ بتادو کہ اس کانفرنس روم میں جو بھی باتیں ہورہی ہیں‘ تم ان سے اتفاق کرتی ہو یا نہیں؟‘‘ وہ بے شرمی اور ڈھٹائی کی انتہا کرتے ہوئے بولا۔

’’میں ان سے بالکل اتفاق نہیں کرتی کیونکہ وہ سب بکواس ہے‘ جھوٹ ہیں۔ وہ جس دوستی کا پرچار کررہے ہیں‘ وہ دوستی نہیں ہے۔ وہ ہماری آستینوں کے سانپ ہیں۔ وہ کبھی ہمیں ڈنگ مارنے سے باز نہیں آئیں گے۔‘‘

آمنہ قدرے اونچی آواز میں بولی تھی۔ عمر نے اردگرد دیکھا‘ وہاں ان کے علاوہ کوئی نہیں



تھا۔ سوائے گاڑیوں کی لمبی قطاروں کے جبکہ بائیں جانب جنگلا نما گیٹ تھا جس پر لگی روشنیاں ان دونوں کے چہرے کا احاطہ کر رہی تھیں۔

’’ایسا لازمی نہیں ہے۔ اگر تم دماغ سے سوچو تو تمہیں احساس ہوگا کہ......‘‘

آمنہ نے یکدم عمر کی بات کاٹی۔

’’دماغ کے فیصلے دل کی مشاورت سے طے ہونے چاہییں جو قومیں دل و دماغ کی اس مشاورت کو ترک کر دیتی ہیں‘ اور ان کے دلوں پر قفل لگ جاتے ہیں۔ انہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ ہاتھ کا استعمال کس جگہ کرنا ہے اور زبان کا کس جگہ۔‘‘

وہ چلا کر بولی تھی۔ اس کے منہ میں 1965ء سے کچھ عرصہ پہلے پیدا ہونے والے کسی شخص کی زبان تھی۔

’’مجھے یہ بات میرے دادو نے تب کہی تھی جب میں فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی۔ انہیں میرے کتھک ڈانس کی کلاسز لینے پر اعتراض تھا۔ انہیں میرے انڈین گانے سننے پر اعتراض تھا اور مجھے ان کی باتیں سن کر لگتا تھا جیسے وہ پاگل ہیں‘ سٹھیا گئے ہیں۔ جیسے ان کے دل میں صرف نفرت ہی نفرت ہے مجھے ان کی باتیں سن سن کر الجھن ہوتی تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے احساس ہوتا گیا کہ پاگل وہ نہیں تھے‘ پاگل میں تھی جو ان کی باتوں کو سمجھ نہیں پائی تھی۔‘‘ اس نے لحہ بھر رک کر سانس لیا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے تھے۔

’’میرے دادو کے بڑے بھائی نے 1940ء میں ہندو مسلم فسادات میں اپنی جان گنوائی تھی پھر پاکستان بن گیا۔ میرے دادو نے ہجرت کے وقت اپنے ماں باپ کو اپنی آنکھوں سے وحشت و بربریت کا نشانہ بنتے دیکھا تھا۔ وہ جس بھائی کو اپنے ساتھ بچا کر لانے میں کامیاب ہوئے تھے‘ بعد میں وہی بھائی مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی کے ہاتھوں شہید ہوا تھا۔ میرے ابو کشمیر میں شہید ہوئے تھے۔ میں نے قاسم کو احمد آباد میں کھویا تھا۔‘‘

وہ ایک بار پھر خاموش ہوئی اب کی بار آنسو اس کی آنکھوں سے اتر کر گالوں پہ پھسلنے لگے۔

’’یہ باتیں تمہارے لیے اہم نہیں ہیں کیونکہ ایسی بہت سی باتیں تم بہت سے بوڑھوں کے منہ سے سن چکے ہوگے۔ اسی سال کا کوئی بوڑھا‘ ستر سال کی کوئی بوڑھی تمہیں ایسے کئی واقعات سنا سکتی ہے۔ ان میں کوئی نیا پن نہیں ہے مگر کوئی ہم لوگوں سے پوچھے جن کے دل‘ دل نہیں رہے‘ کھنڈوں سے بھرے زخم بن چکے ہیں۔ ایسے حالات میں کوئی اٹھ کر جب ان آستینوں کے سانپوں سے دوستی کی باتیں کرتا ہے تو ہمارے یہ دل زار زار روتے ہیں۔‘‘

اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ عمر کو ایسے حالات کی امید نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر اسی طرح روتی رہی پھر اپنے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

"تم یہ باتیں 1965ء میں شہید ہونے والے کسی فوجی کے سوگواران سے کر کے دیکھو۔ تم یہ مشورے 1971ء میں مکتی باہنی کے ہاتھوں ذلت ناک موت پانے والے لوگوں کے سوگواران سے مانگو اور تم یہ باتیں کارگل میں شہید ہونے والے فوجیوں کے گھر والوں سے پوچھو یا پھر وہ لوگ جو سیاچن میں شہید ہوئے' اس کے علاوہ وہ لوگ جو ہر سال سرحد پر کراس فائرنگ میں شہید ہوجاتے ہیں۔ کبھی ان کے گھر والوں سے یہ باتیں کر کے دیکھو' تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا کہ میں اس "دوستی" کے بارے میں کیا سوچتی ہوں۔"

اس نے رک کر عمر کی جانب دیکھا جو لاتعلقی کے انداز میں چیونگم چبا رہا تھا۔

"میں یہ نہیں کہتی کہ مذاکرات نہیں ہونے چاہئیں یا دوستی کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں مگر جو لوگ دوست بن کر آئے ہیں' انہیں دوستوں کی طرح ہی ٹریٹ کرو۔ انہیں فرشتہ سمجھ کر کندھوں پر مت بٹھاؤ' اس "نام نہاد دوستی" میں چھپے اصلی راز کی تہہ تک پہنچنا ضروری ہے جو ہم میں سے کوئی بھی نہیں کر رہا بلکہ ہم خوشی سے پاگل ہو رہے ہیں۔ وہ صرف ہاتھ ملاتے ہیں اور ہم بغل گیر ہونے کو تیار ہوجاتے ہیں۔ وہ ان ایشوز پر بات نہیں کرتے جو ہمارے فائدے کے ہیں مگر جو بات ان کو فائدہ دے رہی ہے' وہ بار بار گھما پھرا کر اسی ایشو کو ڈسکس کرنے لگتے ہیں۔"

اس نے توقف کر کے سانس لیا اور عمر شاید اسی موقع کے انتظار میں تھا۔ وہ تالیاں بجانے لگا۔

"یار! تم جھوٹ بول رہی تھیں کہ تم بولنا نہیں جانتیں۔ تم تو بہت اچھا بولتی ہو۔ لوگ اگر تمہیں بیسٹ ڈیبیٹر کہتے ہیں تو یقیناً ٹھیک کہتے ہیں۔"

اس کے چہرے اور آنکھوں میں عجیب سی شرارتی مسکراہٹ تھی۔

"مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ تم کانفرنس روم میں خاموش کیوں بیٹھی رہیں۔ کسی بات پر تو اختلاف کرتیں نا تاکہ ہمیں بھی احساس ہوتا کہ ہم میں بھی ایک "زندہ" انسان موجود ہے۔"

عمر کا لہجہ پہلی بار سنجیدہ ہوا تھا۔

"میں کیا بولتی عمر ایزد! میں اکیلی ہوں۔ وہاں میرا ساتھ دینے کو ایک بھی شخص موجود نہیں۔ میرے انچاس کے انچاس ساتھی میرا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھے میں اکیلی کیا بولتی۔" وہ مایوسی سے بولی۔

"لوجی...... تم اس لیے خاموش تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ تم شریمتی قانتا راج پال کی انگریزی سے خائف ہو۔ باپ رے' وہ بہت روانی سے انگریزی بولتی ہے۔"

عمر ایزد کے چہرے سے سنجیدگی بالکل غائب ہو چکی تھی۔ آمنہ نے تاسف سے اس کی جانب دیکھا۔ اسے لگا وہ صحیح باتیں ایک غلط شخص کے سامنے کر بیٹھی تھی۔ عمر ایزد سے یہ باتیں کرنا ایسے ہی تھا



جیسے بھینس کے آگے بین بجانا۔ وہ خاموشی سے اپنی گاڑی کی جانب بڑھنے لگی۔ عمر ایزد نے ایسے پشت سے آواز دی تھی۔

"اے مس آمنہ ابوبکر!...... ذرا رکنا تو۔"

آمنہ کے قدم خود بخود رک گئے۔ وہ چند قدم بھر کر اس کے قریب آ گیا۔

"مجھے اس بات پر ہمیشہ حیرت ہوتی ہے کہ مسلمان ہو کر ہم لوگ اکیلے ہونے سے کیوں ڈرتے ہیں۔ حالانکہ "ہم" جانتے ہیں کہ ہم کبھی اکیلے نہیں ہوتے۔ تم بھی ایک عام سی مسلمان نکلیں آمنہ ابوبکر! تم نے بھی عام مسلمان کی طرح "اکائی کی طاقت" پر بھروسہ نہیں کیا نا۔ "اکائی کی طاقت" تو کائنات کی مالک ہے۔ خیر یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ یہ لو' اپنی آنکھیں صاف کر لو۔"

اس نے اپنی جینز کی ہپ پاکٹ سے سفید رنگ کا ایک رومال نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔ آمنہ کے ہاتھ میکانکی انداز میں رومال کی جانب بڑھے۔ عمر کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اکائی کی طاقت" دنیا پر حکمرانی کرتی ہے۔ تم آزما کر تو دیکھو۔"

اس نے آسمان کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ آمنہ نے حیرت سے اس "ولی" کی جانب دیکھا۔ وہ واپس کانفرنس روم کی جانب چل دیا تھا۔ آمنہ وہیں کھڑی رہی۔ چند قدم چلنے کے بعد عمر نے دوبارہ سے آمنہ کی جانب مڑ کر دیکھا۔

"سنو...... کانفرنس روم میں واپس آنے سے پہلے چہرہ مت دھونا' آنسوؤں سے بھری تمہاری آنکھیں بہت خوبصورت لگتی ہیں۔ قانتا راج پال کی ساری خوبصورتی تمہاری ان دو آنکھوں کے آگے بے بس دکھائی دینے لگے گی۔"

آمنہ پہلی بار اس کے فلرٹی انداز پر مسکرائی۔ وہ کانفرنس روم کی جانب بڑھتے ہوئے دوبارہ سے بہت پرجوش ہو چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

کسی نے سچ کہا ہے یہ
محبت اور کہانی میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا
مگر میری محبت تو
کہانی ہی کہانی میں
کوئی راجہ نہ رانی ہے
نہ شہزادہ نہ شہزادی
محبت کی کہانی تو
مسافت ہی مسافت ہے

محبت کی مسافت اور
ضرورت کی مسافت میں
مسافر واپسی کے سارے امکاں پاس رکھتا ہے
محبت کی مسافت میں
مسافر کے پلٹنے کا کوئی رَستہ نہیں ہوتا
وہ ساری کشتیاں اپنی
جلا دیتے ہیں ساحل پر
کہ نا اُمید ہونے پر
پلٹنا بھی اگر چاہیں
تو واپس جا نہیں پائیں
وہیں غرقاب ہو جائیں

''برصغیر کی تقسیم ہی غلط تھی۔''

کانفرنس روم میں گونجنے والی یہ آواز آمنہ ابوبکر کی تھی۔ اسے بہت دیر خاموش رہنے کے بعد بولنے کا موقع ملا تھا اور وہ اس موقع کا پورا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔

''اکائی کی طاقت دنیا پر حکمرانی کرتی ہے' تم آزما کر تو دیکھو۔''

عمر ایزد کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور اس کی آنکھیں آمنہ کو ''کیری آن'' کا سگنل دے رہی تھیں۔ اس نے بھی قانتا راج پال کی طرح بالوں میں ہاتھ چلایا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''برصغیر کی تقسیم ہی غلط تھی کیونکہ تقسیم کرنا تو ایک چیز کو دو برابر حصوں میں بانٹنا ہوتا ہے جبکہ برصغیر کی تقسیم تو ہم سب کے سامنے ہے۔ اس تقسیم میں برابری کے کسی اصول کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا تھا' اس لیے اصولاً یہ تقسیم غلط ہے۔''

وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور پھر سامنے دیکھا۔ اسے سامنے والی رو میں بیٹھے لوگوں کے چہرے پر تجسس نظر آیا۔ وہ سننا چاہتے تھے کہ آمنہ مزید کیا کہتی ہے۔

''یہ تقسیم درست ہو سکتی تھی' اگر کانگریس حقیقتاً بڑے بھائی کا فرض ادا کرتے ہوئے پاکستان کے حصول کو ہندوستان کے ساتھ ملحق کرنے کی سازش نہ کرتی مگر خیر اب تو جو ہونا تھا' ہو چکا۔ ان پرانی باتوں کو یاد رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اب فائدہ کس بات میں ہے۔ میں آپ لوگوں کی بات سے اتفاق کرتی ہوں کہ برصغیر کی تقسیم سے ہمارا زیادہ نقصان ہوا کیونکہ نقصان ہمیشہ اس کا زیادہ ہوتا ہے جس کے ساتھ دھاندلی اور بے ایمانی ہوتی ہے۔''

اس نے پھر توقف کیا۔ سامنے کی رو میں بیٹھے لوگوں کا پہلو بدلنا اس سے مخفی نہیں رہا تھا جبکہ



اس کے پیچھے بیٹھی مدیحہ اقتدار کا ہاتھ اس کے کندھے پر آ ٹکا تھا۔ اس نے بہت نرمی سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔ سمیرہ سہگل کے ہونٹوں پر رکھی انگلی کو نظر انداز کیا اور مصطفیٰ کمال تارڑ کی آنکھوں میں چھپی سرزنش کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے عمر کی جانب دیکھا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں ''V'' کا نشان بنا رہی تھیں۔

عمر ایزد کے بائیں جانب بلال اطہر بیٹھا تھا جس کے چہرے پر بے پناہ دلچسپی تھی۔ ایمان گل بھی پر تجسس نظروں سے آمنہ کی جانب دیکھ رہی تھی۔ آمنہ نے اپنے اندر توانائی کی ایک مسرور کُن لہر اترتی محسوس کی۔ وہ اکیلی کب تھی' اس کے ساتھ اس کے اپنے تھے جو اسے حوصلہ دے رہے تھے۔

''آپ لوگ حقیقتاً ایک عالی ظرف قوم ہیں جو ہمسایہ ممالک کو ساتھ لے کر آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتی ہے اور کبھی کبھی آپ اتنا آگے بڑھ جاتے ہیں کہ آپ کی خود سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ واپس کیسے جائیں گے چونکہ کشمیر کی بات کرنا فی الحال آپ کو پسند نہیں' اس لیے پہلے ہم بنگلہ دیش کی بات کریں گے۔ آپ نے پاکستان کے وجود کو کبھی تسلیم نہیں کیا اور اس تقسیم کو ہمیشہ غلط قرار دیا مگر جب بنگلہ دیش قائم ہوا تو آپ نے نہ صرف اس تقسیم کو جائز قرار دیا بلکہ آپ بنگلہ دیش کے وجود کو تسلیم کرنے والے چند پہلے ممالک میں سے ایک تھے۔

میں یہ نہیں کہہ رہی کہ یہ دوغلا پن ہے' یہ تو آپ کی خارجہ پالیسی ہے۔ اب آپ کی خاجہ پالسی دوغلی ہے یا نہیں' یہ تو آپ کو ہی پتا ہوگا۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ آپ بہت عالی ظرف لوگ ہیں۔

آپ نے مکتی باہنی بنا کر ہمسایہ ملک کا کتنا ساتھ دیا۔ آپ کے اس ساتھ دینے سے ہمارے یہاں کتنے باپوں نے اپنی جوان اولادوں کو دفنایا۔ آپ کو اس امر سے کوئی دلچسپی نہیں اور آپ کو دلچسپی ہونی بھی نہیں چاہیے کیونکہ کچھ معاملات میں ''چشم پوشی'' ہی بہتر رویہ ہوتی ہے۔

آپ سب لوگ بھارت سے آئے ہیں' بھارت' پاکستان کے لیے بڑے بھائی کا درجہ رکھتا ہے اور بڑے بھائی اکثر معاملات میں اس طرح کی ''چشم پوشی'' کر ہی جاتے ہیں مگر ہم لوگ چشم پوش ہیں نہ ہی اعلاظرف۔ ہم لوگ آپ لوگوں جیسا رویہ اپنا ہی نہیں سکتے' اس لیے بنگلہ دیش کے قیام کے وقت ہم نے اپنے زخموں کو خود ہی سہلا لیا تھا اور ان پر خود ہی مرہم لگا کر مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش کے روپ میں تسلیم کر لیا تھا۔ ہم اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہوئے مگر آپ کی طرح وسعت نظری کا ثبوت نہ دے پائے۔ ہم نے بنگلہ دیش کے اندرونی معاملات میں دوبارہ دخل دینے کی کوشش نہیں کی۔''

اس نے رک کر سانس لیا تو بہت سے لوگوں نے بھی گہری سانسیں بھریں۔

''مس آمنہ......! یو آر کوائٹ رونگ اینڈ کین......''

(مس آمنہ! آپ بالکل غلط کہہ رہی ہیں۔ میں......) سورج گپتا نے لمحہ بھر کی خاموشی سے

فائدہ اٹھانا چاہا مگر سمیرہ سہگل نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ہم نے بھی آپ کی ساری باتیں خاموشی سے سنی تھیں مسٹر سورج گپتا۔ اب آپ کی باری ہے۔''

آمنہ نے خفیف سے تحیر میں گھر کر سمیرہ سہگل کی جانب دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر رکھی انگلی غائب ہو چکی تھی۔

''سمیرہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' رابعہ اشفاق بولی جو سمیرہ کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی تھی' آمنہ کھل کر مسکرائی۔

''اکائی کی طاقت دنیا پر حکمرانی کرتی ہے۔ تم آزما کر دیکھو'

آمنہ کی سماعتوں میں سرگوشی ہوئی اور اس کے چہرے کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

''میں آمنہ سے اتفاق کرتا ہوں۔ آپ لوگ سچ مچ بہت اچھے چشم پوش ہیں' آپ لوگ ہمارے خیر خواہ ہیں مگر جن معاملات میں بھی ہمیں آپ کی ضرورت پڑی' آپ نے چشم پوشی کا رویہ اختیار کیا۔''

عثمان علی نے کرسی کی بیک سے کمر ٹکاتے ہوئے بہت میٹھے لہجے میں کہا۔ وہ سب اسی لہجے میں بات کر رہے تھے۔ سب کی یہی کوشش تھی کہ لہجہ بھی تلخ نہ ہو اور دل کی بھڑاس بھی نکل جائے۔

''تم غلط کہہ رہے ہو عثمان!'' عمر ایزد نے حاضرین کی جانب دیکھ کر گفتگو کا آغاز کیا۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''ان لوگوں نے اکثر معاملات میں ہماری مدد بھی کی ہے۔ ایٹمی دھماکے اس کی روشن مثال ہیں۔ یہ لوگ دھماکے کرنے میں پہل نہ کرتے تو ہماری کیا مجال تھی کہ ہم اپنی ایٹمی ٹیکنالوجی دنیا کے سامنے لاتے' اس لیے اس کامیابی کا کریڈٹ انہیں ملنا چاہیے۔

''ہماری کامیابی کا کریڈٹ آپ لوگوں کو جاتا ہے اور آپ کی کامیابی کا کریڈٹ ہمیں ملنا چاہیے۔ آپ کی اتنی طاقتور معشیت کا تھوڑا سا بوجھ تو ہمارے نازک کندھوں پر بھی ہے۔ آپ اپنی طاقتور معشیت کو مزید طاقتور بنانے کے لیے دوڑ دوڑ کر اس طرف آتے ہیں مگر آپ جب بھی آتے ہیں' صرف معیشت کی بات کیوں کرتے ہیں۔ آپ اپنی رنگین ثقافت کو ہی میٹنگ ایجنڈا کیوں بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ صرف اپنے فنکاروں' گلوکاروں اور کھلاڑیوں کو ہی یہاں بھیجنے میں دلچسپی کیوں لیتے ہیں' جبکہ ہمارے یہاں سے صنعتکار' کمپیوٹر انجینئرز' ڈاکٹرز' اکنامسٹ اور انویسٹرز ہی کو اپنے یہاں بلوانے پر کیوں اصرار کرتے ہیں۔ آپ حقیقتاً ہماری اکانومی کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں تو پھر اپنے یہاں سے بھی لوگوں کو یہاں کیوں نہیں بھیجتے۔''

عثمان علی اکنامکس کا اسٹوڈنٹ تھا' اس کی دلچسپی اس موضوع میں تھی۔



''ہمیں اگر آپ کی معیشت کے استحکام میں دلچسپی نہ ہوتی تو ہم اپنی اٹھارہ ہزار کی موٹر بائیک آپ کو پندرہ ہزار میں بیچنے پر کیوں تیار ہوتے؟'' ہمیں اگر آپ کی پروا نہ ہوتی تو ہم آپ کے بچوں کی اپنے ہاسپٹلز میں مفت سرجری کیوں کرتے؟ ہم آپ کے لوکل فنکاروں اور گلوکاروں کو اپنے انٹرنیشنل لیول کے چینلز پر کوریج کیوں دیتے؟''

قانتا راج پال نے پیشانی پر آئی نمی کو غیر محسوس طریقے سے صاف کرتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔

''یہ تو ایک عام فہم سی بات ہے۔ بھلا آپ......'' آمنہ نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ عثمان نے پھر اس کی بات کاٹی۔

''آمنہ! پہلے مجھے ایک بات کلیئر کرنے دو' میں آپ کی توجہ ایک اہم ایشو کی طرف دلانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ آپ اپنی اٹھارہ ہزار کی بائیک ہمیں پندرہ ہزار میں بیچ کر بھی نقصان میں نہیں رہیں گے' کیونکہ پاکستانی پندرہ ہزار روپے تقریباً انڈین اٹھارہ انیس ہزار روپے کے لگ بھگ ہی بن جاتے ہیں۔ کرنسی ریٹ سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ قطعاً گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔''

عثمان اپنی عینک کو ناک پہ جماتے ہوئے سابقہ انداز میں بولا۔

''جہاں تک اپنے ہاسپٹلز میں بچوں کے مفت علاج کی بات ہے تو وہ دوسرے لوگوں کے لیے صرف ایک پبلسٹی پروگرام تھا تا کہ وہ اپنے بیمار بچوں کو آپ کے کارڈیک سرجری کے وارڈز میں علاج کی غرض سے لاسکیں کیونکہ دل کے امراض کا بہترین علاج آپ کے یہاں ہوتا ہے مگر ہمارے یہاں بھی کینسر کا بہترین علاج ہوتا ہے مگر آپ اپنے مریضوں کو پاکستان کی سرزمین پر علاج کی غرض سے بھیجنا بھی پسند نہیں کرتے بلکہ امریکہ اور یورپ' اسرائیل اور روس بھجوانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے اور ہم سے آپ یہ توقع کرتے ہیں کہ ہم مہنگی مہنگی میڈیکل ٹریٹمنٹس کے لیے اپنے مریضوں کو انڈیا بھجواتے رہیں۔ آپ یہ لاجک بھی پیش کرتے ہیں کہ جب ہمسایہ ملک میں بہترین سہولیات میسر ہیں تو پھر امریکہ یا یورپ جا کر خوار ہونے کا فائدہ۔ آپ کو نہیں لگتا کہ کسی بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی کے ساتھ ایسی دورخی پالیسی نہیں اپنانی چاہیے۔

آمنہ کی ہر دلیل اس کے ساتھیوں کو دل ہی دل میں واہ واہ کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ان کے سامنے والی والی رو میں بیٹھے لوگ بھی خود کو بے بس محسوس کر رہے تھے۔

اب کی بار وہ بولنا چاہتے تھے مگر چونکہ ان کی بات خاموشی سے سنی گئی تھی' اس لیے وہ مجبور تھے کہ سب باتیں خاموشی سے سنیں۔

''آپ ہمارے فنکاروں اور گلوکاروں کو کوریج دے رہے ہیں تو یہ بھی پی آر بڑھانے کا

ایک طریقہ ہے۔ آپ پبلسٹی کے لیے یہ سب کر رہے ہیں۔ یہ بھی آپ کی میڈیا وار کا ایک حصّہ ہے۔ آپ ہمارے لوکل فنکاروں کو اتنا بڑھا چڑھا کر اسے لیے پیش کر رہے ہیں تاکہ دنیا بھر کو بتا سکیں کہ آپ بہت عظیم لوگ ہیں اور آپ دوسرے ممالک سے دوستی کرنے کے خواہاں ہیں۔ آپ کو ہم سے غرض نہیں مگر آپ یورپی اور امریکی اقوام کے منہ سے ''واہ واہ'' ضرور سننا چاہتے ہیں۔'' آمنہ کہنے لگی۔

''آپ لوگوں نے خارجہ پالیسی پر بحث شروع کردی ہے۔'' ریتو ورما نے ماحول کی تلخی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''یہ ہمارا قصور نہیں ہے کہ ہماری گفتگو میں بار بار خارجہ پالیسی کا ذکر آجاتا ہے۔ یہ ہمارے تعلقات کی ڈیمانڈ ہے۔ ہم خارجہ پالیسی کی وجہ سے ہی آج اس طرح ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہیں۔ تو ہماری گفتگو میں بار بار اس خارجہ پالیسی کا ذکر آئے گا۔''

بلال اطہر گویا تڑپ کر بولا۔ اس نے پہلی بار گفتگو میں حصّہ لیا تھا۔

''آئی ایم سوری۔ آپ کو شاید برا لگا مگر ہمارا یہ......'' قانتا راج پال نے معذرت کی جبکہ آمنہ نے اس کی بات کاٹی۔

''میں آپ کی بات کاٹنے کے لیے معذرت خواہ ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمیں یہ سب برا نہیں لگتا مگر آپ جس انداز سے یہ سب باتیں جتانے کی کوشش کرتے ہیں' وہ ہمیں اچھی نہیں لگتیں۔ آپ نے ابھی میڈیا کا حوالہ دیا اور یہ کہا کہ میڈیا ناکارہ ہوچکا ہے اور آپ کا میڈیا ہماری رگوں میں اترا ہوا ہے۔ آپ نے کلچر کا حوالہ دیا اور کہا۔ انڈین کلچر اب انڈیا سے زیادہ پاکستان میں نظر آتا ہے۔ آپ کی ان دونوں باتوں سے میں مکمل طور پر اتفاق نہیں کرتی مگر پھر بھی ایک بات تسلیم کرتی ہوں کہ ان دونوں باتوں میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔ آپ کا میڈیا حدود قیود سے آزاد جس قسم کی سوسائٹی کو پیش کرتا ہے' وہ پاکستانی ہی نہیں' انڈین قوم کو بھی گھیر رہی ہے۔ برائی میں لذت ہے اور مدہوشی میں سکون۔ آپ کا ہر چینل یہی سب دکھا رہا ہے اور لوگ یہی سب دیکھ رہے ہیں۔ آپ جن چینلز کو گھریلو چینلز کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ وہاں ایسا گھریلو ماحول دکھایا جاتا ہے کہ انسان سمجھتا ہے کہ شاید وہ جنت میں آگیا ہے۔ بڑے بڑے گھر' زرق برق کپڑوں میں ملبوس انسان۔ آپ ایسا ماحول پیش کرتے ہیں کہ انسان کو یقین ہوجاتا ہے کہ دنیا میں غریبی نام کی کوئی چیز نہیں' کسی ملازم نما انسان کو بھی مسئلہ درپیش ہوگا تو وہ سیکنڑوں' ہزاروں کا نہیں بلکہ لاکھوں کا ہوگا۔ انسان فینٹیسی میں رہنا پسند کرتا ہے اور آپ اسے فینٹیسی فراہم کررہے ہیں۔ اور یہ قوم کے لیے تباہ کن ہے۔

مجھے آپ لوگوں کے ایک مشہور چینل پر کچھ پروگرامز دیکھنے کا اتفاق ہوا اور ان پروگرامز کو دیکھ کر کہیں سے یہ محسوس نہیں ہوا کہ انڈیا آبادی کے لحاظ سے بڑا ملک ہے اور یہاں کے لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ غریبی اور بھوک ہے۔ مگر ان پروگرام کو دیکھ کر تو یہ احساس ہوتا ہے جیسے ''ناجائز اولاد''



ہندوستانی قوم کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔''

اس کی بات پر کئی چہروں پر دھیمی سی مسکراہٹ آئی تھی۔

''یہ بات تو خیر برسبیل تذکرہ آگئی۔ میں آمنہ کی بات کو آگے بڑھانا چاہتا تھا کہ آپ دھیرے دھیرے اپنی ہی نہیں' ہماری قوم کو بھی ٹرینکولائزرز کا عادی بنا رہے ہیں۔ نائن الیون والے واقعہ کے بعد کسی ''امریکن اسکالر'' نے کہا تھا کہ وہ لوگ جو دوسروں کو سلو پوائزن دے کر تباہ کررہے ہیں' ان کا انجام بدترین ہوگا۔ ان کا اشارہ افغانستان کی جانب تھا' جہاں پوست کی کاشت ہوتی ہے اور اس کے علاوہ وہ دہشت گردی کی بھی بات کررہے تھے۔ اب ان امریکن اسکالر کی بات ذہن میں آتی ہے تو ساتھ ہی آپ کی اس میڈیا وار کا خیال آجاتا ہے۔''

عثمان نے عجیب سی بات کی تھی مگر ساحر کمار تڑپ اٹھا اور تڑپنے والی بات بھی تھی۔ یہ تو ڈائریکٹ ان کے میڈیا کو بدنام کرنے والی بات تھی۔ ''آپ لوگ ہمارے میڈیا پر اس طرح تنقید نہیں کر سکتے کیونکہ آپ خود جانتے ہیں پورے پاکستان میں ہمارے ہٹ فنکار آپ کے قومی چینل پر بھی اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ آپ کی ساری قوم ہمارے فلمی ہیروز کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔''

''آپ کی بات اپنی جگہ درست ہے مگر ہم بھی کیا کریں۔ جب آپ اپنے چینلز پر دوسروں سے داد سمیٹنے کے لیے ہمارے فنکاروں کو دکھائیں گے تو ہمیں بھی مجبوراً آپ کے فنکاروں کو اپنے ٹی وی چینلز پر پیش کرنا پڑے گا اور پھر جہاں تک فلمی ہیروز کو دیکھ کر خوش ہونے کی بات ہے تو ہم لوگ کارٹونز دیکھ کر بھی بہت خوش ہوتے ہیں۔''

ساحر کمار کے خاموش ہونے پر عمر ایزد بولا تھا۔ ماحول میں تناؤ بڑھتا جارہا تھا۔

''سن 80ء میں ہمارا میڈیا بھی پاور فل تھا۔ ہمارا میوزک' ہمارے ٹی وی ڈرامے آپ لوگوں کے یہاں نہایت ذوق و شوق سے دیکھے جاتے تھے مگر ہم کتنا ریفائنڈ کلچر پیش کرتے تھے کہ ہمارے بہت سے مشہور پروگرامز اپنے چینلز پر آپ بغیر اجازت آج کل بھی پیش کرتے رہتے ہیں مگر ہم لوگوں نے کبھی آپ پر نہیں جتایا۔ آپ نے کہا کہ ہمارے یہاں بہت سی خواتین آپ کے یہاں کی خواتین سے متاثر ہوکر ساڑھی باندھتی ہیں اور ہم آپ کے کلچر کی نقل کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں ممالک کے کلچر میں تو فرق ہے مگر دونوں کلچرز پر ایک دوسرے کی چھاپ لگی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم آپ کے کلچر کی نقل کرتے ہیں' اس طرح تو آپ لوگوں کے یہاں بھی شلوار قمیض شوق سے پہنا جاتا ہے۔ آپ کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کی چیئرپرسن کی بیٹی اکثر اوقات شلوار قمیض میں ملبوس نظر آتی ہیں تو کیا ہم کہہ دیں کہ ہمارا کلچر آپ کے ایوان تک پہنچ چکا ہے۔''

آمنہ کا دماغ تیزی سے کام کررہا تھا۔ وہ ایک کے بعد ایک دلیل دینے لگی۔

''ہمیں آپ لوگوں کی ایسی باتوں سے یہ الجھن ہوتی ہے۔ ہم جب بھی آپ کی طرف

دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں تو آپ عجیب و غریب اختلافات کا ذکر شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کشمیر کی بات شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ آپ کو سمجھنا چاہیے کہ جب مشرقی پاکستان آپ کا حصّہ ہو کر آپ کے ساتھ نہیں رہ پایا تو کشمیر آپ کے ساتھ کیسے رہ سکے گا۔“

تارا ور ماجو ریتو ورما کی بہن تھی' نہایت تلخی سے بولی۔ اس کے ساتھیوں کے چہروں پر سکون اتر آیا۔ تارا ورما کے اس ”چوکے“ پر اس کے ساتھی داد دینے والی نظروں سے اس یک جانب دیکھنے لگے۔

”آپ اس بات کی فکر مت کیجئے۔ جب کشمیر ہمارا ہوگا تو یہ ہمارا بھی اندرونی معاملہ ہوگا۔ ویسے بھی کشمیر ہماری شہ رگ ہے تو شہ رگ کو دل کے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔“

مدیحہ اقتدار نے جذباتی انداز میں کہا مگر عمر ایزد نے اسے خاموش کروایا پھر گہری سانس بھر کر بولا۔

”آپ اس بات کی حقیقتاً فکر مت کیجئے۔ یہ فکر کشمیریوں کو کرنے دیجئے۔ انہیں استصواب رائے کا حق دیجئے' وہ خود ہی فیصلہ کر لیں گے اور یہ ہم برسوں سے کہتے آ رہے ہیں کہ کشمیری بھائیوں کو ان کی مرضی سے فیصلہ کرنے دیجئے۔“

”میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اگر آپ کشمیر میں مکتی باہنی کی سوتیلی بہن انڈین آرمی کی ناجائز سرگرمیوں کو روک دیں تو کشمیریوں اور کشمیر کے مسائل حل ہو جائیں گے' انشاء اللہ۔“

تسکین ظفر نے بھی اپنی پہلی انٹری دی جبکہ ان کی طرف سے قانتا بولنا شروع ہوئی۔

”ہم دوستی کا ہاتھ بڑھانے میں ہمیشہ پہل کرتے ہیں مگر آپ ہمارا ہاتھ جھٹک کر اس طرح کی بات کیوں شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کا واحد مسئلہ کشمیر ہی تو نہیں ہے۔ آپ مسائل کے انبار تلے دبے ہیں مگر آپ کو احساس ہی نہیں ہے۔ آپ اپنی معیشت کو مستحکم کرنے کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے۔ آپ عام لوگوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے جو امن و آشتی اور محبت سے رہنا چاہتے ہیں۔ آپ اپنی فلم انڈسٹری کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے جو زبوں حالی کا شکار ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ آپ نے ہمیشہ ہمارے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹکا ہے۔“

”تاریخ کے اوراق اس بات کی بھی گواہی دیں گے کہ ہم نے بہت بار آپ کو آزمانے کے بعد یہ پالیسی اپنائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے جب بھی آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا' آپ نے اسے قبول نہیں کیا بلکہ آپ نے ہماری دوستی کی کسی بھی آفر کو اہمیت نہیں دی' اس کے برعکس آپ نے جب ہاتھ بڑھایا' ہم نے نہ صرف اپنا ہاتھ آگے کیا بلکہ پورے خلوص سے اس دوستی کو مضبوط کرنا چاہا مگر آپ نے کیا کیا...... آپ نے ہمارا ہاتھ نہیں جھٹکا مگر اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا اور ہمارا ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا' اسی لیے اب ہم محتاط ہو گئے ہیں۔ ہمیں ڈر لگتا ہے کہ ہم اس ”لٹکنے“ والے مشغلے سے تنگ آ چکے ہیں اور پھر آپ کی ترجیحات بھی ہمیشہ الارم بجاتی رہتی ہے۔ آپ ہماری معیشت پر اتنا زور



دیتے ہیں کہ ہمیں محتاط ہونا پڑتا ہے۔ آپ یہاں اس غرض سے آئے ہیں کہ اپنے اپنے بزنس کو بڑھا سکیں' اسی لیے آپ نے بہت غور و فکر خوض کے بعد ان چیزوں کا انتخاب کیا ہے جو حقیقتاً صرف آپ کو فائدہ دیں گی۔ یہ تو نرا گھاٹے کا سودا ہے' اسی لیے ہم بار بار آپ کی ترجیحات سے ہٹ کر اپنی ترجیحات کی بات کرتے ہیں۔“

آمنہ نے طویل مکالمے کے بعد سانس لیا۔ اس کے ساتھی اس کے لیے میز بجا کر داد دے رہے تھے۔ اسے اب کوئی گھٹن محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بلال نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اب وہ بولنا چاہتا تھا۔

”ساری دنیا جانتی ہے کہ آپ کا فوکس آف انٹرسٹ صرف“ پاکستانی منڈی اور کاروبار کے مواقع“ ہے۔ کیا یہ بڑے بھائیوں والا رویہ ہے؟ کیا بڑے بھائی اس طرح سے چھوٹے بھائیوں کو استحصال کیا کرتے ہیں؟ آپ ہماری معیشت کو کمزور کرنا چاہتے ہیں کیونکہ آپ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ کسی ملک کو کمزور کرنا ہو تو پہلا حملہ اس کی معیشت پر کرنا چاہیے۔“

بلال اطہر کی بات پر ایک بار پھر تالیاں بج اٹھیں مگر یہ تالیاں صرف اس کے ساتھی بجا رہے تھے۔ ہمسایہ ملک سے آیا ہوا پچاس اسٹوڈنٹس کا وہ دستہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔ سچ کی تلخی نے ان کے حلق کو کڑوا کر دیا تھا۔

”ہم جانتے ہیں یہ پچاس برس کی شکایتیں ہیں جو اتنی آسانی سے دور نہیں ہوں گی۔ ہمیں اعتماد کی فضا قائم کرنی پڑے گی۔ ایک دوسرے کا ساتھ دینا ہوگا۔ اس بار ہم یہاں آئے ہیں' اگلی بار آپ آئیے گا۔ یہ آنا جانا ہوتا رہے گا تو سب شکایتیں دور ہوتی رہیں گی۔“

قانتا راج پال نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس ساری بحث سے کافی اکتائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کی تھکی تھکی سی بات پر بہت پر جوش تالیاں بجی تھیں۔

”ہم بھی آپ کے ساتھ خواہ مخواہ کی دشمنی کو طول نہیں دینا چاہتے۔ ہم بھی اچھے ہمسایوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں۔ ہم بھی آپ سے دوستی کے خواہاں ہیں مگر یہ دوستی صرف آپ کی ترجیحات کی بنیاد پر نہیں ہو سکتی' ہماری ترجیحات ہمارے لیے مقدم ہیں۔“

آمنہ نے کہا اور اس بار دونوں طرف سے اسے داد دی گئی تھی۔ حالانکہ تقریباً سب لوگ جانتے تھے کہ یہ اتنی جلدی ممکن نہیں ہے۔

”ہندوستان اور پاکستان کا تعلق اس دھاگے کی مانند ہے جو ٹوٹ جائے تو اسے گرہ لگا کر جوڑ لیا جاتا ہے مگر اس گرہ کی چبھن اور تلخی ساری زندگی نہیں جاتی۔“

آمنہ کو دادو کی کہی گئی بات ایک دفعہ پھر یاد آئی۔ اسے ان کی بات سے اتفاق تھا۔ چائے [illegible] اور ریفریشمنٹ کے لیے مہمانوں کو بلوایا جانے لگا۔ سب لوگ دھیرے دھیرے اپنی جگہ سے اٹھ کر ہال کی جاب جانے لگے۔

''ویل ڈن آمنہ ابوبکر!'' تسکین ظفر نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔

''شاباش آمنہ!'' اعجاز علی نے بھی داد دی جو اس ساری گفتگو میں خاموش تماشائی کی حیثیت سے موجود تھا۔

''کمال کردیا تم نے آمنہ!'' طیب خان نے کہا۔

''ایکسیلنٹ...... ویری گڈ...... شاباش...... زبردست...... خوش کردیا آمنہ!''

ایک کے بعد ایک ساتھی اسے داد دیتے ہوئے گزر رہا تھا مگر عمر ایزد نے اتنا کہنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ حالانکہ آمنہ اس کا شکریہ ادا چاہتی تھی۔

چائے پیتے ہوئے آمنہ نے اسے قانتا راج پال کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف دیکھا۔ اسے ہنسی آگئی۔ عمر ایزد حقیقتاً ایک عجیب لڑکا تھا۔ وہ چائے پیتے ہوئے مسلسل مسکراتی رہی۔

☆ ☆ ☆

"Bravo man, your are too good".

(شاباش یار! تم کمال ہو۔)

وہ اس کے سامنے کھڑا مسکراتی نظروں سے اسے داد دے رہا تھا۔ سب لوگ کانفرنس روم سے نکل کر اپنی اپنی گاڑیوں کی سمت بڑھ رہے تھے۔ وہ بھی اپنی گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول رہی تھی۔ جب عمر ایزد نے اسے مبارک باد دی۔

''تھینک یو...... تھینک یو سو مچ...... تم نے ٹھیک کہا تھا۔'' اکائی کی طاقت'' ساری دنیا پر حکمرانی کرتی ہے۔''

وہ درپردہ اسے اس بات کا کریڈٹ دے رہی تھی کہ اس کی وجہ سے وہ بولنے کے قابل ہوئی۔

"Pleasure is all yours mam".

وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔ آمنہ اس کے انداز پر مسکرائی۔

''مجھے تمہارے دلائل نے حقیقتاً بہت متاثر کیا اور حقیقت تو یہ ہے کہ میں پہلے سے جانتا تھا۔ کہ جب تم بولو گی تو سب دل لگا کر تمہیں سننے پر مجبور ہوجائیں گے اور تمہارا ساتھ بھی دیں گے۔''

وہ ایک بار پھر سنجیدہ ہوا۔

''ہاں' یہ بات تو ٹھیک ہے۔ مجھے احساس ہوا میں غلط تھی۔ وہاں تو سب اپنے بیٹھے تھے اور میں خواہ مخواہ انہیں اتنی اہم سمجھ رہی تھی۔''

آمنہ نے فوراً اعتراف کیا پھر اس کی جانب دیکھ کر بولی۔

''جب ''انہوں'' نے میڈیا کی تکرار کی تو میں کچھ محتاط ہوگئی تھی۔ کیونکہ ان کا میڈیا حقیقتاً بہت طاقتور ہے اور طاقت ہمیشہ فتح حاصل کرتی ہے۔''



''ارے چھوڑو یار! میں اکائی کی طاقت کے علاوہ کسی طاقت پر یقین نہیں رکھتا۔ ''ان'' کے میڈیا کے غبارے سے تو تب ہی ہوا نکل گئی تھی جب بی جے پی کو الیکشن میں شکست ہوئی۔ حالانکہ میڈیا نے سارا زور ایک ''جناب واجپائی'' کو جتوانے کے لیے لگایا ہوا تھا۔''

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا پھر آمنہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

''اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں۔'' اس کا انداز کچھ محتاط سا تھا۔ آمنہ نے مسکرا کر اسے گویا اجازت دی تھی۔

''تم ایسی نہیں تھیں بلکہ بہت مختلف تھیں۔ تم نے بتایا کہ تمہارا منگیتر مرچکا ہے۔ مجھے ایمان نے ابھی بتایا کہ وہ احمد آباد میں رہتا تھا اور کسی کیس میں بے ایمانی سے پھنسا لیا گیا تھا اور پھر وہیں جیل میں یا پھر شاید حراست میں اسے قتل کردیا گیا۔''

وہ محتاط سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ آمنہ کو اس کا سوال سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ نجانے کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ اس ایک حادثے نے تمہیں یکسر تبدیل کر ڈالا۔ یعنی اگر یہ حادثہ نہ ہوتا تو تم ویسی ہی آمنہ ابوبکر رہتیں جو مجھے پہلی بار سری لنکا میں ملی تھی اور جو نظریہ وطنیت کو ڈھکوسلہ اور فرسودہ کہانی کہتی تھی۔''

وہ بہت صاف گوئی سے کہہ رہا تھا۔ آمنہ نے گہری سانس بھری۔ وہ صحیح تو کہہ رہا تھا۔

''ہاں' تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں نے قاسم کو کھونے کے بعد حقیقت کو سمجھا تھا' ورنہ اس سے پہلے تو مجھے ایسی باتوں کا احساس ہی نہیں تھا'' اس نے بہت آرام سے اعتراف کرلیا۔ عمر نے گہری سانس بھری۔

''اب ساری قوم تو اپنا اپنا ''قاسم'' نہیں گنوا سکتی نا تاکہ تم جیسی بن جائے اور تم جیسی سوچ اپنالے۔''

اس نے تلخی سے کہا جبکہ آمنہ کو اس کے منہ سے یہ سن کر حیرت کا جھٹکا لگا۔

''نہیں عمر! تم ایسے مت کہو۔ یہاں لاکھوں کروڑوں افراد ایسے ہیں جنہوں نے 1947ء میں اپنے اپنے قاسم گنوادیے تھے اور تب سے لے کر اب تک وہ صراط مستقیم پر چل رہے ہیں۔ تم یہ مت کہو کیونکہ یہاں صرف آمنہ ابوبکر جیسی لڑکیاں نہیں ہیں جو غلطی کر کے سدھر جاتی ہیں۔ یہاں اس قوم میں بہت اچھی لڑکیاں بھی ہیں جو غلطیاں کیے بغیر بھی سیدھی راہ پر چل رہی ہیں۔ تم اس ملک کے خواص پر مت جاؤ' یہاں کے عوام کو دیکھو جو بے حد محب وطن ہیں۔ یہ جو ہم جیسے لوگ ہیں نا جو سطح پر نظر آتے ہیں جو ہر جگہ چھائے ہوئے نظر آتے ہیں' یہ دراصل ''کمزور'' اور ''ہلکے'' لوگ ہیں جو سطح آب پر اپنی کمزوری کے باعث تیرتے رہتے ہیں اور دنیا کی نظر میں آجاتے ہیں جبکہ یہاں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو اپنی اپروچ میں بہت بھاری ہیں' بہت ٹھوس ہیں اسی لیے وہ گہرائی میں رہتے

ہیں۔ وہ کمزور لوگوں کی طرح سطح آب پر نہیں کرتے۔ تم یقین مانو عمر! اس ملک کی جڑیں گہری ہیں' بہت گہری۔''

وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ عمر کے چہرے سے سنجیدگی پھر غائب ہوگئی۔ اس شخص کا عجیب مسئلہ تھا۔ وہ تب سنجیدہ ہونا پسند کرتا تھا جب سب لوگ غیر سنجیدہ ہوتے تھے اور تب غیر سنجیدہ ہو جاتا جب سب لوگ سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ کر بیٹھے ہوتے تھے۔ اب بھی آمنہ کی انتہائی سنجیدہ بات سن کر وہ مسکرا دیا۔

''مجھے تمہاری بات پر یقین تو نہیں ہے مگر پھر بھی مان لیتا ہوں۔'' وہ پھر سے شرارتی انداز میں بولا۔

''نہیں عمر! میری بات کا یقین کرو بلکہ میں ثابت کرسکتی ہوں۔ مرید کے میں میرے دادو نے غریب بچوں کے لیے ایک اسکول بنا رکھا ہے۔ یہ ایک طرح کی آرگنائزیشن ہے جو غریب بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے مختلف پروگرامز کا انعقاد کرتی رہتی ہے۔ کل شام کو وہاں ایک ورائٹی پروگرام ہے 'جہاں بچوں کے بنائے گئے ہینڈ میڈ کارڈز' مختلف سجاوٹ کی چیزیں' ان کی ڈرائنگز اینڈ پینٹنگز اور کھانے پینے کی اشیاء وغیرہ ہوں گی۔ تم وہاں آنا اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا کہ وہ بچے اس وطن کے معمار لگتے ہیں یا نہیں۔ تمہیں خود ان کی آنکھوں میں وہ جذبہ نظر آئے گا جو اس ایک فیصد اپر کلاس میں نظر نہیں آتا۔ پھر تمہیں میری بات کا یقین آجائے گا۔'' وہ اسے مدعو کرتے ہوئے کہہ رہی تھی جبکہ اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے پھر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

''نا رے بابا...... میں اپنی شام تمہارے اس ورائٹی پروگرام کے نام کرکے اپنا نقصان نہیں کرسکتا۔ مجھے کل شام شریمتی قانتا راج پال نے انوائٹ کر رکھا ہے' پرسوں ان لوگوں کو واپس چلے جانا ہے اور وہ کل کی شام میرے ساتھ گزارنا چاہتی ہیں اور تم چاہتی ہو کہ میں اتنا رنگین پروگرام ڈراپ کرکے تمہارے اس بورنگ ورائٹی پروگرام میں آؤں۔ مجھے معاف رکھو مس آمنہ ابوبکر! میں چلتا ہوں۔''

وہ اس کی بات سنے بغیر آگے بڑھ گیا۔ آمنہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''تم حقیقتاً ایک معمہ ہو عمر ایزد!''

وہ عقب سے جھنجلا کر بولی تھی۔ عمر نے اس کی بات سن کر مڑ کر اسے دیکھا پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا تھا گویا اس کومپلیمنٹ پر شکریہ ادا کر رہا ہو۔ آمنہ مسکراتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس کے پاس آج کی رات دادو سے شیئر کرنے کے لیے بہت سی باتیں جمع ہوگئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

محبت کی کہانی میں مسافت کی بشارت تھی
مسافت طے ہوئی تو پھر



جلا ڈالی تھیں میں نے بھی
وہیں سب کشتیاں اپنی
جہاں پہلا پڑاؤ تھا
شکستہ جسم تھا میرا
میرے سینے میں گھاؤ تھا
بھڑکتا اک الاؤ تھا
کسی کی چاہ میں سب کچھ لٹا کر
آ گیا تھا میں
کہاں پر آ گیا تھا میں؟
جہاں پہچان کا اپنی
حوالہ ہی نہ ملتا تھا
حوادث کے تھپیڑوں سے
سنبھالا ہی نہ ملتا تھا
شب تیرہ سے نکلا تھا
اجالوں کی تمنا میں
مگر مجھ کو کسی جانب
اجالا ہی نہ ملتا تھا
مگر ہمت نہیں ہاری
مگر ہمت نہیں ہاری
یہاں تک آ گیا ہوں میں
جہاں ہر سو اجالا ہے
میری پہچان ہے اپنی' وطن میرا حوالہ ہے
مجھے اس نے سنبھالا ہے اسے میں نے سنبھالا ہے
یہی میرا حوالہ ہے
یہی تیرا حوالہ ہے

☆ ☆ ☆

''جب یہ ملک بنا تو ہمارے پاس کچھ نہ تھا۔ ہم خالی دامن اور دریدہ آنچل لے کر یہاں آئے تھے۔ ہمارے اثاثے' ہماری املاک' ہمارا قیمتی ساز و سامان سب وہاں رہ گیا تھا۔ ہم میں سے

بہت سے لوگوں نے خود اپنے ہاتھوں اپنی بہنوں بیٹیوں کو ذبح کر ڈالا تھا تا کہ انہیں سکھ جتھوں اور ہندو بلوائیوں سے بچا سکیں۔ بہت سے ماں باپ نے اپنے جوان بیٹے کھوئے' بہت سے جوان بیٹوں نے اپنے بوڑھے ماں باپ گنوائے مگر ان سب کے باوجود یہاں اس سرزمین پہ قدم رکھنے کے بعد ہم بہت خوش تھے۔ ہمیں لگتا تھا ہم نے زمین پر جنت جیسی کوئی چیز پا لی ہے۔''

وہ ستر بہتر سال کا باریش آدمی جس کی سفید داڑھی اس کے گہرے تجربے و مطالعے کو ظاہر کرتی تھی' اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔ اس کے اردگرد دائرہ بنا کر بیٹھے بچوں کے چہرے پر انتہا کا تجسس تھا۔ موسم میں حبس نہیں تھا مگر گرمی کے اثرات کے باعث تقریباً سب ہی کے چہرے پر پسینے کی ہلکی نمی تھی مگر ان بچوں میں سے کوئی بھی اکتایا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔ اس باریش شخص نے سفید رنگ کا باریک ململ کا کرتا شلوار پہن رکھا تھا۔ سر پر سفید ٹوپی تھی اور بائیں طرف ایک عصا رکھی تھی۔ اس پورے گراؤنڈ میں اتنی عمر کا کوئی دوسرا آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ یقیناً آمنہ ابوبکر کے دادو' نور الحسن تھے۔ عمر ایزد آگے بڑھ کر انہیں سلام کرنا چاہتا تھا مگر بچوں کے چہرے پر تجسس دیکھ کر وہ ایک سمت میں کھڑا ہوگیا۔ تا کہ دادو اپنی بات مکمل کرلیں۔

''اس زمانے میں کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اسے بمبئی' چنڈی گڑھ' دہلی یا کلکتہ جیسے شہروں میں رہنا ہے بلکہ سب لوگ اپنی اپنی پرتعیش زندگیاں چھوڑ کر پاکستان چلے آئے۔ میں خود اپنے والدین کو گنوانے کے بعد اپنے منے سے بھائی کو اپنے کرتے میں چھپا کر لایا تھا اور بہت سے لوگوں کو اپنے ننھے منے بھائیوں کو کرتوں میں چھپانے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ ہم جب یہاں لاہور پہنچے تو والٹن کی قریب مہاجر کیمپ لگا تھا۔ میں نے سب سے پہلے والٹن کی زمین کا بوسہ لیا تھا۔

میرے دل سے ماں باپ کو کھونے کا ملال بھی نکل گیا تھا کیونکہ پاکستان پہنچ جانے کا خیال ہی اس قدر پرکیف تھا کہ کوئی دکھ دل میں جگہ بنا ہی نہیں پاتا تھا۔ ہم سب جانتے تھے کہ زندگیوں میں امتحانوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے مگر ہم سب پرجوش اور پرامید تھے۔ ہم سب میں ایک لگن تھی اور محنت کا جذبہ بھی۔''

انہوں نے کہتے کہتے رک کر سانس لیا پھر تپائی پر پڑا ایلومینیم کا گلاس اٹھا کر پانی کا ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا اور پھر سے بولنے لگے۔

''میرے بچو! تم کو یقین نہیں آئے گا کہ جب پاکستان بنا تو یہاں تھوڑی سی ٹوٹی پھوٹی سڑکیں تھیں۔ ہمارے پاس ہاسپٹل نہیں ہوتے تھے اور جو ہاسپٹل تھے' وہاں بہت کم مریضوں کی گنجائش ہوا کرتی تھی۔ سڑکیں کم تھیں' اس لیے ٹرانسپورٹ سسٹم بھی بہت ناقص تھا اور گاڑیوں کی تعداد تو بہت ہی کم تھی۔ یہاں کی قابل کاشت زمین بھی بنجر لگتی تھی۔ میں لاہور (والٹن) سے جہانیاں چلا گیا۔ وہاں میں محنت مزدوری کرتا تھا۔ بہت کم پیسے ملتے تھے' مگر ان کم پیسوں میں بھی اتنی برکت ہوتی تھی کہ میں



تینوں ٹائم نہ صرف خود پیٹ بھر کر کھاتا تھا بلکہ اپنے بھائی کو بھی کھلاتا تھا۔ آزادی کے پالینے کا احساس ہی اس قدر مضبوط تھا کہ غربت یا پسماندگی کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ میں نے بہت محنت کی اور اس محنت کا صلہ بھی ملا۔ میں نے محنت مزدوری کرتے کرتے اتنا کما لیا کہ اپنا کاروبار شروع کرسکوں۔ ایک پرچون کی دکان سے ابتدا کی پھر دھیرے دھیرے اسے ایک بڑے سے اسٹور میں تبدیل کرلیا۔ اس کے بعد زندگی میں کچھ ایسے حادثات آئے کہ جہانیاں سے لاہور شفٹ ہونا پڑا مگر یقین کرو میرے بچو! میں کبھی مایوس نہیں ہوا۔ ہمیشہ پرامید رہا کیونکہ مجھے خدا پر یقین تھا۔ مجھے زندگی میں جو کچھ ملا تھا' اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اس دھرتی کی بدولت ملا تھا۔''

وہ ایک بار پھر خاموش ہوگئے۔

''میں تب بھی مایوس نہیں ہوتا تھا اور میں اب بھی مایوس نہیں ہوں۔ جس طرح سے میں نے ترقی کی اور ایک پرچون کی دکان سے ایک بڑے اسٹور کا مالک بن بیٹھا' اسی طرح اس ملک نے بھی بہت ترقی کی۔ پہلے کی نسبت اب ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اب ہمارے ملک میں سڑکوں کی لمبائی تیس لاکھ نوے ہزار کلومیٹر ہوچکی ہے۔ گاڑیوں کی تعداد پچاس لاکھ اکسٹھ ہزار ہو چکی تھی۔ فون لائنز چالیس لاکھ کی حد سے تجاوز کرچکی تھی۔ اس ملک میں اکیس ہزار سنتالیس میگاواٹ بجلی پیدا ہوتی ہے اور اس کی برآمدات بیس ہزار ملین ڈالر ہوچکی ہیں۔''

وہ بات کرتے کرتے تھوڑا رک کے پھر پرسوچ انداز میں بولے۔

''میرے بچو! ہمیں اس صورت حال پر خوش ہونا چاہیے مگر ہم مایوس ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا یہ مسلمان قوم کے لیے باعث شرمندگی نہیں کہ جب کچھ نہیں تھا تو سب بہت پرامید اور پرجوش تھے مگر اب جب بہت کچھ ہے تو ہم اس صورت حال پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی بجائے منہ لٹکا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم سب اپنے وطن کو برا بھلا کہتے ہیں اور ہم میں سے بہت سے لوگ اس وطن کو چھوڑ کر کہیں اور جا کر بسنا چاہتے ہیں۔ میرے بچو! مجھے بتاؤ کہ کیا یہ مایوسی اچھی بات ہے' کیا ہمیں پہلے کی طرح پرامید نہیں رہنا چاہیے؟'' وہ بچوں سے سوال کر رہے تھے اور عمر ایزد نے دیکھا کہ تقریباً سب بچے زور زور سے گردن ہلا رہے تھے۔ ان کی گردنیں اثبات میں ہل رہی تھیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ انہیں پرامید رہنا چاہیے۔ یہی عوامل اقوام کی ترقی میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

''میرے بچو! تبدیلی کی ضرورت زمین میں نہیں' ہم انسانوں میں ہے' ہم پاکستانیوں میں ہے۔ ہم میں یہ جو مایوسی آتی جارہی ہے نا یہ بہت گندی چیز ہے۔ ہمیں خود کو اس مایوسی سے بچانا ہوگا اور ہم بچا لیں گے' انشاء اللہ۔'' انہوں نے نہایت پر اعتماد لہجے میں کہا تھا اور ان کی آواز میں آواز ملانے کے لیے سب بچوں نے ''انشاء اللہ'' کہا تھا۔ عمر ایزد کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

باطل سے ڈلنے والے اے آچھمان نہیں ہم

چھو بال لے چکا ہے تو امتحاں ہما لا

ایک بچے نے اپنی توتلی آواز میں معصوم انداز سے یہ شعر پڑھا تھا۔ عمر ایزد نے اب کی بار ایک قہقہہ لگا دیا تھا۔ دادو کی نظر اس قہقہے کی آواز پر عمر ایزد کی جانب اٹھ گئی۔

"السلام و علیکم۔ مجھے آمنہ نے یہاں بلوایا تھا۔ میرا نام عمر ہے۔" وہ ان کی استفہامیہ نگاہ کے جواب میں بولا پھر قریب آ کر ان سے ہاتھ ملا کر دوسرے ہاتھ میں پکڑے پھول اور کیک ان کی جانب بڑھا دیے۔

"ارے...... تم آمنہ کے دوست ہو...... آمنہ بچے! ادھر آؤ...... یہ عمر بیٹا آیا ہے۔"

انہوں نے اپنی نشست سے اٹھ کر اس کا ہاتھ تھاما اور پھر آمنہ کو پکارا۔ عمر کو شرمندگی محسوس ہوئی اور دادو کے انداز پر دل ہی دل میں اس نے خود کو ڈانٹا بھی مگر دادو نے محسوس بھی نہ کیا تھا۔ آمنہ نجانے کس کونے سے نکل کر اس کے سامنے آ گئی۔ پنک کلر کے سادہ سے لباس میں وہ بالکل چھوٹی سی بچی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے دوپٹہ ایک کندھے سے گزار کر کمر پر باندھ رکھا تھا۔ اس گھریلو سے حلیے میں وہ کوئی اور ہی آمنہ ابوبکر لگ رہی تھی۔

"تم یہاں...... مجھے یقین نہیں آ رہا...... اچھا اس طرف آ جاؤ۔"

وہ اس کے ہاتھ سے پھول اور کیک لے کر بچوں کو تھماتے ہوئے بولی۔ عمر اس کے ساتھ دوسری سمت میں آ گیا۔ جہاں کچھ ننھی منی بچیاں سفید رنگ کے پھولے پھولے فراک پہنے ہاتھوں میں ستارے والی ٹہنیاں تھامے پریوں کے گیٹ اپ میں کسی ٹیبلو کی ریہرسل کر رہی تھیں۔ عمر نے حیرت سے اس وسیع و عریض گراؤنڈ کو دیکھا۔

ایک طرف اسٹالز بھی لگے تھے۔ بچے اپنی اپنی پینٹنگز بھی سجائے بیٹھے تھے کچھ اور چیزیں بھی نظر آ رہی تھیں۔

"تمہیں ایڈریس کس طرح ملا؟ کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟ اپنی گاڑی پر آئے ہو گے؟ وہ میرے دادا تھے۔"

اس نے خود ہی سوالات کرتے ہوئے دادو کا تعارف کروایا۔ اس کے انداز میں عجلت دیکھ کر عمر جھنجلا گیا۔ وہ اتنی دور سے آیا تھا اور مس آمنہ اس کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے بچوں میں مگن تھیں۔

"یار! میں اتنی دور سے آیا ہوں' کم از کم میرا شکریہ ہی ادا کر دو۔" وہ اسے گھورتے ہوئے بولا تو آمنہ مسکرا دی۔

"تم اتنی دور سے آئے ہو مگر میں تمہارا شکریہ ادا نہیں کروں گی البتہ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تم بور نہیں ہو گے اور جب تم یہاں سے واپس جاؤ گے تو تم میرا شکریہ ادا کرو گے۔"

وہ آمنہ کی بات پر مسکرانے کی بجائے خاموشی سے ان بچیوں کو دیکھنے لگا جو گول دائرے میں



گھوم رہی تھیں۔ ان ہی کے قریب ایک نوعمر لڑکی کھڑی تھی جو کسی نظم کو ترنم سے پڑھنے میں مصروف تھی۔ میری پہچان ہے اپنی وطن میرا حوالہ ہے۔

مجھے اس نے سنبھالا ہے اسے میں نے سنبھالا ہے
وطن میرا حوالہ ہے
وطن میرا حوالہ ہے

اس لڑکی کے بائیں جانب زمین پر چند بچے بیٹھے تھے جو ساتھ ساتھ تالیاں بجا رہے تھے اور ٹیبلو کی ریہرسل کرتی بچیوں کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔

"یمنی بیٹا! آپ بازو کو ٹھیک سے نہیں گھما رہیں۔ یوں اوپر سے دائرہ بنا کر نیچے لاؤ۔"

آمنہ نے ایک بچی کو ٹوک کر تصحیح کی۔

عمر اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ بچی کو ہدایات دے کر فارغ ہوئی تو اس کی طرف دیکھ کر ایک بار پھر مسکرا دی۔

"یہ آئٹم چودہ اگست کو پیش کرنے کے لیے خاص طور پر تیار کیا گیا ہے۔ یہ سب تیاری ان بچوں نے کی ہے۔ بچے بہت پرجوش ہیں۔"

وہ بچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"یار آمنہ! میں تو ابھی سے بور ہو گیا ہوں۔ وہاں اچھی بھلی قانتا راج پال کے ساتھ ایک ٹھیک ٹھاک شام گزر سکتی تھی مگر میں یہاں آ گیا اور تم نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ راستے میں مشکل تو نہیں ہوئی اور یہ کہ ایڈریس کیسے ڈھونڈا اور وہاں میری گاڑی......"

"اف! میں عجیب آدمی ہوں' بھول ہی گیا۔ میرا بھائی بھی ساتھ ہے' باہر گاڑی میں بیٹھا ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں دیکھ کر آتا ہوں ہم صحیح جگہ پہنچے ہیں یا نہیں۔ وہ بے چارہ گاڑی میں بیٹھا سوکھ رہا ہے۔"

وہ عجلت بھرے انداز میں بولا۔ آمنہ ایک بار پھر مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی عمر ایزد خود بھی اس جذبے کے تحت یہاں کھنچا چلا آیا ہے جس جذبے کے تحت وہ اور دادو گزشتہ سالوں سے آ رہے تھے۔ و یقیناً ان بچوں کی آنکھوں میں دھیرے دھیرے جلتی امید کی مشعلوں کو مزید ایندھن فراہم کرنے آیا تھا اور آمنہ کے سامنے خواہ مخواہ ایکٹنگ کر رہا تھا۔

"تمہارا چھوٹا بھائی نہیں ہے۔ اس کو بھی ساتھ لے آتے۔" آمنہ نے متبسم لہجے میں کہا تو عمر نے بھنویں اچکا کر اس کی جانب دیکھا۔

"طنز کر رہی ہو"

"ارے نہیں بھئی' میں بھی بالکل سنجیدہ ہوں۔ ہمیں بہت سے بڑے بھائیوں کی' چھوٹے

بھائیوں کی' بہنوں کی' باجیوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں بہت سے ہاتھوں کی ضرورت ہے' ہمیں بہت سے معماروں کی ضرورت ہے جو تعمیر وطن میں حصہ لے سکیں۔''

آمنہ نے بے حد جذب کے عالم میں کہا تھا۔

''اچھا...... ایسی بات ہے تو میں اگلی بار تمہارے اس سکول میں آتے ہوئے اپنی امی' خالہ' چاچی' تائی' اپنے ابو' بڑے بھائی' چاچو' اپنی ہونے والی بیوی' اپنی سالیوں کو' سالیوں کے سسرال والوں کو' اپنے گھر میں کام کرنے والے ملازم کو' اس کی بیوی کو' اس کی بیوی کے بھائی کو اور......''

عمر یکدم خاموش ہوا کیونکہ آمنہ نے بے تحاشا ہنسنا شروع کر دیا تھا۔ عمر کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''ٹیپو...... ٹیپو...... یہاں آؤ۔'' اس نے ہنستے ہوئے دور کھڑے ایک پندرہ سال کے لڑکے کو آواز دی۔

''یہ عمر بھائی ہیں۔ انہیں ذرا کمپنی دو۔'' اس نے اس بچے کو عمر کے ساتھ لگایا اور ساتھ ہی مزید ہدایات دیں۔

''ان کے بھائی بھی ہیں ساتھ' باہر گاڑی میں بیٹھے ہوں گے' انہیں بھی لے آؤ اور سنو' میرے خرچ پر انہیں کولڈ ڈرنک بھی پلوا دینا۔''

عمر چوں چرا کیے بغیر اس لڑکے کے ساتھ عقبی حصے کی طرف آ گیا۔ وہ حصہ سامنے والے حصے کی نسبت زیادہ اچھی طرح سے سجایا گیا تھا۔ بہت سے بچے اور بچیاں ادھر ادھر گھومتے نظر رہے تھے۔ مختلف اسٹالز سجے ہوئے تھے جن میں مختلف چیزیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ ٹیپو تھوڑی دیر میں اس کے بھائی کو لے کر بھی آ گیا۔ عمر اپنے ساتھ عمیر کو خاص طور پر لایا تھا تاکہ اٹھارہ سالہ عمیر اپنے ملک کے مستقبل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ عمیر تھوڑی سی دیر بعد اپنی عمر کے چند ایک دوست ڈھونڈنے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا جو ان ہی کی طرح اس چیریٹی شو میں مدعو تھے۔ عمر نے ایک چھوٹی سی ڈائری نکال کر اس بہت سی باتیں نوٹ کی تھیں۔ اور عمیر نے اپنے ڈیجیٹل کیمرے سے بہت سی تصویریں بنائی تھیں۔

عمر اپنا اگلا آرٹیکل اسی پر امید مستقبل کی جھلملاتی روشنی میں لکھنا چاہتا تھا جبکہ عمیر کو فوٹوگرافی کا شوق تھا۔ اس نے خاص طور سے جشن آزادی کے موضوع پر ہونے والے فوٹوگرافی کے مقابلے کے لیے تصویریں اتاری تھیں۔ ان دونوں کو بلاشبہ بہت مزہ آ رہا تھا۔ عمر جانتا تھا کہ وہ اس شام کو بہت انجوائے کرے گا' اسی لیے وہ ساری مصروفیات پس پشت ڈال کر یہاں آیا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے مٹی کے چھوٹے چھوٹے برتنوں سے سجے ایک اسٹال پر کھڑے ہو کر ایک چھوٹے سے دیے کو ہاتھ میں لے کر پوچھا۔

''یہ چراغ ہے۔ میں نے خود بنایا ہے۔'' وہ بچہ خوش ہو کر بتانے لگا۔ اس دیے پہ بیرونی سطح



پر سبز اور سفید رنگ سے پینٹ کیا گیا تھا۔ وہ دیا بہت خوبصورت نہیں تھا مگر اس بچے کے چہرے پر جو خوشی اور فخر تھا' وہ بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔

''مجھے کتنے میں دو گے؟'' عمر نے اس دیے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس بچے کے اسٹال پر اتنی عمر کا شاید پہلا گاہک تھا' اسی لیے وہ کچھ جھینپ سا گیا۔

''پچاس روپے تو بہت زیادہ ہیں یار!'' انچاس لے لو۔''

عمر نے شرارتی انداز میں سودابازی شروع کی۔ بچے نے سعادت مندی سے گردن ہلائی تو عمر کو ہنسی آ گئی۔ اس نے اپنا والٹ نکال کر پچاس روپے اس کی ہتھیلی پر رکھ کر وہ دیا اٹھایا۔

''میں ان پیسوں کا نیا جھنڈا خریدوں گا۔ اس بار میں اپنے گھر کی چھت پر نیا جھنڈا لگاؤں گا۔''

اس بچے کے چہرے پر یہ سب کہتے ہوئے ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ عمر اسے دیکھتا رہ گیا۔

''تم نے اس قوم کی اصل اسپرٹ دیکھنی ہو تو اس بچے کی آنکھ میں دیکھنا جو جھنڈیوں کی دکان پر اپنے بابا کی قمیص کھینچ کھینچ کر جھنڈیاں خریدنے کی ضد کرتا ہے یا پھر وہ بچہ جو اپنے گھر پر سب سے اونچا جھنڈا لگانے کے لیے محلے والوں سے بانس مانگتا پھرتا ہے یا پھر وہ بوڑھا جو پاکستان کے ساتھ لا الہ الا اللہ کی تسبیح کرتے نہیں تھکتا۔ تم دیکھنا عمر! پھر تمہیں احساس ہو گا کہ وہ سب لوگ بکواس کرتے ہیں جو اس قوم کے مستقبل سے ناامید ہو کر الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں۔''

آمنہ نے اسے یہاں انوائٹ کرتے ہوئے کہا تھا اور وہ اس بات پر بہت دل سے مسکرایا تھا مگر اس نے آمنہ کی سامنے صرف ناک چڑھانے پر اکتفا کیا تھا۔ وہ ننھے سے دیے کو ہاتھ میں لے کر دوبارہ سے آمنہ کی طرف آ گیا جو ابھی تک ان بچیوں کو ریہرسل کروانے میں مصروف تھی۔

''تمہارے لیے'' اس نے وہ دیا آمنہ کی جانب بڑھایا۔ آمنہ نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر وہ دیا تھام لیا۔

''تھینک یو آمنہ!'' اس نے آمنہ کے قریب ہو کر کہا تھا کیونکہ اب کی بار ٹیبلو والی بچیاں' زمین پر بیٹھے بچے سب مل جل کر اونچی آواز میں گنگنا رہے تھے۔

''میری پہچان ہے اپنی' وطن میرا حوالہ ہے''

مجھے اس نے سنبھالا ہے' اسے میں نے سنبھالا ہے وطن میرا حوالہ ہے

وطن تیرا حوالہ ہے''

آمنہ نے مسکرا کر عمر کی جانب دیکھا' وہ بھی مسکرا دیا تھا۔ اس وسیع و عریض گراؤنڈ میں موجود سب لوگوں کی آنکھوں میں امید خود بھی ایک عزم سے مسکرا دی تھی۔

❀......❀......❀